بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

زیر ادارت

...لم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسـ...

...ید جلد ۱۶　　بابتہ ماہ جنوری

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی (سے)

"ہندوستانی روزنامچہ"

از ایڈون مانٹیگو - سابق وزیر ہند

جو بات گھر کے اندر کہی جاتی ہے، یہ سمجھ کر کہ اس کو باہر کوئی نہ سن سکے گا، وہ بات زیادہ دلچسپ اور زیادہ سچی ہوتی ہے، اس کلام سے جو عوام کے درمیان شہرت اور اشاعت کے لئے زبان پر لایا جائے۔ اخبار کے کالموں میں اور پبلک جلسوں میں، مدبرین اور لیڈران کی تقریریں کچھ اور ہوتی اور گھر کی باتیں کچھ اور!

۱۲۳۳۴۱

ایڈون مانٹیگو ۱۹۱۷ء میں سلطنت برطانیہ کے وزیر ہند تھے، اب وہ دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ جب وہ وزیر ہند کی حیثیت سے ۱۹۱۷ء میں ہندوستان کا دورہ اور آئینی اصلاحات کے متعلق اپنی رپورٹ تیار کر رہے تھے تو ایک ذاتی روزنامچہ بھی لکھا کرتے تھے جس میں وہ دل کی باتیں، تجربے اور ان لوگوں کے متعلق اپنے خیالات جو ان سے شرف باریابی حاصل کرتے تھے، بے تکلف اور بے تکان درج کرلیا کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد یہ اوراق ان کی بہن کے ہاتھ آئے۔ اور حال ہی میں بجنسہٖ شائع کر دئے گئے ہیں۔ کتنے "لیڈران قوم" اور "رہنمایان ملت" اور سلطنت برطانیہ کے "وفادار حلیف" اپنے متعلق وزیر ہند کے خیالات کو ان اوراق میں پڑھ کر محظوظ ہوتے ہوں گے! ان اوراق سے ان اصحاب کے دلوں کی کیفیت دلچسپ اور پرلطف ہوگی! اگر ہم پر ظاہر ہو سکتی!-

---

آج تک ہمارے ملک کا "اعتدال پسند" فرقہ مانٹیگو کی نام کی پوجا کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ایک چیز ضرور ایسی تھی جس نے ان کو تمام گذرے ہوئے وزرائے ہند سے بالاتر کر دیا تھا۔ وہ ان کا لائڈ جارج کے عہد وزارت میں اپنے عہدے سے نکالا جانا تھا۔ جس وزیر کے ساتھ لائڈ جارج

ہ مرنہ کر سکے ، اُس کے اندر کوئی خوبی ضرور ہو گی ! ہم غلاموں کے نقطہ نظر سے ! اعتدال پسند گروہ
کا تو ذکر ہی فضول ہے کہ وہ الطاف و عنایات کے ایک سوکھے ٹکڑے کو خوان نعمت سمجھ لیتے ہیں ۔
لیکن اس جماعت کی رائے سے قطع نظر کر کے خود اس روزنامچہ کو دیکھنے کے بعد یہ تو ضرور کہا جا سکتا
ہے کہ مانٹیگو انگلستان کی الیہ پلیٹ جماعت میں نسبتہً بہتر شخص تھا۔

حکومت ہند کے متعلق اس روزنامچہ سے مانٹیگو کے جن خیالات کا تبعدیات ... ...
حکومت کے لئے یک گونہ تکلیف دہ ہوگی ۔ اگر اسلحہ خانے میں کو ...
ہمیں اس روزنامچے کی اشاعت بند کر دے تو اس زلمت میں ...
ہے اور نا قابل اعتراض ہو ۔ تعجب نہیں اگر حکومت کے اعلیٰ دفاتر

" مانٹیگو " کے خیالات کے تین نمونے روزنامچے کے اوراق سے منتخب کئے گئے ہیں۔

(۱) " مانٹیگو " کے خیالات شملہ کے لیڈران ملک کی نسبت

(۲) " " " بعض وائسرائے کی نسبت

(۳) " " " حکومت ہند اور اس کے بعض عمال کے متعلق

یہ اس گذشتہ عہد کی تاریخ کا ایک ٹکڑا ہے جب ہمارے لیڈروں نے انتہائی احتیاط کے ساتھ
" آئینی اصلاحات " کا نام لینا شروع کیا تھا اور وہ بیان کیا جا رہا ہے اس زمانے میں جب ہندوستان
کی نئی نسل بلاتکلف آزادی کامل کا مطالبہ کر رہی ہے ۔ قومی لیڈری کی جو تصویریں مانٹیگو نے شملہ
میں دیکھی ہیں اُن میں بہت سے مرقعوں کا رنگ و روغن اُڑ چکا ہے ۔ جو اُس وقت صف اول میں
تھے آج صف آخر میں نظر نہیں آتے ۔ تاہم وہ سب اس ڈرامے کے ابتدائی سین کے ایکٹر تھے۔
ان کو بھی بھولنا نہ چاہئے۔

سبرامنی ایر: ملنے آئے۔ وہی معمر جج ہیں جنھوں نے ایک شدید[1] خط پریسیڈنٹ ولسن کو لکھا تھا۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بڑی سختی سے اُن کی خبر لی۔

کھاپرڈے: یہ تلک کے دست راست ہیں۔ ان سے باتیں کرنے میں لطف آتا ہے۔ مگر کسی کام کے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

راما سوامی ایر: کے بعد راما سوامی ایر آئے۔ اپنی زندگی میں ان سے زیادہ ہوشیار آدمی میں نے نہیں دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ خیالات میں انتہا پسند ہیں مگر بہت بہت بہت قابل۔ انھوں نے دوران بحث میں بار بار ہم کو (مجھے اور چیمسفورڈ کو) زچ کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ "

گاندھی: اس کے بعد ہم مشہور گاندھی سے ملے۔ یہ ایک سوشل ریفارمر ہیں ان کی حقیقی خواہش یہ ہے کہ لوگوں کی شکایتیں معلوم کریں اور ان کو رفع کرائیں، اپنی شہرت کی غرض سے نہیں بلکہ ابنائے نوع کی حالت بہتر بنانے کے لئے۔"

جناح: ان لوگوں کے بعد جناح آئے۔ نوعمر، نہایت سلیقہ شعار مرعوب کرنے والی شکل و صورت گفتگو کی تمام ترکیبوں سے مسلح۔ اور اپنی پوری اسکیم [illegible] مگر البتہ چیمسفورڈ نے بحث کرنی چاہی ان کو بھی کھا کھا کر اپنا باندھا لہجہ جواب بن نہ آیا۔ جناح بہت ہوشیار آدمی ہیں اور حیف ہے کہ ایسے شخص کو اپنے ملک کے انتظام میں حصہ لینے کا موقع نہ ملے۔"

تلک: کے بعد تلک سے ملاقات ہوئی جو غالباً ہندوستان میں سب سے زیادہ باا‌ثر شخص ہیں اور بہت زیادہ انتہا پسند ہیں۔ کانگریس لیگ اسکیم کے اصلی مصنف غالباً یہی ہیں مگر بحث و مباحثہ

---

(۱) جنگ کے زمانے میں سبرامنی ایر نے پریسیڈنٹ ولسن کو ایک طویل خط لکھا تھا جس میں تفصیل کے ساتھ برطانوی بے انصافیوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ خط اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا۔ اور کچھ عرصہ تک اس کا بہت چرچا رہا۔

میں ان کا کچھ اثر مجھ پر نہیں ہوا "

سنہا (۱): سنہا سے باتیں ہوئیں اس میں شک نہیں کہ بحیثیت مجموعی وہ بہت ہی معقول آدمی ہیں اور میرے نزدیک تو وہ سب سے زیادہ وفادار اور دلچسپ ہندوستانی ہیں "

موتی لال گھوش: "امرتا بازار پتریکا کے دلچسپ اور معمر ایڈیٹر۔ موتی لال گھوش سے طویل ملاقات ہوئی خوب بڈھا ہو۔ بہت شائستہ۔ بہت ہنس مکھ۔ بیحد خوش عقیدہ برہمن مگر تند مزاج۔ سیاسی آدمی۔ سیاسیات میں بہت تلخ اور پبلک کے سامنے ہماری نیت کو ناقابل اعتبار سمجھنے والا۔ مگر تنہائی میں ہماری نیک نیتی کا یقین کرنے والا۔ . .

شاستری: آخر گوکھلے کے قایمقام شاستری سے بھی ملاقات۔

مالوی: "پنڈت مدن موہن مالوی بھی آئے۔ ان سے زیادہ ظاہری حالت بہت دلکش رہی۔ برہمن از سرتا پا نہایت شائستہ بات چیت، اور نہ مٹ سکنے والی تردد .

"اس کے بعد مالوی سے بہت طویل گفتگو رہی ۔۔ مجھے یہ شخص بہت بھایا مگر یہیں کس قدر قوت ارادی ہے۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ مالوی گھاس کے اندر ایک سانپ کے مثل ہے اور بالکل ناقابل اعتبار ہے۔ مگر اس کا یقین کرنا مشکل ہے۔ میرے خیال میں یہ لوگ دگورنمنٹ اس کے ساتھ صحیح برتاؤ کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کرتے ۔ "

چنتامنی: "اس کے بعد چمسفورڈ نے اور میں نے مسٹر چنتامنی ایڈیٹر لیڈر سے طویل ملاقات کی۔ یہ شخص غیر معمولی ذہانت رکھتا ہے۔ میرے خیال میں بحث و مباحثہ میں سب سے ہوشیار ہندوستانی ہے۔ اب تک اس سے زیادہ قابل آدمی میں نے نہیں دیکھا اور اس کی تجاویز بھی غیر معمولی طور پر معقول تھیں ۔ "

---

(۱) لارڈ سنہا۔

سر نیدر ناتھ بنرجی:۔ "سر نیدر ناتھ بنرجی اور مدھولکر آئے۔ بنرجی تو سراپا گفتار ہیں بہت باتونی اور ان میں کوئی آثار اعتدال اور سمجھوتے کے نہیں پائے جاتے۔"

انھوں نے ایک عجیب اصول بیان فرمایا کہنے لگے "آپ خود سیاست داں ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص اقلیت میں ہو تو وہ سوائے اس کے کیا کر سکتا ہے کہ اکثریت میں شامل ہو جائے۔"

واہ! ہندوستانی سیاست دانوں کا کس قدر اعلیٰ اصول کار رہے!"

امام صاحب جامع مسجد:۔ "دہلی کی جامع مسجد کے امام صاحب آئے اور مجھے سمجھایا کہ ہوم رول کس قدر خطرناک چیز ہے اور ہم کو اصلاحات کے دینے میں کس قدر احتیاط ضروری ہے۔ مگر اُن کی کوئی بات دلچسپ نہ تھی۔"

محمود آباد:۔ "بُری انگریزی بولتے ہیں اور میرے خیال میں کلیۃً مخالف ہیں۔ محمود آباد کچھ خوش مزاج آدمی نہیں معلوم ہوتے۔"

"محمود آباد سے بہت طویل باتیں ہوئیں۔ آخر کار میں اُن کی دماغی کیفیت اب اچھی طرح سمجھ سکا اور اب مجھے وہ بہت پسند آئے۔ غالباً مسٹن نے اُن کے ساتھ غلط برتاؤ کیا — وہ ایسے مسلمانوں سے تنگ آگئے ہیں جو محض پین اسلامزم کو ترجیح دیتے ہیں اور ہندوستانی وطنیت کی پروا نہیں کرتے۔ بہت موثر گفتگو تھی۔"

باسو۔ باسو سے کچھ باتیں ہوئیں۔ بڑا ہی چلتا ہوا بڈھا ہے۔ جو کاغذات دیئے جاتے ہیں ان کو نہیں پڑھتے اور مجھے بار بار وہی باتیں سمجھانی پڑتی ہیں جو وہ کاغذات سے معلوم کر سکتے تھے۔ باسو چلتے ہوئے، ہوشیار، ضدی، لڑائی میں پختہ، مگر شکر گذار، شریف، بہت انصاف پسند اور ہمارے لئے اچھا سرمایہ ہیں۔"

سنکرن نایر:۔ سنکرن نایر سے "بہت ہی ناقابل علاج آدمی ہیں، اچھا ہوتا کہ وہ انگلستان میں ہوتے جیسی کہ چیمسفورڈ کی رائے تھی۔ ان کا اختلافی نوٹ زیادہ تر غلط سلط تجاویز سے جن کو انھوں نے

نے۔ ابھی ہیچ سوچا بھی نہیں اور برطانوی گورنمنٹ کے متعلق گالیوں سے بھرا ہوا ہے۔ جس قدر
کھینچا جا سکتا ہو وہ کھینچتے ہیں اور دوسرے کی بات سننا نہیں چاہتے۔ ... جب اُن سے
بحث کیجاتی ہے وہ کسی سمجھوتے پر راضی نہیں ہوتے۔ اپنے شرکا ... کے ساتھ رواداری
نہیں برتتے اور ... گورنمنٹ پر جب وہ کچھ لکھتے ہیں تو سارے کانگرس سے مشورہ کرتے ہیں
اگر ہندوستانی عام رائے کا نمونہ یہی شخص ہو تو میں عام رائے ... [illegible]

محمد علی :- رابرٹسن نے مجھ سے کہا کہ ایک ... ڈیپوٹیشن ... [illegible]
کہا گیا کہ صرف اصلاحات کے متعلق گفتگو ...
کی درخواست بھی کی گئی ممبران ڈیپوٹیشن
راضی نہ ہوئے۔ افسوس، اگرچہ پیغور ...
کر سکتے۔ اور اب وہ بہت بد دل ہو کر ...

میں سے وہ اُن سے ملنے آئے تھے۔ وہ دونوں ... [illegible]
کی اس قدر فکر نہیں بلکہ ہم کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ... گورنمنٹ کی ...
پالیسی کا ایک جزو ہو کہ خلیفہ سے تعرض کیا جائے، اور تجویز یہ کی جائے کہ اس ذلیل ... شاہ
حجاز کو خلیفہ بنا دیں ۔ "

کلیولینڈ، کھانے کے بعد مجھ سے کہتے تھے کہ ایک زمانے میں محمد علی سے ان سے
بہت دوستی تھی۔ ترکوں کے شریک جنگ ہونے سے پہلے ایک دن محمد علی اُن کے
پاس آئے تھے اور یہ رمضان کا آخری دن تھا۔ محمد علی بہت بھوکے تھے کلیولینڈ نے
ان کو پیٹ بھر کر روٹی کھلائی۔ کھانے کے بعد محمد علی نے برطانوی فوجوں کی فتحیابی کی امید
ظاہر کی اور وہ اس پر رضامند ہوئے کہ طلعت بے کو ایک تار دیں اور برطانیہ کے خلاف
شریک جنگ ہونے سے روکیں۔ چنانچہ کلیولینڈ نے صبح کو ان سے اجازت لے کر وہ تار
روانہ کر دیا ۔ "

مسز نائیڈو: "شاعرہ بہت دلکش اور ہوشیار عورت ہے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنے دل میں پوری انقلاب پسند ہے۔"

مسز بیسنٹ: "....... میرے خیال میں ان کے خلاف کارروائی کئے بغیر کام چلانا مشکل ہے۔"

"چمسفورڈ کہتے ہیں کہ مسز بیسنٹ نے ان سے کہا کہ وہ یہ جانتی ہیں کہ فی الحال ہوم رول نہیں مل سکتا مگر وہ چاہتی ہیں کہ کانگریس اسکیم اب منظور کر لی جائے اور ہوم رول جنگ کے بعد دیا جائے۔ درحقیقت ایسی عورت کی سچائی کا یقین کرنا مشکل ہے جو نہایت سنجیدگی سے یہ رائے دیتی ہے کہ پانچ برس کے اندر ہم وہ دفعہ اصلاحات کا قانون بنائیں اور منظور کریں۔"

"مسز بیسنٹ نے ہوم رول کی تاریخ بیان کی۔ ان کی روپہلی آواز آخر تک باقی رہی اور ان کی گفتگو نے مجھ پر بہت اثر کیا۔ اگر گورنمنٹ ہند نے اس عورت کو اپنے طرفداروں میں رکھا ہوتا۔ کاش کہ شروع ہی سے ان کے ساتھ ہوشیاری سے برتاؤ کیا جاتا۔ اگر ان کی خودبینی کو ذرا چمکایا جاتا۔ تو وہ بہت پرلطف بڑی بی ثابت ہوتیں۔"

(۲)

الور: "پٹیالہ بہت عمدہ آدمی ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ الور ان سب سے زیادہ ہوشیار آدمی ہیں۔ جب ان سے بات کیجئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کسی اعلیٰ مدبر سے بات کی جا رہی ہے۔ وہ ہر تجویز کی تمام مشکلات کا اندازہ کر لیتے ہیں ــــ"

"ناشتے کے بعد الور آگئے اور ڈیڑھ گھنٹے تک بہت پرلطف گفتگو رہی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس شخص کی ذہانت کی تعریفوں سے یہ صفحات بھرے دیتا ہوں ــــ"

"کوئی دوسرا ہندوستانی اس قدر ذہین نہیں جس قدر کہ یہ ہیں ــــ ان کی شخصیت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر کس قدر وسعت خیال، علم، اور قوت بحث و مباحثہ موجود ہے۔"

نظام :- چار بجے نظام کا باضابطہ ورود ہوا — اس میں شک نہیں کہ نظام کی شخصیت ہمارے لئے بہت اہم شخصیت ہے اس لئے کہ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بگڑنے نہیں دیا اور ہم نے ان کو چلتے ہوئے بدمعاش وزرا اور ایجنٹ ریذیڈنٹ کے توسط سے کافی استعمال کیا ہے۔ مگر نے تمام والیان ریاست میں، نظام کو ہز اگزالٹڈ ہائی نس بنا کر بہت بد دلی پیدا کر دی۔

"نظام دوشنبہ کی رات کو یہاں ۔۔۔۔ یہاں ۔۔۔ کھانا کھا ۔۔۔ سے مجھ کہا گیا ہے کہ میں کہیں اور کھانا کھاؤں تا کہ ۔۔۔

نہ ہو۔ یہ حرکت تو بالکل لغو ہے ۔۔

انھوں پریشانی اٹھانی ہوگی —

کشمیر :- اس کے بعد کشمیر آئے وہ بوڑھے ۔

سب نے مذاق اڑایا — اس لئے کہ وہ بیٹھے۔ ۔۔۔ — "

اندور :- اندور سے ملاقات ہوئی، بہت شکستہ حال نظر آئے۔ بیمار، کمزور اور کچھ گھبرائے ہوئے — یہ ملاقات کچھ زیادہ مفید نہ تھی "

بیگم بھوپال :- "بیچاری مجھ سے ملنے آئیں۔ ایک بھاری ریشم کے کپڑے میں ایک ذرا سا سوراخ تھا جس میں سے اُن کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ انگریزی بُری بولتی ہیں — تعلیم کے مسئلہ میں دلچسپی ہے اور کسی معاملے کے متعلق بات ہی نہیں کی — "

اس کے بعد میں بیگم کے سب سے چھوٹے لڑکے سے ملا جن کو ۲۳ برس کی عمر میں بیگم نے اپنا چیف سکرٹری بنا دیا ہے، بہت عمدہ لڑکا ہے — "

جے پور :- مترجم کے ذریعہ سے گفتگو کرنی پڑی بار بار یہی کہتے رہے کہ میں تو مال گاڑی ہوں اور تیز رفتار نہیں چل سکتا — "

(۳)

حکومت ہند :- مدراس سے میں بہت افسردہ جا رہا ہوں۔ مجھے یہاں کی حالت بہت مایوس ک

"مسز نائیڈو :- شاعر، بہت دلکش اور ہوشیار عورت ہو لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اپنے دل میں پوری انقلاب پسند ہے ۔

مسز بیسنٹ :- ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خیال میں ان کے خلاف کارروائی کئے بغیر کام چلانا مشکل ہو ۔"

"چمسفورڈ کہتے ہیں کہ مسز بیسنٹ نے ان سے کہا کہ وہ یہ جانتی ہیں کہ فی الحال ہوم رول نہیں مل سکتا مگر وہ چاہتی ہیں کہ کانگریس اسکیم اب منظور کر لی جائے اور ہوم رول جنگ کے بعد دیا جائے ۔ درحقیقت ایسی عورت کی سچائی کا یقین کرنا مشکل ہو جو نہایت سنجیدگی سے یہ رائے دیتی ہے کہ پانچ برس کے اندر ہم دو دفعہ اصلاحات کا قانون بنائیں اور منظور کریں ۔"

"مسز بیسنٹ نے ہوم رول کی تاریخ بیان کی ۔ ان کی روپہلی آواز آخر تک باقی رہی اور ان کی گفتگو نے مجھ پر بہت اثر کیا ۔ اگر گورنمنٹ ہند نے اس عورت کو اپنے طرفداروں میں رکھا ہوتا! کاش کہ شروع ہی سے ان کے ساتھ ہوشیاری سے برتاؤ کیا جاتا ۔ اگر ان کی خود بینی کو ذرا چمکایا جاتا ۔ تو وہ بہت پر لطف بڑی بی ثابت ہوتیں ۔"

(۲)

الور :- "پٹیالہ بہت عمدہ آدمی ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ الور ان سب سے زیادہ ہوشیار آدمی ہیں ۔ جب ان سے بات کیجئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی کسی اعلیٰ مدبر سے بات کی جا رہی ہو ۔ وہ ہر تجویز کی تمام مشکلات کا اندازہ کر لیتے ہیں ۔"

"ناشتے کے بعد الور آ گئے اور ڈیڑھ گھنٹے تک بہت پر لطف گفتگو رہی ۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس شخص کی ذہانت کی تعریفوں سے صفحات بھرے دیتا ہوں ۔"

"کوئی دوسرا ہندوستانی اس قدر ذہین نہیں جس قدر کہ یہ ہیں ۔ ان کی شخصیت کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کے اندر کس قدر وسعت خیال، علم، اور قوت بحث و مباحثہ موجود ہو ۔"

نظام: "چار بجے نظام کا باضابطہ ورود ہوا۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ نظام کی شخصیت ہمارے لئے بہت اہم شخصیت ہے اس لئے کہ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بگڑنے نہیں دیا اور ہم نے اُن کو چلتے ہوئے بڈھے وزرا، اور اپنے ریزیڈنٹ کے توسط سے کافی استعمال کیا ہے۔ مگر ہم نے تمام والیان ریاست میں، نظام کو "ہز اگزالٹڈ ہائی نس" بنا کر بہت بدولی پیدا کر دی۔"

"نظام دوشنبہ کی رات کو یہاں (وائسرائے کے یہاں) کھانا کھائیں گے اس لئے مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں کہیں اور کھانا کھاؤں تاکہ میری موجودگی کی وجہ سے حفظ مراتب کی دشواری پیدا نہ ہو۔ یہ حرکت تو بالکل لغو ہے اور اس طرح نظام کو بادشاہ کے منصب پر چڑھا کر دی۔ وزراء کے ہاتھوں پریشانی اٹھانی ہوگی۔"

کشمیر: "اس کے بعد کشمیر آئے وہ بوڑھے ہیں سب نے مذاق اڑایا۔۔۔ اس نے

اندور: "اندور سے ملاقات ہوئی، بہت ٹھیک ۔۔۔

۔۔۔ یہ ملاقات کچھ زیادہ مفید نہ تھی۔"

بیگم بھوپال: "بیچاری مجھ سے ملنے آئیں۔ ایک بھاری ریشم کے کپڑے میں ایک ذرا سا سوراخ تھا جس میں سے اُن کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ انگریزی بُری بولتی ہیں ۔۔۔ تعلیم کے مسئلہ میں بیحد دلچسپی ہے اور کسی معاملے کے متعلق بات ہی نہیں کی۔۔"

اس کے بعد میں بیگم کے سب سے چھوٹے لڑکے سے ملا جن کو ۲۴ برس کی عمر میں بیگم نے اپنا چیف سکرٹری بنا دیا ہے، بہت عمدہ لڑکا ہے۔"

جے پور: "مترجم کے ذریعہ سے گفتگو کرنی پڑی بار بار یہی کہتے رہے کہ میں تو مال گاڑی ہوں اور تیز رفتار نہیں چل سکتا۔"

(۳)

حکومت ہند: "مدراس سے میں بہت افسردہ جا رہا ہوں۔ مجھے یہاں کی حالت بہت مایوس کن

معلوم ہوتی ہیں یہاں تو حکام حکومت کرنا جانتے ہی نہیں، اپنی بات کی تشریح نہیں کر سکتے، ماتحت کو الگ رکھتے ہیں، اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتے ہیں خواہ وہ پریس ایکٹ ہو یا رزلیوشنوں اور مسودات قوانین کے انتظامی اختیارات ہوں ۔"

"افغان کے غاریک گونہ دلچسپ ہیں اور چٹانوں پر شیوا کی زندگی کے متعلق جو تصویریں کھودی گئی ہیں بہت اچھی ہیں۔ مجھے وہ تصویر خاص طور پر پسند آئی جس میں شیو نے اپنی بیوی کو کاٹ کر ۲۵ ٹکڑے کر دیئے اور پھر دیکھا تو اُن ۲۵ ٹکڑوں سے باون بیویاں پیدا ہوگئیں۔ بالکل یہی واردات گورنمنٹ ہند پر گذرتی ہے جب وہ مسز بیسنٹ کو نظر بند کردیتی ہے ۔"

انتظامی کونسل کے ممبروں نے مجھ سے کہا کہ سب سے زیادہ پریشان کن یہ آثار ہیں کہ سیاسی تحریک دیہات میں پھیل رہی ہے۔ ہندوستان کا بدنصیب سیاسی کام کرنیوالا آخر کیا کرے! اُس سے کہا گیا کہ حکومت خود اختیاری نہیں مل سکتی اس لئے کہ حلقہ ہائے انتخاب اس کے قابل نہیں ہیں، اس لئے کہ صرف تعلیم یافتہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں، اس لئے کہ دیہات کے لوگوں میں سیاسی احساس نہیں ہے اور پھر جب وہ دیہات میں جاتا ہے تاکہ اُن لوگوں میں سیاسی خواہشات پیدا کرے اور حلقہ ہائے انتخاب تیار کرے تو کہا جاتا ہے کہ بے چینی پھیلاتے ہو اور اس قسم کی تحریک بند ہونی چاہیئے۔ سیاسی بے چینی کے رفع کرنے کا طریقہ تو یہ تھا کہ اُس بے چینی کے اسباب رفع کئے جاتے اس کے بعد ہم سیاسی لوگوں کو معقول جواب دے سکتے تھے۔

ہم کو چاہیئے کہ ہم دیہات کے لوگوں کو تعلیم دیں اور جو کچھ ہمارا نقطۂ نظر ہے اُن کو سمجھائیں۔ مگر خاموش بیٹھا رہنا اور پھر جب بے چینی پیدا ہو تو سیاسی کام کرنے والوں کو نظر بند کر دینا۔ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ ہمارے پاس کوئی جواب ہی نہیں ۔" "(ارباب حکومت) اپنی صفائی پیش کرنا سیکھیں نہ یہ کہ سیاسی مطالبہ کرنے والوں کی زبان بند کرنا ۔"

"چیمسفورڈ پر الزام لگانا صحیح نہیں وہ تو ایسے طبقہ سے منتخب کئے گئے جو اس کام کے لئے کسی طرح موزوں نہ تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اچھا وائسرائے اس مسالے سے نہیں بنایا جا سکتا۔

یہ لوگ معاملات کو غلط نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ جس کام پر مقرر کئے جاتے ہیں وہ تو کرتے ہیں، لاکھوں فائل دیکھتے ہیں۔ اپنے قواعد وضوابط کو یاد رکھتے ہیں۔ مگر معاشرتی پہلو سے — حفظ مراتب، حفظ مراتب — حفظ مراتب — کے سوا کچھ نہیں۔ ہر چیز دو حصوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے — گورنمنٹ اور غیر گورنمنٹ، غیر ضابطہ گفتگو اور بحث و مباحثہ کو یہ لوگ جانتے ہی نہیں۔ سیاسی احساس کا ان کے اندر پتہ نہیں۔ عوام [illegible] ہندوستانیوں کی رضامندی حاصل کرنے کا خیال ان کے ذہن سے دور ہے [illegible]

یہ جانتے ہی نہیں۔ ان کا تو بس یہ کام ہے کہ [illegible]

فرائض انجام دے لیں — ہر بات اور ہر قاعدہ [illegible]

"یقیناً سوشل تعلقات جو انگریزوں کے لئے ہے [illegible]

اور یقیناً ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی رہے گی تا وقتیکہ [illegible]

اگر اس قسم کی باتوں کی اصلاح نہ کی گئی — وائسرائے ایسا آدمی ہونا چاہیے جو سیاسی آدمی ہو، جو ہندوستانیوں کو دوست بنائے اور دوسروں کو بھی مجبور کرے کہ وہ دوست بنائیں، جو اپنی فرصت اور کام کے اوقات ہندوستانیوں کی صحبت میں گذارے اور ضابطہ قاعدے کے ان پابندیوں کا خاتمہ کر دے جو دہلی میں گورنمنٹ کے ہر کام میں حائل ہیں۔"

"یہ لوگ (حکومت ہند کے عمال) اس بات کی بڑی فکر رکھتے ہیں کہ میں بغیر وائسرائے کی موجودگی کے کسی سے نہ مل سکوں —"

"مسز بیسنٹ نے بہت اصرار سے کہا کہ میں کانگریس کے اجلاس میں جاؤں — کاش کہ لارڈ چار یہاں کے کاموں کے منصرم ہوتے۔ وہ تو فوراً سیدھے کانگریس کے جلسے میں جاتے ایک زبردست تقریر کر دیتے — میں ایسا کرنے سے روکا جاتا ہوں۔ اگر میں ایسا کر سکتا تو شاید صورت حالات بہتر ہو جاتی۔ مگر گورنمنٹ ہند نے تو بہت احتیاط کے ساتھ ہمارا پروگرام بنایا ہے تاکہ

جب ہندوستان کی اعلیٰ سیاسی تحریک یعنی کانگریس کلکتہ میں منعقد ہو تو ہم بمبئی میں بیٹھے ہوں! اور اب گورنمنٹ آف انڈیا کا یہ عذر ہے کہ ہم تو پروگرام پہلے ہی بنا چکے اور اس لئے اس دعوت کو قبول نہیں کر سکتے!! "

"سب جانتے ہیں کہ بم کے متعلق جب کبھی کوئی بنگالی کچھ لکھتا ہو تو اس کو مٹھائی کے نام سے یاد کرتا ہے ایک دن مدراس میں نکرن نائر نے ہارڈنگ کی دعوت کی اور باسو سے فرمائش کی کہ کلکتے سے کچھ بنگالی مٹھائی بھیج دیں۔ باسو نے کلکتے سے نائر کو تار دیا کہ "وائسرائے کے لئے مٹھائی کل پہنچے"۔ یہ تار، سی۔ آئی۔ ڈی کے ہاتھ پڑ گیا۔ اور باسو اور نائر کی نگرانی شروع ہو گئی!"

"سنہا کہتے تھے کہ نائر نے اُن سے کہا کہ گورنمنٹ کچھ نہ کرے گی (اصلاحات کے متعلق)۔ — سنہا کہتے تھے کہ خدا کرے وقت نہ گزر گیا ہو۔ ہندوستان میں حالات بد سے بدتر ہوتے جاتے ہیں — کاش کہ میں اقتدار پسندوں کے اس ملعون طبقے کو سمجھا سکتا، واقعہ تو یہ ہے کہ ہم ایک کوہ آتش فشاں پر بیٹھے ہوئے ہیں —"

"چمسفورڈ میں بڑی خرابی یہ ہے کہ جب ان کے سامنے بحث ہوتی رہتی ہے تب تو وہ بہت متاثر ہوتے ہیں مگر جہاں قدامت پسندوں کے پاس واپس گئے، بس پھر خدا کی پناہ!"

"یہ منظر ہر اسٹیشن پر (میرے لئے) دردناک ہوتا ہے کہ عام لوگ قریب آنے نہیں پاتے اور کم سے کم دو کھیتوں کے فاصلے پر کھڑے ہوتے سکتے ہیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ

ایسے ملک میں جہاں پولیس ہر چیز پر حاوی ہو چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر کیا خطرہ ہے۔
اگر عام لوگوں کو میرے قریب آنے دیا جائے اور حکومت کو ملک میں ہر دلعزیز بنایا جائے۔
انگلستان میں وزیر اعظم جب دورے پر جاتے ہیں تو اس حالت سے اس حالت کا مقابلہ
کیجئے! ۔ یہاں انتہائی کوشش اس بات کی کی جاتی ہے کہ وائسرائے کو اہل ملک سے
دور رکھا جائے اور اس کا انتظام کیا جائے (شاید یہ صحیح ہو) کہ میری موجودگی سے
وائسرائے کی پوزیشن پر اثر نہ پڑنے پائے ۔۔۔"

"چیمسفورڈ کی اس بات سے بہت تردد ہوا کہ وہ میرے ج
ہیں اس میں مجھ سے متفق ہو کر کارروائی کرنا چاہتے ہ
کو) انتہائی اختیارات استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں
کو غلط طریقہ پر استعمال کرنا شروع کر دیں گے ۔ اصل تو یہ ہے کہ سیاسی پارٹیاں کا صحیح ہو ہے یہ ہوا ہو
کی طرف سے صفائی پیش کی جائے نہ کہ نظر بندیاں ۔ معاملات کو سلجھانا چاہئے نہ خاموشی سے بیٹھا رہنا
تاآنکہ دیگچی ابل پڑے ۔"

" نے چیمسفورڈ سے گفتگو کی (نظر بندوں کے متعلق) وہ نظر بندوں کے متعلق خونریزی
کے الزام کا ذکر کرنے لگے۔ مگر میرے خیال میں تو ان لوگوں کو جب تم نے نظر بند کیا ہے اور
باقاعدہ سزا نہیں دی تو اس قسم کے الزام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نظر بندی کو
بطور سزا کے استعمال کرنے کا خیال بھی نہ کرنا چاہئے ۔۔"

"یہ لوگ (گورنمنٹ ہند) کسی سے بھی صحیح برتاؤ کرتے ہیں ؟ میری رائے کو تعصب سے
متاثر سمجھا جائے گا ۔ میں جانتا ہوں ، لیکن انگلستان میں غالباً کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس

ملک کی حکومت کیا ہے اور دراصل کس قسم کی ہے۔ کاغذات کے انبار میں دبی ہوئی طویل تحریروں کے لکھنے میں مشغول ـــــ کاغذات کی بھاری پوڑوں کے جمع کرنے میں مصروف ۔بس ۔"

" میں تو پھر یہ کہتا ہوں کہ سوسائٹی کی علحدگی کا سوال اصل سوال ہے ۔ یہ واقعہ کہ سویلین ہندوستانیوں کے ساتھ کام تو کر لیتے ہیں مگر کھیلنے کے لئے تیار نہیں ۔یہی باعث ہے موجودہ حالات کا ۔"

ان اقتباسات کے بعد کچھ لطائف بھی ہیں ۔ کچھ غریب ہندوستانیوں کی کمزوریاں بھی ہیں جن کا ذکر مانٹیگو نے ان صفحات میں کہیں کہیں بہ سبیل تذکرہ کیا ہے مثلاً :۔

" آل انڈیا سناتن دھرم کا وفد آیا ۔جب میں نے اُن سے دریافت کیا کہ پارلیمنٹ کے قانون میں سناتنی ہندوؤں کی تعریف کیا کی جائے تو انھوں نے جواب دیا کہ سناتنی وہ ہے جو ذات پات کو مانتا ہو۔ جب میں نے کہا کہ کونسی ذات کو مانتا ہو ؟ تو جواب دیا کہ جی ! بس سناتنی ہندو لکھ دیجے گا یہی کافی ہوگا ۔ یا خدا ! یہ لوگ کس قسم کے بچے ہیں ۔ ان سب کو اس کی فکر ہے کہ گورنمنٹ ان کی حفاظت کرے ۔اپنی ٹانگوں پر کھڑے ہونے سے اس کو بہتر سمجھتے ہیں ۔ میں نے اس پہلو پر ذرا سختی سے گفتگو کی ۔ "

وہ علماء کرام کے وفد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

" انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ اُن کا مقصد سیاسیات میں حصہ لینا نہیں بلکہ اگر اصلاحات ہوں تو اس بات کا اطمینان کرنا چاہتے ہیں کہ گورنمنٹ مولویوں کو فراموش نہ کرے گی ۔ایک صاحب نے فرمایا کہ سب معاملہ ٹھیک ہو جائے گا اگر اس بات کا فیصلہ کر لیا جائے کہ کونسلوں میں کوئی شخص داخل نہ ہو سکے گا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ کٹر مسلمان ہے ۔جب میں نے یہ کہا کہ میرے لئے اس کا علم مشکل ہوگا کہ کون کٹر مسلمان ہے تو جواب ملا کہ مولوی یہ بات گورنمنٹ کو بتا دیا کریں گے ! "

۔ مدراس کے علماء کا ایک وفد آیا۔ جب ان سے وائسرائے نے کہا کہ آپ مختصراً مجھے اور وزیر ہند کو اپنے خیالات بتائیں گے تو مختصر جواب ملا کہ ہم ہوم رول نہیں چاہتے۔ ساتھ ہی ایک بہت دلچسپ بزرگ نے جن کی داڑھی بہت خوبصورت تھی فرمایا کہ میں نے قرآن پڑھا ہے، تمام احادیث اور تفاسیر پڑھی ہیں، انجیل پڑھی ہے لیکن مجھے تو کہیں ان کتب مقدسہ میں کانگریس، مسلم لیگ کی اسکیم کا جواز ثابت نہیں ہوا!!"

اس دلچسپ اشاعت کے دلچسپ اقتباسات پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ کام اپنے سے زیادہ سنجیدہ اصحاب۔

غزل

از حضرت جگر مراد آبادی

مجھے ہلاک فریب مجاز رہنے دے — نہ چھیڑ او نگہ امتیاز رہنے دے

یہ جان آج نکلتی ہے جس کے زانو پر — خدا کرے سر دامان ناز رہنے دے

ازل سے حسن تو عاشق نواز ہی لیکن — جو عشق ہی اسے عاشق نواز رہنے دے

میں راز عشق کو بیگانۂ جہاں رکھوں — مگر جو مصلحت حسن راز رہنے دے

یہ بات کیا کہ حقیقت وہی مجاز وہی — مجاز ہے تو پھر اس کو مجاز رہنے دے

اُسے نہ آئینہ سمجھو وہ اور ہی شے ہے — جس آئینے کو خود آئینہ ساز رہنے دے

میں تیرے قدموں کے صدقے کہاں کے قصور — جھکا ہوا یونہی فرق نیاز رہنے دے

یہ جان ایک بلانوش کی ہے اے ساقی — نہ پھینک دُرد مے خانہ ساز رہنے دے

یہ خانقاہ نہیں پی بھی جا ارے زاہد — یہ میکدہ ہے یہاں احتراز رہنے دے

گذرتی ہے جو دل حسن پر نہ پوچھ جگر
یہ خاص راز محبت ہے راز رہنے دے

امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم

افغانستان ایران کی سطح مرتفع کا سب سے بلند حصہ افغانستان ہے۔ جس کا اوسط ارتفاع چار ہزار فیٹ سے لیکر سات ہزار تک ہے۔ اس کا شمالی پہاڑ یعنی کوہستان ہندوکش [illegible] ہزار فیٹ بلند ہے۔ اور مشرق میں کوہ سلیمان ہے جس کی چوٹیاں سات ہزار فیٹ سے لے کر گیارہ ہزار فیٹ تک بلند ہیں۔

کوہ ہندوکش کی مغربی شاخیں یہ ہیں کوہ بابا کوہ سفید [illegible] سیاہ [illegible] کے شمال میں وہ تنگ قطعۂ ملک واقع ہے جس کو "افغانی ترکستان" [illegible] ترکستان کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے۔

یہ تمام ملک بے آب و گیاہ اور برف پوش پہا[illegible] میدان اور شاداب باغات نظر آتے ہیں جن میں کثرت سے انگور اور [illegible] ہوتے ہیں۔

اس ملک کے باشندے افغان ہیں جو مختلف قبائل پر مشتمل ہیں۔ یہ لوگ اپنی شجاعت دلیری اور حمیت قومی کی وجہ سے اقوام عالم میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔ آزادی ان کے خمیر میں رچی ہوئی ہے۔ اور مہمان نوازی ان کا قومی شعار ہے۔

عہد تاریخی مختلف زمانوں میں افغانستان مختلف حکومتوں کے ماتحت رہا لیکن ہندوستان میں سلطنت مغلیہ قائم ہونے کے بعد یہ ملک حکومت ہند کا ایک صوبہ بن گیا۔ افغانستان کے گورنروں کا تقرر دربار مغلیہ سے باقاعدہ ہوتا رہا یہ حالت تقریباً خروج نادر شاہ افشار تک رہی۔

ایران کی صفوی حکومت جب انتہائی تنزل و انحطاط کی حالت کو پہنچ گئی تو اس وقت ایک طرف تو افغانی سردار میر ویس والی قندھار کی ماتحتی میں ایران پر حملہ کر کے ایرانی مقبوضات کے ایک وسیع علاقہ پر مسلط ہو گئے اور دوسری طرف ترکوں نے ایران کے ایک بڑے حصّہ پر قبضہ کر لیا۔

[illegible] میں جدوجہد سے نادر شاہ افشار کو پیدا کیا۔ جس نے ایران کو ترکوں اور افغانوں کے تسلط سے آزاد [illegible] افغانوں نے خاندان صفویہ کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی اس لئے نادر شاہ نے مناسب سمجھا کہ افغانستان کو فتح کر کے ایران کا ایک صوبہ بنا دے تاکہ افغانوں کو ایران پر دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو چنانچہ افغانستان پر نادر شاہ نے قبضہ کر لیا۔ اور افغانوں کو اپنے نیک سلوک سے مطیع و منقاد کر لیا۔ اس کے بعد صدہا افغانی نوجوان نادر شاہ کی فوج میں داخل ہو گئے جنہوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کے وقت نادر شاہ کے ساتھ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ نادر شاہ کے انہیں افغانی سپاہیوں میں میں ایک نوجوان افغان نظر آتا ہے جس کو تاریخ احمد شاہ ابدالی یا دُرّانی کے نام سے یاد کرتی ہے نادر شاہ کے قتل کے بعد ۱۷۴۷ء میں افغانوں نے ایرانیوں سے آزادی حاصل کر کے باتفاق رائے احمد شاہ دُرّانی کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اور جمال خاں بارکزئی کو ان کا وزیر مقرر کیا۔ یہاں سے جدید افغانستان کی بنیاد پڑتی ہے۔

احمد شاہ دُرّانی نے اپنی شجاعت کی وجہ سے مملکت افغانستان کو وہ وسعت دی کہ نہ تو کبھی پہلے افغانستان میں افغانوں کی اتنی بڑی وسیع حکومت تھی اور نہ بعد کو ہوئی۔ درانی حکومت کی مشرقی سرحد مشرقی پنجاب تک تھی اور مغربی سرحد بحر خزرین سے ٹکراتی تھی۔ احمد شاہ درانی کے کارناموں میں سب سے نمایاں کارنامہ پانی پت کا مشہور معرکہ ہے۔ جس میں اس نے مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو پاش پاش کر دیا۔ جس کے بعد پھر مرہٹہ طاقت سنبھل نہ سکی۔ احمد شاہ نے اپنی حکومت میں کشمیر، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور مکران کو فتح کر کے مملکت افغانیہ میں شامل کر دیا تھا۔

لیکن اس کے جانشینوں میں وہ عالی ہمتی اور مردانگی نہ تھی جو اتنی وسیع سلطنت کے سنبھال لینے میں ان کی ممد و معاون ہوتی۔ الغرض دُرّانی سرداروں کے باہمی نزاع کی وجہ سے وہ درانی خاندان سے بارکزئی قبیلہ کے قبضہ میں آگئی۔

<u>عروج قبیلہ بارکزئی</u> | احمد شاہ دُرّانی کے دربار میں ایک سردار پائندہ خاں بارکزئی نامی بھی تھا۔ جو اپنی ہر دل عزیزی اور رسوخ کی وجہ سے تمام درباری امراء میں ممتاز تھا چنانچہ احمد شاہ کے بعد اس کے

[illegible] شاہ کے عہد میں اس سردار نے کارہائے نمایاں انجام دیئے جس کی وجہ سے تیمور شاہ نے [illegible] کو "سرفراز خاں" کے خطاب سے نوازا۔ جب تیمور شاہ کے بعد اس کے بیٹوں میں سلطنت کے لئے باہمی نزاع چھڑی تو پاینده خاں کی امداد و اعانت سے شاہ زمان خاں افغانستان کا بادشاہ ہوا اور باقی امراء پاینده خاں کی ہر دلعزیزی دیکھ کر جل گئے۔ وہ بادشاہ سے پاینده خاں کے خلاف جھوٹی شکایتیں کرنے لگے۔ بالآخر پاینده خاں کو شاہ زمان خاں نے قتل کرا دیا۔ اس واقعہ کی وجہ سے تمام افغانستان میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ شاہ زماں خاں پکڑا گیا۔ اور پاینده خاں کے [illegible] بڑے بیٹے
شاہ محمود خاں کے سامنے پیش کیا گیا۔ جس نے شاہ زمان کو اندھا کر
میں دھکیل دیا۔ شاہ زمان کے بھائی شاہ شجاع نے
تھا کہ اپنے بھائی کا انتقام لے کر شاہ محمود کو اندھا کر دے لیکن
بارکزئی اور درانی کی داستان نزاع بڑی طویل ہے۔ اس

اب بارکزئی سرداروں نے ایک نئی چال چلی وہ یہ کہ تخت کابل پر ایک سید کو بٹھایا جو ان کا ہم خیال تھا۔ اس وقت شاہ شجاع پشاور میں مقیم تھا۔ اس نے یہ خبر سنتے ہی کابل پر حملہ کیا اور اس سید کو قتل کرا دیا۔ اس واقعہ نے افغانستان کے اندر ایک زبردست شورش پیدا کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا [illegible]ء میں شاہ شجاع افغانستان سے بھاگ کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے اس کی حفاظت کرنے کے بجائے اس کے موتی اور جواہر چھین لئے جن میں شہرۂ آفاق ہیرا کوہ نور تھا۔ ۱۸۰۹ء میں مجبوراً شاہ شجاع انگریزوں کی حفاظت میں آیا۔ اس وقت لدھیانہ پنجاب میں بھی انگریزوں کی سرحدی چھاؤنی تھی۔ افغانستان کا مفرور بادشاہ یہاں آکر مقیم ہوا۔ انگریزوں نے اس کے لئے ماہانہ چار ہزار وظیفہ مقرر کیا۔

لیکن ابھی تک شاہ شجاع تخت کابل کا خواب دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے پھر ایک بار مملکت کابل کے لئے قسمت آزمائی کی۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شاہ شجاع نے سکھوں اور انگریزوں سے معاہدہ کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ طاقتیں افغانستان کو پاینده خان کے بیٹوں سے چھین کر

شاہ شجاع الملک کو دیں۔ جو ان کی نظر میں ملک کا اصلی وارث اور حق دار تھا۔

اور دوسری افغانی برطانوی جنگ	انیسویں صدی کی ابتداء میں ترکی اور ایران کے انحطاط کی وجہ سے روس کا اثر و اقتدار وسط ایشیا میں روز بروز بڑھنے لگا تھا اور حالات

نظر آنے لگا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ایران و افغانستان روسی اقتدار کے ماتحت آ جائیگا۔ اور اس کے بعد روس کا پیش قدمی کا رخ ہندوستان کی طرف بڑھے گا جو شاہان روس کا اصلی مطمح نظر تھا۔ اسی خطرہ نے انگریزی مدبرین کو چوکنا کیا چنانچہ انھوں نے کپتان برنیر کی ماتحتی میں ایک سفارت دربار کابل میں بھیجی اس زمانہ میں دوست محمد خاں امیر افغانستان تھا جس نے شاہ شجاع درانی کو نکال کر درانی حکومت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور بارکزئی خاندان کی حکومت قائم کی تھی۔ اور شاہ شجاع انگریزوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا تھا۔

دوست محمد خاں اور انگریزی سفارت میں ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں دوست محمد خان نے علاوہ اور شرائط کے ایک یہ شرط بھی کی تھی کہ انگریز امیر افغانستان کو پشاور سکھوں سے واپس دلا دیں۔ انگریز سکھوں سے بگاڑ نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انگریزوں نے امیر دوست محمد خاں کی مذکورہ بالا شرط کو منظور نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی سفارت بے نیل مرام واپس آ گئی۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ شاہ شجاع نے سکھوں اور انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا۔ کہ شاہ شجاع کو تخت کابل دوبارہ دلایا جائے۔ چنانچہ انگریز مدبرین کے لئے یہ ایک نہایت ہی زریں موقعہ تھا غرضیکہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ۱۸۳۸ء میں بعہد وائسرائے آکلینڈ بردہ درہ بولان انگریزوں نے افغانستان پر فوج کشی کی بلا مزاحمت انگریزی فوجیں قندھار، غزنی اور کابل پر قابض ہو گئیں۔ امیر دوست محمد خاں افغانستان سے بھاگ کر امیر بخارا کے ہاں پناہ گزین ہوا۔

ادھر انگریزوں نے شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ لیکن شاہ شجاع کی یہ حالت تھی کہ نہ تو مرد میدان تھا نہ سیاسی چالیں جانتا تھا۔ مزید برآں بڑھاپے نے اس کے قویٰ کو شل کر دیا تھا جس

وجہ سے تمام افغانی سردار اس سے نفرت کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قبیلوں نے اس کی حکومت
سے انحراف کیا۔ مجبوراً انگریزوں کو شاہ شجاع کی حفاظت کے لئے افغانستان میں فوج ٹھہرانی
پڑی اب انگریزی فوجوں پر قبائل حملے کرنے لگے۔ کچھ دنوں کے لئے انگریزوں نے زرپاشی کے ذریعے
سے ان حملوں کو روک دیا۔ لیکن کب تک یہ "زرپاشی" اس نفرت کو جو افغانوں کو شاہ شجاع اور انگریزوں
سے تھی روک سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام افغانستان میں شورشیں برپا ہوئیں جس کی وجہ سے انگریز بہت
پریشان ہوئے۔ اس وقت خلاف توقع امیر دوست ؟ خاں نے بخارا سے بھاگ کر اپنے آپکو انگریزوں
کے سپرد کر دیا اور انگریزوں نے اُسے کلکتہ میں نظر بند کر دیا۔ اس واقعہ سے انگریزوں کی ہمتیں بڑھ
گئیں لیکن اس سے افغانوں کی نفرت میں کوئی کمی نہ واقع ہوئی

اب افغانی قبائل نے سردار محمد اکبر خاں کی

سردار محمد اکبر خاں، دوست محمد خاں کا بڑا بیٹا تھا۔ شجا

سے بھی زیادہ ہوشیار رہتا۔ الغرض سردار اکبر خاں نے انگریزوں

معاہدہ کی سب بڑی شرطیں یہ دو تھیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ انگریز شاہ شجاع کے بجائے امیر دوست
محمد خاں کو افغانستان کا بادشاہ تسلیم کریں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ انگریز جلد از جلد افغانستان
سے اپنی فوجیں لیجائیں۔ اور تمام اسلحہ و بارود بطور یرغمال کے اکبر خاں کے سپرد کریں۔ چنانچہ انگریزوں
نے ان تمام شرائط کو منظور کیا اور اپنی فوجیں لے کر ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے لیکن
افغانی قبائل کے حملوں اور برف باری نے انگریزوں کی چودہ پندرہ ہزار فوج کا جلال آباد تک
پہنچتے پہنچتے صفایا کر دیا۔ صرف ایک آدمی زندہ پشاور میں پہونچا جس نے انگریزوں کو اس واقعہ کی
خبر دی۔" الغرض اس تباہی نے انگریزوں پر افغانستان کی طرف سے وہ رعب ڈال دیا۔ کہ انگریزی
فوجیں افغانستان کے نام سے لرزہ بر اندام ہو جاتی تھیں۔ اس مہم کی ناکامی کی وجہ سے لارڈ آک
لینڈ کو اپنے عہدہ سے استعفا دینا پڑا۔ اسی "غلطائے عظیم" کی بنا پر آج تک انگریز مورخ آک لینڈ
کی ہجو کرتے ہیں۔"

۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹوں میں افضل خاں اور شیر علی خاں کے درمیان تخت و تاج کے لئے جھگڑا ہوا۔ شیر علی خاں امیر کا چہیتا بیٹا تھا اس نے انگریزوں سے امداد کی درخواست کی لیکن انگریزوں نے اسے مدد دینے سے صاف صاف الفاظ میں انکار کر دیا۔ اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ انگریز افغانستان کے اندرونی معاملات میں کسی کا ساتھ نہ دیں گے ہاں انگریزوں کی طرف سے حملہ ہوا تو وہ بیرونی دست درازی سے افغانستان کی حفاظت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس اعلان نے امیر شیر علی خاں کو انگریزوں کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اب وہ اپنے قوت بازو سے بھائیوں کے مقابلہ میں ڈٹا رہا۔

۱۸۷۶ء میں افغانستان کے اس باہمی نزاع سے انگریزوں نے فائدہ اٹھا کر خان قلات سے خفیہ طور پر کوئٹہ کا علاقہ خرید لیا۔ اس واقعہ نے امیر شیر علی خاں کو انگریزوں سے ناراض کر دیا۔

اب امیر نے انگریزوں سے خفا ہو کر روسیوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے۔ روسی سفیر دربار کابل میں رہنے لگا۔ انگریزوں سے یہ بات کبھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی کہ روسی اثر و اقتدار افغانستان میں بڑھے۔ چونکہ روسی اس وقت ترکوں سے لڑ چکے تھے۔ ان کی فوجیں تھکی ہوئی تھیں۔ اس موقعہ سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا۔

چنانچہ ۱۸۷۸ء میں انگریزوں نے افغانستان پر تین راستوں یعنی درۂ خیبر، وادی خرم، اور درۂ بولان سے فوج کشی کی۔ امیر شیر علی خاں بھاگ کر روسی علاقہ میں چلا گیا اور روسی امداد کا منتظر تھا۔ کہ اتنے میں موت نے تمام توقعات منقطع کر دیں۔ اس کے بعد امیر یعقوب خاں نے جو شیر علی خاں کا بیٹا تھا۔ جلد انگریزوں سے صلح کر لی۔ ۱۸۷۹ء میں دربار کابل میں روسی سفیر کے بجائے انگریز ریزیڈنٹ رہنے لگا

انگریزوں اور یعقوب خاں کے معاہدے سے افغانستان کے باشندے ناخوش تھے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد انہوں نے انگریزی ریزیڈنسی پر حملہ کر کے آگ لگا دی۔ اس کے بعد انگریزوں نے ایک اور فوج روانہ کی جس نے افغانوں سے بہت ہی سخت انتقام لیا۔ امیر یعقوب خاں

نے اپنے ایک انگریزی فوج کے مقابلہ کیا۔ انگریزوں نے ان کو ہندوستان بھیجا۔ اور ان کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اب افغانوں کی حکومت بظاہر بالکل ختم ہو چکی تھی۔ جنرل رابرٹس کا حکم چلنے لگا اور فوجی قانون کے مطابق تمام افغانوں سے ہتھیار چھین لئے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افغانوں نے لگان دینا بند کر دیا۔ اور شیر علی خاں کے دوسرے بیٹے ایوب خاں نے ہرات سے میوند پر حملہ کر کے قندھار کا محاصرہ کر لیا۔ اور انگریزی فوجوں کو سخت شکست دی۔ ان واقعات نے انگریزوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی کہ افغانستان کے جنگجو باشندوں پر حکومت کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ جانوں کے اتلاف کے علاوہ خزانہ ہند پر بوجھ پڑ رہا ہے۔ اور سوائے نقصان کے فائدے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایک انگریز مورخ افغانستان کے متعلق لکھتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"بتیس کروڑ مصارف کثیر اور ہزارہا جانیں ضائع
کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہ ہوا!"

انہیں ایام میں سردار عبدالرحمٰن خاں جو روس میں پناہ گزیں تھا۔ روس چھوڑ کر حدود افغانستان میں قوت جمع کرنے لگا۔ اور منتظر تھا کہ جونہی موقعہ ملے تخت کابل حاصل کرے چنانچہ خود انگریزوں نے سردار عبدالرحمٰن خاں کو بلایا۔ اور نہایت احترام و اعزاز کے ساتھ تخت کابل پیش کیا۔ اور اس کے بعد انگریزی فوجیں ہندوستان کو واپس ہوئیں۔ ایک معاہدے کے ذریعہ انگریزوں نے سردار عبدالرحمٰن خاں کو اپنا حلیف بنا لیا اب آئندہ صفحات میں اسی عبدالرحمٰن خاں کی زندگی کے واقعات پیش کئے جائینگے۔ جو عظمت و استقلال کی وجہ سے ہر ایک مشرقی نوجوان کے لئے نمونہ ہیں۔

امیر عبدالرحمٰن خاں کا زمانۂ طفولیت اور تعلیم و تربیت

امیر عبدالرحمٰن امیر افضل خاں کے اکلوتے بیٹے اور امیر دوست محمد خاں کے پوتے تھے امیر عبدالرحمٰن خاں کا مقام ولادت اور تاریخ

پیدائش ٹھیک طور پر کسی کو معلوم نہیں۔ البتہ امیر عبدالرحمٰن خاں کا ایک روسی سوانح نگار جو امیر سے روس کی جلاوطنی کے زمانہ میں سمرقند میں ملا تھا۔ لکھتا ہے کہ امیر عبدالرحمٰن خان ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے
امیر کے تمام سوانح نگاروں کو یہ شکایت ہے۔ کہ امیر کے بچپن کے حالات باوجود شدید تلاش و جستجو کے نہیں ملتے خود امیر عبدالرحمٰن نے اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں بھی اپنی اوائل عمر پر کوئی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات اس وقت سے شروع کی ہے جب کہ ان کے والد افضل خاں گورنر افغانی ترکستان نے ان کو کابل سے بلخ بلا کر ان کی تعلیم کا انتظام اپنی نگرانی میں کیا تھا۔ لیکن امیر عبدالرحمٰن خاں کو تعلیم سے کوئی دلی لگاؤ نہ تھا۔ باوجود محنت کے تعلیم کی طرف اُن کا ذہن مائل نہیں ہوتا تھا۔ البتہ سواری اور شکار کے خیالات شب و روز امیر کے دماغ میں موجود رہتے تھے۔ وہ خود اپنی تزک میں لکھتے ہیں۔

"میں نو برس کا تھا جب کہ میرے والد نے مجھے کابل سے بلخ بلا بھیجا۔ وہ اس زمانہ میں بلخ اور اس کے مضافات کے فرمانروا تھے۔ بلخ پہونچکر معلوم ہوا کہ وہ شبرغان کے محاصرہ میں مصروف ہیں۔ میں بلخ میں مقیم رہا۔ اور بعد دو مہینے کے جب شبرغان فتح کر کے وہ واپس تشریف لائے۔ تو میں نے دس میل شہر سے باہر نکل کر جانب جنوب ایک مقام پر جو دشت امام کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا استقبال کیا۔ انھیں دیکھ کر میں نہایت مسرور ہوا اور انھوں نے مجھے بخیر و عافیت پا کر خداوند کریم کی درگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ دو نو ساتھ بلخ واپس آئے۔ چند روز بعد مجھے پڑھنے لکھنے کی فہمایش کی لیکن باوجود دن بھر محنت کرنے کے میں نے نوشت و خواند میں مطلق ترقی نہ کی۔ میں نہایت کند ذہن تھا۔ سبق سے سخت نفرت تھی اور ہر وقت میرا دماغ گھوڑے کی سواری اور شکار کے ذوق و شوق سے پُر رہتا تھا۔ جو کچھ آج پڑھا کل بھول گیا۔ لیکن مجبوری تھی۔ جبراً پڑھنا ہی پڑتا تھا۔ اور اس مصیبت سے نجات کی کوئی صورت نہ تھی میرے اُستاد نے میری تعلیم میں مطلق پہلو تہی نہ کی لیکن کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا

ایک برس بعد والی شہر میں بمقام تختۂ پل میرے لئے ایک باغ تیار کرایا گیا اور وہی میرا مکتب قرار پایا۔"

باوجود اس انتظام اور محنت کے امیر عبدالرحمٰن کی علمی قابلیت کچھ زیادہ نہ بڑھی اور جو کچھ انھوں نے لکھا پڑھا تھا وہ بھی چند دنوں کے بعد بھلا دیا۔ چنانچہ جس زمانہ میں امیر عبدالرحمٰن خاں قطاغان اور بدخشان میں شورشین فرو کرکے اس علاقہ کی حکومت کی تنظیم میں مصروف تھے ان کو ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ جو ان کی علمی قابلیت کا سبب بنا۔ اسی واقعہ کو امیر موصوف نے اپنی تزک میں یوں تحریر کیا ہے۔

"ایک روز میں دربار کر رہا تھا کہ میر اعظم کی [illegible]
تھی اور میرے ساتھ منسوب ہو چکی تھی۔ اس نے [illegible]
ہاتھ میں خط دے۔ اور کسی دوسرے شخص کو نہ دکھا۔۔
خط بند کرا کر لیجائے۔ جیسا کہ میں نے پیشتر بیان کیا ہے مجھے پڑھنے لکھنے کا بھی شوق نہ تھا۔ اور جو تھوڑا بہت سیکھا تھا۔ اُسے بھی بھول گیا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کہ خط پا کر مجھے کس قدر ندامت ہوئی میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور میں نے اپنے تئیں بہت لعنت ملامت کی کہ مجھے فخر ہے۔ کہ میں ایسا اچھا شخص ہوں۔ لیکن درحقیقت مردانگی سے بعید ہے کہ میں جاہل رہوں۔ اس رات کو جب میں سونے کے لئے لیٹا تو بہت رویا۔ اور اپنے خدا کی درگاہ میں نہایت الحاح و زاری سے دعا مانگی . . . . اے خداوند پاک مجھے روشنی عطا کر۔ تاکہ میرا دل اس نور سے منور ہو جائے۔ اور میں پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤں مجھے یقین ہے کہ تو مخلوق کی آنکھوں میں مجھے شرمسار نہ کرے گا۔"

غرضیکہ امیر عبدالرحمٰن تمام رات روتے رہے۔ صبح کے قریب ان کی آنکھ لگ گئی تو انھوں نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا۔ اس نے آکر تین بار عبدالرحمٰن خاں سے کہا کہ "اُٹھ اور لکھ" لیکن عبدالرحمٰن سو گئے الغرض تیسری بار وہی بزرگ ناراض ہو کر کہنے لگے کہ" اگر اس بار سو یا تو

صاف تیرے چشموں میں سواخ کردوں گا" یہ سنکر عبدالرحمٰن خاں لئے اور نوکروں سے قلم دوات منگاکر ان حروف کو لکھنا شروع کیا جو مکتب میں سیکھے تھے طلوعِ آفتاب تک یہ مشق جاری رکھی چنانچہ یوں جوں امیر عبدالرحمٰن زیادہ لکھتے جاتے تھے ان کو مسرت محسوس ہوتی تھی جب دربار میں سرکاری خطوط پیش ہوتے تو حسب معمول امیر کا سکرٹری پڑھنے لگا لیکن امیر نے کہا کہ میں اپنے خطوط آج خود پڑھوں گا تم میری غلطیاں درست کرتے جاؤ۔ سیکرٹری نے مسکرا کر کہا "لیکن بندگانِ حضور کہاں پڑھ سکتے ہیں" یہ سنکر امیر نے ایک خط کھولا اور کہا "اچھا سنو پڑھ سکتا ہوں یا نہیں" الغرض اسی طرح امیر عبدالرحمٰن خاں روز خطوط پڑھتے اور خود جواب تحریر کرتے چند دنوں کے بعد سیکرٹری کی بھی ضرورت نہ رہی چند ماہ کے بعد امیر عبدالرحمٰن خاں نے صوبہ کی روئداد اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے والد کو روانہ کی۔ شروع میں ان کے والد کو یقین نہ ہوا۔ لیکن آخر میں معتبر آدمیوں کے یقین دلانے سے امیر کے والد کو یقین ہوا اور بڑی خوشی ہوئی۔ اور عبدالرحمٰن خاں کے استادوں کو انعام اور خلعت عطا کی اور ان کو ایک مرصع تلوار مع دعائیہ خط کے بدخشان روانہ کی۔

عبدالرحمٰن خاں کا تاشقرغان کا گورنر مقرر ہونا

امیر عبدالرحمٰن خاں جب چودہ برس کے ہوئے تو ان کے والد سردار افضل خاں اپنے والد امیر دوست محمد خاں والی کابل سے ملاقات کرنے کی غرض سے کابل گئے اور ترکستان کی ولایت کا تمام انتظام عبدالرحمٰن خاں کے سپرد کر دیا تھا۔ چھ ماہ تک عبدالرحمٰن خاں نے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا انتظام حکومت صوبہ ترکستان میں رکھا۔ اسی حسنِ انتظام کی بنا پر امیر دوست محمد خاں نے اپنے ہونہار پوتے کو تاشقرغان کا حاکم بنایا۔ دربار کابل سے حکم جاری ہوا کہ "ایک ہزار سوار اور دو ہزار پیدل چھ توپیں لے کر جلد از جلد عبدالرحمٰن خاں تاشقرغان جا کر اپنے عہدہ کا چارج لیلے۔"

غرض کہ عبدالرحمٰن خاں نے حسب فرمان دربار کابل تاشقرغان پہنچ کر اپنے عہدہ کا چارج لیا اور حکومت کا انتظام نہایت عمدہ رکھا اس سخت ذمہ داری کے باوجود امیر نے ہمیشہ مطالعہ کتب جاری رکھا یعنی ایک خاص آدمی امیر کے لئے کتاب پڑھتا۔ اور امیر اس کو غور سے سنتے

عبدالرحمن خاں اپنے تمام مشاغل ایک دستور العمل کے مطابق سرانجام دیتے تھے یعنی مطالعہ کتب
آرام، سواری، دربار، فوجی معائنہ اور شکار ان سب جمعہ کے دن تعطیل ہوتی تھی۔ اور تمام دن
چوگان کے لئے وقف تھا۔

انتظامی قابلیت کی وجہ سے تمام رعایائے تاشقرغان نیز سردل عزیزی حاصل کرلی تھی
عبدالرحمن خاں اپنی گورنری کے زمانہ میں اکثر قحط سالی کے موقع پر تاشقرغان کے کاشتکاروں کی
خراج میں تخفیف کردیتا تھا۔ نہایت ہی کامیاب طریقہ پر امیر نے دو سال تک حکومت تاشقرغان
کو سنبھالا دو سال کے بعد امیر افضل اپنے بیٹے کے انتظامات حکومت ... دیکھنے کے لیے تاشقرغان ... یہ
تمام انتظام حکومت مکمل پاکر اطمینان ظاہر کیا۔ لیکن تخفیف
... امیر افضل خاں کہتے تھے۔ کہ چونکہ صوبہ کے ... خرچ
وصول ہونا چاہیئے۔ عبدالرحمن نے اپنے باپ سے
غریب کاشتکاروں سے نہ لینی چاہیئے۔ امیر افضل خاں نے ...
خراج وصول کیا۔ اور اس کے بعد بلخ واپس چلا گیا۔

عبدالرحمن خاں کا عہدۂ گورنری سے استعفادیکر تختہ پل میں آکر اقامت پذیر ہونا

اپنے باپ کے جانے کے بعد ہی عبدالرحمن خاں نے تاشقرغان
کی گورنری سے استعفادے دیا۔ وہ اس بنا پر کہ انھیں حکومت
کرنے کے پورے اختیارات نہیں دئے جاتے چنانچہ تاشقرغان
کا انتظام حکومت اپنے نائب کو دیکر عبدالرحمن خاں نے تختہ پل میں آکر اپنا تعلیمی مشغلہ جاری رکھا اور
جمعرات کا دن سیر و شکار میں گذارتے تھے چنانچہ امیر موصوف اپنے تزک میں اپنے شکار کا ذکر کرتے
ہوئے لکھتے ہیں

"جمعرات کو میں ہمیشہ شکار کے لئے چلا جایا کرتا تھا۔ اور دوسرے روز شام کے وقت
ایک شب اور دو روز باہر رہ کر واپس آتا تھا۔ شکار میں عموماً دو سو کتے۔ شکرے باز
اور دوسرے شکاری پرند ایک سو خدمتگار اور سوار کل تقریباً پانچ سو آدمی میرے ہمراہ

ہوتے تھے۔ دریائے جیحوں کے قریب جو جنگل ہیں۔ ان میں ہم شکار کھیلا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی اس علاقہ میں ولایت کی بڑی خوفناک کھیل دیکھا ہے۔ ہم مچھلی پکڑتے تھے۔

عبدالرحمن خاں ایک اتالیق کی نگرانی میں

امیر افضل خاں کے بعض درباری ہمیشہ عبدالرحمن کے خلاف شکایتیں کرتے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افضل خاں نے انہیں جنرل شیر محمد خاں نومسلم[1] کی نگرانی میں دے دیا۔ جنرل شیر محمد خاں تین گھنٹے روزانہ تیر اندازی اور مختلف فنون حرب عبدالرحمن خاں کو سکھاتے تھے۔ اور عبدالرحمن خاں دوپہر کو سرکاری آہنگری کے کارخانہ میں چار دو تین گھنٹے بندوق سازی کا کام سیکھتے تھے عبدالرحمن خاں نے تین بندوقیں تیار کیں جو ان کے استاد کی تیار کردہ بندوقوں سے بھی بہتر خیال کی جاتی تھیں۔

الزام مے نوشی اور قید

امیر افضل خاں کا ایک درباری سردار عبدالرحیم خاں تھا۔ وہ عبدالرحمن خاں کی ہر دل عزیزی دیکھ کر کڑھتا تھا۔ وہ ہمیشہ عبدالرحمن خاں کے خلاف افضل خاں سے شکایتیں کیا کرتا تھا۔ اور نئی نئی تہمتیں تراشتا تھا۔ ایک دن اس نے عبدالرحمن خاں کے والد سے شکایت کی کہ آپ کا لڑکا شراب پیتا ہے۔ اور مزید برآں یہ بھی کہا کہ اگر جلد از جلد تدارک نہ کیا گیا۔ تو اس کی صحت کے خراب ہونے کا بہت بڑا امکان ہے۔

غرضیکہ امیر افضل خاں نے بغیر کسی تحقیق کے اپنے بیٹے کو قید میں بند کر دیا۔ اور اسی قید میں عبدالرحمن خاں نے ایک سال تک رنج و مشقت کی زندگی بسر کی۔

عبدالرحمن خاں کا افغانی ترکستان کی افواج کا سپہ سالار مقرر ہونا۔

جس زمانہ میں عبدالرحمن خاں قید میں تھے اسی زمانہ میں شیر محمد خاں" سپہ سالار افواج ترکستان کا انتقال ہو گیا تھا۔ سب سے زیادہ اس عہدہ کا امیدوار وہی سردار عبدالرحیم خاں تھا جس نے عبدالرحمن

---

[1] شیر محمد خاں ایک انگریز تھا اس کا اصلی نام مسٹر کیمبل تھا۔ افغانستان کی پہلی لڑائی میں مسلمان ہو کر افغانی بن گیا تھا اور امیر دوست محمد خاں کے زمانہ میں فوج میں تھا۔ فوجی اور فن جراحت میں نہایت زبردست قابلیت رکھتا تھا افغانی ترکستان کی افواج کا سپہ سالار اعظم تھا ۳۰۰۰۰ فوج اس کے زیر کمان تھی۔

پر مئی نوشی کا الزام لگایا تھا۔ لیکن امیر افضل خاں اب اس سے بدظن ہو گیا تھا۔ اس لئے دکھی معتبر درباری کو یہ عہدہ دینا چاہتا تھا چنانچہ ان کی نظر عبد الروف خاں پر پڑی جو فوجی خدمات کی وجہ سے کافی شہرت رکھتا تھا۔ لیکن اس نے عبدالرحمٰن خاں کا نام پیش کیا اور کہا کہ عبدالرحمٰن خاں کافی سزا پا چکی ہے اب ان کو سالار کے یہ عہدہ دیجئے" امیر افضل خاں نے عبد الروف خاں کے بہت اصرار کے بعد اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اور عبدالرحمٰن خاں کو قید خانہ سے بلایا۔ عبدالرحمٰن خان قید خانہ کی بیڑیاں پہنے ہوئے ایک قیدی کی ہیئت کذائی میں باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس چیز نے امیر افضل خاں کے قلب پر گہرا اثر ڈالا۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو اس حالت میں دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور کہا " پھر تم کیوں ایسی حرکتیں کرتے ہو"

بالکل بے قصور ہوں۔ میری اس حالت میں ہونے کے ا

کہتے ہیں " عبدالرحمٰن خاں یہ الفاظ کہہ رہا تھا۔ کہ عبدالرحیم خا

خاں نے کہا "یہی دغاباز شخص ہے۔ جس کی وجہ سے بیٹے ...

بلکہ یہ بجا ہے کہ میں" ان الفاظ کو سننے کے بعد عبدالرحیم خاں کے چہرے کا رنگ غصہ سے بدلنے لگا۔ لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ اس کے بعد امیر افضل خاں نے تمام فوجی افسروں سے مخاطب ہو کر کہا " ایسے ہوا س باختہ بیٹے کو تمہارا سردار مقرر کرتا ہوں" سب فوجی افسروں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ " خدا نہ کرے کہ آپ کا بیٹا پاگل ہو ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ نہایت عقلمند اور سمجھدار ہے۔ حضور پر رفتہ رفتہ خود روشن ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا۔ کہ اُسے بدنام کرنے والے۔ نمک حرام ہیں" اس کے بعد امیر افضل خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو سپہ سالاری افواج ترکستان کا عہدہ سپرد کیا تمام فوجی افسروں اور نوکروں نے عبدالرحمٰن خاں کو مبارکباد دی۔

الغرض دوسرے دن عبدالرحمٰن خاں نے فوج کا معائنہ کیا۔ اور تمام اسلحہ و میگزین کو دیکھا۔ تمام آہنگری کے کارخانوں کو ملاحظہ کر کے آئندہ کام کرنے کا دستور العمل مرتب کیا۔ یہ واضح رہے کہ عبدالرحمٰن خاں کے تقرر سے پیشتر فوجی محکمہ کی حالت بہت ہی خراب تھی چنانچہ اس نوجوان نے

دونوں میں محکمہ فوجی کی اصلاح کرلی جو فوجی افسر آرام پسند تھے۔ ان کو برطرف کر دیا۔ امیر افضل خاں امیر عبدالرحمٰن کی اعلیٰ فوجی قابلیت دیکھ کر خوش ہوئے۔ اور ترکستان کے محکمہ فوج کا پورا انتظام اُن کے سپرد کر دیا۔

قتاغان اور بدخشان کی مہموں میں عبدالرحمٰن خاں کی غیر معمولی فوجی قابلیت کا ظاہر ہونا۔

اسی زمانہ میں علاقہ قتاغان کے سردار امیر بخارا کا باج گذار تھا۔ امیر افضل خاں پر فوج کشی کی اس کی وجہ یہ تھی کہ افضل خاں نے امیر مذکور کو دوستانہ مشورہ دیا۔ کہ چونکہ تمہارا علاقہ جیحوں کے اس کنارے پر واقع ہے۔ اور مملکت افغانستان سے ملحق ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے۔ کہ تم اپنے آپ کو افغانستان کے ماتحت سمجھو اور خطبہ میں دوست محمد خاں کا نام پڑھو۔ یہ بات سردار قتاغان کو بری معلوم ہوئی۔ اور اس نے افضل خاں کو فوجکشی کی دھمکی دی۔ اب مجبوراً امیر افضل خاں کو مدافعت کے لئے تیاری کرنی پڑی اور امیر افضل خاں نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو فوجی تیاری کا حکم دیا عبدالرحمٰن خاں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی۔ یہ مہلت تیاری کے لئے تھی۔ چنانچہ تیاری کے بعد عبدالرحمٰن خاں نے اپنے والد کو فوج کا معائنہ کرا کر کوچ کا حکم دیا۔ اس موقعہ پر امیر افضل خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو ایک مرصع تلوار عطا کی اور کہا۔ کہ جاؤ خدا حافظ میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا“

دوسری طرف سے امیر قتاغان نے چالیس ہزار فوج کے ساتھ کوچ کیا۔ اور قلعہ غوری کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ عبدالرحمٰن خاں نے سخت شکست دیکر تمام علاقہ قتاغان پر قبضہ کرلیا۔ اور قتاغان کا پورا علاقہ امیر عبدالرحمٰن خاں نے افغانستان کی حکومت میں ملحق کر دیا۔ اس مہم سے عبدالرحمٰن خاں نے مشکل ہی سے فراغت حاصل کی تھی کہ امیر قتاغان اور میر بابے بدخشان کی ترغیب سے اندراب اور خوست کے باشندوں نے حکومت افغانستان کے خلاف بغاوت کی اس بغاوت کو عبدالرحمٰن نے اپنی بے نظیر فوجی قابلیت سے فرو کیا۔ اور اپنے چچا امین خاں کے ماتحت پندرہ ہزار فوج چھوڑ کر خود قتاغان کے انتظامات ملکی کے لئے واپس آئے چند دنوں کے بعد امین خاں نے عبدالرحمٰن خاں کو لکھا کہ ”فوج کافی نہیں ہے کمک روانہ کیجئے ورنہ مجبوراً پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ خط کے

پہنچے ہی عبدالرحمٰن خاں خود وہاں پہنچے۔ اور میر ہائے بدخشان کو پے در پے شکستیں دیکر ٹھیک کر دیا۔ میر ہائے بدخشان کو حکومت افغانستان کی اطاعت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ [illegible] بلخ میں آکر انھوں نے امیر افضل خاں کے آگے حلف وفاداری اٹھایا۔ اس طرح عبدالرحمٰن خاں نے اس علاقہ میں امن وامان قائم کیا۔ ان کامیابیوں کے بعد عبدالرحمٰن خاں جب بلخ و [illegible] نوجوان سپہ سالار کی فوجی قابلیت کی تمام افغانستان میں دھوم [illegible]

شجاع بیٹے کا بلخ میں شاندار استقبال کیا۔ اور ایک [illegible]

میں تقسیم کر دی۔

امیر دوست محمد خاں کا انتقال ان کے بیٹوں کا تخت کابل کے لئے لڑنا

امیر دوست محمد خاں نے ا[illegible] کی حکومت اپنے بیٹوں میں تقسیم [illegible] تھی چنانچہ کابل کی حکومت اور ولیعہدی شیر علیخاں کے لئے مخصوص کر دی تھی۔ دوست محمد خاں کا انتقال ۱۸۶۳ء میں ہوا اب شیر علی خاں نے ولیعہد ہونے کی بنا پر دعویٰ کیا۔ کہ افغانستان کا حقیقی وارث میں ہوں۔ اور محمد رفیق جو اپنی ذہانت کی وجہ سے سیاسی امور میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اُس کو اپنا وزیر و مشیر مقرر کیا۔ امیر شیر علی خاں نے محمد رفیق کو پشاور انگریزوں کے پاس مقررہ وظیفہ لینے کے لئے روانہ کیا۔ انگریزوں نے شیر علیخاں کو کہلا بھیجا کہ جب تک تمام بھائیوں سے اپنی حکومت نہیں منواؤ گے اس وقت تک وظیفہ نہیں مل سکتا۔ غرضکہ امیر شیر علی خاں کو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ تمام افغانستان پر اپنا اقتدار قائم کرے۔ چنانچہ شیر علی خاں نے سب سے پیشتر امیر افضل خاں، عبدالرحمٰن خاں کے باپ والی افغانی ترکستان پر فوج کشی کی اور شکست دی اس کے بعد افضل خاں سے امیر شیر علی خاں نے بمقام مزار شریف قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ افضل خاں کے ساتھ تعظیم و تکریم کا سلوک کرتا رہیگا۔ لیکن چند ہی دنوں میں شیر علیخاں نے یہ تمام مواعید و مواثیق پس پشت ڈالکر افضل خاں کو قید کر دیا۔

باپ کی رہائی کیلئے عبدالرحمن خاں کی جدوجہد

عبدالرحمن خاں افغانستان سے فرار ہو کر امیر بخارا کے ہاں چلا گیا
تھا۔ علمائے بخارا نے شیر علی خاں کے افضل خاں سے عہد شکنی
کی بنا پر کفر کا فتویٰ دیا۔ اور باشندگان افغانستان میں بھی شیر علیخاں کے خلاف نفرت کے
جذبات پیدا ہو گئے۔ عبدالرحمن خاں اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر بلخ کے گورنر کو ملا کر آگے بڑھے اور
شیر علی خاں کی فوجوں کو شکست دی۔ اس لڑائی میں شیر علی خاں کا عزیز ترین بیٹا محمد علیخاں
مارا گیا۔ اس صدمہ نے شیر علیخاں کو پژمردہ اور افسردہ کر دیا۔ چنانچہ اس کا ارادہ تھا کہ ترک
حکومت کر کے مکۂ معظمہ چلا جائے لیکن اسی درمیان میں اعظم خاں جو شیر علی خاں کا بھائی
تھا۔ اور ہندوستان میں پناہ گزیں تھا۔ راولپنڈی سے بھاگ کر عبدالرحمن خاں سے
جا کر ملا۔ اور دونوں نے شیر علی خاں کو پنجشیر کے مقام پر سخت شکست دی۔ شیر علیخاں
قندھار بھاگ گیا۔

عبدالرحمن خاں کا اپنے باپ کو قید سے رہائی دلا کر تخت کابل پر بٹھانا اور ان کے والد کا انتقال

۱۸۶۶ء میں افضل خاں تخت کابل پر قابض ہوئے اور اپنے بھائی
اعظم خاں کو وزیر بنایا۔ چند دنوں کے بعد افضل خاں شراب نوشی
کی وجہ سے نشہ میں مخمور رہنے لگے۔ اور تمام سیاہ سفید کا مالک
اعظم خاں تھا۔ اس چیز نے عبدالرحمن کو بددل کر دیا۔ وہ ان چیزوں
کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ اسی اثنا میں شیر علیخاں قندھاری لوگوں کی امداد سے کابل پر
حملہ آور ہوا۔ لیکن عبدالرحمن خاں سے شکست کھا کر ہرات بھاگ گیا اور عبدالرحمن خاں
نے قندھار پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب دوبارہ شیر علی خاں نے کابل
لینے کی کوشش کی عبدالرحمن کو بیمار چھوڑ کر بمقام پنجشیر شیر علی خاں کی فوجوں کا مقابلہ
کیا۔ اور شکست فاش دیکر۔ دشمن کو ہرات کی طرف بھگا دیا۔ اور بلخ پر قابض ہو گیا۔
انہیں ایام میں افضل خاں کا انتقال ہو گیا۔

عبدالرحمٰن خان کا اپنے چچا اعظم خاں کو تخت پر بٹھلانا اور شیر علی خاں پر فوج کشی کرنا

عبدالرحمٰن خاں نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنے چچا اعظم خاں کو تخت کابل پر بٹھایا۔ اور سپہ سالار ہوگئے اب عبد الرحمٰن خاں نے یہ ارادہ کیا شیر علی خاں کو ملک سے نیست و نابود کردیں۔ چنانچہ اسی غرض سے۔ عبدالرحمٰن خاں کوہ ہندوکش کے اس پار شیر علی خاں سے مقام بامیان میں مشغول جنگ ہوگئے۔ بمبنہ کو فتح کرکے بلخ کے انتظامات حکومت میں ۔۔۔ تھے کہ شیر علی خاں
بیٹے یعقوب خان کو قندھار فتح کرنے کے لئے روانہ
کابل کے لوگ امیر اعظم خاں کی سخت مزاجی کی وجہ۔۔
ہرات سے آگے بڑھکر غزنی پر قابض ہوگیا۔ رخ سے۔
نے فوج کشی کی لیکن شکست کھاکر دونوں چچا بھتیجے بھاگے۔۔ اور تمام افغانستان شیر علی خاں کے قبضہ میں آگیا۔

عبدالرحمٰن خان کا بھاگ کر روسی ترکستان میں پناہ گزیں ہونا

غزنی کے معرکہ میں عبدالرحمٰن خاں اور اعظم خاں کو زبردست شکست ہوئی وہ دونوں کو فرار ہونا پڑا۔ اعظم خاں مشہد بھاگ گیا۔ اور اس کا وہیں انتقال ہوا۔ مگر عبدالرحمٰن خاں جنگلوں میں پھرتے پھراتے اور سختی اٹھاتا ہوا ترکستان پہنچے۔ اس سفر میں عبد الرحمٰن خاں نے جو جو سختیاں اٹھائی ہیں۔ ان کو سنکر انسان کی آنکھوں کے سامنے نیرنگئ عالم کا نقشہ پھر جاتا ہے ان مصائب کا ذکر کرتے ہوئے امیر موصوف اپنی سوانح حیات میں ایک جگہ لکھتے ہیں

"جب سے مجھے شکست ہوئی تھی اس وقت سے اس شب تک جب کہ ہم وزیریوں کے ملک میں پہونچے۔ میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہاں پہونچکر میں نے سواروں سے کہا کہ نہایت بھوکا ہوں۔ ایک پارچہ گوشت ملجائے۔ تو کیا اچھا ہو۔ ان کے پاس ایک روپیہ تھا اس سے گوشت مکھن اور پیاز خریدی گئی۔ اب یہ دقت پیش آئی کہ پکانے کا برتن ہمارے پاس نہ تھا۔ اور اس ملک کے لوگ صرف مٹی کے ظروف استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال

میرے آدمی کہیں سے کڑھائی لے آئے۔ اور اس میں ایک شوربے والا گوشت پکایا۔ میں نے کڑھائی کو دو لکڑیوں سے باندھ کر آگ پر لٹکایا تھا۔ اور گوشت کھانے کے لئے نکالا ہی چاہتا تھا۔ کہ کتا غالباً اس سبب کر کہ وہ رسی جس سے کڑھائی بندھی ہوئی تھی کسی جانوروں کی آنتیں تھیں اپنے منہ میں لے کر بھاگا۔ اور کڑھائی وغیرہ سب کچھ ساتھ لے گیا۔ میرے سوار رستے کے پیچھے دوڑے لیکن گوشت گر پڑا تھا۔ یہ قصہ بھی خدا کی قدرت کا نمونہ تھا۔ تین دن پیشتر ایک ہزار شتر صرف میرا کھانا پکانے کے برتن لانے کے لئے میرے پاس تھے۔ اور آج ایک کتا میرا کھانا اور برتن دونوں لے گیا۔ مجھے اس خفیف کن واقعہ پر تبسم آیا اور روکھی روٹی کھا کر سو رہا۔

غرض کہ عبد الرحمن خاں اس دشت نوردی کے بعد وزیرستان میں پہنچے جہاں انہوں نے انگریزوں سے ہندوستان میں آنے کی اجازت مانگی۔ انگریزوں نے عبد الرحمن کے سامنے یہ شرط پیش کی۔ کہ ہندوستان میں آنے کے بعد پھر حدود ہند سے باہر جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ عبد الرحمن خاں کو یہ شرط ناگوار گذری۔ اس لئے روسی ترکستان جانے کا ارادہ کیا۔ اور اپنے جان نثاروں کے ساتھ لق و دق صحرا اور گھنے جنگلوں کو طے کر کے روسی ترکستان میں پہنچے جہاں روسی وائسرائے نے امیر موصوف کا شاندار استقبال کیا اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ سمرقند میں ایک عالیشان کوٹھی مع وسیع باغ امیر موصوف کو دی۔ روسی حکومت عبد الرحمن خاں کو اخراجات کے لئے ایک ہزار روپیہ ماہانہ دیتی تھی۔ جو ان کے لئے بہت ہی کم رقم تھی۔ غرضیکہ عبد الرحمن خاں نے گیارہ سال روسی ترکستان میں گذارے بموسم شکار میں اکثر وقت شکار میں صرف کرتے تھے اور بقیہ موسم میں اپنے باغ کی دیکھ بھال بذات خود کرتے تھے۔ عبد الرحمن خاں اپنی خود نوشت سوانح حیات میں روسی ترکستان کی مصروفیتوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں

کل گیارہ سال میں سمرقند رہا۔ اور اپنا تمام وقت شکار کھیلنے میں صرف کیا۔ میں سواری

کے گھوڑے دس بار برداری کے خچر ہمیشہ میرے اصطبل میں رہتے تھے اور چند سوار ایک نالی اور دو نالی بندوقوں سے مسلح میرے ہمراہ جاتے تھے۔ نیز شکرہ باز اور دیگر شکاری چڑیاں میرے ساتھ ہوتی تھیں۔ الغرض اس قسم کی تفریح سے غم غلط کر لیا کرتا تھا۔

ایک دوسری جگہ آگے چل کر عبدالرحمٰن خاں اپنی تزک میں یوں تحریر کرتے ہیں:۔

"جب موسم شکار نہ ہوتا تھا تو اپنی کوٹھی کے گرد باغ کو ٹھیک کرایا کرتا تھا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور آدمیوں کو کہتا تھا کہ اس طرح پانی دو ... اس طرح ہل چلاؤ اور اس طرح چھانٹو۔ بعض اوقات اپنے ہاتھ سے بھی مٹی ..."

چینی قومیت و جمہوریت

اہل ہند ملک چین کی حالت حاضرہ سے بالعموم ناواقف ہیں، ہم کو جو کچھ حالات وہاں کے
معلوم بھی ہوتے ہیں وہ بھی غیروں کی زبان اور قلم سے۔ جو اکثر حالتوں میں ناقص بلکہ غیر صحیح
ہوتے ہیں۔ اس لئے عرصہ سے میری خواہش تھی کہ خود چینی ذرائع سے وہاں کے اصل حالات
معلوم ہوں تو اردو میں شائع کئے جائیں۔

ادھر تین سال سے ایک بست سالہ نوجوان مولوی بدرالدین صاحب جو وسط چین کے صوبہ
ہونان کے رہنے والے ہیں۔ اور وہاں کے حالات اخبارات اور جدید تغیرات سے واقفیت
رکھتے ہیں، میرے پاس جامعہ ملیہ میں پڑھتے ہیں۔ میں نے اُن کو صاحب ذوق دیکھ کر
اپنے اس خیال کو ظاہر کیا۔ اس عزیز شاگرد نے میری فرمائش کی تعمیل میں یہ سلسلہ مضامین
اردو میں لکھنا شروع کیا جس میں پہلے چین کے اولین صدر جمہوریہ ڈاکٹر سن یٹ سین
کے چند لکچروں کا ترجمہ ہوگا۔ اس کے بعد دیگر بیانات جن سے چین کی موجودہ حالت
پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ مضامین اصل چینی زبان سے اردو میں ترجمہ کئے گئے ہیں
عزیز موصوف ایمان کی پختگی۔ شرع کی پابندی علمی شوق محنت اور جفاکشی۔ ورزشی
کھیلوں میں شرکت۔ پاکیزگی۔ خوش خلقی۔ زندہ دلی اور خوش باشی کے لحاظ سے طلبائے جامعہ ایک اچھا
نمونہ ہیں۔ اس قلیل عرصے میں عربی اور انگریزی وغیرہ کے علاوہ اردو زبان میں انھوں نے جو لیاقت
حاصل کی ہے اس کا نمونہ ان کا یہ ترجمہ ہے جس کو ہم نے اس کے کہیں کہیں بعض بعض الفاظ میں تبدیلی کی ہے
بجنسہ شائع کرنا مناسب سمجھا۔

ان تقریروں میں چین کے اس ہر دلعزیز اور مشہور رہنما یعنی ڈاکٹر سن یت سین کی قومی اور وطنی روح معلوم
نظر آئے گی جس کے نقش قدم پر وہاں کے زعما چل رہے ہیں۔ اگرچہ ہندوستان کی حالت چین سے
مختلف ہے۔ مگر ان معلومات سے اہل ہند مشرقی اقوام کے عمیق تنزل کی گہرائیاں اور ان سے نکلنے
کے لئے جدوجہد کے راستے معلوم کر سکتے ہیں۔

اسلم

ڈاکٹر سن یت سین کے تین اصول

۱- قومیت ۲- جمہوریت ۳- معیشت. The liveli hood of people

ان تین اصولوں کو چینی زبان میں "شان مینگ چو ئی" کہتے ہیں

چو ئی یا ایک خیال ہے، ایک عقیدہ ہے اور ایک قوت ہے۔ ڈاکٹر سن یت سین

کے تین اصول جو چینی قوم کے لئے ہیں۔ تین اہم باتوں پر مشتمل ہیں۔ یعنی قومیت جمہوریت معیشت۔ یہ تینوں

اصول چین کو آزادی دلانے والے ہیں کیونکہ یہ چین کو ہر حیثیت

اور معاشی حیثیت سے غیر ممالک کے برابر درجہ پر پہنچا سکتے

ہی پر دار و مدار ہے

قومیت کیا ہے؟ وطنیت ہے۔ چینیوں کے نزدیک جو ...

قبیلیت تھی۔ اسی لئے چین میں خاندانیت اور قبیلیت کا چرچا بہت تھا۔ مگر قومیت کا نام و نشان

کہیں نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل یورپ کہتے ہیں کہ چینی لوگ اسقدر منتشر ہیں جیسے ہوا میں اڑتی ریت۔

چینیوں کے پاس خاندانیت اور قبیلیت کی اجتماعی قوت بہت کافی اور زبردست تھی۔ بسا اوقات

خاندانیت اور قومیت کی حمایت میں بے شمار جانوں کی قربانی ہوتی تھی۔ اس کی مثالیں صوبہ کانشان

میں بہت ہیں۔ دو قبیلہ کے لوگ اپنی نزاعات میں خواہ کتنی ہی جانوں اور مالوں کی کیوں نہ قربانی کر دیں

مگر طرفین اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔ یہ اس لئے ہے کہ قبائلی اور خاندانی تعصب ان میں بہت تھا چونکہ

قبائلی اور خاندانی تعصبات نے ان کے دماغوں میں جڑ پکڑ لی ہے۔ لہذا وہ اپنے خاندان اور قبیلہ کے

لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جہاں تک قومیت کا تعلق ہے۔ اس کے لئے کسی نے بھی کوئی

نمایاں قربانی نہیں کی ہے۔ اسواسطے چینیوں کی اجتماعی قوت صرف خاندان اور قبیلوں تک محدود رہی

ہے۔ اور وطنیت کے حدود پر اب تک نہیں پہنچی۔

قومیت کو وطنیت سے تعبیر کرنا، صرف چین اور چینیوں کے لئے موزوں اور مناسب ہے۔

کیونکہ اس لئے کہ عہد چینگ اور عہد ہان Chengand Han Dynesty سے لیکر اب تک ہر عہد میں صرف ایک ہی قوم نے آکر چین کو اپنا وطن بنایا۔ اور چین صرف ایک وطن بنایا غیر ممالک کی حالت بالکل اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ کبھی ایک قوم نے بہت سے ممالک کو اپنا وطن بنایا۔ اور کبھی ایک ملک میں بہت سی قوموں نے اپنا وطن بنایا

قومیت اور وطنیت کا فرق۔ | فطری قوت اور عسکری قوت (قانون قدرت اور قانون جبر)

قومیت اور وطنیت کو دراصل کس چیز نے پیدا کیا؟ مختصر سا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ قومیت کو فطری قوت نے پیدا کیا۔ اور وطنیت کو عسکری قوت نے چین کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ قانون قدرت فطرت کے مطابق ہے۔ بالفاظ دیگر فطری قوت ہی قانون قدرت ہے۔ قانون قدرت سے جو اجتماعی زندگی پیدا ہوتی ہے وہ قوم ہے۔ اور عسکری قوت قانون جبر ہے۔ اور قانون جبر سے جو اجتماعی زندگی پیدا ہوتی ہے وہ وطن ہے۔ اس لئے ایک جمعیت اگر فطری قوت سے قائم ہوئی ہو۔ تو وہ قومیت ہے۔ اور اگر وہ عسکری قوت سے قائم ہوئی ہو۔ تو وہ وطنیت ہے

کن وجوہات سے قوم پیدا ہوتی ہے | پانچ وجوہات سے

وہ چیز جو کہ قوم کو پیدا کرتی ہے مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ فطری قوت ہے۔ اگر ہم ذرا مفصل طور پر اس کا مطالعہ کریں تو بہت سے اسباب ہمیں نظر آئیں گے۔ سب سے بڑے اسباب جو ہیں پانچ ہیں۔ پہلا یہ کہ خون کے رشتہ سے قوم پیدا ہوتی ہے۔ آبا و اجداد جس خون سے ہیں اس خون سے ایک قوم پیدا ہو سکتی ہے۔ دوسرا ذریعہ معاش ہے۔ ذرائع معاش کے اختلاف ہونے کی وجہ سے قوم بھی مختلف ہوتی ہے۔ مویشی چرانے والے مثل بھی ایک قوم بنجاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کو حکومت بھی ملی ہے۔ تیسرا زبان ہے۔ خون کا رشتہ ایک ہی ہو۔ اور زبان بھی ایک ہی ہو۔ تو ایک دوسرے سے آسانی کے ساتھ اثر لے سکتا ہے۔ چوتھا مذہب ہے۔ ایک ہی خدا کے ماننے والے اور ایک ہی عقیدہ رکھنے والے بھی ایک قوم بنجاتے ہیں۔ پانچواں رسم و رواج ہے کیونکہ مخصوص رسوم اور رواج کی پابندی کرنے والے ایک قوم بنجاتے ہیں۔ مختلف نسلوں میں مختلف قومیں پیدا ہونا ہرگز ان پانچ اسباب پر منحصر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کے علاوہ اور بہت سے

اسباب ہیں جو کہ ایک خاص قسم کی قوم پیدا کرتے ہیں۔ البتہ یہ پانچ اسباب جو ہیں وہ فطری قوت کے ارتقاء کر چکے ہیں نہ کہ عسکری قوت کی فتوحات سے۔

ہماری قوم کی موجودہ حیثیت

چینی قوم موجودہ زمانہ میں اقوام کے درمیان کیا حیثیت رکھتی ہے؟ تعداد کے لحاظ سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں چینی قوم کہیں زیادہ ہے۔ تمدن کے اعتبار سے ہمارے پاس چار ہزار برس کی پرانی تہذیب موجود ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اگر ہماری قوم کو ہر لحاظ [illegible] تو کم از کم ان کے برابر ہونا چاہیئے۔ مگر افسوس محض خاندانیت اگرچہ مردم شماری میں ہماری تعداد چالیس کروڑ ہے۔ اور [illegible] وہ فضا میں اڑتی ہوئی ریت کی طرح منتشر ہیں۔ یہاں تک کہ معاملات میں ادنیٰ سے ادنیٰ جگہ بمشکل چین کو مل سکتی ہے۔ اب تو چینیوں [illegible] کا گوشت سمجھ رکھا ہے اور تیز دھار والی چھری سے ان کو کاٹ رہی ہیں۔ اس زمانہ میں چین کی حیثیت نہایت نازک اور خطرناک ہے۔ اگر فوراً ہم نے اپنی قومیت کے سایہ میں پناہ نہ لی اور اس کی رسی کو اچھی طرح پکڑ کر چین کو ایک محفوظ اور مضبوط وطن نہ بنایا تو ہمیں ڈر ہے کہ ہمارا وجود روئے زمین سے مٹ جائیگا۔ اور ہمارا نام و نشان صرف روئے زمین ہی پر نہ نظر آئے گا، بلکہ تاریخی اوراق سے بھی غائب ہوجائے گا۔ اگر ہم موت سے بچنا اور خطرہ سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ فوراً بلا تامل قومیت کا جھنڈا بلند کریں اور وطنیت کی روح اور جذبہ سے اپنے وطن کو بچالیں

دنیا میں آئندہ جنگ کی کیفیت

جب روس میں یہ جدید انقلاب پیدا ہوا۔ تو اس سے ہمیں ایک سبق ملا جس سے ہم اپنے ماضی کے حالات اور واقعات پر قیاس کرکے آئندہ سیاسی کشمکش اور تنازع کی کیفیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ اقوام کے درمیان عالمگیر نزاع ایک لابدی شئی ہے جس سے کسی طریقے سے بچنا محال ہے لیکن وہ مختلف قوموں اور نسلوں میں ہوگی۔ گوری قوم گوری کے ساتھ، زرد قوم زرد کے ساتھ جنگ کریں گی۔ یہ جنگ درجات اور طبقات،

... اور جابر پر، منصف اور اقویا کی جنگ ہوگی۔

دنیا کے آئندہ حالات کیا ہوں گے۔ اور کیا سے کیا ہو جائیگا۔ ہر شخص یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ کوئی قوم ہو یا ملک اگر وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ دوسروں کے دست درازے دبا ہوا ہے۔ غیروں کی طاقت کے نیچے پس رہا ہے۔ اور غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے تو وہ ضرور۔ بالضرور باہم متحد ہو کر طاقتوروں کا مقابلہ کرے گا۔ اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے گا۔

اسی قیاس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انصاف پسند گوری اور انصاف پسند زرد قوموں کے درمیان اتحاد ہوگا۔ اور غیر انصاف پسند گوری اور غیر انصاف پسند زرد قوموں کے درمیان بھی اتفاق ہوگا۔ اور یہ دونوں فریق اپنے اپنے متحد شدہ قوم کے ساتھ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے۔ اور یہی آئندہ کی عالمگیر جنگ ہوگی۔

چینی آبادی میں کمی ہونیکا خطرہ

چینی لوگ برابر اس پر فخر کرتے ہیں کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے آسانی کے ساتھ ان کو نہیں مٹایا جاسکتا۔ ان کو یہ خبر نہیں کہ سو سال کے اندر امریکہ کی آبادی سو کروڑ ہو جانے کا امکان ہے۔ اگر اس وقت امریکہ والے اگر چین کو فتح کر لیں - اور دس امریکی کے درمیان چار چینی کو رکھ دیں۔ اور چینی لوگ ان کی تمدن اور تہذیب اختیار کریں گے تو وہ امریکی ہی ہو جائیں گے۔ اس طریقہ سے ان کی ہستی نہ نظر آئے گی۔ اور انکا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ چینی آبادی مردم شماری میں چالیس کروڑ ہے مگر یہ عہد چیانگ لونگ (Chiang Loung) کی مردم شماری ہے۔ اس کے بعد کوئی معتبر مردم شماری نہیں ہوئی۔ چیانگ لونگ سے لیکر آجتک تقریباً دو سو برس گذر گئے ہیں۔ اس اثنا میں چین کی آبادی میں اضافہ نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک امریکی سفیر چین میں آیا تھا اور چین کی مردم شماری کی کوشش کی۔ اسکا بیان ہے کہ چین کی آبادی زیادہ سے زیادہ تیس کروڑ ہوگی حقیقت میں چین کی آبادی کتنی ہوگی ہمیں خبر نہیں چیانگ لونگ کی مردم شماری سے معلوم ہوتا ہے چالیس کروڑ۔ اور امریکن سفیر کا قول معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آبادی صرف تیس کروڑ ہے۔ فرض کر لیجئے کہ فی الحال چالیس کروڑ ہے۔ تب اس قیاس سے سو سال کے

چینی تعداد ہو گی۔ اور اضافہ ہونے کی امید نہ ہو گی۔ سو سال کے اندر ہماری تعداد میں کم اضافہ نہ ہوا
غیر قوموں کی تعداد برابر بڑھتی رہی، تو وہ لوگ صرف اپنی کثیر تعداد سے ہی چین کو نیست و نابود کر سکتے ہیں
چینی قوم صرف تباہ اور برباد ہی ہو گی بلکہ ان کی تمدن و تہذیب امریکیت میں گم ہو جائے گی۔ اسی طرح قوم و نسل کی
واقع ہوتی ہو ایسی حالت میں اگر غیر قوموں نے ہم کو غلامی کی زندگی بسر کرنے دی تو آئندہ چل کر اگر ہم
غلامانہ زندگی کی خواہش کریں گے تو ہم کو یہ بھی نصیب نہ ہو گی؟

چینی قوم کی مجبوریاں:

سیاسی اور معاشی دباؤ جو چینیوں پر پڑتا ہے وہ فطری آفات سے کہیں ... زیادہ تیز اور ... ...
چینی قوم کو نہایت آسانی کے ساتھ تباہ کر سکتا ہے چینی قوم پر اگر محض ...
سو سال تک زندہ رہنے کی امید ہو سکتی ہے مگر اس پر اگر سیاسی
تک وہ جی سکتی ہے۔ ایک ہی وقت میں اگر تینوں . . . .
چینیوں کے سر پر آ گیا، تو دم کے دم میں ان کی جان نکل جائیگی، اور دنیا میں ان کا زندہ رہنا محال ہو جائے
کیوں کہ فی الحال وہ تو خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔

سیاسی دباؤ

سو سال کے اندر ہی اندر چین کی بہت سی زمینیں دوسرے کے ہاتھوں میں چلی گئیں۔ حال
میں جو زمینیں غیر قوموں کے ہاتھوں میں سپرد کر دی گئیں، وہ وئی ہائی وی[1] Wei Hai Wei تھسن تاؤ
Tsintao، ڈالنی (Dalny)، بندر آرتھر Port Aurthur، کاؤلون Kow loon
اور خلیج کانٹن (Canton Bay) ہیں۔ ان مقامات پر غیر قوموں نے قبضہ کر کے اپنی اپنی قوتوں کا
مرکز بنا رکھا ہے۔ اس سے پہلے جو زمینیں دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئیں، وہ کوریا، تائیوان، بون ہو
ہیں۔ اور اس سے قبل جو زمینیں دوسروں کے ہاتھوں میں چلی گئیں وہ برما، ہند چینی اور خیلونگ کانگ ہیں
ان کے علاوہ سیلان، جاوی، سیام، نیپال، بھوٹان اور بہت سے دوسرے مقامات چین کے ماتحت
ریاستیں تھیں۔

---

(۱) وئی ہائی وی اگست سنہ ... میں واپس لے لیا گیا۔

معاشی دباؤ

معاشی دباؤ سیاسی دباؤ سے زیادہ تیز اور سخت ہے۔ سیاسی دباؤ کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں اور ہم ظاہری طور پر اسی کے زور اور تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے معاشی دباؤ کی کسی کو خبر نہیں ہوتی اور نہ لوگ اس کو محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ نمایاں طور پر آنکھوں کے سامنے نظر نہیں آتا۔

چین غیر طاقتوں کے معاشی دباؤ کی وجہ سے نہ صرف نصف(۱) نوآبادی کے درجہ تک پہنچ گئی ہے بلکہ مکمل(۲) نوآبادی سے بھی نیچے ہے۔ موجودہ زمانے میں ہمیں غیر قوموں کو ایک سو بیس کروڑ ڈالر کی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ اس حساب سے دس سال میں بارہ سو کروڑ ڈالر کی رقم ادا کرنی ہوگی۔ اس معاشی دباؤ نے چین کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ اس کی اجتماعی اور سوشل زندگی بالکل تباہ اور برباد ہوگئی۔ ان مجبوریوں کی وجوہ سے چینی لوگ کس طرح دنیا میں زندگی بسر کر سکتے ہیں!

چین کی موجودہ حیثیت ادنیٰ نوآبادی کا درجہ

کوریہ، ٹاؤوان، جاپان کی نوآبادیات ہیں۔ ہندچینی فرانس کی نوآبادی ہے۔ کوریہ اور ٹاؤوان کے باشندے جاپان کے غلام ہیں اور ہندچینی کے باشندے فرانس کے غلام ہیں۔ پھر چین کس ملک کی نوآبادی ہے اور اس کے باشندے کس ملک کے غلام ہیں؟ چین ان ممالک کی نوآبادی ہے جن کے ساتھ معاہدہ کر رکھا ہے۔ چینی باشندے ان ممالک کے غلام بن بیٹھے ہیں جن کو معاہدے کی رو سے چین پر امتیازی حقوق حاصل ہیں۔ اس واسطے چین ایک ملک کی نوآبادی نہیں ہے بلکہ بہت سے ممالک کی نوآبادی ہے۔ اور چینی باشندے ایک قوم کے غلام نہیں بلکہ بہت سی قوموں کے غلام ہیں۔ مقابلہ کرنے سے کیا ایک ہی ملک کی نوآبادی بننا اچھا ہے یا بہت سے ممالک کی؟ یا ایک ہی قوم کا غلام بننا اچھا ہے یا بہت سی قوموں کا؟ اگر صرف ایک ہی قوم کے غلام بنیں تو جب کوئی قحط یا آسمانی آفت غلام قوم کے سر پر پڑتی تو آقا قوم ضرور کسی نہ کسی طریقے۔ چندہ جمع کرنے سے یا خزانے کا روپیہ نکالنے سے۔ غلام قوم کی مصیبت

---

(۱) Half settlement

(۲) Full settlement

کو دور کرنے کی کوشش کرتی اگر بالفرض وہ تمام مصیبتوں کو دور نہ کر سکتی تو کم سے کم ان میں تخفیف
کردیتی۔ آقا قوم خود یہ سمجھتی ہے کہ غلام قوم کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو دور کرنا ان پر ضروری اور لازم ہے۔
اس واسطے وہ اپنی آقائیت کی وہ ذمہ داریاں اور فرائض جو کہ غلام سے وابستہ ہیں اچھی طرح انجام دے
گی۔ اور غلام قوم بھی اپنی امیدیں اپنی آقا قوم سے رکھے گی۔ اور وہ صرف اپنی ہی آقا قوم سے مدد
اور ہمدردی مانگے گی۔ کیونکہ آقا قوم کو کوئی بہانہ نہیں مل سکتا کہ وہ اپنی غلام قوم کی مدد نہ کرے۔ برخلاف
اس کے چین میں اگر کوئی مصیبت آپڑے اور اس کے باشندوں پر کوئی نظری آفت نازل ہو تو کوئی قوم
اس کی مدد نہیں کرتی۔ کیونکہ اس کے مالک بہت ہیں۔ اور ایک [illegible]
ایک آقا قوم کو اپنی غلام قوم کے ساتھ ہوتی ہیں اور ہوتی
سال ہوئے شمال چین میں ہ پر ہیبت اور [illegible] قحط
نہیں ہے جو اس کے سننے کی تاب لا سکے۔ اس اثنا میں
کے لئے کوشش نہیں کی۔ مشنریوں کے یہ طرز عمل دیکھ کر ہمارے باشندے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض صاحب
لوگوں کی فیاضی اور سخاوت ہے، نہ کہ ان کا فرض! اس سے معلوم ہوا کہ چین کو تاوان اور ہتک سے
سے بھی بدتر ہے اور ایک ہی قوم کا غلام بننا بہ نسبت بہت سی قوموں کے غلام بننے کے کہیں زیادہ
بہتر ہے کیونکہ ان کی قدر زیادہ کیجاتی ہے اور انھیں اپنی آقا قوم سے زیادہ مدد اور ہمدردی مل سکتی ہے۔
مگر بہت سی قوموں کے غلام بننے میں جب کوئی آفت ان پر پڑتی ہے تو کوئی آقا قوم ان کی مصیبتوں کی
طرف توجہ نہیں کرتی اور نہ چین کسی خاص آقا قوم کی شکایت کر سکتا ہے۔ اگرچہ آقا قوم نے اس کی مدد نہ کی
ہو آخر میں چل کر کسی سے بھی مدد نہیں مل سکتی اور سوائے موت کا انتظار کرنے کے اس کو اور کوئی چارہ
نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اگر چین کو صرف نصف نوآبادی کہیں تو نہایت غیر موزوں اور نامناسب ہے
اس کے لئے ایک ایسی خاص اصطلاح کی ضرورت ہے جو کہ اس قسم کے غلام ملک کی حیثیت کا پورا پورا
اظہار کر سکے، اس کے لئے ہم کو کوئی موزوں اصطلاح نہیں مل سکتی، سوائے اس کے کہ ہم اس کو ادنیٰ
نوآبادی کہیں۔ کیونکہ جب مادیات کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ تو ان میں خالص اور غیر خالص دو قسم کے اجزا

ہیں۔ خالص کراٹلی کہتے ہیں۔ اور غیر خالص کراوٹی۔ اور نیز فوجی قاعدہ ہے کہ جس شخص کا عہدہ بڑا ہو اس کو افسر اعلیٰ یا سینیر کہیں گے اور جس کا عہدہ چھوٹا ہو، اس کو اوٹی یا جونیر کہیں گے، چونکہ چین کا درجہ نیچے ہے وہ نو آبادی سے بھی نیچے ہے، اس لئے اس کو اونی نو آبادی کے نام سے موسوم کریں گے

سیاسی دباؤ کا نقشہ

۱۔ کسٹم ہاؤس
۲۔ بنک
۳۔ محصول نقل وحل
۴۔ غیر قوموں کا امتیازی پیشہ
۵۔ علاقہ مستعرات
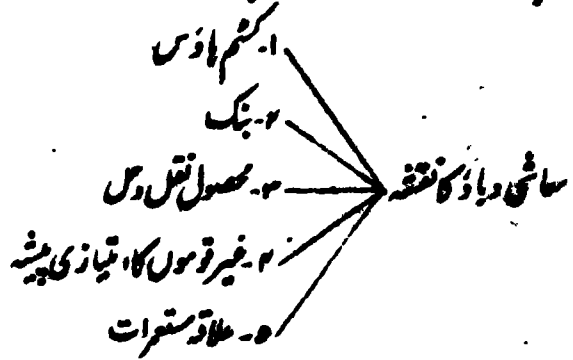
کسٹم ہاؤس

(الف) محصول۔ . . . کسٹم ہاؤس[1] Custom House غیر قوموں کے ہاتھ میں ہو اور وہ آمد ورفت کا محصول اپنی رائے سے مقرر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے چین باوجودیکہ خود ترقی نہیں کرسکتا مگر اسے دوسری قوموں کی ترقی کی کوشش کرنا پڑتی ہے اور باوجودیکہ وہ خود اپنے گھر کے سامان کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ مگر اسے دوسروں کے سامان کی حفاظت کرنا پڑتی ہے۔
سارے ملک میں بدیشی مال بھرا ہوا ہے اور دیسی مال کا راستہ بالکل مسدود ہو، مزدوروں کو کام نہیں ملتا۔ تمام سونا اور چاندی پانی کی طرح غیر ممالک کی طرف بہا جا رہا ہے اور کسٹم ہاؤس سے جو محصول وصول ہوتا ہے چینی حکومت اس کو آزادی سے خرچ نہیں کرسکتی۔
(ب) خسارہ . . . . . ۱۹۲۱ء کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ درآمد بہ نسبت برآمد کے ڈالر کے حساب سے ۵۰ کروڑ زیادہ ہو۔ گذشتہ سال کے مقابلہ میں امسال کی درآمد و برآمد کا توازن ۵ فیصدی بڑھ گیا ہے۔ اگر یہ حال اور دس سال تک جاری رہا تو صرف تجارتی شعبے میں ہر سال

---

(۱) حال گزشتہ ۱۹۲۸ء میں کسٹم ہاؤس کو چین نے واپس لے لیا اور نئے طریقہ محصول کا اعلان بھی ہو چکا ہے۔ مگر ابتک اسے عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔

ایک سو بیس کروڑ اور پچاس لاکھ ڈالر ...... ۱۲۵۰۰۰۰ غیروں کے ہاتھ میں چلے جائیں گے۔ یہ گویا چینیوں پر ایک غیر مشکل محصول ہے جسے سالانہ چین دوسروں کو ادا کرتا ہے۔

بنک

(الف) نوٹ۔۔۔۔ غیر قومیں معمولی سے خرچ پر روزانہ سیکڑوں نوٹ چھاپ لیتی ہیں۔ اور ان پر غریب چینی اعتبار کرتے ہیں۔ سونا اور چاندی کے بجائے ان نوٹوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اس سے غیر قوموں کو ہزارہا ڈالر کا نفع ہوتا ہے چین میں Current Notes جو نوٹ ہیں سب کے سب ان کی بنکوں کے ہیں۔

(ب) مبادلہ Exchange۔۔۔۔ محصول ملتا ہے بلکہ جب وہ روپیہ ادا کرنے لگے مل جاتا ہے۔ فرض کیجئے اگر کوئی چینی دس ہزار ڈالر کا ۔۔۔ کمیشن دونوں مل کے تقریباً تین سو ڈالر کا نقصان ہوتا ہے۔ اس بناپر اگر دس ہزار ڈالر تین دفعہ بنک کے ذریعے سے تبادلہ کیا جائے تو کل رقم اجنبی بنک میں غائب ہو جائے گی۔

(ج) ودیعت Deposit۔۔۔۔ ۱۹۱۱ء[1] میں پیکن کے اجنبی بنک والے امانت رکھنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے تھے کہ وہ نہ صرف سود نہیں دیتے تھے بلکہ اس کے برعکس ان سے کچھ وصول کر لیتے تھے تاکہ وہ ان کے روپئے اور جائداد کو محفوظ رکھیں، اس زمانے میں اجنبی بنکوں میں جو ڈالر ودیعت کے طور پر جمع کئے گئے تھے وہ دو سو کروڑ کے قریب تھے۔ آج کل اس کے دگنے ہو گئے ہوں گے۔ سود جو دیا جاتا ہے وہ تین ہی فیصدی کے حساب سے۔ اور ان ڈالروں کو لیکے غریب تاجروں اور کسانوں کو قرض دیتے ہیں اور ان سے جو سود لیا جاتا ہے وہ آٹھ فیصدی بلکہ دس فیصدی ہے۔ یہ بنک والے چین کا روپیہ لوٹ کر اپنی تجارت

---

(۱) اس ہی سال میں انقلاب پسندوں نے شاہ مانچو کو تخت سے اتار دیا۔ اور نان کینگ میں جمہوریت کا اعلان کیا گیا۔

کا سرمایہ بنا لیتے ہیں اور چینیوں کا خون چوس کر اپنے آپ کو خوب موٹا تازہ، قوی اور مضبوط کرتے ہیں۔ سالانہ جو نفع ان کو ملتا ہے تقریباً پانچ کروڑ ڈالر ہے۔ تین قسم کے منافع ملک کے سالانہ نیک والوں کو تقریباً دس کروڑ ڈالر ملتے ہیں۔

محصول نقل وحمل

چین کا مال غیر ملکوں کے جہازوں سے ایک سے دوسری جگہ لیجانا پڑتا ہے۔ کیونکہ چین کے پاس ابتک ایسی بڑی جہازی کمپنی قائم نہیں ہوتی ہے جو کہ اپنے مال کے نقل وحمل کی ضروریات کو پورا کرسکے، غیروں کے جہازوں سے جو مال ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کیا جاتا ہے اس پر حد سے زیادہ محصول باربرداری لگایا جاتا ہے۔ مثلاً دس کروڑ ڈالر کا مال چین سے یورپ تک لیجاتا ہے، تو محصول باربرداری جو اس پر عائد کیا جاتا ہے وہ کم از کم دس فیصدی کے حساب سے لگایا جاتا ہے۔ یعنی دس کروڑ ڈالر مال کا محصول باربرداری ایک کروڑ ڈالر ہوتا ہے۔ ہر سال چین سے تقریباً سو کروڑ ڈالر کا مال غیر ممالک میں جاتا ہے اور صرف محصول باربرداری میں دس کروڑ ڈالر چین کو ادا کرنے پڑتے ہیں۔

چین میں غیر قوموں کے امتیازی پیشے

معاہدے کے امتیازی حقوق کی بنا پر غیر ممالک والے چینیوں کا خون خوب چوستے ہیں، صرف شمالی مانچوریہ ریلوے کمپنی کے اندازہ کرنے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ہر سال چین کو کتنا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس ریلوے کی آمدنی سے جاپان کو سالانہ پانچ کروڑ ڈالر کا نفع ملتا ہے۔ اس قسم کے اور بہت سے پیشے ہیں جو کہ غیر قوموں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کو تقریباً سالانہ سو کروڑ کا نفع ملتا ہے۔

علاقہ متفرات

(الف) ٹیکس ..... ہانگ کانگ۔ تائی وان۔ شنگھائی۔ ٹین ٹسن۔ دالین۔ ہان کاؤ۔ ان مقامات میں ہر سال تقریباً بیس کروڑ ڈالر ٹیکس غیر قومیں چینیوں سے وصول کرتی ہیں۔

(ب) کرایہ زمین لینڈ ٹکس Land tax سے دس گنا زیادہ۔
(ج) قیمت زمین . . . . سال بسال زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ علاوہ مستورات میں ان
تین وسائل سے غیر قومیں جو رقم وصول کرتی ہیں، وہ تقریباً پچاس کروڑ ڈالر ہے۔
ان پانچوں کے علاوہ اور اور ذرائع سے غیر قومیں جو رقم وصول کرلیتی ہیں وہ چار کروڑ سے
زیادہ ہے۔

ان چھ ذرائع سے غیر ممالک جو دولت چین سے لوٹتے ہیں

بینی قومیت کے فقدان کے اسباب

۱۔ مانچو بادشاہ کو جب کسی قوم پر غلبہ حاصل ہوتا
قوم کے تمام قومی زیورات اور جواہر چھین لیتا تھا۔ چنانچہ اس
اختیار کیا جس سے مغلوب قوم کے خیالات نیست و نابود ہو گئے۔

۲۔ قومی خیالات کی طرف بے توجہی کرنے سے قومیت بھی ساتھ ہی ساتھ مفقود ہو گئی۔ ہندوستان
اگرچہ اب تک محکوم رہا مگر اس کے قومی خیالات چین کے جیسے نہیں رہے کہ غیر قوموں کو اس پر غلبہ حاصل
ہوتے ہی قومیت فوراً فنا ہو جائے۔ اور پولنڈ Poland پر اگرچہ غیر قومیں سو سال سے حکومت
کرتی رہی ہیں۔ مگر ان کے قومی خیالات اب تک محفوظ ہیں، چنانچہ عالمگیر جنگ کے زمانے میں ان کو
فوراً آزادی مل گئی . . . . چین تو اپنے قومی خیالات ہی کھو بیٹھا۔ اسی وجہ سے یورپ کی سیاسی
اور معاشی قوت نے اگر اس کو نہایت آسانی کے ساتھ دبا لیا۔ ورنہ ہرگز چین کے حالات ایسے نہ ہوتے
جیسے آج ہیں۔

۳۔ چینی قومیت کے فقدان کا تیسرا سبب یہ ہے کہ وہ قبل از وقت عالمگیریت کی حامی بن بیٹھی
چین نے غیر محکوم ہونے سے پہلے اپنی قومیت کے حدود سے نکل کر عالمگیریت کے ملک میں قدم رکھ دیا
یہی وجہ ہے کہ جب کوئی قوم اس پر غالب آئی تو چین نے اپنی قومیت کے زیور کو عالمگیریت کے دامن
میں لپیٹ دیا۔ اور اپنی قومیت کی جانب سے لاپروائی برتی اور عالمگیریت کے چکر میں کبھی ان کو قومیت

کا خیال نہ آیا۔ اصولی طور پر آیا عالمگیریت مفید ہے یا مضر؟ اگر مفید ہے تو چین کیوں تباہ ہو گیا۔ اور اس کی قومیت کیوں مفقود ہو گئی؟ ..... چونکہ عالمگیریت کا خیال چینیوں کے دماغ کے اندر برابر رہا، اس لئے جب مانچو بادشاہوں نے اُن پر اپنی حکومت جاری کی تو تمام ملک کے باشندے ان کے غلام ہو گئے ..... اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت اکثر لوگ عالمگیریت کے حامی تھے اور قومیت کوئی اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چین کا بادشاہ کوئی بھی ہو اور چاہے جس قوم سے ہو، اس کے لئے خوش آمدید اور مبارک کے نعرے لگائے جاتے تھے۔ اگر کوئی چینی امریکہ یا برطانیہ کی شہریت اختیار کرے تو قومیت کے مفقود ہونے کی وجہ سے وہ ضرور امریکہ یا برطانیہ کو مدد دے کر چین کو فسخ کرے گا ..... اگر قومیت کا احساس چین میں نہ رہا اور عالمگیریت کا چرچا دن بدن زور پکڑ گیا تو چینیوں کے لئے کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جس سے ان کی زندگی باقی رہ سکے اور سوائے غیروں کے پاؤں کے نیچے پامال ہونے کے اور کوئی صورت نہیں ہوگی۔

قومیت اور عالمگیریت

چند سال کا واقعہ ہے کہ ایک مزدور روزانہ مزدوری کرتا تھا۔ مزدوری کرتے کرتے دس بارہ ڈالر اس نے جمع کر لئے۔ ان ڈالروں سے اس نے ایک لاٹری Lottery کا ٹکٹ خرید لیا، چونکہ وہ ایک خانہ بدوش آدمی تھا اور اس کا کوئی گھر نہ تھا۔ اور جب ٹکٹ خرید لیا گیا تو اس کو رکھنے کی جگہ نہ ملی، آخر اُس نے یہ سوچا کہ ٹکٹ کو اس بانس[1] کے اندر رکھ دیا جائے جس سے وہ مزدوری کرتا تھا۔ بہت اندر رکھنے کی وجہ سے وہ آسانی کے ساتھ باہر نہیں نکل سکتا تھا، مگر اس نے اپنے ٹکٹ کا نمبر خوب یاد کر لیا تھا۔ لاٹری کا نتیجہ یہ نکلا کہ انعام اول اس مزدور کو ملا۔ اس خوشخبری سے تقریباً وہ دیوانہ ہو گیا کیونکہ تھوڑے دن کے بعد وہ نواب بن بیٹھے گا۔ اس خیال اور نشے میں اُس نے یہ سمجھا کہ اب اس کو بانس کی ضرورت نہیں ہے چنانچہ اس نے اُسے دریا میں پھینک دیا ..... عالمگیریت کی

(۱) ہندوستانی قلی عموماً ایک ٹوکرا اپنے ساتھ رکھتا ہے مگر چین میں قلی بجائے ٹوکرے کے ایک لمبا سا بانس یا لکڑی کا ڈنڈا رکھ لیتا ہے۔

حالت لاوری کی سی ہے جس سے دولت کا امکان ہے مگر وہ بانس جس سے مزدور مزدوری کرتا تھا وہ قومیت ہے جس سے قومی زندگی باقی رہ سکتی ہو۔ انعام اول جو ملا ہو وہ چین کی انتہائی ترقی کا زمانہ تھا جس زمانے میں اہل چین نے عالمگیریت میں قدم رکھا ہے۔ چونکہ ہمارے آباء و اجداد یہ سمجھتے تھے کہ ان کی اولاد امن و امان کی زندگی بسر کرے گی، اس لئے انھوں نے قومیت کا بانس عالمگیریت کے دریا میں پھینک دیا۔

تعلیم یافتہ جو کہ جدید تہذیب کے دریا میں غرق ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ عالمگیریت اچھی ہے۔ اور برابر اس کے لئے تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کو خیال ہے۔ یہ بات اگر ہمارے آباؤ اجداد یا امریکہ والے یا انگریز لیکن اگر یہ کسی چینی کے منہ سے نکلے اور خصوصاً ان نوجوانوں تصور کرتے ہیں تو ہرگز ہرگز مناسب نہیں ہے کیونکہ وہ چیزیں ہمارے پاس نہیں ؟ اور وہ چیزیں کہاں ہیں جو کہ امریکن اور انگریز کے پاس ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ نہایت لغو اور زمانہ و فطرت کے خلاف بکواس کرتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اُٹھیں اور تمام قوموں کا مقابلہ کریں۔ انسان کا کام وہ ہے جو کہ انسانیت اور فطرت کا تقاضہ ہو۔ . . . . ہمارے چالیس کروڑ بھائیوں کو چاہیے کہ مظلوم قوموں کے ایک ارب پچاس کروڑ افراد کو ساتھ لے کر قومیت کا جھنڈا بلند کریں سب سے پہلے جو کام ہم کو کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم میں خود آپس میں اتفاق ہو اور اس کے بعد دوسری قوموں کے ساتھ اتحاد ہو۔ پھر ان ایک ارب پچاس کروڑ مظلوموں کے ساتھ مل کر دنیا کو ظالم اور جابر قوموں کے پچیس کروڑ افراد کا مقابلہ کریں۔ ان ظالموں اور جابروں کے مٹانے کے بعد ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کوئی اور ظالم روئے زمین پر تو نہیں رہ گئے۔ اگر ہم اس سے مطمئن ہو گئے کہ واقعۃً دنیا میں کوئی ظالم نہ رہا تب ہم اپنی قومیت کو چھوڑ دیں گے اور عالمگیریت کے پر جوش مبلغ بن جائیں گے۔

شہنشاہیت

شہنشاہیت کے معنی کیا؟ شہنشاہیت کے معنی یہ ہیں کہ سیاسی قوت سے کسی دوسرے ملک کے انتظامات میں دخل دینا چین کی اصطلاح میں The policy of seeking

کہتے ہیں وہ قوم یا وہ ملک جو اس قسم کی پالیسی رکھتی ہو، وہ شہنشاہیت a planting field in other land.
ہے۔ یورپ کی ہر قوم تقریباً اس مرض میں مبتلا ہے اور وہ ہر وقت یہ چاہتی ہے کہ کسی طرح غیر ملکوں میں
اپنے قدم جمادے، یہی وجہ ہے کہ ان میں جنگ وجدل بھی زیادہ ہوتا ہے۔ تقریباً دس سال کے اندر
ضرور ایک معمولی جنگ ہوتی ہو اور ہر سو سال کے اندر ایک زبردست جنگ ہوتی ہے۔ ان میں سب سے
زیادہ اہم اور بڑی حال ہی کی عالمگیر جنگ ہو۔

عالمگیر جنگ

اس دفعہ جو عالمگیر جنگ رونما ہوئی وہ محض فوقیت حاصل کرنے، ضعیف قوموں کو پامال کرنے
اور ان کے وطنوں کو تقسیم کرنے کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کا پہلا سبب یہ ہو کہ سکسن saxon اور
ٹیوٹانک Teutonic قوم دونوں بحری فوقیت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ کیونکہ جرمن قوم آگے بڑھ رہی ہو
اور اس کی بحری قوت آہستہ آہستہ وسیع اور مضبوط کی جارہی ہے۔ اور ان کی دلی خواہش یہ ہو کہ کم سے
کم دنیا میں وہ دوسری بحری طاقت بن جائیں۔ برخلاف اس کے انگلینڈ یہ چاہتا ہے کہ اس کی بحری
طاقت سارے عالم پر چھا جائے۔ جرمن کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر کیونکر چین سے گذر سکتی ہے۔ وہ یہ
سمجھتا ہے کہ بغیر جرمن کی بحری طاقت کو گرائے اس کو سمندر میں کوئی فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس واسطے
ان دونوں کے جذبہ تفوق سے یہ جنگ پیدا ہوئی۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ کی جتنی طاقتور قومیں
ہیں وہ یہ چاہتی ہیں کہ ضعیف قوموں کے وطنوں کو پامال کر دیں۔ اور انھیں آپس میں تقسیم کر لیں۔ مشرق
ادنیٰ میں ایک چھوٹا سا ملک جس کا نام ترکی ہے، سو سال سے اس کا حال یہ ہو رہا ہے کہ لوگ اس کو
مریض مشرق ادنیٰ کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اندرونی بدنظمی اور سلطان کی غیر معمولی شخصیت پرستی کی وجہ
سے ترکی نہایت خراب اور کمزور ہو گئی ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر یورپ کی مختلف قوموں نے یہ ارادہ
کر لیا کہ کسی طریقہ سے اس کو بانٹ لیا جائے۔ مدتوں سے اس مسئلہ کا حل نہ ہو سکا۔ اور اسی کے حل کرنے
میں اہل یورپ کی باہمی کشمکش نے یہ جنگ پیدا کر لی۔

قوموں کی خود مختاری اور استقلال

جب امریکہ کے صدر ولسن نے اپنا آزادی کا پیام عام کو پہنچایا تو اس سے دنیا کی چھوٹی اور
ضعیف قوموں میں غل مچ گیا کہ طاقتور جرمن کو گرانا چاہیئے تاکہ اس کے بعد دنیا میں جتنی ضعیف اور غلام
قومیں ہیں ان کو خود مختاری اور استقلال کا موقع مل جائے۔ اتحادیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا
اور تمام یورپ اور ایشیا کی ضعیف قوموں کو جمع کر لیا اور ان
طاقت (جرمنوں) کے خلاف آلات حرب اٹھائے۔ جب
تو استقلال کا پیام انگلینڈ اور فرانس کو بہت پسند آیا۔ گویا
ہیں۔ مگر جب صلح کا وقت آیا۔ اس وقت پر جو شرائط ان
تھیں تو وہ نہ صرف غیر منصفانہ اور ناقابل برداشت تھیں بلکہ ان سے غلامی کی زنجیریں اور بھی مضبوط
ہوگئیں اور اس وجہ سے غلام قوموں کو مایوسی ہوگئی اور وہ ہمیشہ کے لئے اپنی بدنصیبی اور بدقسمتی پر روتی
رہیں۔ فتحیاب قوموں نے ہمیشہ کے لئے یہ خاص امتیازی حیثیت اپنے لئے تجویز کر لی کہ دنیا میں جتنی چھوٹی
اور ضعیف قومیں ہیں سب کی سب ان کے زیر سایہ رہیں۔ گویا کہ انھوں نے ضعیف قوموں کے نفع و نقصان
کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور وہی سیاہ اور سفید کی مالک ہیں۔ برابر ان کی کوششیں یہ رہتی ہیں کہ کسی طریقے
سے ضعیف قوموں کو اپنے قابو میں رکھیں اور ان کو اٹھنے کا موقع نہ دیں، چنانچہ فتحیاب قوم نے ایک
اطمینان بخش مگر مصنوعی ترکیب نکالی جس پر ضعیف قوموں کو متحد ہونے کے لئے آمادہ کرتی رہتی ہیں۔ یہ
مصنوعی اور جھوٹی ترکیب عالمگیریت کا شور ہے۔ حال میں جو عالمگیریت کا شور ممالک یورپ میں مچا ہوا
ہے وہ دراصل شہنشاہیت کی دوسری شکل ہے۔ اس جدید ترکیب سے اہل یورپ یہ چاہتے ہیں کہ ضعیف
قوموں اور ان کے وطنوں کو اپنی ذاتی جائداد کی طرح محفوظ کر لیا جائے۔ مگر ضعیف قومیں اتنی بیوقوف
نہیں ہیں کہ دوبارہ ان کے دھوکے میں آجائیں۔ چنانچہ تمام ضعیف قومیں اپنی نیند سے جاگ گئی ہیں اور
جابر قوم کی چالاکی سے آگاہ ہوگئی ہیں۔ انھوں نے ٹھیک طور پر یہ معلوم کر لیا کہ عالمگیریت محض ایک
جال ہے جس کو فتحیاب قوم نے ضعیف قوموں کو پھنسانے کے لئے بچھا رکھا ہے، چنانچہ پیغمبر کی دعوت

اور منادی کے تمام ضعیف قومیں متفق ہو کر استقلال اور خود مختاری کے لیے ہر قسم کی کوشش کر رہی ہیں۔

چینیوں کی امن پسندی

عہد ہان سے لے کر اب تک برابر چین کو یہ امتیاز حاصل ہو کہ اس نے کبھی کسی غیر ملک پر حملہ نہیں کیا کیونکہ چینیوں کی طبیعت میں یہ بات موجود تھی کہ وہ کسی غیر قوم سے جھگڑنا اور لڑنا ناپسند کرتی تھی اور وہ ہمیشہ امن و سلامتی پر قائم رہنا پسند کرتی تھی۔ امن پسندی کا خیال عہد ہان کے زمانے سے بہت کافی پھیل گیا ہے۔ عہد سونگ Soong میں چین نے نہ صرف غیر ممالک پر چڑھائی نہیں کی بلکہ زیادہ خاموشی اور امن پسندی کی وجہ سے غیر ممالک نے چین پر حملے کرنے شروع کئے۔ عہد منگ Ming میں بھی چین نے کسی پڑوس کی ریاست کو نہیں ستایا، جزائر ملایا کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں جو چین کو خراج دیتی تھیں اور چینی تہذیب قبول کرتی تھیں۔ یہ اُن کی مرضی تھی نہ کہ چین نے اُن پر جبر کیا تھا۔ جس وقت یورپ کی جنگ بہت زوروں پر تھی تو ایک انگریز میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا "ڈاکٹر سن، آپ اپنی جنوبی حکومت کو بھی اتحاد ثلثہ کی جماعت میں شامل کر کے جرمن کے خلاف جنگ کریں۔" (اس زمانے میں چین کے اندر دو حکومتیں موجود تھیں، جنوبی اور شمالی، جنوبی حکومت کا مرکز کانٹان تھا اور شمالی حکومت کا مرکز پیکن، دونوں اندرونی معاملات میں خود مختار تھیں، مگر بیرونی تعلقات شمالی حکومت کے ساتھ ہوتے تھے) کیونکہ جرمن کے قبضے میں چین کی بہت سی زمینیں ہیں، میں نے کہا اس وقت ہمارے پاس اتنی طاقت نہیں ہو کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی زمینیں لے لیں اگر ہوئی تو ضرور سب سے پہلے اس کو لیتے جو زیادہ وسیع اور بڑی ہو ...... میں نے پھر کہا: ہم نے تو دو ہزار سال پہلے شہنشاہیت کا خیال چھوڑ دیا اور امن اختیار کیا۔ تمہاری غیر انسانی حرکات اور جبری افعال کو دیکھ کر ہم نے یہ سمجھ لیا کہ تم ابتک وحشی ہو۔ اور اب تک جنگ و جدال نہیں چھوڑ سکتے ہو۔ اگر تم جرمن سے لڑنا چاہتے ہو تو تم خود جا کے اُن سے لڑو کیونکہ ہم تمہارے ساتھ نہیں ہیں۔ مگر ہاں جب تم جنگ سے تھک جاؤ گے اور صلح اور امن اختیار کرنے کا ارادہ کرو گے، اُس وقت اگر تم آ کر ہم سے یہ کہو گے کہ ہم امن کا بُت نصب کرنے میں تمہاری مدد کریں تو تم ہم کو ضرور تیار پاؤ گے۔ اس کے علاوہ اور ایک بات بھی تم سن لو

یعنی ہم نہیں چاہتے کہ چین بھی تمہارے ساتھ غیر منصفانہ اور جابر قوت بن جائے۔ اور نہ ہمیں یہ امید ہے کہ چین ایک غیر منصف طاقت بننے کی کوشش کرے گا۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ حتی الامکان اپنی انصاف پسندی کی نیک خصلت کو محفوظ رکھے اور آئندہ زمانے میں جب تمام عالم جنگ سے بیزار ہو جائے گا تو چین اپنی اس نیک خصلت کو ان کے لئے چراغ راہ کے طور پر پیش کرے گا۔ اس وجہ سے ہم موجودہ جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔

چین کا سیاسی فلسفہ

موجودہ زمانے میں یورپ کی نئی تہذیب کا سلاب۔
پیدا ہوا ہے وہ چین کے کئی ہزار برس پیشتر کا پرانا خیال۔
داری اور اشتراک پر مبنی تھا۔ لینن کا جو مخلوط حکومت کا مقولہ ہے [illegible]
مارکس کا خیال خالص اشتراکیت پر مبنی نہیں تھا۔۔۔۔ غیر ممالک میں اشتراکیت صرف [illegible] ن کا ایک اقرار نامہ ہے۔ چین میں ہانگ شو چوانگ کے زمانے میں اشتراکیت کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ یورپ نے جو آج کل چین سے آگے اور ترقی یافتہ ہے اور دنیا میں زیادہ فوقیت حاصل کی ہے وہ سیاسی فلسفہ کی وجہ سے نہیں بلکہ مادی ترقی کی وجہ سے ہے کیونکہ موجودہ زمانے میں اُن کی مادی ترقی بہت زوروں پر ہے۔

ہم اب یورپ سے صرف وہ چیزیں سیکھیں گے جو ہمارے پاس نہیں ہیں اور ہم صرف اُن باتوں میں اُن کی تقلید کریں گے جو کہ واقعی اچھی اور مفید ہیں۔ چین کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ سائنس ہے نہ کہ سیاسی فلسفہ۔ جہانتک سیاسی فلسفے کا تعلق ہے یورپ چین کا محتاج ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ عالم میں جو قوم علوم و فنون سے سب سے زیادہ محبت رکھتی ہے وہ جرمن قوم ہے۔ مگر جرمنی میں جو لوگ علوم کے پیچھے لگے رہتے ہیں وہ برابر ان کی تحقیقات کرتے رہتے ہیں۔ ان کو چینی فلسفہ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی تہذیب کی تحقیق کرتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ چینی فلسفہ اور ہندوستانی تہذیب کی مدد سے سائنس کی وہ کمی اور غلطی درست ہو جو کہ اور کسی ذریعے سے درست نہیں ہو سکتی۔ ہمارے پاس جو اصلی تہذیب کا جوہر ہے اس سے اب تک اہل یورپ واقف نہیں ہیں۔

اور نہ اس پر انھوں نے اچھے طریقے سے غور کیا۔ دنیا میں سیاسی فلسفے کے میدان میں چین کا بہت کافی حصہ ہے۔ اور دنیا کی عالمگیر خوبیوں میں چینیوں نے ہمیشہ سلامتی اور امن کا آئینہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ مگر قومیت مفقود ہونے کی وجہ سے ہماری پرانی خوبیاں اور عمدہ خصلتیں زیادہ روشن نہیں معلوم ہوتی ہیں یہ ایک بڑی وجہ ہے جس سے ہم پیچھے رہ گئے ہیں۔ حال میں جو عالمگیریت کا شور اہل یورپ مچا رہے ہیں وہ درحقیقت شہنشاہیت کی شکل ثانی ہے اور یہ قوت اور جبر کے اوپر مبنی ہے۔ یورپ کے لوگ کہتے ہیں کہ طاقت عقل ہے۔ اسی اصول پر جس کے پاس طاقت ہے اس کے پاس عقل ہے۔ اس عقل کو اہل یورپ الصراط المستقیم کہتے ہیں۔ چینیوں کی طبیعت میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ قوت اور جبر سے کام لینا پسند کریں، اُن کے نزدیک جو قوت سے کام لیتا ہے وہ وحشی ہے۔ چینیوں کی یہی سلامتی اور امن پسندی کی روح درحقیقت عالمگیریت کی جان ہے۔ مگر کون اس کا خیال کرتا ہے؟ اگر ہم اس روح کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور اسے ترقی دینا چاہتے ہیں تو اس کے لئے ہمیں کسی بنیاد کی ضرورت ہے۔ اگر بنیاد نہ ہو تو ہم ہرگز اس روح کو محفوظ نہیں کر سکتے، پس ضرورت ہے کہ ہم اپنی قومیت کو اس کی بنیاد بنائیں۔

قومیت کو زندہ کرنے کے طریقے

۱۔ چین کے موجودہ حالات کو پہچاننا اور اس پر غور کرنا . . . . . اگر ہم اپنی قومیت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم اپنے دل کی گہرائی سے چین کی موجودہ مشکلات اور مجبوریوں پر غور کریں۔ چونکہ یہ ایک نہایت نازک اور خطرناک وقت ہے لہٰذا ان مشکلات کو جو کہ ہمیں صاف نظر آتے ہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح سے شاید ہماری کھوئی ہوئی قومیت دوبارہ حاصل ہونے کی امید ہو سکے۔ اگر ہم نے دل سے ان مشکلات کو نہیں پہچانا اور صرف یہ خواہش کی کہ قومیت کہیں سے مفت ہمارے ہاتھ آجائے تو آخر کار سوائے حسرت اور مایوسی کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ مایوسی کیا یعنی قوم مٹ جائے گی۔ وہ بلائیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے فوراً ہمارے سر پر ٹوٹ پڑیں گی، یعنی سیاسی و اقتصادی معاشی دباؤ اور غیر ممالک کی کثرت آبادی کا دباؤ۔ یہ تین قسم کے دباؤ ہمارے سر پر پڑے ہیں اور ہم کو مٹا رہے ہیں۔ اول الذکر کو لیجئے، سیاسی قوت سے کسی قوم کو فنا کرنا تو ایک لمحہ کا کام ہے۔ خصوصاً ایک ایسے

کمزور اور پست چین کو۔ آج ہم یہ نہیں جانتے کہ کل ہمارا کیا حشر ہوگا۔ سیاسی قوت سے کسی ملک کو برباد کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو عسکری قوت سے۔ چین ایک لمحے میں کیوں فنا ہو سکتا ہے؟ اس لئے کہ ہمارے پاس نہ بری طاقت ہے جس سے ہم اپنے اہم مقامات کی حفاظت کر سکیں اور نہ ہمارے پاس بحری طاقت ہے جس سے ہم اپنے بڑے بندرگاہوں کی محافظت کر سکیں، اور نہ ہمارے پاس ہوائی طاقت ہے جس سے ہم آسمان کی طرف سے دشمن پر حملہ کر سکیں۔ اگر جاپان نے ہم سے تعلق قطع کر کے جنگ کا اعلان کیا تو دس روز کے اندر وہ اگر چین کو تباہ کر دے گا۔ اگر امریکہ سے جنگ [illegible] کو نیست و نابود کر دے گا۔ اگر برطانیہ کے ساتھ جنگ کا شعلہ

چین کا ستیاناس ہو جائے گا۔ فی الحال تمام طاقتیں [illegible]

کہ وہ چین سے ہمدردی رکھتی ہیں اور اس پر رحم کھاتی

بلکہ اس لئے کہ ان کو ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب جنگ چھڑ جائے تو [illegible] کی صورت اختیار کر لے۔ اور اس لئے ان کو فائدہ نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حال میں وہ ظاہراً چین پر حملہ کرنا نہیں چاہتی ہیں لیکن درحقیقت وہ چین کو نیست و نابود کرنے کے لئے ایک ایسی ترکیب کی تلاش میں لگی ہوئی ہیں جس سے آپس میں تصادم اور تنازع کا موقع پیدا نہ ہو...... عسکری قوت سے مطلب توپ مشین گن اور آلات حرب سے کام لینا ہے۔

سیاسی قوت کے دوسری دباؤ کی صورت یہ ہے کہ سیاست داں ایک قلم لے کر ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھتا ہے اور یہ عسکری قوت سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے کہ اگر طاقتور آلات حرب استعمال کریں گے تو ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، اس کو اٹھا کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ لیکن اگر انھوں نے حکمت عملی اختیار کر لی تو صرف چند سیاست داں ایک جگہ بیٹھ کر آپس میں کچھ گفتگو کر کے پھر قلم لے کر ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر اس پر دستخط کر دیں گے۔ پس ایک کاغذ کی اتنی قوت ہے کہ وہ دم کے دم میں چین کو فنا کرنے کے لئے کافی ہے۔ بین الاقوامی سیاسی تعلقات میں چین کی حیثیت نہایت نازک ہے۔

اب معاشی دباؤ کو لیجئے؛ اس سے پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ معاشی دباؤ جو چین پر پڑتا ہے وہ

بھاری ہے اور اس سے کہیں سخت اور بھاری ہے۔ اور ہر سال چین کو غیر ممالک کو ایک سو بیس کروڑ ڈالر ادا کرنا
پڑتے ہیں۔ اور یہ رقم سال بہ سال زیادہ ہوتی جاتی ہے اور یہ زیادتی کبھی ختم ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس
کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم ان حسابات پر نظر ڈالیں جو کہ درآمد و برآمد کے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ مقابلۃً درآمد
ڈالر کے اعتبار سے سالانہ بیس کروڑ زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت برآمد کے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال چین
کو بیس کروڑ ڈالر کا خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ تو دس سال پہلے کی بات ہے۔ جب ہم موجودہ زمانے کے
درآمد و برآمد کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سالانہ پچاس کروڑ ڈالر کا خسارہ ہوتا ہے۔ صرف
دس سال کے اندر رقم خسارہ ۲½ بڑھ گئی۔ الغرض ہر دس کے اندر رقم خسارہ تین گنی زیادہ ہو جاتی ہے۔
اس لحاظ سے اگر اور دس سال گزر جائیں تو رقم خسارہ تین سو کروڑ ڈالر تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر اس رقم کو چار
چالیس کروڑ آبادی پر تقسیم کر دیا جائے تو ہر فرد کے ذمے سات ڈالر اور پچاس سینٹس (50 - 5 ۶)
پڑتا ہے۔ بالفاظ دیگر ہر ایک چینی غیر ممالک کو سات ڈالر اور پچاس سینٹس کا پول ٹکس Poll Tax
ادا کرتا ہے پھر چالیس کروڑ آبادی میں بیس کروڑ عورتیں ہوں گی۔ چینی عورتوں کی حالت کو مدنظر رکھتے
ہوئے یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ پول ٹکس کے ادا کرنے سے قاصر ہیں، اس واسطے مرد جو
ہیں وہی اپنی عورتوں کے پول ٹکس کے ذمہ دار ہیں تب اس کا مطلب یہ ہے کہ بجائے سات ڈالر اور پچاس
سینٹس کے ان کو پندرہ ڈالر پول ٹکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ پھر مردوں میں وہی حال ہے کہ ان میں بعض
ضعیف بڈھے ہیں اور بعض ننھے بچے ہیں، یہ لوگ منافع کے شریک ہیں نہ کہ منافع کے پیدا کرنے
والے۔ اگر ان بیس کروڑ مردوں میں سے دس کروڑ بڈھے اور بچے الگ کر دئے جائیں تو صرف
دس کروڑ ایسے نوجوان مرد باقی رہ جاتے ہیں جو کچھ منافع پیدا کر سکتے ہیں۔ ان دس کروڑ مردوں کو
اپنے ضعیف والدین اور کمزور بچوں کا ٹکس اپنے سر پر لینا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک منافع پیدا
کرنے والے اور کمانے والے نوجوان کو سالانہ تیس ڈالر صرف پول ٹکس کی ادائیگی میں صرف کرنا ہوتا ہے۔
غور کرنے کی بات ہے کہ شاید دنیا میں ایسا کوئی ملک نہیں ہے جس کے ہر ایک باشندے پر اتنا سخت اور
بھاری پول ٹکس عائد کیا گیا ہو۔ صرف اس کے تصور کرنے سے ہمارے ہوش اڑے جاتے ہیں اور وہ

چونکہ فی الحال چین پر تین وبائیں پڑی ہیں اس لئے تمام چینیوں کو چاہئیے کہ وہ ان کی حقیقت سے واقف ہوں ۔ خصوصاً تعلیم یافتہ طبقے کو چاہئیے کہ وہ ان وباؤں کی اصلیت اور حقیقت غافل ودیوش باشندوں کو بتادیں ۔ ان پڑھوں اور جاہل لوگوں کو آگاہ کریں ۔ تاکہ تمام باشندوں کو اس خطرناک نتیجہ کا علم ہو جائے ۔ چین تو ہر گز ہرگز اس دنیا سے کہیں نہ بھاگ سکے گا ۔ ہاں البتہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے تدبیر اختیار کرنا چاہئیے ۔ تب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی مہلک آفت آ جائے تو اس کے فرزندوں کو کیا کرنا چاہئیے ؟ پرانی ضرب المثل ہے کہ جانور کو بھی مجبوری کے وقت میں جہاد کرنا پڑتا ہے ۔ ہم تو انسان ہیں " کیا ہم کو مجبوری کے وقت ہتھیار باندھ کر اپنے دشمن کا مقابلہ نہ کرنا چاہئیے ! اور ان کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ نہ کریں گے ؟ اس فیصلہ کن جنگ کی تیاری کے لئے ہم کو قومیت کی اشاعت کی ضرورت ہے ۔ سب سے پہلے ہم چالیس کروڑ بھائیوں کو بتادیں کہ ان کی موت کا وقت آگیا ہے ۔ " موت کے وقت جانور بھی جہاد کرتا ہے ۔ کیا ہماری قوم کو جس کی زندگی ختم ہونے والی ہے ۔ جہاد کرنے کی ضرورت نہیں ہے ! یہ وقت ایک نہایت اور نازک وخطرناک وقت ہے ۔" لہذا چالیس کروڑ انسانوں میں سے ہر ایک فرد کو اپنی قومیت کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ جب ہماری قوم نے اپنی موت وحیات کی حقیقت کو سمجھ لیا ۔ تو ہمیں اپنی قومیت کو اس کی اصلی اور حقیقی شکل پر لانے کے لئے بہت آسانی ہوگی ۔

۲ ۔ چھوٹی جماعتوں کو ترتیب دیکر کاموں میں لانا

جہاں تک قومیت کا تعلق ہے ۔ چینی قوم کی مثال بالکل ہوا میں اڑتی ہوئی ریت کی طرح ہے یہاں تک کہ ان کو یہ خبر بھی نہیں کہ قومیت کیا چیز ہے ۔ مگر برخلاف اس کے خاندانی اور قبائلی جمعیت نہایت منظم اور مضبوط ہے ۔ اور ان میں خاندانی اور قبائلی پرستش کا خیال نہایت بلند اور پختہ رہا ہے ۔ مثلاً کسی کی کسی سے راستے میں ملاقات ہوئی اور ان میں گفتگو ہوئی ۔ تو اگر یہ معلوم ہوا کہ وہ ایک ہی قبیلہ میں سے ہیں ، تو ان میں غیر معمولی محبت کا اظہار نظر آتا ہے ۔ اور ایک دوسرے کو چچا یا بھائی سے مخاطب کرنے لگتا ہے ۔ ان کے اسی مسعود و محمود نظریہ کو اگر وطنیت تک توسیع دی

دی جائے، تو ہمیں یقین ہے کہ ان کی ملی جمعیت بھی ایسی مضبوط اور قوی ہوگی جیسی ان کی خاندانی اور قبائلی جمعیت ہے۔ جب ہم اپنی مفقود قومیت کو زندہ کرنا چاہتے ہیں، تو ہم ضرور سب سے پہلے ملک کے ان تمام چھوٹی مگر منظم خاندانی اور قبائلی جماعتوں کو جو کہ مضبوط اور زبردست ہیں اکٹھا جمع کرلیں، تاکہ ہم ان کو ترتیب دے کر اور ان کو ملا کر کے ایک قومی جمعیت بنا دیں۔ کیونکہ جب ہم ایک مضبوط اور منظم قومی جمعیت کو قائم کرنا چاہتے ہیں، تو ہم کو ضرورت اس کی ہے کہ اس کے لئے ایک مضبوط بنیاد ہو۔ اور چونکہ چین میں جتنی خاندانی اور قبائلی جماعتیں ہیں ۔۔۔ سب ۔۔۔

مضبوط اور قوی ہیں لہذا ان کو اپنی قومی جمعیت کی بنیاد بنانے کی

کوشش کی جائے۔ تو چین میں قومیت بنانا

اور بہ نسبت غیر ممالک کے زیادہ آسان ہے۔ کیونکہ ہم ۔۔۔

معیار بناتے ہیں۔ اور غیر ممالک میں فردیت قومیت کا معیار ہے ۔۔۔

کے قانون میں والدین، بھائی اور بہن کے حقوق علیحدہ علیحدہ محفوظ کئے گئے ہیں۔ اگر کسی شخص پر کوئی مقدمہ چلایا جائے، تو اس کے خاندانی حالات نہیں پوچھے جاتے ہیں بلکہ مدعی اور مدعی علیہ کی ذاتی غلطی یا صواب کو دریافت کیا جاتا ہے۔ پھر انہوں نے اس فردی نظریہ کو بلند اور وسیع کر کے اپنی قومی نظریہ کی تعمیر کی۔ اس بنا پر ان میں فرد اور قوم کے درمیان کوئی مضبوط ربط نہیں ہے۔ اور ان کی قومیت جو ہے وہ صرف افراد پر منحصر ہے نہ کہ کسی مشترک چیز پر۔ اسی لحاظ سے جہاں تک قوم اور قومیت کا تعلق ہے۔ غیر قوموں نے چینی قوم پر کوئی فوقیت حاصل نہیں کی۔ کیونکہ چین میں فردیت کے علاوہ خاندانیت اور قبیلیت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جب کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ تو اپنے خاندانی یا قبائلی سردار سے مشورہ لینا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ چینی قومیت کی ابتدا خاندانیت سے ہوئی۔ پھر قبیلیت تک پہنچی، اور قبیلیت نے قومیت کی صورت اختیار کی۔ اس قسم کی جمعیت جو کہ درجہ بدرجہ بڑھتی اور وسیع ہوتی گئی ہے۔ اس میں کسی قسم کی بدنظمی اور بدترکیبی واقع نہیں ہوتی ہے چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، ان کے تعلقات نہایت مضبوط ہیں۔

جب ہم اپنی خاندانیت اور قبیلیت کو قومیت کی حد تک پہنچانا چاہتے ہیں، تو اس کی ترکیب یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے تمام لوگوں کو آگاہ کر دیں کہ وہ مظلوم اور کمزور قوم ہیں اور ان کے حالات نہایت خراب اور بدتر ہیں۔ اگر وہ اپنے حالات درست کرنا چاہتے ہیں اور ظالم قوم سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ضرورت اس کی ہے کہ ان میں آپس میں اتحاد پیدا ہو، اور چین میں جتنی خاندانی اور قبائلی جمعیتیں ہیں وہ سب کے سب ملا دی جائیں۔ اور ان کو ایک جمعیت بنا دیا جائے جس کا نام قومی جمعیت ہوگا۔ جب چین ہو قومی جمعیت قائم کریگی، تو ضرور سب ملکے غیر ممالک کا مقابلہ کر سکیں گے۔ یہ گویا ایک فوری ترکیب ہے جس سے ہم غیر ممالک کی کچھ مدافعت کر سکتے ہیں۔ جب ہماری قومی جمعیت ایسی مضبوط اور قوی ہو جائیگی تو اس وقت چاہے غیر طاقت جس قسم کی ناروا ترکیبوں سے ہم کو دبانے کی کوشش کریں، خواہ سیاسی قوت سے، خواہ معاشی قوت سے، اور خواہ کثرت آبادی کے زور سے ہم کو کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس لئے چین کو بچانے کے جو اصلی تدبیر ہے۔ وہ قومی جمعیت اور قومیت ہے۔ چار سو خاندانی اور قبائلی جمعیتوں سے ہم ایک نہایت مضبوط قومی جمعیت تیار کر سکتے ہیں۔ جس سے ہم اپنے ملک کی حفاظت کے فرائض انجام دے سکیں گے۔ جو طاقت ہم کو دبانے آئیگی، ہم ضرور کچھ مدافعت کر سکیں گے۔ غیر ممالک کی مدافعت کرنے کے لئے دوسری ترکیب تدریجی ہے۔ یعنی غیر ممالک سے قطع تعلق۔ تاکہ ان کی شہنشاہیت کا اثر ہمارے اوپر کم ہو جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی قومی حیثیت قائم رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ کم سے کم ہمارا وجود دنیا میں باقی رہ جائے۔"

اس سے پہلے چینی قوم کی حیثیت کیا تھی؟

ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ہماری موجودہ حیثیت ادنیٰ نو آبادی کی سی ہو گئی ہے۔ مگر اس سے پہلے چین ایک زبردست اور مہذب سلطنت تھی۔ اس کی حیثیت بالکل موجودہ برطانیہ، امریکہ، فرانس اور جاپان کی حیثیت سے مشابہ تھی۔ مگر جس چیز نے چین کو ایسی زبردست اور طاقتور سلطنت بنایا تھا وہ کون سی چیز تھی؟ ——— شروع ہی میں قومی قوت بڑھی، اور ساتھ ہی ساتھ تہذیب اور تمدن کا چرچا۔ ان کے علاوہ اخلاقی خوبیاں۔

اخلاقی خوبیاں:

جہاں تک اخلاقی خوبیوں کا تعلق ہے "اب کوئی چینی یہ فراموش نہیں کرسکتا ہے"
کہ وہ کیا تھی؟ وہ سب سے نمایاں خوبیاں جو چینیوں میں پائی جاتی ہیں وہ اطاعت اور فرمانبرداری، رحم
وہ محبت وفا اور وفاداری، پھر امن پسندی اور سلامت روی ہیں۔ ان تمام خوبیوں کی جو کہ چینیوں میں صحیح
ہیں لوگ برابر تعریف کرتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانے میں غیر قوموں کی سیاسی اور معاشی دباؤ سے اور ان
کی تہذیب کے سیلاب سے یہ تمام خوبیاں زیادہ نمایاں نہیں معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں تک بعض وہ
نوجوان جو کہ یورپ کی نئی تہذیب سے مرعوب ہیں وہ بھی ان عمدہ خوبیوں [illegible]
ان کے نزدیک گویا کہ جب نئی تہذیب دستیاب ہو گئی تو پرانی:
مگر ان کو یہ تمیز نہیں کہ وہ مفید ہے یا مضر اور ان کو یہ"
ضرورت ہے ان کو محفوظ رکھنا چاہئے اگر واقعی ہمارے
ضرور ہم اس کو چھوڑنے پر تیار ہیں۔ ہزاروں برس سے امن پسندی اور سلامت روی گویا چینیوں کی فطرت
میں داخل ہو گئی ہے۔ انفرادی معاملہ میں وہ خاکساری اور تواضع کو مقدم سمجھتے ہیں اور جماعتی یا
سیاسی معاملہ میں ان کا یہ مقولہ ہے کہ "جو قتل و غارت پسند نہیں کرتا وہی حکومت کرسکتا ہے" ان کی
یہ خوبیاں غیر قوموں سے بالکل مختلف ہیں یہی وجہ ہے کہ چینی لوگوں کی فرمانبرداری، اطاعت رحم محبت
وفا اور وفاداری اور دیگر قسم کی پرانی تمدنی خوبیاں غیر قوموں سے بالاتر ہیں اور چینیوں کی امن پسندی
اور سلامت روی ان سے کہیں زیادہ ممتاز ہے یہ تمام خاص خاص خوبیاں اور نیک خصلتیں گویا
ہماری قوم کی روح اور جان ہیں جن پر ہماری قوم کی موت و حیات کا دارومدار ہے۔ ہم کو نہ صرف
اپنے لئے ان خوبیوں اور خصلتوں کو محفوظ رکھنا چاہئے بلکہ تمام جابروں اور غازیوں کو یہ بتا دیں کہ
ہمارے پاس یہ چیزیں ہیں جن سے اپنے میں پھر زندگی کی نئی روح پیدا کرسکتے ہیں۔"

قدیم علوم و فنون:

چین کے پاس ایک سلسلہ وار سیاسی فلسفہ کا ذخیرہ ہے۔ جو کہ غیر ممالک کے بڑے بڑے

سیاست دانوں کی نگاہوں سے نہیں گزرا ہے اور نہ کبھی کسی سیاست داں نے اسے صاف اور واضح طور سے بیان کیا ہے جس طرح ہمارے آباء اجداد نے تشریح کی۔ ٹاہیو میں The Grand Learning. تحقیق فطرت اشیا، تمیز حق و باطل، تخلیص نیت[1]، صدق قلب تزکیہ نفس، تنظیم بیت، "انتظام امور حکومت" اور "امن عالم" کے متعلق جو فقرے ہیں وہ ہمارے فلسفہ وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔ ڈکانوش کا یہ خیال ہے کہ اس وقت امن قائم ہو سکتا ہے۔ جب حکومتوں کا معقول اور اچھا انتظام ہو۔ مگر حکومتوں کا انتظام اس وقت تک معقول اور اچھی طرح سے نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک دنیا میں ایک ایسا گھر بھی باقی رہ گیا ہو جس میں بدنظمی اور بے ترتیبی واقع ہوئی ہو۔ کسی گھر کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک گھر کے افراد خود تزکیہ نفس نہ اختیار کریں۔ تزکیہ نفس بیکار ہے۔ جب تک صدق قلب نہ ہو۔ اور صدق قلب ہو ہی نہیں سکتا جب تک خلوص کی نیت نہ باندھی جائے۔ نیت کا خلوص حق و باطل کے پہچاننے سے ہوتا ہے۔ اور حق و باطل کو پہچاننے کے لئے فطرت اشیا کی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب چیزیں اگرچہ اخلاق کے حدود میں ہیں۔ مگر ان کو علوم و فنون میں شامل کرنا بھی مناسب ہے ہمارے آباء اجداد ان اخلاقی خوبیوں سے اپنے زمانے میں بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں۔ مگر افسوس قومی سوچ مفقود ہونے کی وجہ سے علمی روح بھی غائب ہو گئی۔ تخلیص نیت اور صدق قلب تو انسان کے اندرونی علوم ہیں۔ اس کے متعلق ہم تفصیل نہیں بتا سکتے کیونکہ ہم ان سے ناواقف ہیں۔ ہاں۔ اس سے پہلے ہمارے پیش رو ان کے متعلق بہت سے کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنے سے شاید ہم کو یہ معلوم ہو گا کہ کہاں تک ہمارے آباء اجداد نے ان مسائل پر غور کیا ہے۔ جہاں تک تزکیہ نفس، تنظیم بیت اور انتظام امور حکومت کا تعلق ہے، ہم اپنے آباء اجداد سے کہیں زیادہ پیچھے ہیں اور زمانے میں ہم کو لیاقت حاصل نہیں ہے جس سے ہم اس درجہ

[1] نیت کو خالص کرنا۔ چونکہ نیت خلوص کا مفہوم اردو میں ادا ہوتا ہے اس لئے یہاں مجبوراً تخلیص کا لفظ جو اس کا پورا مفہوم اظہار کرتا ہے استعمال کرنا پڑتا ہے۔

پر پہنچ سکیں جس درجہ پر ہمارے اسلاف پہنچے تھے .... ہم تو اپنے ملک میں بھی حکومت نہیں کر سکتے .... اگر ہم یہ لیاقت پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہم تنظیم ہیئت کے قابل ہوں اور اگر ہم غیر ممالک کے فہم کے دباؤ سے بچنا چاہتے ہیں، تو ضروری ہے کہ ہم تزکیۂ نفس سے شروع کریں۔ اور چین میں جتنی علمی ذخیرہ ہیں ان کا مطالعہ کریں اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان کے اسباب و علل پر براہین قائم کریں تاکہ ہم کو ایک ایسا راستہ مل جائے جس سے ہم اپنی قومیت کی مدت کو پھر زندہ کر سکیں۔"

پرانی قوت اختراع!

ہمارے پاس پرانے علوم و فنون کے علاوہ قوت ...
چین کی قوت فکری اور ذہانت ہرگز غیر ممالک کا مقابلہ نہیں کر ...
کی کیفیت کیا تھی اور اس کی قوت فکری کیسی تھی کیا ہمارے نوجوان اس سے بے خبر ہیں؟ اس زمانہ میں اہل چین کی ذہانت اور قوت فکری غیر ممالک سے کہیں زیادہ ممتاز اور بلند تھی۔ آج کل غیر ممالک میں جو سب سے زیادہ تعجب انگیز چیزوں کا ظہور ہو رہا ہے، ان میں اکثر چین کی پرانی ایجادیں ہیں مثلاً قطب نما .... قطب نما گو بظاہر ایک چھوٹی سی چیز ہے۔ مگر اس مادی ترقی اور تجارتی وسعت کے زمانے میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے بے نیازی نہیں برتی جا سکتی اور اس کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔ بغیر اس کے جہاز نہیں چلا سکتے۔ بغیر اس کے ہوائی جہاز نہیں اڑا سکتے، اور بغیر اس کے کسی انکشافی مہم پر نہیں جا سکتے۔ جب اس چھوٹی سی چیز کی حقیقت اور تاریخ کا پتہ لگانا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چین کی ایجاد ہے۔ اگر اہل چین کے دماغوں میں قوت فکری نہیں تھی، تو ہرگز ایسی چیز ایجاد نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ چیز جو کہ بنی نوع انسان کے لئے زیادہ اہم اور ضروری ہے وہ فن طباعت ہے۔ آج کل یورپ کے بنائے ہوئے ٹائپ جس سے گھنٹہ بھر میں سینکڑوں اخبارات نکالتے ہیں۔ اگر ان کی اصلیت دریافت کی جائے، تو تحقیقات سے یہ معلوم ہوگا۔ کہ یہ بھی چین کی ایجاد ہے۔ موجودہ زمانے میں گھر کی آرائش اور زیبائش کے لئے

دوسری جس چیز کی ضرورت پیش آتی ہے وہ چینی ظروف اور سفال ہیں آج کل دنیا میں کوئی ایسا گھر نہیں ہے جہاں ان کی ضرورت نہ ہو۔ اور جب سے کہ گھر اصلی اور نفیس چینی ظروف سے بھرے ہوتے ہیں اس کو فیشن ایبل اور جنٹلمین سمجھا جاتا ہے۔ چینی ظروف دراصل مہذب اور متمدن لوگوں کی آرائش کے سامان ہیں۔ اور یہ چیزیں چین کی صنعت وحرفت میں خاص حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وقت غیر ممالک ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر وہ خصوصیت نہیں پیدا کر سکتے جو کہ چینی ظروف میں پائی جاتی ہے۔ جدید آلات حرب میں سے جو بارود ہے وہ دراصل چین کی ایجاد ہے۔ اس لئے کہ ہزار سال سے پہلے چین میں ایک قسم کا دھواں دار بارود بنایا جاتا تھا اور اس دھواں دار بارود سے آہستہ آہستہ بے دھواں دار بارود ایجاد ہو گیا۔ غرض کہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو کہ چین کی ایجاد نہ ہو۔ اور اب دنیا اس کو استعمال نہ کرتی ہو۔ غیر قوموں نے جو ترقی حاصل کی، ان کی خوشہ چینی کر کے کی ہے۔ جہاں تک رہنے سہنے ترتیبائش اور آرائش کا تعلق ہے۔ ان چیزوں میں سے جن کا انسان محتاج ہے۔ اکثر چین کی ایجاد ہیں پینے کی چیز جیسے چین کی چائے دنیا میں مشہور ہے۔ اور آج کل سارا عالم کثرت سے استعمال کرتا ہے۔ مہذب لوگ شراب کے بجائے استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ بدمستی اور بے ہوشی سے بچے رہیں پوشش کے لئے جو چیز سب سے زیادہ خوشنما جاذب نظر قیمتی ہلکی اور نرم سمجھی جاتی ہے۔ وہ ریشم ہے دنیا میں ریشم پہننے والے دن بدن زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اگرچہ لوگ اس کو کثرت سے پہنتے ہیں اور دیکھتے ہیں پھر بھی کسی نے اس سے نفرت یا ناپسندیدگی ظاہر نہیں کی۔ ریشم کے کیڑے سے جو ریشم حاصل کرنے کی ترکیب ہے چین ہی نے سب سے پہلے دنیا کو بتلائی۔ اور یہ دو ہزار برس پہلے کی ایجاد ہے، یورپین مکانات کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا فن تعمیری درجہ کمال پر پہنچ چکا ہے۔ مگر آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس فن تعمیر کا اصول اور اہم ترکیبیں سب کے سب چین کے فن تعمیر سے اخذ کی گئی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ بلکہ اہل یورپ اسی پر ناز کرتے ہیں جب انھوں نے کسی

مسلم مورخین نے بارود کو مسلمانوں کی ایجاد لکھا ہے، مگر یہ ممکن ہے کہ اہل چین نے بھی اس کو مسلمانوں سے اخذ کیا ہو۔ یا ایجاد کیا ہو۔ مسلم

بھوسنے سے دریا پر ایک معلق پل بنوایا یا کسی پہاڑ میں سوراخ کیا تو وہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کیا کیا
عجیب اور غریب چیزیں بنائیں۔ مگر جب بعض مغربی سیاح (Szechuen)
اور تبت کے سرحد پر پہنچتے ہیں اور وہاں کے وہ معلق پل جو کہ دو چوٹے پہاڑوں کے درمیان یا
سمندروں کا پلکا دیں دیکھائی دیتے ہیں تو انکو دو دفعہ قرار کرنا پڑتا ہے کہ پل بنانا پورپین
دانوں کا تیجہ نہیں ہے۔ بلکہ چینی ذہانت کی یادگار ہے۔ ان مذکورہ بالا واقعات سے ہم کو
معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہمارے آباؤاجداد کی ذہانت اور قوت فکری کیا تھی اور کس طریقے سے انھوں نے اپنے
ملک کو ترقی یافتہ اور مہذب بنایا تھا ؟ اگر ہم اپنے آباؤاجداد کے عالت پر راجعت کرنا چاہتے ہیں
اور ان کی اصلی ذہانت اور قوت فکری کو دوبارہ زندہ کرنا
ہیں کہ اس کے لئے کوشش کریں۔ جب ہم اپنی پرانی خوبیو
علوم و فنون زندہ کریں گے، جب ہم اپنی اصلی صنعت
اپنی ذہانت اور قوت فکری سے کام لیں گے، تب ہم کو اپنی اصلی
جس سے ہم دنیا میں دوبارہ اپنے جوہر دکھلائیں گے۔ اور لوگ ہمارے سامنے تسلیم
خم کریں گے۔

قومی روح زندہ کرنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟

۱۔ یورپ اور یورپ کی خوبیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرنا .... جب
ہم اپنی قومی روح۔ قومی خصوصیات، قومی خوبیاں، قومی جذبات اور قومی امتیازات دوبارہ حاصل
کرلیں گے۔ تو ہم کو چاہیئے کہ یورپ اور امریکہ کی خوبیوں کو حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہم ہر
حیثیت سے ان کے مدمقابل ہو سکیں۔ ورنہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ بعض لوگ کہتے ہیں ان کی۔
خوبیوں اور امتیازات کو حاصل کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے۔ کیا واقعۃً یہ کوئی مشکل ہے ؟
ہماری قوم اکثر یہ خیال کرتی ہے کہ یورپ کی مشینری کا سیکھنا بہت دشوار ہے۔ مگر ان کو یہ خبر نہیں
کہ یورپ کے نزدیک جو سب سے زیادہ مشکل اور دشوار کام ہے۔ وہ آسمان کی طرف اڑنا ہے

ہوا اور فضاؤں میں ہم بہت سی چیزیں اڑتی ہوئی نظر آتی ہیں وہ ہوائی جہاز ہیں ۔ اور وہ آسمان کی طرف اڑ جاتی ہیں۔ کیا ان میں کوئی چینی پرواز نہیں ہے؟ پرواز تو یہیں کے ایک خاص خاصیت ہے۔ جب ان کی پرواز ہم سیکھ سکتے ہیں۔۔۔ اور دشواری نہیں معلوم ہوتی ہے۔ تب کون سی چیز ہے۔ جس کے سیکھنے میں ہم کو دشواری معلوم ہوتی ہے۔ ہمارا مادہ اچھا ہے۔ تہذیب کی بنیاد اچھی ہے۔ قوت فکری اور ذہانت ہم میں موجود ہے۔ تب کون سا کام ہے جس کو ہم نہیں سیکھ سکتے؟ ہزاروں برس پہلے فطرت نے ہمارے اندر ترقی کا مادہ ودیعت کیا تھا اور اور جذب کرنے کی قوت ہم کو بخشی تھی۔ جس سے ہم ہر قسم کی خوبیاں اور امتیازات اپنی طرف کھینچ لے سکتے ہیں اور جذب کر سکتے ہیں۔ غیر ممالک سے سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنا۔ اور ہرگز ہرگز ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹنا۔ اگر ہم سائنس میں مہارت پیدا کرنا چاہتے ہیں، تو جتنی چیزیں جو سائنس کے اصول سے ان کے ملکوں میں تیار کی جاتی ہیں، ان کو ہم بھی اسی اصول پر اپنے ملک میں تیار کرنے کی کوشش کریں۔۔۔ اس طریقے سے اگر ہم اس پر مستقل طور سے عمل کرتے رہے، تو کم از کم دو سو سال کا وقت بچ جائے گا۔ .... اس سے پہلے اگرچہ کئی سو سال تک ہم تنزل اور کمزوری کے عالم میں رہے۔ مگر اب امید ہے کہ چند ہی سال کے اندر ہم تمام طاقتوروں کے ہمسر بن جائیں گے۔

۲۔۔ تمام عالم کے لئے ایک اہم فرض اپنے سر پر لینا .... چین کا پرانا مقولہ ہے۔ "ضعیفوں کی اعانت اور امداد کرنا" یہی وجہ ہے کہ چین نے اپنی ترقی اور عروج کے زمانے میں، ہند چینی، برما، کوریہ اور سیام کی جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، ان کو کم سے کم استقلال اور خود مختاری دے رکھی تھی۔۔ موجودہ زمانے میں جب یورپ کی شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا سیلاب مشرق کی سرزمین پر پہنچا تو ہند چینی فرانس کا شکار، برما برطانیہ کا لقمہ اور کوریہ جاپان کی خوراک بن گیا۔۔۔ اس واسطے جب ہم اپنی

فوقیت کو دوبارہ زندہ لیں گے، تو ہم کو نہ صرف غیروں کی خوبیوں کو سیکھنی پڑیں گی، بلکہ تمام عالم کے لئے ایک اہم ذمہ داری اور فرض اپنے سر لینا پڑے گا۔ دنیا میں کون سا ایسا فرض ہے جس کو چین اپنے سر پر لینے کو آمادہ نہیں ہے؟ آج کل یورپ کے لوگوں نے جو راستہ اختیار کر رکھا ہے وہ جور، تعدی، جبر اور تشدد کے سوا اور کچھ نہیں ہے: غیروں کے وطن، مال اور جان کو پامال اور برباد کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لہذا جب چین قوت حاصل کریگی۔ اور عروج کی مالک ہو گی۔ تو وہ بجائے غیر قوموں پر جور، تعدی، جبر، تشدد کرنے کے اور بجائے غیر قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے
ان کی اعانت و امداد کریگی، وہ یورپ کی شہنشاہیت ا
بلکہ وہ ایک ایسا راستہ اختیار کریگی۔ جو کہ اپنے لئے
اس کے لئے ضروری ہے کہ چین قبل از وقت ایک
جیسی انسانیت سوز عمل سے بچی رہے، اور یہ تدبیر سوا اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ جب اس کو قوت آجائے۔ تو وہ حتی الامکان اپنی قومی جوہر سے، اپنی قومی جبلت سے اپنی قومی امتیازات سے، اپنی قومی فطرت سے، اپنی قومی خصوصیات سے اور اپنی قومی خوبیوں سے ان چھوٹی چھوٹی ضعیف قوموں کی مدد کرے۔ جو کہ ظالم اور جابر اقوام کے پنجۂ ہوس میں اسیر ہیں۔ ان کے ساتھ باہمی متحد ہو کر، طاقتوروں کا مقابلہ کریں۔ اور ان کو دنیا سے مٹا دیں۔
جب یقین ہو جائے کہ ہماری اعانت و امداد سے چھوٹی اور ضعیف قوموں کو نجات مل سکتی ہے تو ضرور ہم اس نیک اور خالص نیت پر قائم رہیں گے۔ اور ان کی اعانت و امداد کی کوشش کریں گے۔ اس لئے کہ جب ہم خود غیر طاقتوں کے پنجے میں ان کے سیاسی دباؤ اور معاشی دباؤ کے نیچے تکالیف و آلام محسوس کرتے ہیں تو اُس زمانے میں جبکہ ہم کو دنیا میں فوقیت حاصل ہو گی، تو اس وقت ہم بھی ان چھوٹی اور ضعیف قوموں کی تکالیف اور آلام کو محسوس کرتے ہوں گے جو کہ غیروں کے قبضے میں ہیں، اس احساس کی یاد دلانے سے ہم

بھی پھر رہوں گے کہ ان کی مدد کریں اور شہنشاہیت اور سرمایہ داری کو دنیا سے مٹا دیں گا
جب ہم کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اب دنیا میں کوئی ظالم اور جابر نہ رہا، تو ہم سب قوموں کے
ساتھ امن و امان کا گیت گائیں گے اور جنت کی زندگی بسر کریں گے ، اگر ہم نے فرض
کا حق ادا کر دیا، تو ضرور ہم کو یہ کہلانے کا استحقاق ہو گا کہ درحقیقت چینی قوم امن پسند اور سلامت
رو قوم ہے ـــــ اور بلاشبہ چینی قوم حکومت کی چلانے والی ہے ـــ اس فرض کو انجام
دینے کے لئے سب سے پہلے ہم کو چاہئے کہ اپنی قومیت کو زندہ کر دیں ، اور اپنی قومی
حیثیت کو دنیا میں قائم رکھیں ، اور اپنی خاص قومی خوبیوں سے امن پسندی اور سلامت
روی ، تمام عالم کو فتح کر لیں ، اور سب قوموں کو ایک عالمگیر حکومت کے ماتحت منسلک
کر دیں ، تاکہ ہم اپنے اس اہم اور انسانی فرض کو بخیر و خوبی انجام دے سکیں ،، اور یہ
ہی وجہ ہے ہم کو قومیت کی ضرورت ہے ـــ

(باقی آیندہ)

ہموطن

ایک فنکیل سپاہی جس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے اور کھڑے ہوئے تھے، اپنے مریض رفیقوں سے کہہ رہا تھا، عورتیں مجھ پر مرتی ہیں۔

وہ جھونپڑی کے بیچ میں کھڑا تھا، اُس کے قریب تین اور مریض تھے۔ وہ چوڑے تختوں پر لیٹے تھے جن پر سڑا ہوا سوکھا پھوس بچھا تھا۔ ان میں سے دو یونہی بے پروائی سے چھت کی جانب تک رہے تھے۔ تیسرا عورت کی طرح گدڑی میں لپٹا ہوا ایک کونے میں لیٹا تھا۔

کڑاکے کا جاڑا تھا۔ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔۔

صنوبر کے درخت تھے جن کی شکلیں پنسل سے ملتی تھیں۔ آتش

میں سے دھوئیں کے بھبکے نکل رہے تھے کوؤں کے ترچھی شکل کے دل [illegible]

تھیں جن پر با ہر سرخ چوپارہ نشان بنے ہوئے تھے اور اندر صنوبر کے داغ دار شہتیروں کے گٹھے تھے۔

بیمار سپاہی بے کاری اور وحشت سے زچ آگئے تھے۔ اُن کا توپ کا رسالہ میدان جنگ میں تھا، مگر انہیں واپس جانے کی جلدی نہیں تھی۔ وہاں اُن کا فرض تھا کہ حکم بجا لائیں، خندقیں کھودیں، علاوہ ازیں دشمن کی گولیوں کا ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا۔ ایک سپاہی کو گٹھیا تھی۔ دوسرا ٹانگوں کی پھنسیوں کا علاج کرا رہا تھا۔ گدڑی والے سپاہی کو کچھ دنوں سے میعادی بخار آنے لگا تھا۔ کھڑے بالوں والے سپاہی کو ایک سفلہ بیماری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا، عورتیں مجھ پر جان دیتی ہیں۔ سمجھتے ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ خدا کی قسم، یہ واقعہ ہے! کیوں مرتی ہیں، اس کا بھید شیطان ہی کو معلوم ہے۔ مجھے عورتوں کو پرچانے کا ڈھب آتا ہے۔ اصل گر یہ ہے کہ عورت پر کبھی دست درازی نہ کرو۔ اُن سے کام نکالنے کا ڈھب آنا چاہیئے، یہی اصل چیز ہے۔ سب عورتیں دست درازی کی قدر نہیں کرتیں۔ کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں،

اس کے خلاف میں کچھ نہیں کہتا۔ مگر یہ ترکیب ہمیشہ نہیں چلتی۔ اچھی عورت کے ساتھ شریف بننا پڑتا ہے، اس کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے، یہ نکتہ سمجھ لینا چاہئے یہی اصل چیز ہے۔ میں ایک دفعہ کپتان ورتن صاحب کے ہاں باقاعدہ ملازم تھا۔ کپتان ورتن بہت زوردار آدمی تھے۔ اُن کے ہاں ایک جوان عورت بھی گھر کا کام کاج کرنے پر نوکر تھی، نک سک سے درست پاک صاف عورت تھی۔ اچھی خاصی شریف زادی معلوم ہوتی تھی۔ سبھاؤ کی بُری نہیں تھی۔ پہلے میرے دل میں آیا کہ شہدپن سے کام نکالو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ پھر میں نے دوسری چال چلی۔ وہ کہتی ہاں میں بھی کہتا ہاں، وہ کہتی نہیں میں بھی کہتا نہیں، اس کے ساتھ کبھی یہاں گیا، کبھی وہاں۔ تھیٹر لے گیا، چاکلیٹ خرید دئے۔ جو میں چاہتا تھا وہ ہوگیا۔ اس نے آنا جانا شروع کیا مگر اس کا وقت نکل چکا تھا روز رات کو اُس سے ملنے پہنچتا . . . پھر اس سے طبیعت بھر گئی۔ یہ واقعہ ہے کہ عورتیں مجھ پر مرتی ہیں۔ سب یہی کہتے ہیں۔

چھوٹا ڈاکٹر تھرما میٹر لئے کمرے میں داخل ہوا۔

کیوں میاں دیہاتی، پھر عورتوں کی چاہت کے من گھڑت قصے سنا رہے ہو؟ خوب پیٹ بھر کر جھوٹ بولو! صاف ظاہر ہے عورتیں تم پر کس طرح مرتی ہیں۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے آنکھ ماری۔

انھوں نے تمھیں خوب صلہ دیا۔

سابق اردلی نے بناوٹی بے پروائی سے کہا، ان عورتوں پر تین بار لعنت! انہی کی وجہ سے شاید میری زندگی تباہ ہو جائے!

ڈاکٹر نے گدڑی والے کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

میاں دیہاتی سوتے ہو؟ ذرا ہوشیار ہو جاؤ۔ ٹمپریچر لینا ہے کس طرح تھرتھر کانپ رہے ہو! مجھے ڈر ہے کم از کم چالیس درجے حرارت نکلے گی۔

بیمار نے دھیمی آواز سے کہا، کچھ پیوں گا . . .

یہ لو، تھرما میٹر بغل کے نیچے دبالو۔

مریض نے حکم کے بموجب تھرمامیٹر لے لیا اور چپ ہو گیا۔ اُس کا بدن بھنکا جاتا تھا اور کسی پہلو کل نہیں پڑتی تھی۔

جھونپڑی میں اندھیرا ہو گیا۔ ڈاکٹر چلا گیا اور ایک پیالہ دربغیر پینی کا ایک چھوٹا ٹین کا لیمپ لے کر واپس آیا۔ لیمپ میں سے سرخی مائل دھوئیں دار لو نکلتی تھی۔ ڈاکٹر نے اُسے آتش دان پر رکھدیا۔ کھڑکیاں فوراً نیلی معلوم ہونے لگیں۔ کمرا روشن ہو گیا۔ مگر ساتھ ہی بھرا بھرا اور غلیظ نظر آنے لگا۔

ڈاکٹر نے پوچھا بہت تکلیف ہے؟

جی ہاں۔

تمہاری کیفیت بڑے ڈاکٹر صاحب سے بیان کر دوں گا۔

آدھ گھنٹے کے اندر سب کی آنکھیں لیمپ کی لو پر لگی تھیں

وہی دہشت چھا گئی۔ جس سپاہی کو گٹھیا تھی وہ کھجانے لگا۔ کہنے

شیطان انھیں غارت کرے! کمبخت پھر کاٹ رہے ہیں۔ ابھی سے۔

نہیں۔ کوئی جھونپڑی ان سے خالی نہیں ہے۔

وہ بے چین ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھ بیٹھا، جیب سے ایک چکنی چھوٹی ڈبیا نکالی اور ایک دیا سلائی جلا کر شعلے کو دیوار کے سہارے لے گیا۔

پھنسیوں والے سپاہی نے پوچھا۔ انھیں پھر جلا رہے ہو؟

ہاں موذیوں کو پھونکتا ہوں۔ زندگی حرام کر دی ہے

ذرا خیال رکھنا کہیں جھونپڑی میں آگ نہ لگا دو۔

گھبراؤ نہیں!

دیر تک سکوت رہا

اردلی نے پھر کہنا شروع کیا، سارا قصہ یہی ہے۔ عورتیں مجھ پر مرتی ہیں۔ کیوں مرتی ہیں یہ میں خود نہیں جانتا۔ ایک میں بھی اتنا حوصلہ نہیں نکلا کہ میرا مقابلہ کرتی۔ قسم کھا کے کہتا ہوں ابھی پچھلے سال کا

میں رخصت پر تھا۔ عورتوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ سپاہیوں کی بیویاں ان کی نسبت تم نہیں ہوں گے!

جو آدمی کیڑے پتنگوں کو چبا رہا تھا۔ وہ کہنے لگا، سپاہیوں کی بیویوں کی بات تم ہی کہتے ہو کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا! لیکن سب جانتے ہیں، خاوند گھروں پر نہیں ہوتے نا۔

چنبیلی والے آدمی نے غصے میں آکر کہا، ڈر کس بات کا ہے؟ میاں دور دراز خندقوں میں ہے مرد کے بغیر گزارہ مشکل ہے! ہماری زندگی کیا ہے قید با مشقت ہے۔ مجھے کہیں پتہ چل گیا کہ میری چہیتی بیوی میرے ساتھ چھل بل کر رہی ہے تو اسے ہلاک کر دوں گا، خدا کی قسم، جان سے مار ڈالوں گا!

اردلی بولا، ٹھیک کہتے ہو، مگر تم سے یہ ہو گا نہیں! ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ رخصت پر وہاں پہنچا سب لوگ ٹوپیاں اتار اتار کر سلام کر رہے ہیں۔ خوب گلچھرے اڑائے! عورتوں کے مارے رستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ مگر ایسی عورتیں مجھے نہیں چاہئیں۔ میں چاہتا ہوں کہ عورت جوان ہو اور بنی ٹھنی ہو۔ جس گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں کونے سے تیسری جھونپڑی میں ایک عورت رہتی تھی، اچھی قسم کی، کسی سپاہی کی بیوی اسے داشتہ کہتے تھے۔ معقول قسم کی عورت ادھیڑ! میں [illegible] ہو گیا۔ پہلے پہل دال نہیں گلی۔ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ میری ایک نہیں سنتی۔ دست درازی کی۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔ شرافت کا کھیل کھیلا۔ اس سے بھی بات نہ بنی۔ میں نے اپنے دل میں سوچا، یہ آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں۔ سارا توپچی پنا دھرا رہ گیا! کبھی یہ داؤں چلا، کبھی وہ جتن کیا۔ ذرا نہیں پسیجی۔ روز اس کے ساتھ ٹہلنے جاتا ہوں، مگر وہ ہے کہ پسیجنے کا نام نہیں لیتی۔ اس سے کہتا ہوں: آج رات کو تمہارے پاس آؤں گا۔ وہاں منہ پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ کیا مجال جو ذرا مسکرا دے۔ میں دیکھتا ہوں لوگ مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ مگر نہیں! سوچنے کی بات ہے، ایک دن خود اپنی مرضی سے میرے پاس پہنچی، کہنے لگی، اب خاوند کے بغیر نہیں رہا جاتا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ میاں کی شکل دیکھے دو سال ہو گئے۔ میں نے نرمی سے پیار کیا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا وغیرہ وغیرہ۔ چھٹیوں بھر میرے ساتھ بیوی کی طرح رہی، شام کو اس سے ملنے جاتا ہوں وہ میرے جوتے اتارتی ہے اور اس کے سارے بدن میں کپکپی چھوٹ جاتی ہے، خوب مزے لوٹے! پر پچھا میں

کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ ایسی خاموش طبیعت کی تھی کہ میں کیا کہوں۔ خوب عورت تھی۔ بڑی بات یہ کہ اگر کوئی اس کے قریب پہنچتا تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ مگر میرے سامنے ہتھیار ڈال دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ عورتیں مجھ پر مرتی ہیں۔

پھنسیوں والے سپاہی نے مشکوک ہو کر پوچھا کس صوبے کے باشندے ہو؟،

غرض، ضلع انانی الفیسکی کا۔ ہم تم اتفاق سے ہم وطن تو نہیں ہیں؟ ، نہیں میں تو دیحیک کا ہوں؛

اچھا۔ خوب عورت تھی داشا بھی۔ بس ملائی دار چائے۔ اس کا خیال کر کے۔ ۔

کافی دیر تک خاموشی رہی۔

گدڑی والے آدمی نے نحیف آواز سے پوچھا کس گاؤں کا؟

سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اندھیرے کونے

نکولائفکا، ضلع انانی الفیسکی کا۔ تم بھی وہیں کے ہو؛

گدڑی والے نے کہا ہاں ہم تم ایک ہی دیس کے ہیں۔ میں بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اردلی نے شگفتہ ہو کر کہا، تو تم چاپاہی کی بیوی داشا کو جانتے ہو گے؟

نحیف آواز والے نے جواب دیا، جانتا ہوں۔ وہ میری ہی بیوی ہے۔ میری تو گویا ہم تم ہم وطن ہیں۔

اتنا سنا تھا کہ آٹھ میل پرے میدان جنگ سے توپ کے دھماکے کی دھیمی آواز صاف سنائی دی

پھنسیوں والا سپاہی کھانسا:

گدڑی والے نے کہا، کچھ پینے کو مل جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وہ پھر جلد ہی گیا سردی چڑھ رہی تھی اور بے کل تھا۔ اس کا جی چاہا کہ نہ کچھ دیکھوں نہ سنوں، نہ حرارت محسوس کروں جس نے آنکھوں اور کنپٹیوں میں آگ لگا رکھی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا کہ نہ لڑائی ہے نہ جھونپڑی، نہ کھڑے بالوں والا سپاہی۔ عالم خیال میں وہ اپنی جھونپڑی میں پہنچ گیا، اور یہ سب کچھ ایک بھیانک خواب تھا۔ (کیتا الیف)

تنقید و تبصرہ

انتخاب مثنویاتِ میر۔ یہ کتاب سلسلۂ کلام اساتذۂ اردو کی تیسری کڑی ہے جس کو آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان نائٹ ایم اے، ایل ایل۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا، فی الحال ہیڈ جج ہائیکورٹ الہ آباد نے مع تمہید و مقدمہ ترتیب دے کر چھپوایا ہے۔ سرورق طرزِ کہن کی یاد تازہ کرتا ہے اگرچہ اُس کی بیل دلکش ہے۔ شروع میں فہرست تصحیح اغلاط درج ہے جو تین صفحوں پر ختم ہوتی ہے۔ اس کے بعد تمہید ہے چار صفحے پُر کئے گئے ہیں اور مقدمہ صفحہ ۹ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۶ پر ختم ہوا ہے۔ بعد ازاں انتخاب مثنویات کی بسم اللہ ہو جاتی ہے جس کی تمت بالخیر ۳۲ صفحوں پر ہوتی ہے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ کاغذ سفید معمولی اور قیمت ۱۲ ہے۔ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی ہے اور غالباً وہیں سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں سب سے بڑی کمی اس بات کی ہے کہ لائق مرتب نے اپنے مقدمہ میں مثنویاتِ میر کے متعلق کچھ تحریر نہیں کیا۔ میر کے حالات زندگی کو تو خوب پھیلا کر لکھا ہے اور اُن کی عام شاعری سے بھی خوب بحث کی ہے لیکن مثنویات جن کا انتخاب علحدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے اس قابل نہیں سمجھی گئیں کہ فاضل مرتب اُن کی خوبیاں اور خصوصیات شرح و بسط کے ساتھ بیان فرماتے۔ ضمناً ایک جگہ آپ نے مولانا حالی کا قول اور پرفیسر آزاد کی رائے نقل کی ہے اور دوسری جگہ سید علی حیدر طباطبائی کی رائے درج کی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ چھ سات سطروں میں آگیا ہے اور آپ نے اپنی رائے قطعی رائے ظاہر نہیں کی۔ تمہید میں بھی جو سبب انتخاب لکھا ہے وہ صرف اُن وجوہ تک محدود رکھا ہے جو میر کی خود مثنویات میں انتخاب کی محرک ہوئیں۔ یہ کچھ نہیں لکھا کہ خود میر کی مثنویات کا انتخاب کیوں علحدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا؟ اگر شاہ صاحب بالقابہ کے نزدیک سرورق پر سلسلۂ کلام اساتذہ لکھ دینا اس سوال کا جواب ہے یا میر کی شخصیت کے سامنے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا تو ہم یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ میر کی زبان اور

انداز بیان دونوں زمانہ حال کے مطابق نہیں۔ لہٰذا اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ فاضل مرتب تفصیل کے ساتھ میر کی مثنویات یا اُن کا انتخاب شائع کرنے کی ضرورت تحریر فرماتے تاکہ میر کی کلیات سے مثنویات کی علٰحدگی مفید و کارآمد قرار دی جاسکتی۔ محض اس واقعہ سے کہ مولوی عبدالحق نے انتخاب کلام میر چھاپا ہے، آپ مثنویات کا انتخاب چھاپ دیں اس امر کی توجیہ نہیں ہوتی۔

ہمارے نزدیک مقدمہ میں حسب ذیل امور پر روشنی ڈالنی چاہئے تھی خواہ میر صاحب کے حالات زندگی کو دو تین صفحات سے زائد جگہ نہ ملتی کیونکہ لائق مرتب نے ان کے باپ کے نام اور سال پیدائش کے سوا دیگر تذکرہ نویسوں سے کسی امر میں اختلاف نہیں کیا جس کے ...

(۱) اردو میں مثنوی کا رواج کب ہوا؟

(۲) میر سے پہلے کن شعرا نے مثنویاں لکھیں

تھے (ولی نے بھی کئی مثنوی لکھی ہیں اور ولی سے پیشتر دکنی

(۳) مثنویات میر کی کیا خصوصیات ہیں اور میر نے مثنوی میں ... کیا نئی طرز اختیار کی اور خود مثنوی میں کیا اصلاح یا کیا اضافہ کیا؟

(۴) میر اور اس کے ہمعصر شعرا کی مثنویات کا موازنہ (اگرچہ بقول مولانا حالی، اثر کی مثنوی خواب و خیال، میر کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ تاہم اسی زمانے کی ہونے کی باعث مقابلۃً پیش کی جاسکتی ہے۔

(۵) میر کے بعد کس کس شاعر نے عہد حاضر تک مثنویاں لکھی ہیں اور وہ کس پایہ کی ہیں؟ اور میر کی مثنویات فی زمانا کیوں قابل قدر ہیں؟

ہمیں امید ہے کہ لائق مرتب طبع ثانی کے وقت میر کے حالات زندگی کو مختصر کر دیں گے اور غیر ضروری امور پر بحث کرنے کی بجائے متذکرۂ بالا مسائل پر داد تحقیق دیں گے۔

ان نقائص کے باوجود جو ہم نے اوپر بیان کئے ہیں ہم نہایت خوشی کے ساتھ شاہ صاحب کی محنت و جگر کاوی کی داد دینا چاہتے ہیں سچ یہ ہے کہ آپ جیسے عدیم الفرصت شخص سے ایسی

کتاب کا مرتب ہونا جیسی کہ مثنویات میر ہے بساغنیمت ہے۔ آپ نے نہایت غور و تلاش کے بعد اُن مشکل اور غریب الفاظ کے معانی تحریر فرمائے ہیں جو مثنویات میر میں آگئے ہیں اور جن کے معانی معلوم نہ ہونے سے لطف نظم مفقود ہو جاتا۔ یہ بڑی محنت کا کام تھا جس کو آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ ہم کو بعید مسرت ہے کہ آپ کو اُردو زبان میں کتابیں لکھنے کا خیال ہو گیا ہے۔ شاید آپ کی مرتبہ کتابوں کی تیسری قسط ہے۔ مشق و مزاولت سے زبان کی خامیاں جو کہیں کہیں پائی جاتی ہیں دور ہو جائیں گی اور نقص تو لازمہ بشریت ہے، بڑے سے بڑے مصنف کی کتابوں میں بھی نقائص پائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر میں ایک دو مثال بطور نمونہ پیش کرتا ہوں جو اُردو کے روز مرہ کے خلاف ہیں۔

تمہید کے پہلے صفحہ پر آپ نے لکھا ہے " اور غیر پاکیزہ تصورات کی اشاعت ہرگز شایاں نہیں " لفظ شایاں علحدہ استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس کے ساتھ کوئی دوسرا لفظ ضرور ہونا چاہئے۔ مثلاً شایانِ وقت اس موقع پر لکھدیتے تو یہ نقص دور ہو جاتا۔

بعد ازاں آپ نے تحریر فرمایا ہے " مگر یہ امید کرنا کہ اس کوشش میں پوری کامیابی حاصل ہو گی ممکن نہیں ہے " ایسے موقع پر " ممکن نہیں ہے " استعمال نہیں کرتے۔ بیکار ہے، فضول ہے لکھنا چاہئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن میں انگریزی فقرہ اس اظہار خیال کے لئے آیا اور آپ نے اُردو میں اُس کا ترجمہ کر دیا۔

مقدمے کے پہلے صفحے پر آپ ارقام فرماتے ہیں " ان کے والد اپنے کو عزیز مردہ کہلوانے لگے " اگر اپنے کی جگہ " اپنے آپ " کر دیا جائے تو بہتر ہو کیونکہ صرف " اپنے کو " ناگوار گزرتا ہے " کہلوانے لگے " بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کی جگہ " کہلانے لگے " ہونا چاہئے۔

بہر حال کتاب اس لائق ہے کہ شائقین اردو اس کا خیر مقدم کریں اور شاہ صاحب اور میر صاحب دونوں کے خیالات سے مستفید ہوں۔

منتخبات ہندی کلام ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید جعفر حسن صاحب پی ایچ۔ ڈی استاذ معاشیات و عمرانیات جامعہ

خانیہ ۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ حجم ۲۲۵ صفحے ۔ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ نفیس، جلد خوشنما ۔ قیمت ۱۲/

ہندی شاعری کی سادگی بے تکلفی سوز و درد مشہور ہے اور یہی چیزیں عوامی شاعری کی جان ہیں اسی لئے ہمارے یہاں گانے والے اکثر ہندی چیزیں گاتے ہیں اور سننے والے ان کے میٹھے اور اثر میں ڈوبے ہوئے الفاظ کو سن کر سر دھنتے ہیں ۔ ان پڑھ لوگوں میں خصوصاً عورتوں کی زبان پر زیادہ ہندی کے گیت رہتے ہیں ۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جس طرح اور بہت سی گھریلو چیزوں سے ناواقف ہے ۔ اسی طرح اس گھریلو شاعری سے بھی ناآشنا ہے ۔ اسی جنتے کی خاطر ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے یہ قابل قدر کام انجام دیا ہے کہ ہندی کے سوسے زیادہ دوہے جمع

تشریح کی ہے اور ایک مختصر مقدمے میں ہندی بھاشا کی

اس سے رہا ہے ۔ روشنی ڈالی ہے ۔ ہمیں اس کتاب میں یہ بات

سلجھاتے ڈاکٹر صاحب عمرانی اور اجتماعیاتی مسائل میں جا الجھے ہیں

گی ہو وہ اُسے ہر جگہ نظر آتی ہے ۔ اور ہر شے اسی کی یاد دلاتی ہے ۔ ع بہ آواز دولاب مستی کنند ۔ آخر موقع اور محل بھی کوئی چیز ہے ۔ جیسے ہوشیاری کے موقعے پر مستی اچھی نہیں معلوم ہوتی اسی طرح مستی کے موقعے پر ہوشیاری بھی زیب نہیں دیتی ۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب آئندہ جب ہندی کے جواہر ریزوں کو جمع کریں گے تو ان پر خالص شاعری کے نقطۂ نظر سے تنقید فرمائیں گے ۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب ایسی ہے کہ جسے ادب اور شاعری کا ذوق اور خوبصورت کتابوں کا شوق ہو اسے اس کا ایک نسخہ ضرور منگوانا چاہئے ۔

شذرات

انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ جس دن کا ڈر تھا وہ دن پیش آیا ۔ مولانا محمد علی کا سایہ ملت اسلامی کے سر سے اٹھ گیا ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی کشتی بے ناخدا کے رہ گئی ۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

جب مولانا نے شدید مرض کی حالت میں سفر لندن کا ارادہ کیا تو ان کے طبی مشیروں نے بہت کچھ سمجھایا ۔ ان کے دوستوں اور نیازمندوں نے منتیں کیں کہ اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالئے مگر ان کے عزم راسخ کے آگے کوئی بات پیش نہ گئی وہ لندن تشریف لے گئے اور باوجود علالت کے تندرستوں سے زیادہ تندہی اور جفاکشی سے کام کرتے رہے ۔ ہندوستان کے مسلمان بےچینی سے ان کی صحت کی خبروں کا انتظار کرتے تھے ۔ خبر آئی کہ علالت بڑھ گئی پھر خبر آئی کہ اب افاقہ ہے ۔ طبیعت روز بروز سنبھلتی جاتی ہے ۔ ایک روز دفعۃً یہ جانکاہ ستانی آپہنچی "مولانا محمد علی کا انتقال ہوگیا"

سارے ملک میں ہندو مسلمان عیسائی پارسی جس طرح مرحوم کا ماتم کر رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا کی ذات ہندوستان کے لئے ایک نعمت تھی جس کی قدر بعد زوال ہو رہی ہے اور ابھی اس سے زیادہ ہوگی ۔ خصوصاً مسلمانوں کو اب معلوم ہوگا کہ وہ شخص جو ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا ان کی قومی زندگی میں کیا اہمیت رکھتا تھا ۔

مولانائے مرحوم کو بہت سے سیاسی ، علمی اور تعلیمی اداروں سے تعلق تھا اور وہ سب آج ان کے ماتم دار ہیں مگر جامعہ ملیہ سے مرحوم جو قلبی اور روحانی رابطہ رکھتے تھے اس کی بنا پر یہاں کے

اساتذہ اور طلبہ کو ان کی وفات کا جتنا صدمہ بھی ہو کم ہے۔ جامعہ ملیہ کے خیال نے انھیں کے دماغ
میں پرورش پائی تھی اور انھیں کی کوششوں سے عملی جامہ پہنا تھا۔ وہ اس کے پہلے پرنسپل تھے
اور آخر تک اس کے بہی خواہ اور محسن رہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مولانا کو نوجوانوں کی تعلیم
اور ہدایت دل سے عزیز تھی اور اگر ممکن ہوتا تو وہ کبھی جامعہ ملیہ کی مسند صدارت سے علحدہ نہ ہوتے۔
لیکن ان کی ذات قومی کاموں کے لئے یک انار و صد بیمار کی مصداق تھی۔ جا ... عل ... عرصہ
تھی اور مرحوم کو جیل سے رہا ہونے کے بعد ذاتی اور قومی مشاغ...
ان کا جامعہ سے اتنا گہرا تعلق باقی نہ رہ سکا۔ تھوڑے د...
پھر ان کا سایہ عاطفت نصیب ہوا۔ مرحوم آخر عمر...
تھا۔ مگر اس کے باوجود جب کبھی جامعہ کو ان کی توجہ اور مدد کی...
سے ہر طرح کی تکلیفیں سہہ کر اپنی اس محبوب تعلیم گاہ کی خدمت کرتے تھے وقتاً فوقتاً مولانا جامعہ میں
تشریف لاتے تھے اور گھنٹوں قیام کرتے تھے۔ جامعہ کے بچوں سے پیار اور محبت کی باتیں کرنا،
بڑوں کے سامنے علمی اور مذہبی مسائل پر تقریر کرنا، اساتذہ کی ہمت بڑھانا، مشکل معاملات میں
خلوص دل سے مشورہ دینا اور امکان بھر مدد کرنا یہ مرحوم کا دلچسپ مشغلہ تھا جس میں انھیں
روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ سنہ ۱۹۲۹ء کے آخر میں مولانا کوچہ چیلان سے قرولباغ اٹھ آئے تھے
اور اس وقت سے لے کر سفر یورپ تک جامعہ والے برابر ان کی صحبت سے فیضیاب اور ان کی
شفقت و محبت سے سرور ہوتے رہے۔ مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھے جب سو تھ لے گا سارے
کام چھوڑ کر پچاس روپیہ ماہوار معاوضے پر جامعہ میں پڑھایا کروں گا۔ اگر موت مہلت دیتی تو
کوئی عجب نہیں کہ ایک دن مرحوم کا یہ ارادہ پورا ہوتا۔

ایسے محبت والے بزرگ کے سایہ عاطفت سے محروم ہو جانا جامعہ کے لئے بڑی بدقسمتی ہے۔
مسیح الملک مرحوم کی وفات کے تین ہی سال کے بعد یہ دوسرا جانکاہ داغ جامعہ والوں کو اٹھانا پڑا۔

ہے۔ مگر مرضی الٰہی میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں۔ رضاً بقضاءٖ و تسلیماً لامرہٖ۔

دنیا کی رسم ہے کہ سوگوار آپس میں ایک دوسرے کو بھی پرسا دیا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذاتی تعلق کی بنا پر مرحوم کی وفات کا صدمہ سب سے زیادہ بیگم محمد علی صاحبہ۔ ان کی صاحبزادیوں مولانا شوکت علی صاحب اور دوسرے عزیزوں کو ہے۔ ہم ان غم نصیبوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ اس رنج میں نہ صرف ہم لوگ بلکہ سارا ہندوستان اور کل عالم اسلام ان کے ساتھ شریک ہے۔ خداوند تعالیٰ انھیں مصیبت میں صبر جمیل عطا فرمائے

مولانا مرحوم سے ہمیں جو عقیدت تھی اس کا اظہار ان چند سطروں سے نہیں ہو سکتا۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اپریل یا مئی میں جامعہ کا ایک خاص نمبر محمد علی نمبر کے نام سے نکالیں جس میں جامعہ والوں اور دوسرے لوگوں سے مرحوم کی زندگی اور ان کے کام کے مختلف پہلوؤں پر مضمون لکھوائے جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ مرحوم کے احباب اس میں ہماری مدد کریں گے۔ آئندہ نمبر میں ہم زیادہ تفصیل سے اپنی اسکیم کو بیان کریں گے۔

مرحوم کی وفات کی خبر سنتے ہی ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جامعہ ملیہ کو ان کی کوئی یادگار قائم کرنا چاہیے۔ اس سلسلے کے دو ہفتے کے بعد لوگوں کے خطوط آنا شروع ہوئے کہ مولانا محمد علی کی یادگار کی تحریک جامعہ سے اب تک کیوں نہیں اٹھی۔ ان حضرات کی اطلاع کے لیے یہ لکھنا ضروری ہے کہ منتظمین پہلے ہی دن سے اس مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔ مگر ڈاکٹر انصاری صاحب اور مولانا شوکت علی صاحب کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

اس وقت دو تجویزیں ان کے پیش نظر ہیں ایک تو یہ کہ جامعہ کی مجوزہ عمارت میں یونیورسٹی

ہال مولانا محمد علی کے نام سے موسوم ہو اور دوسری یہ کہ اردو اکادمی مولانا سے منسوب کرکے عمرانی علوم
یعنی سیاسیات، معاشیات، تعلیمات وغیرہ کی تحقیق و اشاعت وغیرہ کے لئے مخصوص کر دی جائے۔

جامعہ جب علیگڑھ میں قائم ہوئی اور اس کے لئے کچھ بڑی بھلی عمارت بنی تو اس میں بڑے ہال
کا نام محمد علی ہال رکھا گیا۔ دہلی میں منتقل ہونے کے بعد ست جامعہ نگر کی عمارتوں میں سب [illegible] طلبہ نے
جوش عقیدت سے یہاں بھی مرکزی دارالاقامہ کے ہال کو نام [illegible]
کے ابتدائی زمانے کی یادیں اور طلبہ کے قابل قدر [illegible]
جو انشاءاللہ اوکھلے میں بنے گی یونیورسٹی ہال کا نام [illegible]

[illegible] مگر مولانا محمد علی جیسے شخص کے لئے جس نے مسلمانوں کو قومی آزادی اور قومی تعلیم کے نام سے آگاہ
کیا جس نے مایوسی میں اُن کی ہمت بندھائی، بے حسی میں انھیں جوش دلایا تاریکی میں انھیں راہ عمل دکھائی
محض اتنی یادگار کافی نہیں۔ اس لئے ہم اس تجویز کی دل سے تائید کرتے ہیں کہ اردو اکادمی مولانا
کے نام سے موسوم کی جائے اور اس میں اعلیٰ قابلیت کے فارغ التحصیل طلبہ کو وظیفے دے کر عمرانیات
کے مسائل خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست اور تعلیم کے متعلق علمی تحقیقات کرنے کا موقع
دیا جائے۔ اس طرح کا ایک تحقیقی ادارہ قائم کرنے کی آرزو مرحوم کے دل میں مدت سے تھی اور جامعہ
کے مختلف شعبوں میں انھیں اردو اکادمی سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی۔ حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم
کی وفات کے بعد جب جامعہ کا دستور اساسی مرتب ہو رہا تھا تو مولانا مرحوم نے ہم لوگوں سے یہ اصرار
فرمایا کہ مجھے چاہے کسی اور کمیٹی میں رکھو یا نہ رکھو مگر اکادمی کی مجلس انتظامی میں ضرور رکھنا۔ اس لئے
مولانا کی یادگار اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ اردو اکادمی کا انتساب ان کے نام سے ہو اور یہ
اس قابل بنا دی جائے کہ اس علمی کام کو جس کے انجام دینے کی حسرت وہ اپنے ساتھ قبر میں لے

گے انجام دے سکے۔

امید ہے کہ آئندہ مہینے کے آخر تک ڈاکٹر انصاری صاحب اور مولانا شوکت علی صاحب کے مشورے سے یادگار کا مسئلہ طے ہو جائے گا۔ اس وقت ہم انشاء اللہ اکادمی کی مفصل اسکیم ارباب نظر کے سامنے پیش کریں گے۔

قیمت طلب (وی۔ پی) پیکٹوں کے متعلق
قواعد ڈاکخانہ میں ترمیم

ابھی تک جو قیمت طلب پارسل دس روز تک ڈاکخانہ میں بطور امانت رکھے جا سکتے تھے۔ لیکن جنوری ۱۹۳۱ء سے افسران ڈاکخانہ نے اس رعایت میں غیر معمولی تخفیف کر دی ہے اور اب تمام وی پی (V.P.P.) کے ذریعہ آئی ہوئی چیزیں خواہ وہ اخبارات و رسائل کے پیکٹ ہوں یا کتابوں اور دیگر اشیاء کے پارسل۔ دس دن کے بجائے صرف تین یوم ڈاکخانہ میں بطور امانت رکھے جا سکیں گے۔ اگر تین یوم کے اندر مکتوب الیہ قیمت دے کر وی۔ پی (V.P.P.) کو نہ چھڑا لے گا تو وی پی فرستندہ کے پاس واپس کر دیا جائے گا۔

تین دن سے زیادہ امانت رکھوانے کے لئے مکتوب الیہ کو ایک تحریری درخواست اور دو آنے یومیہ کی فیس بذریعہ ٹکٹ ڈاک، داخل کرنا ہوگی لیکن دس دن سے زائد کوئی پارسل کسی طرح ڈاکخانے میں امانت نہ رکھا جائے گا۔

اس قاعدے کی رو سے خریدار صاحبان کو جامعہ کا وی پی (V.P.P.) فوراً وصول کر لینا چاہئے ورنہ ڈاکخانہ تین دن کے اندر اس کو دفتر ہذا میں واپس کر دے گا اور ہر واپس شدہ رسالہ پر ہم کو محصول کا نقصان برداشت کرنا پڑے گا، امید کہ ناظرین جامعہ اس جدید قاعدے کو نوٹ فرما لیں گے۔

منیجر

فہرست مضامین رسالہ "جامعہ" بابتہ جلد ۱۵

از جولائی تا دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء

مذہب

جغرافیہ و ہیئت

ادب و تاریخ ادب

تاریخ و سوانح عمری

معاشیات

تعلیم و اجتماعیات

افسانہ

سیاسیات

حصہ نظم

تنقید و تبصرات

(کتب)

(رسائل)

متفرقات

شذرات

فہرست مضمون نگاران

(۱) ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی ۔ استاذ جامعہ ملیہ

(۲) ڈاکٹر سید جعفر حسن صاحب پی ایچ ڈی ۔ استاذ جامعہ عثمانیہ

(۳) نصیر الدین صاحب ہاشمی ایم ۔ آر ۔ اے ۔ ایس ۔ ایف

(۴) ایک طالب علم

(۵) مولوی محمد حسین صاحب محوی

(۶) سید ابو حمزہ صاحب بھوپال

(۷) سید محمود عمر صاحب بی ۔ ای ۔ انجنیر جوناگڈھ

(۸) محمد حسین صاحب ادیب ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ای ۔ ٹی

(۹) ڈاکٹر ایس اے حمید پی ایچ ڈی

(۱۰) راغب احسن صاحب بی اے کلکتہ

(۱۱) کریم الرضا خاں صاحب ایم اے ۔ ایل ایل بی (علیگ) شاہجہانپوری

(۱۲) غلام سرور صاحب بی اے (جامعہ)

(۱۳) مولوی عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی

(۱۴) اسرائیل احمد خاں صاحب مدرس خشیل اسکول رنگون

(۱۵) مولوی سید وحید الدین صاحب پاروی ۔ بنارس

(۱۶) حیات اللہ خاں صاحب انصاری

(۱۷) حضرت کیفی چریاکوٹی

(۱۸) حضرت اختر جوناگڈھی

۸۸

(۱۹) حکیم محمد اجمل خاں صاحب
(۲۰) مولانا اسلم صاحب جیراجپوری
(۲۱) میر خورشید علی صاحب رضوی۔ بی ۔ اے (علیگ)
(۲۲) ابراہیم عمادی صاحب معلم جامعہ ملیہ
(۲۳) عبد الواحد صاحب سندھی معلم جامعہ ملیہ
(۲۴) حضرت جلیل قدوائی
(۲۵) محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)
(۲۶) مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا وکیل غازی آباد
(۲۷) غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
(۲۸) پنڈت برج موہن صاحب کیفی دتاتریہ
(۲۹) مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب
(۳۰) حضرت جگر مرادآبادی
(۳۱) سید نصیر احمد صاحب
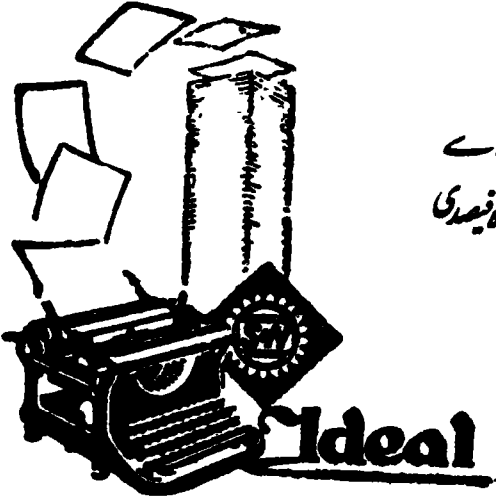
بقائے صحت کی نو ایجاد مشین

زمانہ حال کی خصوصیات میں سے ایک امر یہ بھی ہے کہ نہ صرف موت کا مقابلہ بہتر اور زیادہ کامیابی سے ہو رہا ہے بلکہ شباب کے قیام اور عود کی طرف بھی زیادہ توجہ کی جا رہی ہے۔ پچیس برس پہلے جو لوگ پہاڑوں پر جانے کے فائدے سے بالکل ناآشنا تھے۔ آج وہ ہر سال پہاڑوں پر جا کر شباب اور حیات دونوں کی مدت میں اضافہ کرنا اپنا فرض عین سمجھتے ہیں۔ سرسبز پہاڑوں پر سورج کی روشنی سے بنفشی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہی اس شباب اور حیات کی توسیع کا باعث قرار دی گئی ہیں۔ پہاڑوں کے پھل اور میوے ہمیشہ سے صحت اور قوت بخش سمجھے جاتے ہیں آج یہ راز افشا ہو گیا ہے کہ وہ بھی شعاع بنفشہ کو مہینوں تک پختگی کے وقت تک جذب کر کے اس قدر مفید ہو جاتے ہیں۔

آج بنفشی شعاع کے مفید ثابت ہو جانے کے بعد سائنس دانوں نے ہر گھر میں اس کو پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ ایکسرے بجلی کے آلے سے اس کو مصنوعی طور پر پیدا کیا جاتا ہے اور نہ صرف قوت، حسن شباب اور توسیع حیات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ فالج۔ گٹھیا۔ ورم۔ درد۔ پھوڑے وغیرہ کے علاج میں بھی بے مثل نتیجہ پیدا کیا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک مشین کا رہنا نہایت ضروری ہے جہاں بجلی نہیں ہے وہاں بنفشی شعاع سے مس کی ہوئی اشیاء لگانے اور نہانے سے بھی بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔ جن طلبہ کی نشو و نما میں کمی ہو یا حافظہ خراب ہو یا نیند اور ہاضمے میں کمی محسوس ہوتی ہو تو ملاقات یا خط و کتابت کریں۔

پتہ: نیرنگی قلم (وایولٹ رے انسٹی ٹیوٹ) ایجرٹن روڈ۔ دہلی

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین

جلد ۱۶ بابتہ ماہ فروری

سالانہ قیمت مبلغ پانچ روپئے

صلی اللہ علی سیدنا محمد و آل محمد وسلم

اندلس میں اسلامی فتوحات کا درخشاں عہد

عبدالملک کا عہد اور ملک کی عام حالت | ہمارے مضمون کا آغاز اس زمانے سے ہوتا ہے جب کہ لوگ چاروں طرف مصائب و فتن میں مبتلا تھے اور عبدالملک ابن مروان کی توجہ عبداللہ ابن زبیر، ابن الاشعث و ازارقہ وغیرہ کی مدافعت پر مبذول تھی۔ اہل روم اور کردوں کے معاملات کی حالت نہایت نازک ہو گئی تھی فارس کے باقی لوگوں کی حالت بھی تشویش سے خالی نہ تھی وہاں کے لوگوں نے اپنے بہت سے شہر جو شامیوں نے فتح کرلئے تھے فاتحین سے پھر چھین لئے اور اہل شام کو نکال دیا۔

ولید کا عہد | جیسے جیسے موقع ملا عبدالملک نے سعی و کوشش سے کئی شہر پھر فتح کئے مگر جب سب پر قبضہ نہ ملا تو اس کے بعد ولید نے اپنے عہد میں اس مہم پر فوجیں روانہ کیں اور غنیم پر حملے کر کے روم کے مفتوحہ شہر جو دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے دوبارہ اپنے تصرف میں لئے بلکہ ان شہروں کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی قبضہ کرلیا۔ پھر خراسان کے نکلے ہوئے شہر بھی دوبارہ قبضہ میں لے کر اپنا تسلط قائم کیا۔ اور ملک کی حد بندی کی اور اپنے فتوحات کا دائرہ اتنا وسیع کرلیا کہ ایران کے تمام ملک اس کے تصرف میں آگئے اور کردوں کے علاقے کے سوا جو نہایت محفوظ تھا کوئی حصہ ملک فتح ہونے سے باقی نہ رہا۔

عقبہ ابن نافع | اس زمانے میں افریقیہ کی سرحد کا معاملہ دوسری سرحدوں کے مقابلے میں ولید کے لئے بہت زیادہ اہم اور جاذب توجہ تھا۔ عقبہ ابن نافع حارثی الفہری افریقیہ میں قیروان کی بنا ڈال کر وہاں ایک قلعہ تعمیر کر چکے تھے۔ عقبہ ابن نافع حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں عبداللہ ابن سعد ابن سرح عامری کے عامل تھے۔

سرحدوں کا انتظام کرنے کے بعد عقبہ نئے فتوحات کے لئے قدم بڑھائے اور جس طرف

گئے۔ فتح و نصرت نے ان کے قدم چومے۔ یہاں تک کہ عقبہ تیونس اور سبرہ تک پہنچ گئے۔

ان واقعات کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سے ملک میں بہت سے فساد پیدا ہوگئے۔ اس زمانے میں افریقہ میں موسم گرما میں افواج کی واپسی منقطع ہوگئی تھی۔ اہل بربر کے معاملات بھی زیادہ سخت ہوگئے تھے۔ بڑی دشواریوں کے بعد کہیں ان فتنوں سے نجات ملی۔ موسم گرما کے افواج متعینہ افریقہ حضرت معاویہ کے عہد میں واپس ہوگئیں۔ افریقہ کی حالت درست ہوگئی اور اس وقت تک پر امن رہی جب حضرت عقبہ ابن نافع نے

میں یزید ابن معاویہ کے حکم سے جزیرے کے گورنر

عقبہ کا مد مقابل بربر کا ایک قبیلہ تھا جس کو

کیا۔ عقبہ ان سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوگئے اور ان کی

بعد ہی حضرت ابن زبیر کا قضیہ اور دوسرے فسادات اٹھ کھڑے ہوئے اور عبد الملک ابن مروان بھی مرگیا

موسیٰ ابن نصیر | جب ولید کو تخت اور اس نے افریقیہ کی سرحدی اہمیت پر نظر کی تو موسے ابن نصیر کو بلایا جو بنی امیہ کا مولیٰ (غلام) اور ان غیر مسلم نفیسوں کی اولاد سے تھا جو خالد ابن ولید کے ہاتھوں عین التمر میں اسیر ہوئے تھے اور بیان کرتے تھے کہ ہم تاوان جنگ کے مطالبے میں رہن ہیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہم بکر بن وائل کے قبیلے سے ہیں۔

موسیٰ، عبد العزیز ابن مروان کی غلامی میں داخل تھے اور عبد العزیز سے آزادی حاصل کرکے ان کی طرف سے شنہ ھ میں افریقہ وغیرہ کی مہم پر مامور ہو رہے تھے۔ ولید نے موسیٰ ابن نصیر کو چند ایسے لوگوں کی معیت میں افریقہ روانہ کیا جو بلا جبر و اکراہ اپنی خوشی سے اس مہم کے لئے تیار تھے۔ شام کا لشکر ان کے ساتھ نہ کیا۔ مصر و افریقہ کے لشکر اور مسلمان مجاہدوں کے گروہ ان کے لئے کافی سمجھے۔

موسیٰ کی فتوحات | موسیٰ ابن نصیر خلیفہ سے رخصت ہوکر مصر آئے۔ وہاں کی فوج ساتھ لے کر افریقہ پہنچے وہاں سے بھی بہادروں کی ایک جماعت ساتھ لی۔ اب موسیٰ کا لشکر نہایت مہذب و باقاعدہ تھا۔ انھوں نے اپنا مقدمۃ الجیش طارق ابن زیاد کے سپرد کر دیا تھا۔ ان تیاریوں کے بعد موسیٰ بربریوں

سے بہادری سے جنگ کرتے اور ان کے شہروں پر پیہم قبضہ کرتے ہوئے طنجہ تک پہنچ گئے جو بلاد بربر کا ایک مرکزی مستقر تھا۔

موسیٰ نے طنجہ اور اس کے بعض مواضعات فتح کرلئے جو اس سے پہلے فتح نہ ہوئے تھے۔ یا بقول بعض فتح ہوکر ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ غرض ان فتوحات کے بعد اہل طنجہ نے موسیٰ کی اطاعت قبول کی اور موسیٰ نے طنجہ کو اپنا مستقر بناکر مسلمانوں کو وہاں آباد کیا اور اس کی حیثیت قیروان کی سی بنادی پھر ۸۹ھ میں ولید کو تمام واقعات کی اطلاع دی۔

اس کے بعد موسیٰ نے اور قدم بڑھائے اور ساحل بحر کے شہر فتح کرنا چاہے جن میں شاہ اندلس کے گورنر مقرر تھے اور ان شہروں اور ان ملحقات پر انہی گورنروں کا تصرف تھا۔ ان تمام شہروں کی ناک شہر سبتہ تھا۔ سبتہ اور اس کے ملحقات پر ایک اندلسی سردار بلیان کی حکومت تھی۔ موسیٰ ابن نصیر نے بلیان سے جنگ کی تو انھیں بلیان کی طاقت اور دلیری اور کثرت افواج کا اندازہ ہوا۔ اتنی بے شمار فوج ابتک موسیٰ نے نہ دیکھی تھی۔ موسیٰ مجبوراً مقابلے کی طاقت نہ دیکھ کر طنجہ واپس ہوئے اور حریف کے آس پاس کے مواضعات لوٹ مار سے غارت کرتے رہے۔

سبتہ والوں کی امداد کے لئے اندلس کی کشتیاں برابر چکر لگاتی اور ذخائر رسد مہیا کرتی رہتی تھیں۔ اندلس کے لوگ اپنے شہروں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی مدافعت اپنے شہروں اور ناموس کے لئے بہت سخت ہوتی تھی۔ ان کی اس حالت میں غیطشہ شاہ اندلس کی وفات تک کوئی تغیر نہ ہوا اور سب متفق و متحد رہے۔

رذریق کی تخت نشینی غیطشہ نے اپنی جو اولاد چھوڑی ان میں شہرت اور ابتہ بھی ہیں جن کو اہل ملک نے پسند نہ کیا اور انھیں کی بدولت تفرقہ کی بنا پڑگئی۔ اندلس کا شیرازۂ نظم پراگندہ ہوگیا اور سب نے اپنی خوشی سے ایک بہادر و جنگجو سردار رذریق کو بادشاہ بنالیا۔ رذریق کو اندلس کے شاہی خاندان سے کوئی تعلق نہ تھا البتہ وہ وہاں کا مشہور شہسوار اور ایک بڑا جنرل تھا۔ رذریق کی اسی ناموری کی وجہ سے زمام ملک اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔

حال اندلس کا ملکی رواج | اندلس کے تمام عمال کا دستور تھا کہ وہ اپنی اولاد ذکور و اناث کو پایہ تخت طلیطلہ میں اپنے بادشاہ کے پاس بھیج دیتے تھے۔ بادشاہ کی خدمت سوائے ان کے کوئی دوسرا نہ کرسکتا یہ لوگ زمانہ بلوغ تک یہیں رہتے اور آداب سلطنت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان کے بالغ ہونے پر بادشاہ انھیں میں ایک کو دوسرے کے ساتھ بیاہ دیتا تھا اور تمام مصارف کا خود کفیل ہوتا تھا۔

دختر جلیان کا اہم واقعہ اور جلیان کی مسلمانوں سے سازش | رذریق کی بادشاہی میں جلیان کی لڑکی [illegible] میں آئی۔ رذریق نے [illegible]
یہ بات اہل ملک کو ابھی نہ معلوم ہوئی اور کسی نے [illegible]
بہت اثر ہوا اور اس نے غضبناک ہوکر دین مسیح کی قسم [illegible]
رذریق کو دفن نہ کردوں گا چین نہ لوں گا۔ اس کے بعد ہی [illegible]
کو اندلس کے شہروں میں سے آیا اور اپنے متعلق اطمینانی معاہدات کرکے موسیٰ کو تسخیر اندلس پر توجہ دلائی اور اندلس کی بے حد تعریفیں کرکے موسیٰ کو مشتاق بنا دیا۔ یہ واقعہ ۹۰ھ کے بعد کا ہے۔

ان فتوحات اور اندلس کی مہم کا حال موسیٰ نے ولید کو لکھ بھیجا۔ ولید نے جواب میں لکھا کہ "بہتر ہے۔ مگر ابتداءً معمولی فوج کے ساتھ اندلس میں داخل ہو اور مسلمانوں کو خوفناک سمندر میں ڈال کر دھوکہ نہ دو" موسیٰ نے پھر لکھا کہ "جس دریا سے ہم کو واسطہ ہے وہ سمندر نہیں ہے بلکہ ایک خوشنما خلیج ہے" ولید نے جواب دیا کہ اگر یہ صحیح ہے تو بھی تھوڑی تھوڑی فوج کے ساتھ داخل ہو۔"

طریف اور اندلس کی پہلی مہم | چنانچہ موسیٰ نے اپنے موالی میں سے ایک شخص طریف کو بھیجا جس کی کنیت ابوزرعہ تھی۔ چار سو پیادہ اور سو سوار اس کے ساتھ کئے یہ سب چار کشتیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور اس جزیرے میں پہنچے جسے جزیرۂ اندلس کہتے تھے۔ یہ جزیرہ اہل اندلس کا کشتی گھر اور کشتی سازی کا کارخانہ تھا۔ طریف کے یہاں پہنچنے کے بعد اس جزیرہ کو اس کے نام سے منسوب کرکے جزیرۂ طریف کہنے لگے۔

جب تک سب ساتھی نہ آگئے طریف اسی جزیرے میں ایک جانب ٹھہرا رہا پھر اکٹھا ہوکر جزیرے

والوں پر حملہ آور ہوا اور قیدی اور بہت سا مال غنیمت لے کر صحیح سلامت واپس ہوا۔ یہ مال اس قدر زائد اور گراں قدر تھا کہ موسیٰ نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یہ واقعہ ماہ رمضان ۹۱ھ کا ہے۔

طارق ابن زیاد | اس فتح سے موسیٰ کے حوصلے بڑھ گئے اور اب ان لوگوں نے فتح اندلس کے لئے عجلت کی موسیٰ نے اپنے مولیٰ (غلام) طارق ابن زیاد کو اپنا سپہ سالار مقرر کیا۔ طارق ملک فارس کے ایک ہمدانی سپاہی تھے بعض کا قول ہے کہ وہ موسیٰ کے آزاد کئے ہوئے نہ تھے بلکہ قبیلہ صدف کے موالی سے تعلق رکھتے تھے۔ غرض موسیٰ نے طارق کو سات ہزار مسلمانوں کے ہمراہ جزیرۂ اندلس پر چڑھائی کرنے کے لئے بھیجا۔ اس تعداد میں زیادہ تر بربری اور موالی تھے۔ عرب برائے نام تھے۔ اس لوگوں کے پاس صرف چار کشتیاں تھیں۔ انھی کشتیوں میں یہ لوگ سوار ہوکر کئی دفعہ میں آئے اور اس حکمت سے اپنی شان و شوکت کا بھرم قائم رکھا۔ پھر اس نواح میں ایک بلند پہاڑی کو جائے پناہ قرار دے کر سب اکٹھے ہوگئے۔ یہ داخلہ ۹۲ھ میں ہوا۔

روذرق کی جنگی تیاریاں | شاہ اندلس کو جب طریف کی غارتگری کا علم ہوا تو وہ اس وقت بنبلونہ کی جنگ میں مشغول تھا اس لئے وہ طریف کے حملے سے متاثر ہوکر واپس ہوگیا مگر جب طارق کے اندلس میں داخلے کا حال معلوم ہوا تو اس کی توجہ اور زیادہ بڑھ گئی اور اس نے پوری تیاری کے ساتھ فوجیں جمع کیں جن کی مجموعی تعداد ایک لاکھ نفر یا کچھ کم و بیش تھی۔ طارق نے یہ خبر سن کر موسیٰ کو فتح جزیرہ کی اطلاع دیتے ہوئے مزید اہتمام کے لئے توجہ دلائی اور لکھا کہ جزیرہ اور بحیرہ پر پورا قبضہ ہوچکا ہے مگر اب شاہ اندلس نے اتنی زبردست تیاری کی ہے کہ ہم میں مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔

موسیٰ نے جس وقت طارق کو اس طرف روانہ کیا تھا اسی وقت سے کشتیاں تیار کرانا شروع کردی تھیں۔ طارق کے کمک مانگنے تک کثرت سے کشتیاں بن چکی تھیں جس وقت طارق کا خط پہنچا موسیٰ نے اسی وقت پانچ ہزار سپاہی بھیج دئے اس طرح اندلس میں طارق کے پاس مسلمانوں کی کل تعداد بارہ ہزار نفر ہوگئی اس وقت ان کے پاس کافی سے زیادہ لونڈی غلام جمع ہوچکے تھے۔ یلیان بھی اہل بلد کی ایک جماعت کے ساتھ مسلمانوں کے پاس آگیا تھا وہ ان کو مخفی مقامات کی رہبری کرتا جاتا تھا اور

مسلمانوں کے لئے خبریں حاصل کرتا تھا۔

رذریق کے خلاف سازش جس وقت رذریق بلاد اندلس کے سرداروں اور وہاں کے شہزادوں کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا ہوا اور مسلمانوں کی تعداد اور ان کی خبری معلوم ہوئی تو رذریق کے لوگوں نے آپس میں مشورہ کرکے کہا کہ رذریق خبیث ہما ی ملک پر مسلط ہوگیا حالانکہ شاہی خاندان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ تو ہمارے یہاں کے کمینوں میں ۔۔۔ ملانو کو تو ہمارے وطن میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

مطلب پورا ہو جائے گا تو چلے جائیں گے۔ اس لئے اس

مقابلے کے وقت ایسی صورت نکالنا چاہئے کہ ہمیں اس

ان لوگوں نے عین وقت پر رذریق سے دغا کرنے کی ٹھان لی

ششبرت کو میمنہ اور ابہ کو میسرہ پر مقرر کیا تھا اور یہ دونوں شاہ غیطشہ سابق شاہ اندلس کے بیٹے تھے اور شکست کی سازش کرنے والوں کے یہی سرگروہ تھے۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے جبکہ اندلس سنہ ۸۸ھ سے سنہ ۹۰ھ تک تین سال سخت قحط میں مبتلا رہا اور وبائی امراض سے اندلس کی نصف آبادی مر چکی تھی۔ مقابلے کا سال سنہ ۹۱ھ ہے جس کو سنہ ظریف و خلف کہتے تھے۔

جنگ اور رذریق کی شکست وانجام غرض رذریق و طارق کی جنگ جزیرے میں اس جگہ ہوئی جس کو بحیرہ کہتے تھے۔ یہ جنگ نہایت سخت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رذریق کے میمنہ و میسرہ دونوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ جن پر وہی ششبرت و ابہ مقرر تھے۔ اب قلب سے مقابلہ ہوا۔

رذریق نے قلب لشکر پر کچھ دیر تک مسلمانوں سے مقابلہ کیا مگر اس کے قدم جمنے نہ پائے اور ہزیمت کھا کر بھاگا۔ مسلمانوں نے اس جنگ میں خوب بازوؤں کے جوہر دکھائے اور اپنی تیزدستی اور قتل و غارت سے فوج عظیم کو بے حواس کر دیا۔

رذریق جو لشکر سے غائب ہوا تو اس کا پتہ کسی کو نہ چلا مگر مسلمان اس کی تلاش میں تھے ایک جگہ

ایک سفید گھوڑا دلدل میں پھنسا ہوا ملا جس پر یاقوت و زبرجد کی مرصع زین کسی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اس کو نکالا۔ اس کے بعد ایک جوڑا دو لباس بھی ملا۔ ان وجوہ سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ رذریق دلدل میں پھنس کر غرق ہو گیا۔ ورنہ سوائے خدا کے کوئی اس کے حال سے باخبر نہیں ہے۔ نہ وہ زندہ ہاتھ آیا اور نہ کہیں اس کی لاش دیکھی گئی۔

طارق کی مزید فتوحات

اس فتح کے بعد طارق جزیرے کے تنگ راستے سے گزرا اور وہاں سے شہر استجہ میں داخل ہوا۔ استجہ کے لوگوں نے مقابلہ کیا اور ان کی مدد میں وہ لوگ بھی شریک ہو گئے جو رذریق کی جنگ میں شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ مقابلہ بہت اہم تھا اس میں مسلمانوں کے سپاہی کثرت سے کام آئے اور زخمی ہوئے۔ مسلمانوں کو جنگ میں ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا تھا لیکن نتیجے میں اللہ نے ان کی مدد کی، دشمنوں کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ گئے۔

اب طارق نے شہر استجہ کے ایک چشمے پر پڑاؤ ڈالا جو نہر کے متصل تھا اور شہر سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ اس وقت سے اس چشمے کو عین طارق کہتے ہیں۔ طارق کی جرأت اور شہر میں داخلے کے حالات سن کر دشمنوں کے سرداروں پر رعب چھا گیا۔ اور وہ طلیطلہ کی طرف بھاگ گئے کیونکہ پہلے ان کا خیال تھا کہ طارق بھی طریف کی طرح لوٹ مار کر کے چلا جائے گا شہر پر قبضہ نہ رکھے گا۔ طلیطلہ پہنچ کر ان لوگوں نے وہاں کے شہروں پر فوجیں قائم کر دیں۔ اور قلعوں کے دروازے بند کر لئے۔

مغیث رومی اور قرطبہ کی مہم

اب یلیان نے طارق سے کہا کہ اندلس کی بڑی جنگ سے تو فرصت مل گئی ہے۔ میرے آدمی رہبری کے لئے تیار ہیں۔ اب آپ ان کے ساتھ اپنی فوجیں روانہ کر کے طلیطلہ پر قبضہ کیجئے۔ چنانچہ طارق نے ولید ابن عبدالملک کے غلام مغیث رومی کو استجہ سے قرطبہ روانہ کیا اور سات سو سواروں کی فوج ساتھ کی پیادہ سپاہی بالکل نہ دئے کیونکہ مسلمانوں میں سب کو سواری میسر آجانے کی وجہ سے پیدل فوج ہی نہ رہی تھی۔ قرطبہ ان لوگوں کا سب سے بڑا شہر تھا اور آج کل اندلس کا دارالسلطنت اور وہاں کا قیروان ہے۔

پھر قرطبہ فوجیں بھیج کر طارق نے ایک لشکر شہر ریہ کی طرف روانہ کیا اور ایک غرناطہ کی جانب

جالیقیہ کا ایک مشہور شہر تھا۔ اور خود بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ طلیطلہ کے قصد سے روانہ ہوا۔

قبضہ قرطبہ کی مفصل کیفیت

مغیث طارق سے رخصت ہوکر قرطبہ کے حدود میں داخل ہوا اور موضع شقندہ کے چاولوں کے ایک کھیت کو کمینگاہ قرار دے کر اپنی تدابیر میں مصروف ہوا۔ یہ کھیت شقندہ اور
قرطبہ کے درمیان واقع تھا یہاں سے مغیث نے اپنے ساتھ کے جاسوس خبر رسانی کے لئے بھیجے جو
کسی کھیت سے ایک چرواہے کو پکڑ لائے۔ مغیث نے اس سے قرطبہ کا حال پوچھا تو اس نے کہا کہ
وہاں کے بڑے سردار طلیطلہ چلے گئے ہیں اور د لی ؟ ...
ہیں۔ ان لوگوں میں قرطبہ کے ضعیف ، کمزور باشند...
کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ فصیل بہت مضبوط ہے ...
یہ دروازہ وہی ہے جو پل کا دروازہ ہے۔

ان حالات سے مغیث کو بہت تقویت حاصل ہوئی۔ وہ رات کے وقت جب خوب تاریکی
پھیل گئی چند لوگوں کے ساتھ تیار ہوکر نہر قرطبہ پر آیا۔ خدا کی قدرت ہی فتح مقدر تھی اس لئے اسباب
بھی ویسے ہی پیدا ہوگئے۔ یعنی اس رات کو آسمان سے بارش اور اولہ باری خوب ہوئی۔ فصیل کے
چوکیدار بارش و سردی کے ڈر سے پاسبانی سے غافل ہوگئے۔ اس وقت فضا کی یہ کیفیت تھی کہ ہوا
کی دھیمی سنسناہٹ کے سوا کچھ سنائی دیتا تھا۔ مغیث اور اس کے ہمراہی نہر کو عبور کرکے فصیل
کے پاس آئے۔ نہر سے فصیل تک تیس ہاتھ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے فصیل پر
چڑھنا چاہا مگر کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس کی مدد سے اوپر پہنچ سکتے۔ مجبوراً واپس ہوئے اور اُس
چرواہے کو لائے اس نے رہبری کی تو ایک رخنہ نظر آیا جو تھوڑے بلندی پر تھا اور اس کے نیچے ایک انجیر
کا درخت تھا۔ ان لوگوں نے رخنہ پر پہنچنا چاہا تو ناکام رہے۔ آخر ایک بربری شخص اس درخت پر چڑھا۔
مغیث نے اپنا عمامہ اس کو اتار کر دے دیا۔ عمامے کی مدد سے وہ فصیل پر چڑھ گیا اور اس کے ساتھ
بہت سے آدمی اور بھی فصیل پر چڑھ گئے۔ اب مغیث سوار ہوکر شہر کے دروازے پر اپنی فوج کے
ساتھ کھڑا ہوگیا اور جو لوگ فصیل پر پہنچ چکے تھے ان کو حکم دیا کہ دروازے پر پہنچ کر یکایک دربانوں پر

توڑ کر یہیں۔ یہی دروازہ پل کا بھی تھا اور ان دونوں پل منہدم ہو چکا تھا۔ قرطبہ میں کوئی اور پل نہ تھا اس لئے اس دروازے کو باب الجزیرہ بھی کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے مغیث کے حکم سے ایسا ہی کیا اور ان پہ دفعتہً ٹوٹ کر گرے اور انھیں قتل کر کے دروازے کے قفل توڑ کر دروازے کھول دئے۔ مغیث اپنی فوج اور جاسوسوں کو ساتھ لے کر شہر میں داخل ہو گیا۔ اور ایوان حکومت کا قصد کیا جب والی قرطبہ کو خبر پہنچی تو وہ اپنے چار پانچ سو ساتھیوں کے ہمراہ شہر کے مغربی دروازے سے نکلا اس دروازے کو باب اشبیلیہ کہتے تھے اور ایک کنیسہ میں پناہ لی جو شہر کی جانب مغرب واقع تھا۔ یہ کنیسہ بہت مضبوط اور محفوظ تھا اور سینٹ اجلج کے نام سے مشہور تھا۔ گویا یہ کنیسہ ایک چھوٹے قلعے کا کام دیتا تھا۔ جس میں والی قرطبہ قلعہ بند ہو گیا تھا۔

فتح ریہ

غرض مغیث نے ایوان حکومت پر قابض ہو کر اس کی حفاظت کا انتظام کیا دوسرے دن کنیسہ کا محاصرہ کر کے طارق کو فتح کی اطلاع دی۔ ادھر جو لشکر فتح ریہ کے لئے روانہ ہوا تھا اس نے ریہ فتح کر لیا۔ ریہ کے مغرور سردار وہاں کے دشوار گزار پہاڑوں میں روپوش ہو گئے اس کے بعد یہ لشکر اس فوج سے جا ملا جو علاقہ البیرہ کی مہم پر مقرر تھی۔

فتح غرناطہ اور مسلمان فاتحوں کا یہودیوں کے متعلق ایک پسندیدہ قانون

(غرناطہ) کا محاصرہ کر کے اسے بھی فتح کر لیا۔ ان دونوں مسلمان فاتحوں کا یہ قاعدہ تھا کہ جس نئے شہر کو فتح کرتے اور اس میں ان کو یہودی ملتے تو یہودیوں کو محفوظ حصۂ شہر میں بسا دیتے تھے اور مسلمانوں کی معمولی جماعت حفاظت کے لئے چھوڑ کر خود بڑے بڑے سرداروں کے ساتھ آگے بڑھ جاتے تھے۔ یہی انھوں نے غرناطہ میں کیا۔ مگر علاقہ مالقہ کے شہر ریہ میں یہ صورت نہیں ہوئی کیونکہ انھیں وہاں یہودی نہ ملے اور نہ ایسی آبادی نظر آئی۔ مسلمانوں نے ریہ کو صرف جائے پناہ کے طور پر رکھا تھا جب ضرورت ہوتی یہاں محفوظ ہو جاتے تھے۔

فتح تدمیر
شاہ تدمیر سے مقابلہ اور اس کی عجیب چال

اب مسلمان ریہ سے علاقہ تدمیر کو روانہ ہوئے یہ علاقہ اپنے فرمانروا کے نام سے موسوم تھا۔ اس کے مستقر کا نام

ہو گیا تھا۔ شاہ تدمیر نے بہت سا لشکر مہیا کر کے مقابلہ کیا مگر مقابلہ کمزور رہا اور شاہ تدمیر کو شکست فاش ہوئی۔ مسلمانوں نے اپنی خون آشام تلوار سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو چند نفوس بچ رہے تھے انھوں نے اوریولہ میں پناہ لی۔ انھیں میں ان کا بادشاہ بھی تھا مگر اس حالت میں کہ نہ اس کے پاس مدافعت کا کوئی سامان تھا نہ کچھ فوج ہی باقی بچی تھی لیکن چونکہ وہ نہایت تجربہ کار اور تیز عقل تھا اس لئے اس نے اپنے یہاں کی عورتوں کے بال کھلوا کر ان کے ہاتھوں میں جیاسے دے اور انھیں مردوں کی وضع میں مسلح کر کے شہر کی فصیل پر کھڑا کر دیا

جو میدان جنگ سے بچ آئے تھے۔ شاہ تدمیر کو اس

ان کی ظاہری حالت سے مرعوب ہو گئے اور سمجھے کہ

بنا کر صلح کی گفتگو کرنے آیا۔ مسلمانوں نے اس کو امان دی

میں آتا جاتا رہا اور شرائط طے کر کے صلح کر لی۔

اس تدبیر سے علاقہ تدمیر کو بلا جنگ و جدال کامل امن حاصل ہو گیا اور مسلمان حالت صلح میں اس پر قابض ہو گئے۔

عہد نامہ صلح کی تکمیل کے بعد شاہ تدمیر نے اپنا نام ظاہر کر دیا اور مسلمانوں کو اپنے شہر میں لے گیا۔ جب یہ لوگ شہر میں داخل ہوئے تو وہاں کی حالت دیکھ کر بہت نادم ہوئے مگر وعدہ پر قائم رہے۔ پھر اس فتح کی اطلاع طارق کو دے کر تھوڑی فوج تدمیر کے پاس چھوڑی اور طلیطلہ کی طرف بڑھے تاکہ طارق سے مل جائیں۔

والی قرطبہ کی گرفتاری واقعہ کنیسۃ الاسرای

مغیث نے قرطبہ کے کنیسہ کا جو محاصرہ کر رکھا تھا وہ تین ماہ تک قائم رہا محصورین شدت محاصرے کی تاب نہ لا سکے۔ اسی حالت میں ایک دن مغیث نے والی قرطبہ کو صبح کے وقت تنہا بھاگتے ہوئے دیکھا کہ جبل قرطبہ کی طرف بھاگا ہوا جا رہا ہے تاکہ طلیطلہ میں اپنے ساتھیوں سے مل جائے۔ یہ دیکھ کر مغیث نے بھی اس کا تن تنہا تعاقب کیا۔ والی قرطبہ نے اس کو پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تو قسطلیرہ کی طرف بھاگا۔ وہ اس وقت ایک زرد گھوڑے پر سوار تھا۔ جب

مغیث نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس نے دیکھا کہ اب مغیث سر پر آیا ہی چاہتا ہے تو گھبرا گیا اور راستہ کاٹ کر ایک خندق میں جا پڑا جس میں پھنس جانے کی وجہ سے اس کے گھوڑے کی گردن ٹوٹ گئی اور وہ گھوڑے سے اتر کر اپنی ڈھال پر بیٹھ گیا۔ اسی عالم میں مغیث نے آکر اس کو گرفتار کر لیا۔ ملوک اندلس میں اس کے سوا کوئی شخص گرفتار نہیں ہوا اور ملوک یا مسلمانوں کی امان میں آگئے۔ یا جلیقیہ کی طرف بھاگ گئے۔ اس سے فارغ ہو کر مغیث بقیہ سرداران قرطبہ اور محصورین کنیسہ کے پاس پہنچا اور ان سب کو قید کر کے قتل کر دیا۔ اس تاریخ سے اس کنیسہ کو کنیسۃ الاسرا (قیدیوں کا گرجا کہنے لگے) صرف والی قرطبہ مغیث کی قید میں رہا اس غرض سے قتل نہ کیا گیا کہ اس کو امیر المومنین کے پاس زندہ پہنچا دیا جائے۔ بعد ازاں مغیث نے قرطبہ کے یہودیوں کو جمع کر کے شہر میں آباد کیا اور قرطبہ کا ایوان حکومت اپنے لئے مخصوص کر کے شہر اپنے ساتھیوں کے لئے چھوڑ دیا

طلیطلہ کی مہم۔ شہر پر قبضہ اور مائدہ سلیمان کی دستیابی

طارق جب اپنی فوجوں کو لئے ہوئے طلیطلہ پہنچے تو شہر خالی پایا۔ اپنے تھوڑے ساتھی انتظام کے لئے چھوڑے اور خود مع لشکر کے دریائے وادی الحجارہ سے گزر کر غنیم کا تعاقب کرتے ہوئے ایک درے میں پہنچے جو بعد میں فج طارق کے نام سے مشہور ہوا۔ اس درے سے گزر کر اس شہر میں پہنچے جو پہاڑ کے عقب میں واقع تھا۔ اس شہر کا نام مائدہ تھا۔ اس کا نام ہونے کی وجہ تھی کہ اس میں سیدنا سلیمان علیہ السلام کا مائدہ دستیاب ہوا تھا یہ مائدہ سبز زبرجد کا بنا ہوا تھا۔ اس میں پائے پلے لگے ہوئے تھے جن کی تعداد تین سو پچھتر تھی۔ شہر اور مائدہ پر قبضہ کر کے طارق نے سامنے کے ایک اور شہر کو فتح کیا اس میں بھی بہت سے زیورات اور دولت غنیمت ملی۔ اس کے بعد طارق آگے نہیں بڑھے اور ۹۳ھ میں یہیں سے طلیطلہ کی طرف واپس ہو گئے۔

اندلس میں موسیٰ کی افواج کا داخلہ

اس کے بعد رمضان ۹۳ھ میں موسیٰ کی افواج قاہرہ حرکت میں آئیں جن کی تعداد اٹھارہ ہزار بیان کی جاتی ہے۔ چونکہ موسیٰ کو طارق کی فتوحات کی خبر پہنچ چکی تھی اور وہ طارق پر حسد کرنے لگے تھے اس لئے جب وہ اسی سال جزیرہ اندلس میں داخل ہوئے اور ان سے اسی راستے پر آگے بڑھنے کو کہا گیا جس پر طارق گئے تھے تو انھوں نے از راہ حسد یہ راستہ اختیار کرنے سے انکار

کر دیا۔ پھر طلیطلہ کے ساتھ کئے ہوئے غیر مسلم رہبروں نے اس سے کہا کہ اگر یہ خیال ہو تو ہم آپ کو ایسا راستے سے لیجائیں گے جو پہلے سے بہتر ہے اور ایسے شہروں تک پہنچائیں گے جو طارق کے مفتوحہ شہروں سے زیادہ شاندار ہیں اور آج تک کسی سے فتح نہیں ہوئے۔ اللہ کو منظور ہے تو وہ آپ کے ہاتھوں فتح ہوں گے موسیٰ ان لوگوں کی حوصلہ افزائی سے بہت خوش ہوئے و... طارق کی فتوحات اور ان کے طرز عمل سے بہت رنجیدہ تھے۔

فتح شذونہ و قرمونہ | ابلیطان کے لوگ موسیٰ کو مدینہ تک...
کیا۔ پھر شہر قرمونہ پہنچے۔ یہ شہر نہایت مضبوط تھا اندلس...
اور نہ محصورین کے لئے اس سے بہتر کوئی جائے پناہ تھی
کہا کہ اس شہر پر لڑنے کی ضرورت نہیں ہے یہ صرف حیلہ و تدبیر ...
یا اس کے آدمی شکست خوردہ لشکر کی وضع بنا کر پناہ لینے کے بہانے سے باب فصیل پر پہنچے قلعے والوں نے دھوکے میں آ کے ان کو اندر بلا لیا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت مسلمانوں کے پاس اپنے سوار بھیج کر اپنی کامیابی کی اطلاع دی اور باب قرطبہ کھول دیا۔ مسلمانوں کا لشکر دفعتہً دربانوں پر حملہ آور ہو کر قرمونہ میں داخل ہو گیا۔ اور شہر پر قبضہ کر لیا۔

فتح اشبیلیہ | اس طرح قرمونہ کو فتح کر کے موسیٰ اشبیلیہ پہنچے۔ یہ شہر اندلس کے شہروں میں اپنی شان و عمارات اور مضبوطی کے لحاظ سے بہت بڑا شہر تھا اور قوطیوں کے غلبے سے پہلے اندلس کا دارالملک تھا۔ اس میں قدیم عمارات کے آثار بہت تھے۔ جب قوم قوط کا غلبہ ہوا تو انھوں نے بجائے اشبیلیہ کے طلیطلہ کو پایۂ تخت قرار دیا اور رومانیوں کا شرف اور مذہبی تفقہ اور انکی امارت اشبیلیہ تک محدود رہ گئی۔ غرض موسیٰ نے اس شہر پر کئی ماہ تک محاصرہ قائم رکھا تب خدا کی مدد سے یہ فتح ہوا اور اشبیلیہ کے رؤسا بھاگ کر شہر باجہ چلے گئے۔ اشبیلیہ میں بھی موسیٰ نے یہودیوں کو بلا کر آباد کیا یہاں سے موسیٰ شہر ماردہ پہنچے۔

شہر ماردہ کی مہم۔ واقعہ برج شہدا | یہ شہر بھی بعض ملوک اندلس کا پایۂ تخت تھا۔ اور اس میں بھی آثار قدیمہ

محل اور عمارات اور گرجے تھے جن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ موسیٰ نے اس شہر کا بھی محاصرہ کر لیا مگر محصورین
مقابلے پر تیار تھے موسیٰ نے یکبارگی حملہ کیا تو انھوں نے فصیلوں پر سے سختی کے ساتھ اس کا جواب دیا
فصیلیں موسیٰ کی افواج سے ایک میل یا کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں جب موسیٰ نے دیکھا کہ ان کا زور کم
نہیں ہوتا اور یہ لوگ رہ رہ کے مسلمانوں پر حملہ کرتے ہیں تو انھوں نے فصیل کے ایک نقب کا پتہ لگایا
جو چٹانوں کے درمیان واقع تھی۔ اس میں رات کے وقت سواروں اور پیادوں کو پوشیدہ کر دیا
صبح کے وقت دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ دشمن جس طرح ایک دن پہلے لڑے تھے اسی طرح پوری طاقت کے
ساتھ لڑنے کے لیے نکلے ان کے نکلتے ہی کمینگاہ کے لوگ بھی تلواریں سنبھالے ہوئے ٹوٹ پڑے نہایت
کامیاب مقابلہ رہا دشمن بری طرح مارے گئے۔ چند نفوس جو بچ رہے تھے بھاگ کر شہر کے اندر چلے
گئے۔ اس شہر کی فصیلیں بہت مضبوط تھیں اس سے قبل ایسی عمارات کا پتہ نہیں ملتا اس کی مضبوطی کی
وجہ سے مسلمانوں کو ان پر آسانی سے قابو نہ ملا۔ کئی مہینے گزر گئے آخر فصیل کے ایک برج میں بذریعہ دبابہ
سرنگ لگانا شروع کی۔ مگر جیسے ہی پتھر اکھڑے اندر کے ایک غار کا راستہ نکل آیا۔ اس غار کا نام
اہل اندلس کی زبان میں لاشہ ماشہ تھا۔ اس غار میں پہنچے تو مسلمانوں کے کدالیوں اور پھاوڑوں
نے کام نہیں دیا وہ اسی کوشش میں تھے کہ دشمنوں کی فوج آ پڑی جتنے مسلمان اندر تھے ایک ایک
کر کے شہید ہو گئے۔ اس واقعے کی بنا پر اس برج کا نام برج شہدا ہو گیا۔ جو اب تک مشہور ہے مگر اس
نام کی تاریخ سے کم لوگ واقف ہوں گے۔

فتح ماردہ کا عجیب عنوان

یہ واقعات رمضان سنہ ۹۴ھ کے ہیں۔ عید الفطر کے دن موسیٰ کو فتح ہوئی
جس کی دلچسپ کیفیت یہ ہے کہ شہدا کے واقعے کے بعد محصورین کی ہمت بہت بڑھ گئی اور انھوں نے
فخریہ کہا کہ ہم نے موسیٰ کو شکست دی اگر وہ صلح منظور کرتے ہوں تو آج ہی کر لیں چنانچہ جلد تصفیہ کرنے
کی غرض سے اپنے سردار موسیٰ کے یہاں بھیجے۔ پہلے دن جب یہ لوگ موسیٰ سے ملے تو انھوں نے
موسیٰ کی داڑھی سفید دیکھی گفتگو کر کے چلے آئے کیونکہ کوئی بات طے نہ ہو سکی۔ پھر دوبارہ عید سے ایک
دن قبل ملے تو انھوں نے موسیٰ کی داڑھی سرخ دیکھی۔ اس دن موسیٰ نے مہندی لگائی تھی۔ یہ دیکھ کر

انھیں بڑا تعجب ہوا اور آپس میں کہنے لگے کہ شاید یہ آدم خور ہیں ورنہ داڑھی کا رنگ سرخ ہونے کی کیا
وجہ ہے حالانکہ کل تک سفید تھی۔ پھر سہ بارہ عید کے دن ملنے آئے اب کے موسیٰ کی داڑھی سیاہ پائی
نہایت حیران ہوئے اور اہل شہر سے آکر کہا کہ "اے احمقو، تم توانبیاء سے جنگ کر رہے ہو جو اپنے
آپ کو جس رنگ کا چاہتے ہیں بنا لیتے ہیں دیکھو ان کا بادشاہ بڑھے سے جوان ہوگیا۔ جاؤ جو کچھ وہ
مانگے دے دو اور اس پر راضی ہو کر صلح کرلو کہ کینگاہ والی لڑائی میں جو لوگ مارے گئے ہیں ان کا
تمام مال۔ اور جلیقیہ کی طرف بھاگنے والوں کی دولت مع ...
زیورات موسیٰ کے لئے دینا منظور ہے چنانچہ اس پر سہ
سنہ ۹۴ھ میں مسلمان فاتحوں کے لئے شہر کے دروا...
مسلمانوں کے داخلے کے بعد اہل اشبیلیہ نے
باجہ و لبلہ کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کر بیٹھے۔ ان کے اس اچانک حملے سے اسی مسلمانوں
کی جانیں ضائع ہوگئیں جو لوگ اس جنگ سے بچے انھوں نے ماردہ پہنچ کر موسیٰ کو خبر دی جب موسیٰ
ماردہ کو فتح کر چکے تو اپنے بیٹے عبد العزیز کو لشکر دے کر اشبیلیہ روانہ کیا۔ عبد العزیز اشبیلیہ فتح
کر کے پھر موسیٰ کے پاس گئے

طارق و موسیٰ کی تکرار ملاقات | ختم شوال سنہ ۹۳ھ کے بعد موسیٰ نے طلیطلہ کے قصد سے کوچ کیا تو راستہ
میں طارق نے استقبال کیا۔ اور نہایت عقیدت و احترام ظاہر کر کے موضع طلبیرہ میں ملاقات کی۔
موسیٰ نے جب طارق کو دیکھا کہ تو کوڑا سنبھالا اور اس کے سر پر کئی چابک رسید کئے اور اپنی رائے کے
خلاف عمل کرنے پر تنبیہ کے پھر طارق کو ساتھ لے کر طلیطلہ گئے اور طارق کو مال غنیمت اور مائدہ پیش
کرنے کا حکم دیا انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی مگر مائدے کا ایک پایہ اکھاڑ کر رکھ لیا۔ جب موسیٰ نے پوچھا
کہ یہ پایہ کہاں ہے تو کہہ دیا مجھے نہیں معلوم میں نے تو ایسا ہی پایا ہے۔ مجبوراً موسیٰ نے دوسرا پایہ
سونے کا تیار کرایا اور مائدے کے لئے غلاف بنوا کر اس میں رکھا۔ پھر یہاں سے بڑھ کر موسیٰ نے سرقسطہ
اور اس کے ملحقات اور شہر فتح کئے۔

دربار خلافت سے موسیٰ طارق اور مغیث کی طلبی

سنہ ۹۵ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کا ایلچی آیا اور وہ موسیٰ کو طارق اور مغیث کے ساتھ اندلس سے اپنے ہمراہ لے گیا۔ اندلس پر موسیٰ کے بیٹے عبدالعزیز کو مقرر کیا اور اشبیلیہ کو اس کا دارالحکومت قرار دیا۔ چونکہ یہ شہر ایک زبردست دریا کے کنارے واقع تھا جس کا عبور کرنا بہت دشوار تھا اس لئے یہ کوشش کی گئی کہ اشبیلیہ میں مسلمانوں کے جہاز رہیں۔ اور وہ بلاد اندلس کا مستقر ہو جائے۔

غرض یہاں کے انتظامات عبدالعزیز پر چھوڑے گئے۔ موسیٰ، طارق، مغیث اور ان کے ساتھ والی قرطبہ جس کو مغیث نے گرفتار کیا تھا دارالخلافت دمشق کو روانہ ہوئے۔ راستے میں مغیث نے دربار خلافت سے اپنے خصوصیات و تقرب کا اظہار کیا۔ اس پر موسیٰ نے والی قرطبہ کو مغیث سے لینا چاہا تاکہ خود اس قیدی کو دربار میں پیش کرے۔ مگر مغیث نے دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس کو خود خلافت پناہ کے حضور میں پیش کروں گا۔ موسیٰ نہ مانے اور ان کو اس معاملے میں ایسی کد ہو گئی کہ انھوں نے مغیث سے زبردستی چھین لیا۔ پھر لوگوں نے موسیٰ سے کہا کہ اگر تم اس کو زندہ لے جاؤ گے تو مغیث یہی کہیں گے کہ میں نے اس کو گرفتار کیا ہے۔ اس لئے اس کو قتل کر ڈالنا بہتر ہو۔ چنانچہ موسیٰ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد دارالخلافت پہنچے۔ اس وقت ولید کا انتقال ہو چکا تھا اور اُن کے بجائے سلیمان خلیفہ تھے۔

اندلس میں عبدالعزیز ابن موسیٰ کی امارت اور شہادت کا افسوسناک قصہ

اندلس میں یہ رنگ تھا کہ عبدالعزیز ابن موسیٰ نے اپنے زمانۂ امارت میں رذریق کی بیوی ام عاصم سے نکاح کر لیا تھا اور اس سے بہت محبت کرنے لگے تھے ایک دن اس نے عبدالعزیز سے کہا کہ بادشاہ جب تک تاج نہ لگائیں ان پر بادشاہی زیب نہیں دیتی۔ اگر تم کہو تو میں اپنے پاس کے سونے اور جواہرات سے تمھارے لئے تاج تیار کر دوں عبدالعزیز نے عذر کیا کہ ہمارے مذہب میں ایسا نہیں ہو۔ ام عاصم نے اصرار کیا اور کہا کہ جو کام تم خلوت میں کرو گے اس کو تمھارے مذہب والے کیسے جان جائیں گے۔ سب کے سامنے تاج لگانے کی ضرورت نہیں صرف میری خوشی کے لئے گھر میں لگا لیا کرنا۔ غرض عبدالعزیز اس کے اصرار سے مجبور ہو گئے اور خلوت میں تاج استعمال کرنے لگے۔ ایک دن ام عاصم کے پاس سر پر تاج رکھے ہوئے بیٹھے تھے کہ

قرآن مجید کے ترجمے

(مشرقی زبانوں میں)

تبلیغ کے سلسلے میں مسلمانوں کی کوششیں بہت

تبلیغی مرکز نہیں ہے، نہ آج تک اس کام کے لئے کوئی

میں لایا گیا۔ سوائے اس کے کہ علماء، صوفیاء اور واعظین

کلمۃ اللہ کے اس مقدس مگر صبر آزما فرض کو انجام دیتے رہے اور

میں۔ اس کے برعکس مسیحی مبلغین نے، جن کو تمام عیسائی دنیا اور دول مسیحیہ کی طرف سے بے اندازہ امداد و اعانت حاصل ہے، اپنے مشن کا جال دنیا کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں پھیلا رکھا ہے، اور گو مسلمانوں کی خاموش، غیر منظم اور شخصی تبلیغ کے مقابلے میں ان کی مساعی غیر مشکور رہی ہوں، مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں بائبل کا ترجمہ نہ ہوا ہو، بایں ہمہ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ قرآن کریم کے تراجم کا دائرہ بھی وسعت میں بائبل سے کسی طرح کم نہیں رہا۔ چنانچہ مغرب میں، یونانی، لاطینی، اطالوی، پرتگالی، سویدی، سروی، پولونی، اسپینی، جرمنی، فرنچ، روسی، انگریزی حتیٰ کہ اسپرانٹو تک میں، اور مشرق میں قریب قریب تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، میری رائے ناقص میں تو یہ بھی کلام الٰہی کا ایک معجزہ ہے کہ اس نے مشرق اور مغرب کی مختلف زبانوں میں جلوہ فرما ہو کر ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف عربی دنیا بلکہ کافۃ الناس کے لئے نازل ہوا ہے!

رحمتِ حق بن کے آیا ساری دنیا کے لئے!

فرقان مجید کے ان مشرقی اور مغربی تراجم پر ایک فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر شودین

ہے، جو لیج (بابلجیم) Liege یونیورسٹی کا پروفیسر ہے۔ فرانسیسی زبان میں ایک خاص کتاب لکھی ہوا سی میں سے اخذ کرکے ہم بالفعل مشرقی تراجم کا ذکر کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ مشرق کی کتنی زبانوں میں کتاب سماوی کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر موصوف کی یہ کتاب دراصل اس سلسلے کی دسویں جلد ہے جس میں اس نے ہر فن سے متعلق ایک جلد میں دس مختلف علوم و فنون کے ماتحت ان تمام عربی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو یورپ میں سنہ ۱۸۱۰ء سے کر ۱۸۸۵ء تک ۷۵ برس میں (اصل یا ترجمہ) شائع ہوئی ہیں چنانچہ اس دسویں جلد میں اس نے قرآن کے متون مخطوطہ و مطبوعہ تفاسیر اور یورپی تراجم کے جتنے اڈیشن مشرق اور مغرب میں نکلے ہیں ان سب کو بیان کیا ہے۔ اور ضمناً بعض مفید ابواب کا اضافہ کیا ہے، مثلاً قرآن مجید کے تراجم مغربی و مشرقی وغیرہ۔

یہ کتاب ۱۹۰۷ء میں لپزیگ (جرمنی) سے شائع ہوئی ہے، اور اس لحاظ سے گذشتہ ۲۲ برسوں میں جتنے تراجم قرآن السنۂ مختلفہ میں ہو چکے ہیں ان کا ذکر اس میں نہیں آیا۔ البتہ ہم نے کہیں کہیں حاشی میں حسب معلومات ان تراجم مابعد کا ذکر کیا ہے۔ مؤلف نے جن مشرقی زبانوں میں تراجم قرآن کا ذکر کیا ہے ان کے علاوہ بھی اور مشرقی زبانوں مثلاً چینی، ملیالم، تلگو، ہندی، مرہٹی وغیرہ میں بھی قرآن مجید کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

اختر

مرہٹی | حسب ذیل تراجم اس زبان میں موجود ہیں :-

(۱) سلیمان بن جبرول اور نثیل ابن خسدائی یہودی کا قرون وسطیٰ میں کیا ہوا ترجمہ۔ سنہ ۱۸۵۵ء، ۱۸۵۹ء، ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۵ء اور ۱۸۹۵ء۔

(۲) جیکب لیوی کا ترجمہ (المتوفی سنہ ۱۶۳۲ء)

Bibliographie des Ouvrages Arabes ou Relatifs Aux Arabes.

(۳) ریکنڈروف (M. Roorendorf) کا ترجمہ، لائپزگ ۱۸۵۰ء

(۴) " " " ، مطبوعہ اے، لائپزگ ۱۸۶۲ء بمقابلہ ۱۸۵۸ء

فارسی | فارسی تراجم[1] میں ۱۹ ترجموں کا ذکر ہے، جو ایران اور ہندوستان کے مطبوعہ یا قلمی ہیں۔ اور ان کے نسخے یورپ کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تراجم فارسی کی فہرست میں صادق خوانساری کے ایک مطبوعہ لیتھوگراف نسخہ طہران ۱۸۵۴ء کا ذکر ہے جس کا ایک نسخہ عجائب خانہ لندن میں موجود ہے۔ انہی تراجم میں ایک وہ قلمی نسخہ بھی ہے جو ٹیپو سلطان کا تھا یا اس کے مطالعہ خاص کا۔

ترکی | اس زبان میں حسب ذیل تراجم کا ذکر ہے۔

(۱) مخطوطات مختلفہ جو یورپ کے مختلف کتب خانوں ...

(۲) اسمٰعیل فرخ آفندی کا ترجمہ مع تفسیر طبع قسطنطنیہ ۱۲۵۸ھ ۔ ۱۸۴۲ء) طبع جدید ۱۲۸۲ھ

(۳) محمد خیر الدین کا ترجمہ ۴ جلدوں میں طبع بولاق ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء)

آرمنی | ترجمہ جو ۱۸۲۲ء میں کیا گیا۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برلن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

جاوی | اس میں تین تراجم ہیں :-

(۱) ترجمہ جاوی جس کا ذکر جرنل ایشیاٹک ۱۸۳۲ء جلد ا صفحہ ۲۵۰-۲۵۸ میں ہے۔

(۲) ترجمہ ایس۔ کیزر (S. Keyzer) در زبان جاوا مطبوعہ ۱۸۶۳ء

(۳) ترجمہ جاوی، مطبوعہ بتیویا، لینگ کپنی، ۱۸۵۸ء

مکاسری | جاوا کے قریب جزیرۂ مکاسر (Macassare) کی زبان۔ اس میں ۲ ترجمے ہیں :-

---

(۱) فارسی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ شیخ سعدی شیرازیؒ کا ہے اس کے بعد کئی ترجمے ہوئے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا فارسی ترجمہ شاہ ولی اللہؒ کا ہے جو "فتح الرحمٰن" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اختر

(۱) اغد نیلار (W. M. Bonselaar.) کا ترجمہ، مطبوعہ روٹر ڈام ۱۸۶۷ء
(۲) جیتس (B. F. Mathes) کا ترجمہ، اس کا مقدمہ ملیس M. C. Millies نے لکھا ہے۔

ملائی | زبان جاوی کے علاوہ یہ ایک اور زبان ہے جو ملک جاوا میں بولی جاتی ہے اس کے لئے حروف عربی استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس زبان کا ایک ترجمہ مدت ہوئی ہماری نظر سے گزرا تھا، اس میں ۳ تراجم ہیں :-
(۱) ترجمہ قرآن بزبان ملائی از ورنڈلی (Werndly) مطبوعہ ۱۸۳۶ء۔
(۲) جیتس کا ترجمہ قرآن بزبان ملائی
(۳) مخطوطہ لیڈن نمبر ۱۶۹۶

سنسکرت | = قرآن شریف ، مطبوعہ رزاقی پریس، فلسکیپ سائز، صفحات ۶۱۶ بزبان سنسکرت، مطبوعہ لیتھو گراف کانپور ۱۸۸۸ء۔ اس کا ذکر لندن کے مشہور مشرقی کتابوں کے تاجر لوزیک کی فہرست (Luzac's Oriental List.) بابتہ جولائی۔ اگست ۱۹۰۹ء میں ۱۹۳ نمبر پر ہے، اور قیمت دو شلنگ بتائی ہے۔

ٹامل | حبیب محمد الفاکیری کا ترجمہ قرآن مطبوعہ بمبئی ۱۸۹۶ء ، ۱۳۱۳ھ صفحات ۶۲۶ لنکاشائر کے انڈیپنڈنٹ کالج کے کتب خانے میں قرآن مجید کا ایک حصہ ٹامل حروف میں پتوں پر لکھا ہوا موجود ہے۔ ایک مدراسی اہل قلم ڈینکٹ رمن نے بھی حال ہی میں ٹامل زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے۔

اروی | اروی اور ٹامل زبان میں ترجمہ قرآن بخط عربی

بنگالی | (۱) ترجمہ قرآن از گریس چندر سین ۳ جلدوں میں، مطبوعہ کلکتہ ۱۸۸۱ء ، ۱۸۸۶ء
(۲) ترجمہ بنگالی از نعیم الدین و غلام سرور، کرایتہ ۱۹۰۹ء۔

پشتو | بعض سورتوں کا ترجمہ بزبان پشتو۔ اس زبان میں زیادہ تراجم نہ ہونے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ افغانستان کے لوگ عموماً عربی فارسی کے عالم ہوتے ہیں، اور اس لئے پشتو ترجمے کی ضرورت نہ پڑتی ہوگی۔

پنجابی ترجمۂ قرآن بزبان پنجابی لیتھو ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) و ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء)، مع ترجمہ فارسی۔ اس ترجمے کا ایک نسخہ عجائب خانہ لندن کے کتب خانے میں موجود ہے۔

سندھی (۱) ترجمہ عزیز اللہ متعلوی، طبع بمبئی ۱۲۹۳ھ

(۲) ترجمۂ محمد صدیق طبع بمبئی ۱۹۱۰ء

گجراتی[1] (۱) عبد القادر کا ترجمہ طبع بمبئی ۱۲۹۵-۹۶ھ (۱۸۷۹ء)

اردو تراجم قرآن

اردو میں متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں[2] پروفیسر :

---

(۱) گجراتی میں یہ دو بہترین ترجمے بعد کو شائع ہوئے ہیں: (۱) پروفیسر اصفہانی الفنسٹن کالج بمبئی کا گجراتی ترجمۂ قرآن ۲ جلدوں میں بمبئی سے شائع ہوا ہے۔ ایک کالم میں اصل متن اور دوسرے کالم میں ترجمہ ہے، حواشی میں تفسیری نوٹ ہیں۔ زبان اور صحت کے لحاظ سے بہترین ترجمہ ہے۔ (۲) ترجمہ حضرت مولانا صوفی میر محمد یعقوب شاہ صاحب چشتی صابری دو جلدوں میں، صفحات ۱۵۴۰ طبع بمبئی ۱۹۲۰ء

(۲) موجودہ زمانے کے تراجم اردو میں اصحاب ذیل کے ترجمے اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ مولانا نذیر احمد دہلوی مرحوم
۲۔ مولانا اشرف علی تھانوی
۳۔ مولوی ابو الفضل احسان اللہ عباسی
۴۔ مولوی عاشق الٰہی میرٹھی
۵۔ مولانا محمود الحسن مرحوم شیخ الہند
۶۔ مولوی مقبول احمد شیعی
۷۔ مولوی فتح محمد جالندھری

مزید تراجم اردو کے لئے دیکھو الفہرست مرتبہ محمد سجاد مرزا بیگ صفحہ ۳ و ۴

اختر

جامعہ۔ اردو میں قرآن کے ترجموں کی تعداد ۴۰ سے زیادہ ہو چکی ہے۔

(۱) ترجمہ قرآن بزبان اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء (بحوالہ تاریخ ادب الہند از گارسیں دتاسی ج ۳ صفحہ ۳۸۰)

(۲) ترجمہ مرزا کاظم علی جوان مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۰ء (دتاسی ج ۲ صفحہ ۳۰۹)

(۳) موضح القرآن از مولانا شاہ عبدالقادر (ابن شاہ ولی اللہ) دہلوی مطبوعہ کلکتہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) دو جلد۔ اس کے مختلف اڈیشنوں کا ذکر کیا ہے۔

(۴) ترجمہ شاہ رفیع الدین طبع کلکتہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء، ۱۸۳۹ء) (مختلف اڈیشن)

(۵) ترجمہ گمنام مطبوعہ لکھنؤ لیتھو ۱۸۴۴ء

(۶) سید احمد خاں کا ترجمہ طبع علیگڑھ ۱۸۸۰ء (غالباً تفسیر کو ترجمہ سمجھ لیا ہے۔

(۷) ترجمہ ابراہیم بن عبدالعلی مطبوعہ آرہ ۱۸۸۶ء

(۸) ~~ترجمہ~~ [illegible]الدین، سیالکوٹ ۱۸۹۰ء

(۹) ترجمہ غیر معروف طبع دہلی ۱۸۹۲ء

(۱۰) ترجمہ علی بہادر (گارسن دتاسی ج ۱ صفحہ ۱۸۷)

(۱۱) ترجمہ امانت اللہ شیدا قلمی موجودہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ (دتاسی ۳ صفحہ ۱۰۲)

چینی قومیت و جمہوریت

ڈاکٹر سن یت سین کے تین اصول

۲ - جمہوریت

جمہوریت کا مفہوم

ایک جمعیت — ایک منظم جمعیت کے افراد کو عوام کہتے ہیں۔
وہ کیا ہے؟ وہ ایک قوت ہے یا طاقت۔ احکام کو نافذ کرنے اور جمہور کو منسلک کرنے کی قوت، سیاست کی تعریف ہے۔ جمہوریت وہ قوت ہے جس سے عوام حکومت کی نگرانی کرتے ہیں، اور حکومت ان کے کام چلاتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ نگرانی عوام کے ہاتھ کا کام ہے، عوام کے کام چلانا انتظام سے مراد ہے۔ وہ قوت جس پر عوام کے کام کے ربط و ضبط، حل و عقد کا انحصار ہے، جمہور کی سیاسی قوت ہے، جمہور کی سیاسی قوت سے جس جمعیت کو چلایا جاتا ہے، اس کو جمہوریت کہتے ہیں۔

جمہوریت کا وظیفہ

جمہوریت کا وظیفہ کیا ہے؟ حال پر نظر ڈالنے اور ماضی پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ جمہوریت کا وظیفہ جو ہے اس کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ جنس انسان کی زندگی کا محفوظ اور قائم رکھنا۔ انسان کی زندگی کا قائم رکھنا دو اہم باتوں پر منحصر ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کی حفاظت ہو، دوسرے یہ کہ پرورش ہو۔ انسان کو روزانہ حفاظت اور پرورش کی ضرورت ہوتی ہے۔ حفاظت سے مراد مدافعت کرنا ہے، خواہ انفرادی خواہ اجتماعی، مدافعت کی قوت کافی ہو تب انسان کی زندگی باقی رہ سکتی ہے۔ پرورش کا مطلب روزی تلاش کرنا ہے، یہ حفاظت اور پرورش جنس انسان کے لئے ایسی دو اہم باتیں ہیں جن سے انسان کا بے نیاز ہونا محال ہے مگر چونکہ انسان اپنی زندگی باقی رکھنا چاہتے ہیں، اور جانور بھی۔ اور چونکہ انسان اپنی مدافعت

کھانا چاہتے ہیں اور دوسرے حیوان بھی۔ اور چونکہ اولاد آدم کو کھانے کی ضرورت ہے اور جانور کو بھی۔ اس سے
ان میں تصادم اور تنازع پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ بشر کو تنازع بقا کے لئے جنگ کرنی پڑتی ہے اور غیر ذی عقول کو بھی
جنگ ایک ایسی چیز ہے جس سے بچنا محال ہے، اور برابر جاری رکھنا پڑتا ہے۔ ان وجوہ سے
یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جمہوریت بھی ایک آلۂ حرب ہے جس کے ساتھ انسان اپنی بقا کے لئے جنگ کرتے ہیں۔

تنازع کی تدریج

زمانے کے لحاظ سے تنازع کو کئی درجے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ . . . چونکہ ہم جمہوریت کی اصلیت
دریافت کرنا چاہتے ہیں لہذا ہم زمانے کے اعتبار سے تنازع کے درجات مرتب کرتے ہیں . . . سب سے پہلا
وہ زمانہ تھا جس میں انسان اور جانور کے درمیان جنگ ہوتی تھی۔ اسی وقت حقوق جیسی چیز استعمال کرنے
کی گنجائش نہ تھی بلکہ صرف قوت سے کام لیا جاتا تھا۔ دوسرا عہد وہ تھا جس میں انسان اور دیوتاؤں کے
مابین نزاع ہوتی تھی، خوشی غم، آفت، برکت یہ سب چیزیں دیوتاؤں کی طرف منسوب کی جاتی تھیں۔ تعد
نماز اور قربانی سے ان کی خوشامد کی جاتی تھی۔ تیسرا وہ وقت تھا جس میں انسان انسان سے لڑتا تھا ملک
کی ملک کے ساتھ جنگ ہوتی تھی۔ ایک قوم دوسری قوم سے لڑ بیٹھتی تھی۔ یہ شہنشاہیت کا زمانہ تھا۔ موجود
زمانہ گویا کہ وہ تنازع کا چوتھا عہد ہے جس میں ایک قوم اور ایک ملک کے اندر جنگ ہوتی ہے۔ رعایا بادشاہ
سے لڑتی ہے۔ یہی زمانہ ہے کہ نیک بدسے، انصاف طاقت سے مظلوم جابر سے نزاعات کرتے ہیں۔
چونکہ اس زمانے میں عوام اپنے حقوق کے لئے ہتھیار اٹھاتے ہیں لہذا اس کو عہدِ جمہوریت کہیں گے۔

چین میں جمہوریت کا تخیل

دو ہزار برس پہلے کانفوشس اور مانشس دونوں کے دونوں جمہوری حکومت کے قائل تھے۔ کانفوشس
کہتے ہیں، عالمگیر قانون اس لئے قائم رہ سکتا ہے کہ دنیا جمہوری ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کانفوشس
ایک ایسی عالمگیر حکومت کے قائل تھے جس کے تمام انتظامات عوام کے ہاتھ میں ہوں۔ اس کے علاوہ
وہ یو اور شون کو مانتے تھے اس لئے کہ یو اور شون کا اصول حکومت یہ تھا کہ وہ حکومت کو اپنی ذاتی
جائداد نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے طرز حکومت گو بظاہر شہنشاہیت معلوم ہوتے تھے مگر حقیقت میں حکومت کی

شع جمہوری حکومت کی روح تھی۔ اس وجہ سے کنفوشس ان کے نام عزت سے لیتے تھے۔ مَنشس کہتے ہیں کہ رعایا افضل ہے۔ تخت شاہی حقیر چیز ہے۔ اور پادشاہ اسفل ہے " دوسری جگہ کہتے ہیں کہ " پادشاہ رعایا کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور ان کے کانوں سے سنتا ہے "، پھر کہتے ہیں کہ " میں نے ایک بدمعاش چیو کا قتل سنا ہے نہ کہ ایک پادشاہ کا "۔ اس زمانے میں مَنشس کو یقین ہو گیا کہ دنیا میں پادشاہ کی ضرورت نہیں ہے اور انھوں نے یہ بھی سمجھ لیا کہ شہنشاہیت کے

اس زمانے کے اُن پادشاہوں کو جو عدل و انصاف سے
دانشمند حکراں کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور ان ظالم
کرتے تھے، بدمعاش اور حقیر ذات کے نام سے پکارتے ہیں ۔

ورزی کرنا گویا ہر فرد کے لئے لازم اور واجب ہے۔ مندرجہ بالا باتوں سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ جمہوریت کا تخیل دو ہزار برس سے قبل چینیوں کے دماغوں میں موجود تھا، ہاں فرق ضرور تھا کیونکہ اس وقت جمہوریت کا تخیل خواب ہی رہ گیا تھا۔ اور اس کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ یہ تخیل بالکل یورپ میں یوٹوپیہ (utopia) کے تخیل سے مشابہ تھا جس پر فوراً عمل کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ تمدن اور تہذیب کے اعتبار سے چین یورپ سے آگے تھا اور جمہوریت کا خیال بھی دو ہزار برس پہلے پیدا ہوا۔ مگر یہ خیال اُس وقت صرف اقوال پر محدود رہا، اور عملی شکل میں ظاہر نہیں ہو سکا۔

عوام کے فطری حقوق

روسو یورپ میں جمہوری حقوق کا ایک زبردست مبلغ اور حامی تھا۔ اس کی کتاب سوشیل کانٹرکٹ کا موضوع بحث یہ ہے کہ مساوات اور آزادی انسان کا پیدائشی حق ہیں۔ ہر شخص کو فطرۃً یہ حق حاصل ہے کہ اُن میں ذات پات کے درجات نہ ہوں اور ایک دوسرے کے مساوی ہوں، مگر رفتہ رفتہ لوگوں نے اپنے پیدائشی حق سے غفلت کی اور اپنے فطری حقوق کو فراموش کر دیا۔ لیکن اگر ارتقاء کے نقطۂ نظر سے ہم

---

(۱) چیا یک ظالم اور جابر حکراں تھا جو اپنے ماتحت کے ہاتھ سے مقتول ہوا۔

انسان کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مساوات[1] انسان کا پیدائشی حق نہیں ہے، بلکہ سیاسی کشمکش اور تمدنی عناصر سے رونما ہوا ہے۔ کیونکہ جب ہم ارتقار کی تاریخ پر غور کرتے ہیں تو اس قسم کے فطری یا پیدائشی حق کا نمونہ کہیں نہیں ملتا۔ اس بنا پر روسو کا نظریہ غلط تھا اور وہ کسی بنیاد پر مبنی نہیں تھا۔ . . . مگر جب روسو مساوات کا حامی بن بیٹھا اور اس کی روح عوام کی رگوں میں پھونکنے لگا تو اس وقت کی سیاسی حالت اس قسم کی تھی کہ اس کا نظریہ قبول کر سکتی تھی۔ اور اس کا خیال جذب کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس کا کلام کسی بنیاد پر مبنی نہ تھا، پھر بھی مقبول عام ہوا۔ جہاں تک روسو کے اس نظریہ کی اصلی غرض و غایت کا تعلق ہے یقیناً یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ایک غیر فانی کارنامہ دنیا میں چھوڑا ہے۔

جمہوری تحریک کی کیفیت

دو سو سال پہلے انگلینڈ میں عوام اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے اٹھے، سو سال کے بعد امریکہ میں آزادی کی تحریک شروع ہوئی جس کی وجہ سے وہ برطانیہ کے ہاتھ سے نکل کر خود مختار ہو گیا۔ اور وہاں جمہوری حکومت قائم ہو گئی۔ اس تحریک کے بعد دس سال بھی نہیں گزرا کہ فرانس میں انقلاب پیدا ہوا۔

ہر نقطہ سے جب ہم دنیا کی رفتار کا مطالعہ کرتے ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل عوام کی طبیعت جمہوریت کی طرف مائل ہے۔ آئندہ چل کر خواہ کتنی ہی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں اور خواہ کتنی ہی ناکامیاں نظر آئیں، پھر بھی جمہوریت دنیا سے مٹ نہیں سکتی، بلکہ وہ باقی رہے گی۔ اس زمانے میں عوام کا رجحان جو کہ جمہوریت کی طرف منتقل ہو گیا ہے اس کی کیفیت بالکل بہتے ہوئے پانی کے مانند ہے۔ چاہے اس میں کتنا ہی گرد و غبار پڑ جائے وہ بہا تا ہوا ان کو لے جائے گا۔ اور وہ اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا کر سکیں گے۔ عالم میں حکومت کی شکل تو خدائیت تھی۔ خدائیت سے شہنشاہیت کی صورت اختیار کر لی۔ پھر شہنشاہیت سے جمہوریت پیدا ہو گئی۔ جمہوریت کے بعد اور کوئی ایسی صورت نہیں

---

(۱) مساوات کے بارے میں ذکر آئے گا۔

چکی ہو اس کے خلاف ہو۔ اگر اس کے بعد کوئی مخالف عنصر پیدا بھی ہوا اور اس کی قوت ایسی زبردست ہو جیسی یان شیکائی⁽¹⁾ کی یا ایسی مضبوط جیسی چانگ شونگ کے لشکر کی تو وہ بھی آخر میں ناکام ہوگی۔

چین کو کیوں جمہوریت کی ضرورت ہے

انقلاب کے زمانے میں چین کو اس لئے جمہوریت کی ضرورت ہے کہ عوام کا رجحان اس کی طرف مائل ہے۔ اور اس لئے ضرورت ہے کہ خانہ جنگی جلد سے جلد ختم ہو جائے [illegible]

ہیں تو ضروری ہے کہ اس کا مطلب اور مفہوم اچھی طرح [illegible]

تو شہنشاہیت کا خیال ہرگز ہمارے دماغ سے [illegible]

ہم جماعت سے لڑنے کا اندیشہ ہے اور ہم وطنوں [illegible]

طرح ملک میں خانہ جنگی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا اور جنگ [illegible]

باشندے خاک میں مل کر رہ جائیں گے۔ اس وجہ سے ہم کو جمہوری حقوق کی بنا پر ایک جمہوری حکومت قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ . . . . جس کے بادشاہ چالیس کروڑ آدمی ہوں گے . . . جس سے آپس کی جنگ ختم ہونے کی امید ہے اور چین کی تمام مصیبتیں دور ہو سکتی ہیں۔

خود مختاری کا مطلب

جمہوری حکومت کا مفہوم بڑے بڑے علما خود مختاری بتلاتے ہیں۔ کیونکہ اہل یورپ امریکہ جس چیز کے لئے جنگ کرتے ہیں اور اپنی جان پر کھیلتے ہیں سو خود مختاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوریت کا چرچا دن بدن پھیلتا جاتا ہے چونکہ اہل یورپ اور امریکہ برابر تین سو سال سے خود مختاری کے لئے جنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے خود مختاری یورپین اور امریکن علمار کی نگاہ میں ایک گراں اور قابل قدر چیز ہے اور ان کے باشندے بھی اس کی حقیقت سے زیادہ آشنا ہیں۔ مگر جب یہ اصطلاح چین میں آئی

---

(۱) یان شیکائی چینی جمہوریت کا دوسرا صدر تھا۔ ۱۹۱۵ء میں اس نے شہنشاہیت کا دعویٰ کیا۔ چانگ شونگ یان شیکائی کا دست بازو اور زبردست فوجی جنرل تھا۔

[illegible] بعض پڑھا ہو کر جمہوریت کے معنی کا مطالعہ کر چکے ہیں خود مختاری کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا چیز ہے مگر عام کر
بازاری لوگوں سے یا دیہاتی لوگوں سے اگر یہ بات کہیں تو ہرگز ان کی سمجھ میں نہ آئے گی [illegible] تعجب کی نگاہ سے
ہمیں دیکھیں گے۔ نہ صرف یہ لوگ بلکہ بعض نوجوان اور طلبہ یا وہ لوگ جو کہ یورپ اور امریکہ کی سیاست
سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کو اکثر کتابوں میں یہ لفظ نظر آتا ہے۔ پھر بھی اگر ان سے اس کی حقیقت پوچھے
تو وہ ہرگز نہیں بتا سکتے۔ خود مختاری کا مفہوم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک جمعیت کے افراد اپنی جمعیت میں
آزادی سے نقل و حرکت کر سکیں، اور بغیر روک ٹوک کے آجا سکیں۔ بس یہی خود مختاری ہے۔ ایک انگریز
عالم نے کہا ہے کہ ہر فرد کی خود مختاری یہ ہے کہ وہ دوسرے کی آزادی میں خلل نہ ڈالے۔ اور یہی حقیقی خود
مختاری ہے اور اگر اس نے دوسرے کی آزادی میں خلل یا رکاوٹ پیدا کر دی تو یہ خود مختاری نہیں ہے۔

انقلاب چین اور خود مختاری

اس سے قبل اہل یورپ عدم آزادی کے آلام و تکالیف کافی محسوس کرتے تھے۔ اور چونکہ ان میں
آلام و تکالیف کو برداشت کرنے کی تاب نہ تھی، اس لئے وہ مجبور ہو کر آپس میں متحد ہونے اور یک دلی
کے ساتھ آزادی کے واسطے جان تک دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب ان کو آزادی مل گئی تو جمہوری حقوق
کا سوال پیدا ہو گیا۔ آج یورپ اور امریکہ کا انقلابی سیلاب جب چین کی سرزمین پر پہنچا تو چین کے اکثر نئے
تعلیم یافتہ اور محبان وطن سب کے سب خود مختاری کے لئے اٹھے، ان نئے تعلیم یافتہ اور محبان وطن نے
چاہا کہ جس طرح اہل یورپ نے خود مختاری کے لئے فرانس میں ہولناک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اسی طرح
اپنے ملک میں انقلاب پیدا کر دیں تاکہ چین یورپ اور امریکہ کی طرح آزاد ہو۔ ان کے اس رجحان کے
متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بندر کی طرح ہیں جو انسان کے ہر کام کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ دوسرے
شخص کا طرز عمل دیکھتے ہیں، اس کے نقل کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، خواہ وہ جمہوری حقوق کا مفہوم
سمجھیں یا نہ سمجھیں، خواہ انہوں نے غور و فکر سے ان کا مطالعہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، ہماری جماعت کا اصول ثلاثہ
سے ملک میں انقلاب پیدا کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم انقلاب کے ذریعے سے خود مختاری حاصل کرنے
کی کوشش کریں، بلکہ ہمارے انقلاب میں نہایت عمیق معنی مستور ہے، جس کی سمجھ اور واقفیت ہونے کے

ملے محمد وزیر درکار ہے۔ اس سے قبل انقلاب فرانس کا رائج ورڈ (Watchword) آزادی
اور امریکہ کا رائج ورڈ استقلال تھا۔ اس وقت ہمارا رائج ورڈ اصول ثلثہ ہے۔ اس اصول ثلثہ کے
لئے ہم نے بہت سا وقت اور دماغ صرف کیا ہے۔ بہت کاٹ چھانٹ، تحقیق اور نچوڑ کے بعد تب ہم نے
اس کو اپنا رائج ورڈ بنایا ہے نہیں کہ دوسروں کے شور و غل پر ہم بھی چلا اٹھتے ہیں ..... چین میں اس
وقت اگر کوئی آزادی کے لئے تحریک پیدا کرنی چاہتا ہے تو
تکلیف کو نہیں محسوس کرتے ہیں، یہ تحریک بالکل بیکار بلکہ
البتہ اگر کوئی شخص دولت حاصل کرنے کی کوئی تحریک
ارد گرد جمع ہو جائیں گے اور اس کی مدد کرنے کو تیار ...
چاہتے ہیں؟ دولت کمانے کی تحریک ..... ہم کیوں نہ سیدھے سادے الفاظ میں کہہ دیں کہ یہ
تحریک تحصیل دولت کی ہے؟ یہ اس لئے ہے کہ دولت کمانے کی تحریک اور اصول ثلثہ کے درمیان عام
و خاص کا فرق ہے۔ دولت کمانے کی تحریک اصول ثلثہ کو شامل نہیں کر سکتی۔ لیکن اصول ثلثہ میں دولت
کمانے کی تحریک شامل ہے ..... چین میں زمانۂ قدیم سے آج تک اگرچہ آزادی کا نام نہ تھا،
مگر اس کی روح موجود تھی سو وہ بھی ضرورت سے زیادہ تھی۔ صرف وہ آزادی ہم کو مل جانی کافی ہے۔
اس کے علاوہ اور کسی قسم کی آزادی کے ہم محتاج نہیں۔

یورپ میں اس لئے انقلاب پیدا ہوا کہ ان میں آزادی نہ تھی لوگوں نے آزادی حاصل کرنے
کے لئے انقلاب پیدا کیا۔ ہم کو بہت کافی آزادی ملی تھی، ایسی آزادی کہ افراد نے اپنی جماعت کو بھی چھوڑ دیا
جماعت کا وجود جب نہ رہا تو مدافعت کی قوت بھی کم ہو گئی۔ اس بنا پر اہل یورپ ہم کو منتشر ریت کہتے
ہیں ..... اگر چین غیر ممالک کے جبر و استبداد کی مدافعت کرنا چاہتا ہے تو چینی باشندے کو اپنی
انفرادی آزادی توڑنا پڑے گی۔ اس کو توڑ کر ایک قوی اور مضبوط جمعیت قائم کرنی ہوگی جس

---

(۱) (نوٹ صفحہ) جو کہ ڈاکٹر سن یت سین کے اصول ثلثہ کو مانتے ہیں اور ان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

طرح ریت پر سخت بنانے سے، وہ پتھر کی سی مضبوط ہوتی ہے اور جس طرح سمنٹ کو انسان اور جانور کے شکار ہونے
اور پاؤں کے دبانے سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اسی طرح غیر ممالک کے ظلم و ستم چین کو نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔
..... انقلاب چین کو تحریک آزادی نہیں کہا جا سکتا۔ اگر ایسا ہوگا تو یہاں کے باشندے ہمیشہ کے لئے
ریت کی طرح منتشر رہیں گے اور کبھی بھی ان میں ایک مضبوط جماعت تیار نہ ہو سکے گی اور ہم بھی اپنی تحریک کی
اصل منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکیں گے۔

ہمارا انقلابی نعرہ قومیت، جمہوریت اور معیشت ہے۔ جب ہم اپنی قومیت کو عملی جامہ پہنانا چاہتے
ہیں تو ضروری ہے کہ اپنے ملک کی آزادی کے لئے کوشش کریں۔ اس زمانے میں آزادی کا لفظ ہرگز
افراد کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کو ملک کے لئے استعمال کرنا چاہئے، جب ہمارا ملک آزادی
اور خود مختاری سے نقل و حرکت کر سکے تو وہ ضرور ایک طاقتور ملک بن جائے گا ..... طلبہ کا اپنی ذاتی
آزادی کو قربان کرنے سے مطلب یہ ہے کہ روزانہ کاموں میں لگے رہیں، علوم و فنون کے لئے اپنے آپ کو
وقف کر دیں۔ جب علوم و فنون سے واقفیت ہو گئی، غور و فکر کی قوت بڑھ گئی۔ لیاقت و قابلیت پیدا کر لی
تو اس وقت وفاداری سے اپنے ملک کی خدمت کریں۔ سپاہی جب اپنی ذاتی آزادی کو قربان کرے گا
تو وہ ایک نظام اور ڈسپلن کے ماتحت جان و دل سے اپنے ملک اور ہموطنوں کی ذلت اور رسوائی
دور کرے گا۔ اس طریقے سے چین کو حقیقی آزادی مل سکتی ہے ..... چین اب تو دس ملکوں سے زیادہ کا
غلام بنا بیٹھا ہے۔ اس کو مطلقاً آزادی نہیں ہے ہم کو اپنے ملک آزاد کرانے کے لئے بجز انقلابی تحریک
کے کوئی عمل کار آمد نظر نہیں آتا۔ ہمارا انقلابی اصول جو ہے وہ فطرت اور انسانیت کا ایک نچوڑ ہے۔ ہم
ان اصول سے چالیس کروڑ انسانوں کو ملا کر ایک وسیع مگر مضبوط جمعیت قائم کر سکتے ہیں، جب اس جمعیت
کو آزادی مل گئی تو چین اور اس کے باشندوں کو بھی ضرور آزادی مل جائے گی۔ اس وقت چینی قوم حقیقی
آزادی کا لطف اٹھا سکے گی، اگر ہمارے نعرۂ اصول ثلثہ کا فرانس کے انقلاب پسندوں کے نعرے سے
مقابلہ کیا جائے تو فرانس کا نعرۂ آزادی ہمارے نعرۂ قومیت سے مشابہ ملے گا۔ کیونکہ یہی اصول ہیں جو کہ
چین کو آزادی دلانے والے ہیں۔ فرانس کی مساوات ہماری جمہوریت سے مشابہ ہے۔ کیونکہ ہماری

جمہوریت عوام کو سیاسی میدان میں مساوی درجے پہنچاتی ہے۔ جس سے شہنشاہیت مٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس محبت جنس انسان کا نعرہ ہے جس کی اصلیت اخوت ہو۔ اخوت سے مراد یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان بھائی بھائی ہیں۔ ہمارا اس کو محبت جنس انسان سے تعبیر کرنا بالکل درست اور بجا ہے۔ جن وجوہ پر محبت جنس انسان مبنی ہے ان پر ہماری معیشت بھی مبنی ہے کیونکہ ہمارے معیشت کے اصول سے چاہیں کہ ہر انسانوں کی راحت و آسائش [illegible]
انسانوں کو آرام پہنچانا بغیر محبت کے ناممکن ہو۔

انقلاب کی ابتدا

استبدادیت اور شخصیت کے زمانے میں باد

انسانوں میں طرح طرح کے درجات پیدا کر دئے۔ انسان کی عدم مساوات سے ... وثروت کے بے حد جور و تعدی، شدت و جبر کی وجہ سے مظلوم اور دبے ہوئے طبقے کو کہیں جانے کا راستہ نہ ملنے کی وجہ سے انقلاب کا آتش فشاں پہاڑ بنا دیا اور عوام مجبور ہو کر عدم مساوات کو مٹانے کے لئے اٹھے، شروع شروع میں انقلاب سے مطلب یہ تھا کہ انسان میں جو غیر مساوی طبقے و درجے قائم ہوئے ہیں ان کو برابر کر دیا جائے اور عدم مساوات کے جو حدود ہیں ان کو ایک قلم توڑ دیا جائے۔

۱۔ عدم مساوات

مساوات حقیقی اور غیر حقیقی
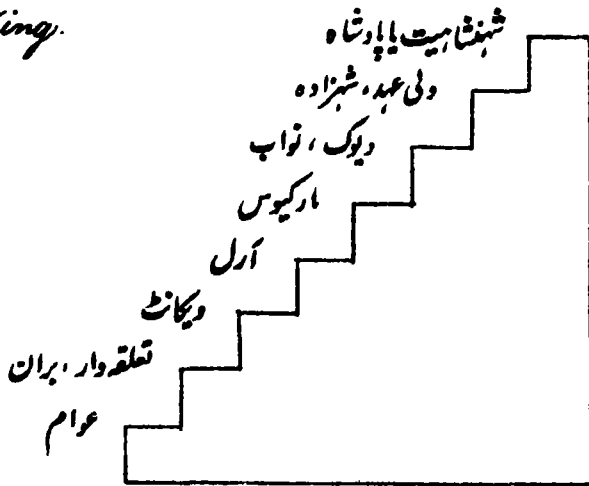
ہر شخص کا ایک دوسرے کے برابر ہونا غیر ممکن ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانے کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ فطرت نے کوئی فطری مساوات انسان میں نہیں رکھی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ انسان میں فطری مساوات ہے، اور وہ ایک حد تک اپنے خیال کو عملی جامہ پہناتا ہے تو وہ دراصل ایک مساوات غیر حقیقی ہوگی (نقشہ نمبر ۱) ایک طرف سے تو برابر معلوم ہوتا ہے، مگر دوسری طرف سے نیچا اونچا نظر آتا ہے۔

جہاں تک سوشیل مساوات کا تعلق ہے انسان کا پہلا قدم ایک ہموار اور عام پلیٹ فارم پر ہونا چاہئے پھر آہستہ آہستہ حسب لیاقت اور فطانت ہر ایک کو اپنی حیثیت کے کام انجام دینا چاہئے، چونکہ انسان کی فطانت و ذہانت فطرۃً مختلف ہے، لہٰذا اس سے جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ بھی مختلف ہے۔ اس واسطے انسان میں فطری مساوات کہاں سے ہو سکتی ہے، ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص کو لیاقت اور ذہانت کے مطابق اپنی حیثیت پر قائم رہنا چاہئے تاکہ حقیقی مساوات ہو سکے۔ اگر لیاقت اور ذہانت کا لحاظ کیا جائے تو جب کوئی شخص بڑی حیثیت اور اونچے مقام پر پہنچ گیا تو لوگ (اس سے نیچے کے لوگ) جبراً و قہراً ہم حیثیت کرنے کی غرض سے، اس کو نیچے کی طرف کھینچ لائیں گے۔ اگر دنیا میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو ترقی کیسی ہو سکتی ہے، بلکہ وہ پستی کی طرف چلی جائے گی۔ اس وجہ سے جب ہم جمہوری مساوات پر بحث کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا میں ترقی بھی ہو، تو ہم کو یہ طرز عمل اختیار کرنا چاہئے کہ تمام جنس انسان سیاسی میدان میں ایک عام مقام پر کھڑی رہے کیونکہ مساوات تو انسان کی ایجاد کردہ چیز ہے نہ کہ قدرت کی۔ پس انسان کی ایجاد کردہ مساوات صرف سیاسی معاملے میں کارآمد ہو سکتی ہے۔ اس واسطے چین کے اس انقلاب کے بعد جب ہر شخص کا مقام سیاسی میدان میں برابر ہو جائے (نقشہ نمبر ۲) تو یہی حقیقی مساوات ہے۔

انقلاب چین اور مساوات
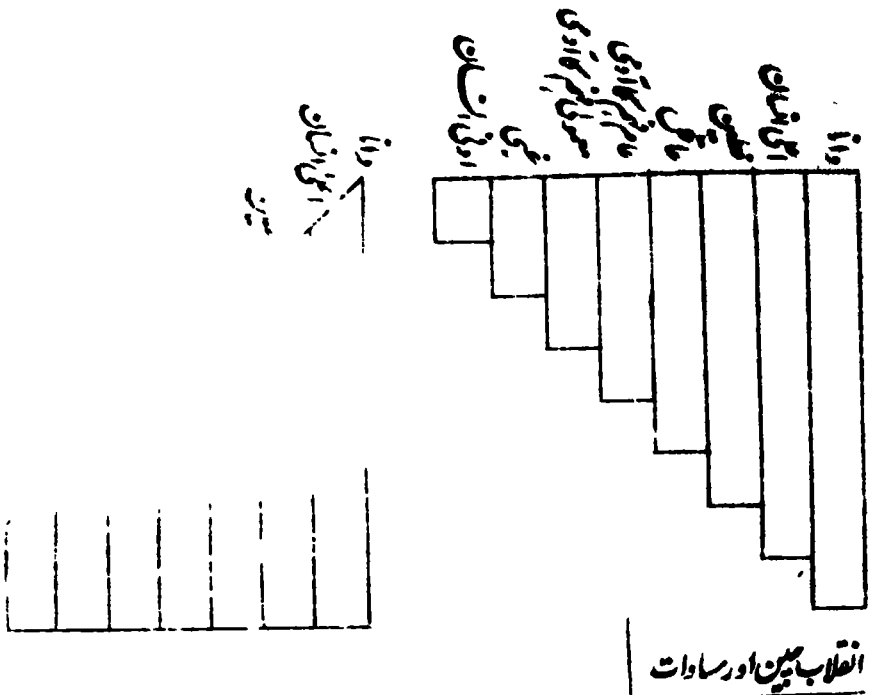
چین کے اہل انقلاب مساوات اور آزادی کو مقدم نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ سب سے پہلے عوام کے تین اصول کو پسند کرتے ہیں اس لئے کہ جب ان اصول ثلثہ کو عملی جامہ پہنایا جائے گا تو مساوات اور آزادی خود بخود آ جائے گی۔ چین میں کبھی مساوات یا آزادی کے لئے کوئی جنگ نہیں پیدا ہوئی۔ یہاں ہزاروں سال سے تخت شاہی اور شہنشاہیت کا خیال جو کہ لوگوں کے دماغوں میں اب تک باقی رہا ہے چین کے غیر مکمل انقلاب کا باعث ہوا۔ چونکہ ہم ان خیالات کو مٹانا چاہتے ہیں اور لوگوں کے دماغوں سے انہیں جڑ سے اکھاڑنا چاہتے ہیں لہذا ہمیں مجبوراً انقلاب کی تحریک اختیار کرنی پڑتی ہے۔

اب ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ حقیقی مساوات اور آزادی کا قدم کسی جگہ پر قائم اور کسی چیز کے ساتھ وابستہ ہونا چاہئے۔ حقیقی مساوات اور آزادی کی بنیاد جمہور کے سیاسی حقوق پر کھڑی ہونی چاہئے۔ اور صرف اسی سے وابستہ ہونی چاہئے۔ جب جمہور کے سیاسی حقوق کی بنیاد نہ ہو تو مساوات اور آزادی کیونکر حاصل اور محفوظ ہو سکتی ہے۔ اس واسطے چین میں انقلاب پسندوں نے تحریک پیدا کر دی۔ ان کی غرض وغایت

گو یہ مساوات اور آزادی (ملکی آزادی نہ کہ انفرادی) ہی، مگر جمہوریت اُن کے اصول اور اختلافی نفس سے خارج نہیں کی جا سکتی کیونکہ حقیقی جمہوریت حاصل کرنے پر ہی تو عوام کو مساوات اور آزادی مل سکتی ہے اور اسی وقت وہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے مساوات اور آزادی جمہوریت میں شامل ہیں۔ اہل یورپ اور امریکہ اب تک جمہوریت کے لئے جہاد کرتے ہیں...... مساوات کی خرابیاں جو یورپ اور امریکہ میں پھیلی ہوئی ہیں وہ اس لئے ہیں کہ انھوں نے مساوات کو ایک ناگزیر اور شے سمجھ رکھا ہے..... مساوات اگر کسی زمانے میں مفید ثابت ہو تو ضرور اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، ورنہ اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ جمہوریت کو اس وقت ترقی اور وسعت دی جا سکتی ہے، جب کہ مساوات اور آزادی عوام اور حکومت دونوں کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہو۔

لیاقت اور ذہانت میں فطری عدم مساوات

دنیا میں جتنے انسان ہیں فطری فطانت و ذہانت کے لحاظ سے عموماً تین طبقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ (یعنی جاننے والا اور سمجھنے والا، یہ جاننے اور نہ سمجھنے والا۔ اور نہ جاننے اور نہ سمجھنے والا) اعلیٰ وہ لوگ ہیں جو مفکرین، موجدین، مخترعین اور مرشدین ہیں اوسط وہ لوگ ہیں جو مبلغین، مخبرین، منبہین اور مبشرین ہیں اور ادنیٰ وہ لوگ ہیں جو کہ لوگوں کے ارشاد و ہدایت پر عمل کرتے ہیں اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں۔ دنیا میں یہ تین قسم کے آدمی موجود ہیں۔ ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں اور سب کی ہم آہنگی سے دنیا کی تہذیب اور شائستگی میں ترقی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ انسان میں فطانت اور ذہانت کے لحاظ سے عدم مساوات پیدا کر رکھا ہے، مگر انسان یہ چاہتے ہیں کہ ان میں مساوات ہو، گویا کہ یہ انسان کی ایک اعلیٰ اخلاقی غایت ہے جس کے لئے وہ کوشش کر سکتے ہیں، اور یہ کوشش بھی کرنا چاہئے۔

مساوات کی حقیقت

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ دنیا میں تین مختلف قسم کے آدمی موجود ہیں۔ ان میں مساوات ہونا ناممکن ہے۔ اگر انسان ان میں مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس مساوات کی غرض و غایت

صرف انسانی خدمت ہونا چاہیے، نہ کہ تعصب و طرفداری۔ فطین اور ذہین لوگوں کی لیاقت و قابلیت ضرور
اوسط درجے کے لوگوں سے بالاتر ہے، وہ اپنی لیاقت اور قابلیت سے ہزارہا انسان کی خدمت کرسکتے
ہیں، اور ان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں، اوسط درجے کے لوگ حسب لیاقت و قابلیت سو سو آدمی کی خدمت
کرسکتے ہیں، اور ان کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں معمولی آدمی اپنی لیاقت و قابلیت کے مطابق دو چار مجھ جیسا
کی خدمت کرسکتے ہیں اور ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں۔

خدمت کرسکتے ہیں اور اس کے لئے کارآمد ثابت ہو

ہے اس شخص کو اتنے کام کرنے کا موقع دینا چاہیے

رہیں اور ذاتی اور شخصی خیال چھوڑ کر بنی نوع انسان کا لحاظ

مساوات ہے، مگر انسان اپنے اخلاقی نقطۂ نظر سے مساوات پیدا کرسکتے ہیں، پس یہی مساوات کی
حقیقت ہے۔

مغرب میں جمہوریت کی تاریخ

دنیا کی جمہوری حکومت کے نشو و نما کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوا کہ سب سے پہلے اس
کی تحریک امریکہ میں ہوئی۔ اس زمانے میں جمہوریت پسندوں کے درمیان دو فریق تھے، ایک تو جیفرسن
کی پارٹی تھی کہ حاکمانہ قوت عوام کے ہاتھ میں رہنا چاہیے خود ہیملٹن اس کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حاکمانہ
قوت حکومت کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ آخر مؤخر الذکر کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ حقیقی جمہوریت کی پہلی رکاوٹ
تھی دوسرا انقلاب فرانس تھا جس سے عوام کو ضرورت سے زیادہ حقوق حاصل ہوگئے۔ ان حقوق کو
غیر مناسب طور پر استعمال کرنے سے وہاں مفسد اور فتنہ انگیز لوگوں کی حکومت ہوگئی۔ یہ جمہوریت
کی دوسری رکاوٹ تھی۔ تیسری مرتبہ بسمارک نے (جرمن سیاست داں) اپنی غیر معمولی چالاکی اور حکمت
عملی سے جمہوریت کے مٹانے کی کوشش کی۔ یہ تیسری رکاوٹ ثابت ہوئی۔ یہی جمہوریت کے نشو و نما
کی مختصر تاریخی حالات ہیں جو کہ ممالک مغرب میں گزرے۔ غرض یہ ہے کہ اہل یورپ و امریکہ جب مساوات
اور آزادی کے لئے اٹھے تو ان کو سیاسی حقوق ملے۔ مگر جب ان حقوق میں ترقی اور وسعت ہوتی گئی تو ان

محدود طرح کی خرابیاں اور پیچیدگیاں رونما ہوئیں۔ جمہوریت کے بڑے کھلے ہے پہلے لوگوں نے اس کو دبا نا
شروع کیا۔ شخصیت اور استبدادیت کے ہتھیار سے توڑنے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں جب
شہنشاہیت کو گرا دیا گیا تو جمہوریت پسند لوگوں نے حقیقی جمہوریت میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ اور جب اس
کو عملی جامہ پہنانے لگے تو طرح طرح کی خرابیاں ظاہر ہوئیں۔ ان خرابیوں کی وجہ سے جمہوریت اپنے حقیقی
جوہر نہیں دکھا سکی اور عوام کے لئے فائدہ مند ثابت نہ ہوئی۔ آخر جب بسمارک نے دیکھا کہ جمہوریت کو جو کہ علم
کے رجحان کے مطابق ہے، نہیں دبایا جا سکتا تو اس نے بجائے جمہوری قوت کے حکومت کی قوت استعمال
کرنی شروع کی تاکہ ملک میں ایک قومی اشتراکیت کا نظام قائم ہو۔ یہ طرز عمل بھی جمہوریت کے لئے رکاوٹ
ثابت ہوا۔ جمہوریت کی تحریک اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلی کوشش تو امریکہ ہی میں کی گئی
مگر اس وقت جمہوری حکومت سے عوام کو جو حقوق ملے وہ صرف حقوق انتخاب تھے۔ اس زمانے میں
ممالک مغرب کے لوگ یہی سمجھتے تھے کہ جمہوری حقوق صرف انتخاب پر محدود ہیں، جب ہر شخص کو، خواہ وہ شریف
ہو یا حقیر، غنی ہو یا فقیر، دانشمند ہو یا نادان، انتخاب کا حق مل گیا تو یہ سمجھ لیجئے کہ ان کے جمہوری حقوق
کافی ترقی اور وسعت پا چکے۔ مگر گردش ایام کا تماشا دیکھئے جنگ عظیم کے بعد ہوا کا رخ بدل گیا، حالت
اور ہو گئی۔ اس اثنا میں اگرچہ بیحد رکاوٹیں جمہوریت کے درمیان آ کر حائل ہوئیں مگر جمہوری حقوق کا
چرچا دن بدن زور پکڑتا جاتا ہے۔ اور ان میں کوئی رکاوٹ موثر نہیں ہو سکتی ہے۔ موجودہ زمانے میں
اہل سوئزرلینڈ کو حقوق انتخاب کے علاوہ استشراع (۱) (Initiative) اور حقوق ترمیم یا
تصحیح شرع (Referendum) بھی حاصل ہیں یعنی عوام کو افسران کے متعلق انتخاب کے حقوق
دارالعوام میں کسی قانون بنانے کے لئے مسودہ پیش کرنے کے حقوق، اور کسی پرانے قانون میں ترمیم
یا تصحیح کرنے کے حقوق حاصل ہیں۔ اگر اکثریت ایک بات اچھی سمجھتی ہے تو ان کو حق ہے کہ دارالعوام میں
اس کے قانون بنانے کے لئے تجویز پیش کرے، یا دارالعوام سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ اس کے لئے قانون

(۱) مجموعہ اصطلاحات، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں لکھا ہے کہ Initiative ہدایت اور Referendum
مراجعت ہے۔

بناسکے، اس کو حق استشراع کہتے ہیں۔ اور اگر اکثریت کسی پرانے قانون کے متعلق خیال کرے کہ وہ رفتار زمانہ کے مطابق نہیں ہے، ملک و قوم کے لئے غیر مفید ہے تو اس کو حق ہے کہ اس میں کوئی ترمیم یا تنسیخ کی تجویز پیش کرے اس کو حق اصلاح یا تنسیخ کہتے ہیں۔ لہذا اہل سوئٹزرلینڈ کو غیر ممالک کے لوگوں سے دو حقوق زیادہ حاصل ہیں، اس طرح پر ان کو تین حقوق حاصل ہیں۔ امریکہ کے مغربی شمالی حصے ... کثرت سے نئی آبادی ہے وہاں کے باشندوں کو بہ نسبت ...

یعنی حق استرجاع (Recal ...)

اور جگہ پر مقرر کرنا یا اس کو کسی وجہ کی بنا پر ملازمت سے۔

یہ حقوق اگرچہ عام طور پر نہیں پھیلے ہیں، مگر اکثر حصے ...

حقوق حاصل ہیں یعنی حق انتخاب، حق استشراع، حق تنسیخ، حق استرجاع یہ چار حقوق مغربی شمالی امریکہ میں کافی طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ آئندہ چل کر تمام امریکہ میں پھیلنے کی امید ہے بلکہ یوں کہئے کہ تمام دنیا میں پھیلنے کی امید ہے آئندہ زمانے میں اگر جمہور کو کافی حقوق ملنے کی توقع ہے تو ضرور امریکہ کے ان چار حقوق پر عمل کرنا پڑے گا۔

چین کے اہل انقلاب و جمہوریت

ہماری جماعت اصول ثلثہ سے چین کو ترقی یافتہ اور خوشحال بناسکتی ہے، ہماری نظر میں جو جمہوریت ہے وہ یورپ اور امریکہ کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔ ہم صرف ان کی تاریخ سے کچھ مواد اخذ کرسکتے ہیں نہ یہ کہ مکمل طور پر انکی تقلید کریں اور قدم بقدم ان کے پیچھے چلیں۔ ہم جمہوری حقوق کے اصول سے ملک چین میں عوام کی ایک مکمل حکومت قائم کرسکتے ہیں اور یہ جمہوریت یورپ اور امریکہ کی جمہوریت سے بھی بالاتر ہوگی۔

اہل چین میں حس خود اعتمادی کا فقدان

۱۹۰۰ء میں چین کے رضاکاروں کی جو جماعت تھی وہ اہل چین کے اعتماد خودی اور قوت خودی کا آخری مظاہرہ تھا جو یورپ اور امریکہ کی نئی تہذیب کا مقابلہ کرسکتا تھا . . . چین کے بعض

مفکرین کی رائے ہو کہ چین کو ترقی اور قوت حاصل کرنے کے لئے غیر ممالک کی تقلید کرنی ضروری ہو، نہ صرف ادبیات اور سائنس میں بلکہ سوشل اور سیاسی تعمیری کاموں میں بھی . . . . . اہل چین میں اعتماد خودی کا حس بالکل معدوم ہو گیا اور بجائے اپنے اوپر بھروسا کرنے کے تقلید کا خیال دن بدن ان کے دماغوں کے اندر گھستا جاتا ہے . . . . غیر ممالک کے ان خیالات کو جن پر اب تک اہل یورپ خود بھی کاربند نہیں ہو سکے ہیں، ہمارے بعض ہموطن عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں . . . . غیر ممالک کی تقلید کرنے کی وجہ سے اہل چین اپنی ذاتی چیزوں کو چھوڑنا پسند کرتے ہیں اور ہر کام میں ان کی چال اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، جب کبھی غیر ممالک کی کوئی نئی بات سنائی دیتی ہے تو فوراً ہمارے نوجوان اس کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔

مغرب کی مادی ترقی اور سیاسی فلسفہ

مغرب میں سیاسی فلسفے کی رفتار اتنی تیز نہیں ہو جتنی کہ مادی ترقی کی۔ ان کے موجودہ سیاسی تخیل اور ہزار سال پہلے کے سیاسی فلسفے میں اصولاً کوئی بڑا فرق نہیں ہو۔ اگر ہم سیاسی میدان میں ان کے پیچھے اس طریقے سے چلیں جس طرح ہم مادی میدان میں ان کی تقلید کرتے ہیں تو یہ ایک بڑی غلطی ہو گی۔ ان کی مادی ترقی دن بدن مختلف رنگ اختیار کرتی ہے . . . . . اس کے سیکھنے میں ہمیں اچھی طرح ان کے ساتھ قدم بقدم چلنا مشکل معلوم ہوتا ہو۔ مگر برخلاف اس کے ان کی سیاسی رفتار بہت ہی سست اور بیجان سی ہے۔ مثلاً انقلاب امریکہ کے بعد جمہوریت نے جو صورت اختیار کر لی تھی اور عوام کے حقوق میں جس قدر وسعت ہوئی اس میں اور موجودہ جمہوری حالت میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ بلکہ تقریباً وہی ہے جو تھی۔ اب فرانس میں جس جمہوریت پر عمل کیا جاتا ہے، وہ زمانہ انقلاب کی جمہوریت سے کہیں پست ہو۔ ہم کو غیر ممالک کی تقلید میں ضرور ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے اور ان میں تمیز کرنا چاہئے، غیر ممالک میں جمہوری حقوق کے زیادہ تیزی کے ساتھ نہ پھیلنے کی وجہ جو ہوئی وہ یہ ہے کہ ان کو اصولاً جمہوری حقوق کا کوئی حل نہ ملا۔

تشکیل جمہوریت میں چین کو غیر ممالک کی تقلید نہ کرنا چاہئے

مغرب کے رسم و رواج جو چین سے مختلف ہیں، وہ بہت ہیں اگر چین نے اپنے رسم و رواج کا لحاظ نہ کیا

اور غیروں کو سوشیل اور سیاسی حقوق میں اس طریقہ سے تقلید کی جس طرح ہم مشین چلانا سیکھتے ہیں تو اس بڑی
کمی حماقت نہیں ہوسکتی مجسم مشین تو مادے سے بنائی جاتی ہے مگر غیر مجسم سیاسی مشین نفسیات کے اوپر
تعمیر کی جاتی ہے۔ موجودہ صدیوں کے اندر مشین سازی میں بے شمار اختراعات ہوئیں مگر نفسیات میں
اس میں تیس برس کے عرصہ میں کچھ ترقی ہوئی وہ بھی پورے طور پر نہیں۔ اس لئے [illegible] نفسیاتی مشین
کے تیار کرنے میں جو قوم کی ترقی کے لئے بنائی جاتی ہے [illegible]۔

... جہاں تک اہل مغرب کی سیاست کا تعلق ہو ان کے طرز عمل
تمام انتظامات اصولاً اب تک لاعمل رہے ہیں [illegible]
اور پیچیدگیوں کو حل کرنا چاہتا ہے تو اسے اصول
اخذ نہ کرنا چاہئیں۔ ضرورت یہ ہو کہ ہم خود ایک نئی قوت [illegible] کام [illegible]
عقدہ حل ہو جائے۔ اگر اس وقت ہم اندھوں کی طرح دوسروں کے سہارے سے قدم اٹھائیں گے
تو آئندہ چل کر ہماری قومی زندگی بالکل تلخ ہو جائے گی۔

حقوق اور قوت

سوئٹزرلینڈ کے ایک عالم کہتے ہیں کہ جس ملک میں عوام کو سیاسی حقوق مل گئے، حکومت کی قوت گر گئی
اس کی وجہ یہ ہوئی کہ عوام کو ڈر تھا کہ حکومت اپنی قوت پر جمی رہ جائے گی اور جمہور اس پر قابو نہ پا سکیں گے
اس واسطے لوگ حکومت کی قوت کو محدود کر دیتے ہیں۔ تاکہ جمہور طاقتور بن جائیں یہی وجہ ہے کہ جس ملک میں
جمہور کے سیاسی حقوق وسیع ہو گئے تو اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے جدید صورتیں نکالنے کی ضرورت
محسوس ہوئی۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے عوام کو چاہئے کہ وہ اپنے رویہ کو حکومت کے متعلق بدلیں
شروع شروع میں عوام برابر حکومت کے متعلق مخالفانہ رائے ظاہر کرتے رہتے تھے۔ انقلاب کے بعد جب
ان کو آزادی اور مساوات مل گئی اور دن بدن ترقی ہونے لگی تو بعض لوگوں نے آزادی اور مساوات کو
غیر محدود سی چیز سمجھ لیا۔ اس تجاوز اور تعدی کی وجہ سے حکومت کچھ انتظامی کام نہیں کر سکی اور جب حکومت
بیکار ہو گئی تو ملک میں اگرچہ اس کا نام موجود ہے۔ مگر درحقیقت وہ عدم حکومت کے برابر ہو۔

موجودہ زمانے میں عوام نے حکومت کے متعلق جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کو اصل بدلنا چاہیے۔
مگر سوال یہ ہے کہ اس کی صورت کیا ہو؟ مغرب کے علماء نے اگرچہ اس بات کو محسوس کیا ہے۔ مگر اب تک
کوئی نئی ترکیب ان کے ذہن میں نہیں آئی۔ ہم جو انقلاب کا جھنڈا بلند کر کے جمہوری حقوق کے حامی بن بیٹھے
ہیں، ہمارے ذہن میں ایک معقول ترکیب آئی ہے۔ ہماری یہ ترکیب دنیا کی ایک نئی ایجاد ہے۔ جو
ترکیب ہم نے سوچ رکھی ہے وہ اس مسئلے کے اصول کو حل کرتی ہے۔ ہماری یہ ترکیب سوئٹزرلینڈ کے
موجودہ علماء کی رائے سے ملتی جلتی ہے۔ انھوں نے بھی یہی سوچا ہے کہ عوام کے رویہ کو حکومت کے
متعلق بدلنا چاہیے، جب کہ اور لوگ بھی ہمارے ہم خیال ہیں تو یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ہمارا خیال جو کہ عرصہ
سے ذہن میں گردش کر رہا ہے کسی مغالطے پر مبنی نہیں ہے۔ ہماری نئی ترکیب کیا ہے؟ وہ یہ کہ عوام کے
سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت میں فرق کرنا چاہیے۔ ان میں فرق کرنے کا خیال ہماری نو ایجاد
ہے جو یوروپین یا امریکن علماء کے ذہن میں نہیں گزرا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں جمہور کے سیاسی حقوق پر جو عمل درآمد ہوا ہے اس کے متعلق عوام کا ذہن
مخالفت سے خالی نہیں اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت میں
کوئی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ چین کو یورپ اور امریکہ کے اس عمل پر ہو بہو نہ چلنا چاہیے، بلکہ ہماری بتائی
ہوئی ترکیب کے مطابق قدم اٹھانا چاہیے یعنی حقوق اور قوت میں ایک نمایاں حد قائم رکھنا ہوگی جس
سے لوگ معلوم نہ کر سکیں کون کونسے عوام کی سیاسی حقوق ہیں اور کون کون سی حکومت کی انتظامی قوت
ہے۔ جب عوام حقوق اور قوت کے درمیان تمیز کر لیں گے تو ان کا وہ رویہ جو انھوں نے حکومت کے متعلق
اختیار کر رکھا ہے، خود بخود تبدیل ہو جائے گا اور حکومت بھی پورے طور پر اپنے انتظامی کاموں میں
ترقی اور استواری پیدا کر سکے گی۔ چین میں عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت میں
حد بندی قائم کرنا نہایت آسان ہے اس لئے کہ چین کی تاریخ میں آطو(۱) اور چو کو آلانگ کی مثال موجود ہے۔

---

(۱) آطو چین کا ایک حکمراں تھا۔ چو کو آلانگ اس کا وفادار وزیر تھا۔ ملک کے تمام انتظامات، حکومت کے سارے
نظم و نسق اسی کے ہاتھ میں اور اسی کے اختیار میں تھے۔

اگر حکومت اچھی ہے تو چالیس کروڑ آدمیوں کو چاہئے کہ اس کو چو گولاینگ سمجھیں اور ملک میں جتنی انتظامی قوتیں ہیں سب کی سب اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ اگر حکومت اچھی نہیں ہے تو عوام کو اختیار ہے کہ وہ تمام قوتیں واپس لے لیں اور اپنے کام آپ چلائیں۔ یورپ و امریکہ کے لوگ حقوق اور قوت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اس لئے آج تک تقریباً تین سو برس سے ان میں جمہوری حقوق کا سلسلہ لاینحل چلا جا رہا ہے۔

ہم جب عوام کے سیاسی قوت اور جمہوریت کے اصول [illegible] تو یورپ کی تقلید نہ کرنا چاہئے، بلکہ سب سے پہلے ہم حقوق اور قوت [illegible] ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ جو لوگ صاحب حقوق [illegible] اور ٹھیک راہ پر ان کو چلائیں تاکہ ہم ان پریشانیوں اور ان غلطیوں میں گرفتار نہ ہوں جن میں وہ مبتلا ہوئے، یورپین اور امریکن [illegible] رویہ کو محسوس کیا ہے۔ اور اس پر غور کر رہے ہیں کہ اس کو دور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی ترکیب نکالیں۔ مگر کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اب تک وہ نہیں بتا سکے۔ ہم نے تو اس ترکیب کو نہایت صاف اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے یعنی حقوق اور قوت کی تفریق جس کا مزید ذکر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک ملک کے سیاسی معاملے کا تعلق ہے عوام کو اصولاً سیاسی حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ جہاں تک امور جمہور کو چلانے کا تعلق ہے حکومت کو انتظامی قوت حاصل ہونا چاہئے اور تمام انتظامات قوم کے خاص خاص مگر لائق و فائق ماہرین کے ہاتھ میں سپرد کر دینا چاہئے۔ عوام حکومت کے افسران کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں کہ وہ محترم معزز نامور اور مشہور صدر ہے یا وزیر بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھیں کہ مکان کی حفاظت کرنے والا دربان، کھانا پکانے والا باورچی، علاج کرنے والا طبیب، گھر بنانے والا معمار، موٹر چلانے والا ڈرائیور اور کپڑے سینے والا درزی ہے — اس قسم کے نام جو چاہے رکھئے۔ جب عوام حکومت اور افسران کے متعلق یہ رویہ اختیار کر لیں گے تو ملک کے معاملے سدھر جائیں گے اور حکومت و قوم کو ترقی مل سکے گی۔

جمہور کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت

چونکہ ہم نے عوام کے سیاسی حقوق اور حکومت کی انتظامی قوت کے درمیان حدود قائم کر رکھی ہیں

اس لئے اس سے جو سیاسی کل بنتی ہے وہ بالکل مادی مشین کے مانند ہے۔ اس کا ہر ہر پرزہ، ہر ہر جز اپنی طاقت اور قوت کے مطابق اپنا اپنا کام کرتا ہے۔ پرزے کی قوت اور ہے اور مشین کو چلانے کی قوت اور ہے۔ اس نو ایجاد سیاسی کل سے ایک جدید نظام حکومت تعمیر ہوتا ہے۔ جدید نظام حکومت بغیر ان دونوں قوتوں کے مل جل کر کام کرنے کے ناممکن ہے بلکہ بغیر ان کے حدود معلوم کرنے کے بھی ناممکن ہے کیا کسی طریقے سے ہم ان کے حدود اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں؟ اس کے لئے ضرورت یہ ہے کہ ہم اصولی طور پر سیاسی حقوق اور انتظامی قوت پر نظر ڈالیں۔ حقوق تو عوام کے ہیں سیاسی حقوق ان قوتوں کو کہتے ہیں جو اجتماعی زندگی کا ربط و ضبط اور نظم و نسق پیدا کرتی ہیں اور انتظام عوام کے کاموں کو چلانے کا دوسرا نام ہے۔ وہ قوت جو کہ جمہور کے امور کو ہم آہنگی کے ساتھ چلاتی ہے، حکومت کی انتظامی قوت ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس کے انتظامی حقوق ہیں، ایک حکومت میں دو مختلف قوتیں موجود ہیں، ایک تو عوام کے سیاسی حقوق، دوسری حکومت کی انتظامی قوت۔ ان میں سے ایک حکومت کی نگرانی کرنے کی قوت ہے دوسری حکومت کی ذاتی قوت ہے جس سے وہ لوگوں کے بتائے ہوئے فرائض کو انجام دیتی ہے۔ چونکہ ہم نے ایک نظام حکومت کے عناصر دو بڑی قوتوں میں تقسیم کر دئے ہیں، اس لئے سیاسی قوت پوری کی پوری عوام کے ہاتھ میں رہنا چاہئے، جب انھوں نے قبضہ کر لیا تو بلا واسطہ حکومت کی نگرانی کر سکتے ہیں اور بلا واسطہ امور سیاست میں رائے دے سکتے ہیں۔ دوسری انتظامی قوت ہے یہ قوت مکمل طور پر حکومت کے قبضے میں رہنا چاہئے جبکہ حکومت نے اس قوت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، تو وہ اچھی طرح سے اپنے ملک کا انتظام کر سکتی ہے۔ اور امور جمہور کو بخوبی انجام دے سکتی ہے۔ اور اپنی قوم کے لئے خوش حالی اور فارغ البالی پیدا کر سکتی ہے۔ یہی انتظامی قوت یا انتظامی حقوق ہیں۔

جمہور کے سیاسی حقوق

جمہوری حقوق کے متعلق جو طرز عمل اختیار کیا گیا ہے۔ کیا ان میں کوئی نئی ترکیب نہیں نکالی گئی ہے؟ جمہور کا پہلا حق، حق انتخاب ہے۔ موجودہ زمانے میں جو جمہوریت کے ترقی یافتہ ملک ہیں، اُن کے عوام کو صرف ایک حق انتخاب ملا ہے۔ کیا صرف اس ایک ہی حق پر کار بند ہو جانا دنیا کی سیاست کے لئے کافی

ہے وہ صرف اس ایک ہی حق پر عمل کرتا۔ گویا پرانے زمانے کی ایجاد شدہ مشین کو استعمال کرتا ہے جس میں
صرف مشین کو آگے کی طرف چلایا جا سکتا ہے۔ اور پیچھے کی طرف نہیں ہٹایا جا سکتا! نئی ترکیب ہم نے جو نکالی
ہے وہ یہ ہے کہ حق انتخاب کے علاوہ حق استرجاع بھی ہو Recall جب عوام ان حقوق کے پرزے کو
دبائیں گے تو جو چیز واپس طلب کرنا ہو، خود بخود واپس آجائے گی ۔ دونوں حقوق [illegible] گرانی کرنے
کے ہیں، عوام ان دونوں حقوق سے کسی کو افسر بنا کے باہر بھیج [illegible]
افسران کا آنا جانا عوام کی مرضی سے ہو سکے گا، گویا کہ یہ ایک [illegible]
کی طرف ہٹانا اس کے انجن کی حرکت سے ہوتا ہے [illegible] ملک میں [illegible]
ان کے علاوہ، قانون کی ضرورت ہے۔ یعنی عوام کے امور [illegible]
ہے۔ اس کے متعلق عوام کو کیا حقوق حاصل ہونے چاہئیں کہ وہ قانون کی نگرانی کرسکیں؟ اگر جمہور کسی بات
کے متعلق یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کے لئے مفید ہے تو وہ اس کے قانون بنانے کے لئے تحریک
کریں، تجویز پیش کریں، یا دارالعوام سے مطالبہ کریں کہ وہ اس کے لئے ایک قانون بنا دے۔ اس قسم کے
حق کو حق استشراع (۱) کہتے ہیں۔ یہ ان کا تیسرا حق ہے، اگر جمہور یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ قانون جو کہ عرصہ
سے ملک میں جاری ہے، اور ملک کی حالت اور زمانے کی رفتار کے لحاظ سے اس کا بجنسہ باقی رہنا عوام
کے لئے غیر مفید بلکہ مضر ہے۔ تو اس کے لئے بھی عوام کو ایک حق ہونا چاہئے جس سے وہ اس غیر مفید
قانون میں کچھ تبدیل اور ترمیم کرسکیں۔ ترمیم و تصحیح کے بعد عوام کو حق ہے کہ وہ حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ
اس ترمیم شدہ قانون کو نافذ کرے اور اصلی قانون کو منسوخ کردے۔ اس حق کا نام حق ترمیم یا تصحیح ہے۔ یہ عوام
کا چوتھا حق ہے۔ عوام یہ چار حقوق اپنے ہاتھ میں رکھنے کے بعد کہہ سکتے ہیں کہ انکو کافی حقوق مل گئے ہیں
اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بلاواسطہ جمہوری حقوق کے حقدار ہوگئے ہیں، اس سے پہلے تو عوام کو کافی حقوق
نہیں ملتے تھے عوام صرف اپنے نمائندوں کے انتخاب کرسکتے تھے۔ مگر ان کے انتخاب کے بعد ان کو کوئی
حق نہ تھا کہ وہ اور چیزوں کے متعلق کچھ دریافت کرسکیں، اس قسم کے حقوق بلاواسطہ جمہوری حقوق کہلاتے
ہیں۔ بلاواسطہ جمہوری حقوق سے مطلب حکومت مندوبین ہے۔ مندوبین کے توسط سے عوام حکومت

(۱) یعنی قانون بنانے کی تحریک عوام کی طرف سے

کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور بالترتیب ان کو کوئی حق نہیں کہ وہ ان کی نگرانی کریں۔ جب ان چار حقوق پر پوری عمل در آمد ہو جائے جن کے ذریعے سے عوام حکومت کی نگرانی کر سکیں تو اپنی حکومت کو حکومت جمہوری کہہ سکتے ہیں۔

حکومت کے لازمی انتظامی حقوق

حکومت کے دفتری حقوق، آجر کے حقوق کی طرح ہیں، یعنی وہ حقوق جن سے حکومت عوام کے کاموں کو انجام دیتی ہے ..... حکومت جس قسم کا کام کرے عوام کی مرضی سے ہونا چاہئے مگر حکومت کو اپنے کام کرنے کے حقوق بھی تو ملنا چاہئیں۔ کام کرنے کے حقوق ملنے کے بعد حکومت ان حقوق کے مطابق اور ان کے حدود کے اندر جو چاہے کر سکتی ہے۔ اگر عوام دیکھیں کہ حکومت کا قدم اپنے جائز حدود سے باہر نکلا ہے تو اس کو روک سکتے ہیں۔

حکومت کے مکمل نظام اور بخوبی کام کو انجام دینے کے لئے پانچ حقوق اساسی کی ضرورت ہے۔ ان پانچ انتظامی حقوق کی بنیاد پر حکومت کا مکمل نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور انہی سے حکومت امور عامہ کو بخیر و خوبی انجام دے سکتی ہے۔

مکمل جمہوری حکومت کا نظام

جب حکومت اور عوام دونوں حقوق اور قوت رکھتے ہوں تب دونوں کا توازن قائم ہو سکتا ہے۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ان کو چار بڑے بڑے حقوق تو مل گئے، یعنی حق انتخاب، حق استرجاع، حق استشراع اور حق ترمیم یا تنسیخ۔ مگر اب تک حکومت کو ایک حق بھی نہیں ملا! ـــ نہیں، نہیں حکومت کے لئے پانچ حقوق محفوظ ہیں، یعنی حق عاملہ، حق شارع یا قانون سازی، حق عدالت، حق معائنہ اور حق مواخذہ۔ عوام اپنے چار سیاسی قوتوں سے، حکومت کی پانچ انتظامی قوتوں کی نگرانی کرتے ہیں۔ اور حکومت اپنی پانچ انتظامی قوتوں سے امور عوام کو چلاتی ہے اور باہم منسلک کرتی ہے یہی سب سے اچھی صورت ہے جس سے جمہور کا مکمل نظام حکومت قائم ہو سکتا ہے۔ اب ہم نقشے کے ذریعے سے ان بڑی قوتوں کے تعلقات ظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگ اس کو ذہن نشین کر لیں اور ان کے بین اور

واضح طور پر معلوم کر سکیں۔ پہلا نقشہ جمہور کی سیاسی قوتوں کو بتاتا ہے اور دوسرا نقشہ حکومت کی انتظامی قوتوں کو۔ اول الذکر حکومت کی نگرانی اور اس کی بندش کرتی ہیں اور آخر الذکر عوام کے کاموں کو چلاتی ہیں۔ ان دونوں حقوق کے ذریعے سے عوام اور حکومت کے درمیان توازن قائم رہ سکتا ہے اور اس سے جمہوری حقوق اور حکومت جمہوری کا سوال صحیح طور پر حل ہو جاتا ہے اور عوام اور حکومت دونوں تسکین اور اطمینان پاتے ہیں۔
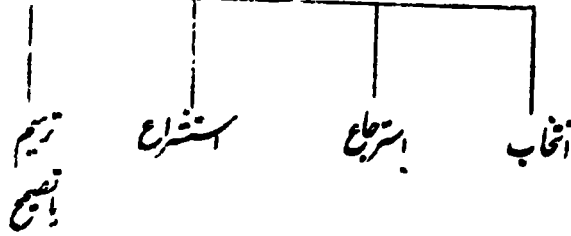
(باقی)

عمر طوسوں کے خیالات

پرنس عمر طوسوں کا نام اہلِ مشرق کے لئے محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ اصلاحِ مشرق کے سلسلے میں جن جلیل القدر ہستیوں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں عمر طوسوں کا نام ایک امتیازی حیثیت سے شمار کرنا پڑے گا۔ موصوف نے مشرق کی اصلاح اور اس کے حقوق کی حفاظت کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر رکھا ہے اور اس معاملے میں ان کی مساعی جمیلہ مستحقِ صد تحسین قرار دی جا سکتی ہیں۔

علاوہ ازیں آپ ایک وسیع النظر، صاحب رائے اور روشن خیال ماہر سیاسیات کی حیثیت سے بھی غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کے سیاسی نظریات اکثر سیاسی رہناؤں کے لئے چراغِ ہدایت بن چکے ہیں اور موجودہ سیاسیات کی گتھیوں کے سلجھانے میں آپ کے ناخنِ تدبیر نے اکثر مشرق کی امداد کی ہے۔ آپ کے اکثر مقولے ضرب المثل کی طرح زبان زدِ خاص و عام ہو چکے ہیں۔ چنانچہ سوڈان کے مسئلہ میں یہ فقرہ (جو اہلِ مصر کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا) آپ کی وسعتِ نظر کا ثبوت ہے:-

"اگر ہم سوڈان پر حکومت کریں گے تو سوڈان ہم پر حکومت کرے گا!"

علمی حیثیت سے آپ کو ایک "فاضل شہزادہ" کہہ سکتے ہیں۔ عربی اور فرانسیسی زبانوں میں آپ کی متعدد معرکۃ الآرا تصانیف شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔

ان تمام محاسن کے ساتھ اگر آپ کی وہ عدیم المثال تواضع اور منکسر المزاجی شامل کر لی جائے جو اس قابلِ رشک جاہ و منزلت کے لحاظ سے تعجب خیز معلوم ہوتی ہے، تو حیرت ہو گی کہ قدرت نے اس جلیل القدر ہستی کو کس فیاضی اور بے بگری کے ساتھ خوبیاں عطا فرمائی ہیں۔ اور غالباً یہی وہ بڑا سبب ہے جس نے جمہور کے قلوب کو آپ سے وابستہ کر رکھا ہے اور لوگ آپ کو نہ صرف ایک (مصری) محبِ وطن کی حیثیت سے محبوب رکھتے ہیں بلکہ ایک ایسے "محبِ مشرق" کی حیثیت سے آپ کی عزت کی جاتی ہے جو دل سے ان کی رفعت و فارغ البالی کا خواہاں ہے اور ہمیشہ ان کی مسرت و مصیبت میں ہر طرح شرکت کے لئے آمادہ

رہتا ہے۔

مشرق کا فرض اولین | میں نے شہزادۂ موصوف سے سوال کیا :-

"کیا آنجناب یہ دریافت کرنے کی اجازت دیں گے کہ مشرقی اقوام کو اپنی حیات عامہ میں سب سے پہلے کس امر کی جانب توجہ کرنا لازمی ہے ؟"

آپ نے فرمایا :-

"اس سوال اور اس قسم کے دوسرے سوا[illegible]

ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس پر غور کرتے وقت جواب [illegible]

ہوں ان کا بھی جواب پر بہت کچھ اثر ہوتا ہے مشرقی اقوام [illegible]

ہیں ضروریات اور اکثر افادے کے لحاظ سے بعض امور [illegible] بعض پر مقدم کر دینا اگر ایک نقطۂ نگاہ سے درست ہو سکتا ہو تو دوسرے نقطۂ نظر سے اس سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہو اس لئے اس قسم کے سوالوں کے جوابات تمام تر اعتباری اور نسبتی ہوتے ہیں۔ طریق غور و فکر اور قیاس اہمیت امور کے اعتبار سے ہر انسان ایک خاص ذہنیت رکھتا ہو اور اس قسم کی رایوں کی قدر و قیمت صرف اس وقت معلوم ہو سکتی ہے جب ان کا عملی تجربہ کر کے ان کے فوائد و محاسن کا کلی اطمینان کر لیا جائے۔

میں نے اپنے جواب کو اس مختصر تمہید سے اس لئے شروع کیا کہ اس معاملے میں میرے مسلک کی توضیح ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ وہ اعتبارات پر مبنی ہے جس طرح یہ ممکن ہو کہ وہ واقعات کے مطابق ثابت ہو اور حقیقت سے منطبق ہو جائے اسی طرح یہ بھی ممکن ہو کہ ایسا نہ ہو۔

اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مشرقی اقوام کو اپنی حیات عامہ میں جس امر پر سب سے زیادہ توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہو اس کا تعین جس طرح اجتماعی نقطۂ نظر سے ہو سکتا ہو اسی طرح سیاسی و اقتصادی وغیرہ دوسرے مختلف نقطہ ہائے خیال سے بھی ممکن ہے۔ لیکن یہ مختلف اعتبارات کچھ اس طرح باہم مخلوط و متداخل ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے علٰحدہ اور ممتاز نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے میں اثر انداز ہوتا ہے اور بغیر قصد اور ارادے کے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی تیسری

حیثیت اس سے متاثر ہو جاتی ہے۔ آپ یقیناً ان تمام حیثیات سے بحث کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ان میں سے
کوئی ایک آپ کے پیش نظر ہے اس لئے میری رائے میں آپ کے سوال کا جواب یہ ہو سکتا ہو کہ :۔

"اقوام مشرق میں ہر ایک قوم پر جو سب سے پہلا فرض عائد ہوتا ہے وہ یہ ہو کہ من حیث القوم
اپنی تکوین و تنظیم پر نظر ثانی کر کے قومیت کا قصر جدید مستحکم بنیادوں پر تعمیر کریں اور اپنی فطرت میں ان عناصر کو
شامل کریں جو قوم کو فیضان حیات سے آشنا کر کے اس کی رگوں میں عمل کی روح پھونک دیں۔ ساتھ ہی ان
اسباب پر بھی نظر ڈالیں جنہوں نے پہلی عمارت کو آفات و مصائب کا نشانہ بنا دیا تھا۔ اور اپنی پوری قوت
سے ان کے تدارک و استیصال کی کوشش میں مصروف ہو جائیں۔ مذہب اور اختلاف عقائد کو کسی
حالت میں بھی اس عمارت کے انہدام اور اس کی بنیادوں کے کھوکھلا کرنے کا بہانہ نہ بنایا جائے جہاں
تک ممکن مذہبی تعصب کو کم کیا جائے اور رواداری و وسیع المشربی کو اپنا شعار بنا کے مذہب کو صرف
اس حد تک محدود کر دیا جائے جہاں تک اس کی حدود ہیں۔ مذاہب کا مقصد عموماً انسانیت کی خدمت اور
معاملات کی نگہداشت ہو۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ انہیں اسی مقصد کے لئے استعمال کیا جائے نہ جیسا کہ
آج کل انہیں افتراق و انقسام اور کینہ پروری و تنگ خیالی کے لئے آلۂ کار بنا لیا گیا ہے۔ مذہب کے
اس غلط طریق استعمال نے ہی مشرقی اقوام کو ضعیف کر دیا ہے اور ان پر ہر طرف سے مصائب و آفات
کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔

جب ہر قوم کے رہنما سمجھ لیں گے کہ ان کے ذاتی اور وطنی مصائب کی بنیاد محض وہ اختلافات ہیں
جو انہیں آباؤ اجداد سے ورثے میں ملے ہیں، جنہوں نے بغض و عداوت ان کی گھٹی میں ڈال دی ہے،
جنہوں نے ان میں افتراق کا بیج بو کر انہیں فرقہ بندی کی لعنت میں مبتلا کر دیا ہے اور جنہوں نے
ان کی قوت کو ضعف سے اور کثرت کو قلت سے بدل دیا ہے، جب وہ خلوص قلب سے اس کے قائل
ہو جائیں گے اور ان کے دل میں اس بد قسمتی کا صحیح احساس ہو جائے گا تو یہ احساس بلا توقف انہیں عمل
کی جانب متوجہ کرے گا۔ افتراق کو بھلا دیا جائے گا، اختلاف کو پس پشت ڈال دیا جائے گا یا کم از کم
ان میں اتنی نرمی پیدا کر دی جائے گی اور انہیں اتنے تنگ حلقوں میں محدود کر دیا جائے گا کہ ایک وطن

کے فرزندوں کی اخوت میں حارج نہ ہو سکیں اور باہمی تعاون و اشتراک عمل کی راہ میں روڑا نہ اٹکا سکیں تاکہ شفیق ماور وطن اور مشترکہ روایات و مراسم کے درمیان رابطہ بن سکیں اور ان کے قلوب کو ایک دوسرے سے مانوس کر سکیں۔ اس وقت وہ تمت اختلافات اور وہ آتش بار جذبات سرد ہو کر ختم ہو جائیں گے! امن و سکون کا دور دورہ ہوگا اور مصالح عامہ اور قومی منفعت کے مقابلہ میں کوئی ان اختلافات کو یاد کرنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کرے گا۔

"مختصر یہ کہ مشرق کی بیماری "نفاق" اور

افغانی نے اس نکتہ کو پورے طور پر معلوم کر لیا تھا۔"

"مصریوں نے اس پر اتفاق کر لیا ہے کہ تفرقہ۔ ۔ ۔ ۔

اہل مغرب نے بھی اس راز کو سمجھ لیا ہے اسی لئے انھوں نے مشرق میں اپنی سیاست کی بنیاد "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو!" کے نظریہ پر قائم کی ہے۔ ایک وطن کے باشندوں میں اختلاف قدیم سے ضعف اور ذلت کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ ایران کی طوائف الملوکی میں اور سکندر کی بقائے سلطنت کے لئے ارسطو کے مشہور مشورے میں اہل نظر کے لئے بہترین سامان عبرت و بصیرت موجود ہے۔

جہاتما گاندھی کو جب معلوم ہوا کہ بعض مسلمان نادانی اور غلط فہمی کی وجہ سے آمادۂ نزاع ہیں تو وہ بکمال دانشمندی یہ اعلان کر دینے پر آمادہ ہو گئے کہ :۔

"باہمی افتراق و اختلاف کی بہ نسبت ہمیں یہ زیادہ پسند ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کی اقلیت کی حکومت میں رہیں!"

مولانا محمد علیؒ نے گول میز کانفرنس میں اپنی تاریخی اور یادگار تقریر کے دوران میں فرمایا:۔

"برطانیہ نے ہندوستانیوں کو تاریخ کی غلط تعلیم دی اور یہی فرقہ وار تنازعات کا سرچشمہ ہے اس وقت ہندوستانیوں کی عنان حکومت اکثریت کے ہاتھ میں ہے اور میں اقلیت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے اکثریت کی حکومت تسلیم کرتا ہوں . . . . جس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں نے فیصلہ کر لیا کہ ہم اپنے درمیان تفریق نہ ہونے دیں گے جیسا کہ

ہم نے کر لیا ہے) اسی وقت برطانوی اقتدار کا خاتمہ ہو جائے گا۔"

"میری رائے میں مشرقی اقوام کو جس چیز کی طرف فوراً متوجہ ہو جانا چاہیئے میں نے اس کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ یہ رائے صرف "دوسرے" مدبرین کے اقوال کی صدائے بازگشت کہی جا سکتی ہے کیونکہ ہم سب کی رائے میں اس سے زیادہ کوئی اہم اور ضروری مقصد نہیں ہو سکتا۔"

جمعیت اقوام مشرقیہ | میں نے عرض کیا:-

"کیا ایک "جمعیت اقوام مشرقیہ" کا قیام ممکن ہے، وہ کیونکر تشکیل ہو سکتی ہے اور اس کا مرکز کہاں قائم کیا جا سکتا ہے؟"

ہز ہائنس نے فرمایا:-

"جب ہر ایک مشرقی قوم اُن تمام امور پر حاوی ہو جائے گی جن کی ایک ایسی حقیقی قوم کی تشکیل میں ضرورت پیش آتی ہے جو منظم، متحد اور اپنی قومیت و وطنیت کی فدائی ہو۔ تو اس مرحلے پر یعنی "جمعیت اقوام مشرقیہ" کے قیام پر غور کرنا آسان ہوگا۔ یہ جمعیت مشترک فیہ امور عامہ پر نظر ڈال سکے گی۔ اس کی آواز مؤثر اور اس کے نتائج شاندار ہوں گے۔

لیکن بحالات موجودہ اگرچہ اس قسم کی جمعیت کا قیام ممکن ہے تاہم اول تو وہ خود ضعیف اور غیر اہم ہوگی پھر جن ارکان سے اُس کی تالیف ہوگی اُن کا ضعف اس میں اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اس لئے فی الحال اُس سے کسی خاص فائدے اور معتدبہ نفع کی امید نہیں کی جا سکتی۔ اُس کی تشکیل اور تعیین مرکز کا سوال ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور ابھی سے اس کے متعلق غور و خوض کرنا جلد بازی ہے۔

مشرق کی بیداری | میں نے کہا:-

"مشرق کی موجودہ بیداری کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے: کیا وہ ہماری آرزوؤں کے مطابق ہے یا اس میں ایسے عناصر کی کمی ہے جن کی وہ محتاج ہے اگر اس میں کچھ عیوب ہیں تو اُن کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے؟"

آپ نے جواب دیا:-

"مشرق کی بیداری ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ جنگ عظیم اور اس کے مصائب و آفات نے بڑی حد تک اس میں اثر کیا ہے لیکن ہنوز آرزوؤں کی تکمیل نہیں ہو سکتی ہے۔ تاہم امید قوی ہے کہ وہ جلد یا بدیر ضرور اس مرتبہ تک پہنچ کر رہے گا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں رہے ابھی تک بعض عناصر کی احتیاج باقی ہے۔ جن میں سب سے اہم ان مختلف فنون کی جانب متوجہ ہونا ہے جو قوموں کو اپنی ضروریات کے حصول میں اغیار سے مستغنی کر دیں۔ اُن کے کثیر استعمال [illegible] ات وثروت اور استقلال و آزادی کی بنیاد بن سکیں

مگر نہ رہے۔

اس کے عام عیوب میں جو سب پر حاوی ہیں

واقسامات کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ مختلف اقوام مشرق میں دوسرے خاص خاص عیوب بھی پائے جاتے ہیں جو زیادہ تر مختص المقام ہیں۔ مثلاً ٹرکی اور مصر کی ترقی میں یہ مخصوص عیب ہے کہ وہ ہر اچھے برے معاملے میں حرف بہ حرف یورپ کی "کھلی نقالی" پر زور دیتے ہیں اور مغربی تمدن کی اندھا دھند تقلید میں مصروف ہیں۔ یہ ایک غیر مستقل بیداری ہے جس میں ہمارے اور اہل مغرب کے طبائع، عادات، اخلاق، اور مذہب کے اختلافات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں ہمارے قدیم تمدن کی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے باوجودیکہ اس سے اخذ کرنا لازمی تھا بلکہ اُسے تو اپنی موجودہ ترقی کی بنیاد بنانا چاہیئے۔ البتہ جو امور روح عصریہ سے متفق نہ ہوں انھیں یا تو ترک کر دینا چاہیئے یا معتدل بنا لینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری اقوام کے تمدنوں سے (جن میں مغربی تمدن بھی شامل ہیں) ضروری اور مفید باتیں منتخب کر لینا چاہیئے اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ لینا چاہیئے تاکہ ہماری ممتاز قومیت اور مخصوص زندگی کا بقا و قیام ممکن ہو۔"

مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب! میں نے کہا:-

"ایسی صورت میں کیا آنجناب کا خیال ہے کہ مشرق مغرب میں بنیادی اور ناقابل تصفیہ اختلافات

موجود ہیں؟"

آپ نے فرمایا:-

"ہاں، مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب! یہ ایک ایسا مقولہ ہے جس کی تاریخ و واقعات اور ماضی و حال سے تائید ہوتی ہے کیونکہ ان دونوں کو ایک مرکز پر جمع کر دینا بظاہر غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ انسانیت اپنی موجودہ سطح سے بلند تر ہو جائے اور تمام انسانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کر دے لیکن اس کا بہت ہی کم احتمال ہے اور اس کی امید باندھنا خیالی پلاؤ پکانا ہے۔"

سماجی اصلاح کے وسائل

میں نے کہا:-

"کیا آپ یہ سوال کرنے کی اجازت دیں گے کہ موجودہ زمانے میں سماجی اصلاح کے لئے کن وسائل کا اختیار کرنا ضروری ہے؟"

موصوف نے فرمایا:-

"موجودہ زمانے میں سماجی اصلاح کے لئے جو ذرائع استعمال کئے جا سکتے ہیں وہ چند در چند ہیں ان میں سے صرف اہم امور کے تذکرے پر کفایت کرتا ہوں غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کر کے انہیں مجملاً مختصر طور پر ذکر کروں گا تاکہ گفتگو طویل نہ ہو جائے۔ ان وسائل کے منجملہ مندرجہ ذیل زیادہ اہم ہیں:-

(۱) سیاسی اور مذہبی اختلافات، تنازعات اور خصومات کے خلاف جدوجہد۔

(۲) تعلیم کی عمومیت جو قوم کے لڑکوں اور لڑکیوں سے جہالت کی بیخ کنی کر دے اور تعلیم کے تمام مدارج میں تعلیمی حالات و معاملات میں ایک ہمہ گیر اور عام اصلاح جو اپنے جوہر اور اصول میں ثبات و استحکام پر مشتمل ہو۔ ساتھ ہی انقلاب زمانہ اور مرور ایام جن تغیرات کی ضرورت پیدا کرتے جائیں ان کے لئے کافی گنجائش اور لوچ موجود ہو اس اصلاح میں دوسرے تمام امور سے پہلے "عملی پہلو" کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے تاکہ آئندہ نسل میں تمام آزاد پیشے اور ذرائع معاش اختیار کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور اس کا منتہائے نظر صرف سرکاری ملازمت تک محدود نہ ہو۔

(۳) مفید صنعت و حرفت کی مختلف شاخوں کی جانب اسی نسبت سے متوجہ ہو جانا جتنی سخت ہیں ان

کی ضرورت ہو۔ اس کی اور زراعتی ترقی کی راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان پر پانی کی موجوں سے رقی رو پیدا کرکے غالب آنا، اس عظیم الشان مقصد کے اجرا کے لئے جس کا تعلق براہ راست ہماری روزمرہ زندگی سے ہے، مردانہ وار مستعدی سے آمادہ ہو جانا۔ موجودہ طرز عمل جو سراسر تن بہ لب اور تساہل مشتمل پر مبنی ہے قطعاً کارآمد نہیں ہو سکتا جب اولوالعزمی اور خلوص سے کام لیا جائے گا تو تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی منزل مقصود قریب آجائے گی اور غیر معمولی مفید نتائج رونما ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس صورت میں ہم کثیر التعداد کارخانے جاری کر سکیں گے، خصوصاً پارچہ بافی اور سوت
کی روئی کا بڑا حصہ اپنے ملک ہی میں صرف کر سکیں گے
نہیں ہوا کرے گی۔ میں نے اس تجویز کو بھی اجتماعی اس
اقتصادیات سے ہو اور اسے آسانی سے "اقتصادی اصلاح [illegible]
کا اجرا بھی اسی نوعیت میں داخل ہے، جو صنعت و حرفت، [illegible] اعت، تجارت، اور انجمن ہائے امداد
باہمی (کوآپریٹو سوسائٹیز) کے لئے لابدی ہیں۔

(۴) صحت عامہ کے معاملات سے دلچسپی لینا، جن امراض نے ہمارے ملک کو اپنا "مستقل وطن" بنا لیا ہے۔ ان کے مقابلے کی جدوجہد کو المضاعف کر دینا، ایسے اسباب زیادہ سے زیادہ تعداد میں مہیا کرنا جو صفائی اور پاکیزگی کی ترقی میں معاون ہوں، مزدوروں، دیہات کے باشندوں اور خصوصاً کاشتکاروں سے "برہنہ پائی" کی عادت چھڑانا جو کثرت سے ان میں مروج ہے، ورزشی کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور ان کا دائرہ وسیع کرنا، منشیات و مسکرات کا استیصال کرنا، اور علانیہ و خفیہ بدکاری کا انسداد کرنا۔

(۵) ہر قسم کی تبلیغ و ارشاد کا وسیع اور بہتر پیمانے پر انتظام کرنا اور اس مقصد کے لئے ایسے خوش بیان مقررین اور مہذب و تربیت یافتہ خطیبوں کا پیدا کرنا جو قابل اعتماد طریقہ پر قوم کے اندر فضائل اور تربیت عامہ کی نشر و اشاعت میں کوشش کریں اور مذہبی روح کو اس طرح پھیلائیں کہ اُسے افتراق و انتشار کا ذریعہ نہ بنایا جا سکے بلکہ وہ منشائے الٰہی کے مطابق خیر و سعادت کا سبب اور

ہمارے خیال میں ایک ایسی قوم کے لئے جمہوریت .... عامہ بن جائے
کا دور دورہ ہو، اصلاح کا یہ طریقہ تعلیم عامہ کا آسان ترین ذریعہ ہے اور اس طرح تہذیب و علمیت کی
تعمیم، قیام امن و اطمینان اور مقاومت منکرات میں جلد تر اور غیر معمولی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

(۶) منظم جماعتوں کا اس امر پر اتفاق کر لینا کہ "آئین" کا کامل احترام کیا جائے گا اور اس کی ترقی
و اشاعت میں امداد دی جائے گی تاکہ جمہوری نظام تمام شعبوں میں عام ہو جائے اور خاندان کی تعمیر میں بھی
کا کام دے۔ اور لوگوں کے باہمی تعلقات و معاملات میں حاکمانہ اثر انداز ہو۔"

عورت کے حقوق و فرائض | میں سے کہا:-

"مشرقی عورت کے حقوق و فرائض کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے؟"

صاحب موصوف نے جواب دیا:-

"عورت کا حق ہے کہ اُسے طفولیت کے زمانے میں تہذیب، تربیت اور تعلیم سے بہرہ اندوز کیا جائے
ایک بیوی کی حیثیت سے اُس کا حق ہے کہ اُس کے ساتھ انصاف، خلوص، اور حسن اخلاق کا برتاؤ ہو تاکہ وہ
اپنے معاشرتی اور اجتماعی فرائض ادا کر سکے اور ایک اچھی بیوی اور مدبر گھر کی ملکہ بن سکے جو اپنے شوہر کے
ساتھ نتیجہ خیز اشتراک عمل کرے۔"

"اُس کی تعلیم سے میری یہ مراد ہے کہ وہ اس قدر علم حاصل کرے کہ اُس کے شوہر، اس کے گھر،
اور اس کے بچوں کی جانب سے جو فرائض اُس کے ذمے عائد ہوتے ہیں انھیں بخوبی ادا کر سکے۔ بہتر ہے
کہ بعض خواتین ایسی بھی ہوں جو مخصوص نسوانی ضروریات کی ماہر ہوں۔ بعض صنائع سے واقف ہوں اور
اسراف و فضول خرچی سے بچتے ہوئے "جمالیات" کا بھی کسی قدر ذوق رکھتی ہوں۔"

"پہلی شق میں اس کا معلمہ، طبیبہ، قابلہ (دائی)، نرس، یا خادمہ ہونا شامل ہے۔ دوسری شق میں
اسے خیاطی یا موزے اور گلوبند وغیرہ بننے یا کاڑھنے سے واقف ہونا چاہیے۔ تیسری شق میں اُس کے
لئے ضروری ہے کہ بعض فنون لطیفہ مثلاً تصویر کشی، موسیقی، نقاشی، کتابت اور شعر میں مہارت پیدا کرے۔
لیکن وکالت، انجنیری، تمثیل اور کونسلوں کی ممبری وغیرہ اس قسم کے پیشے اختیار کرنا جن

میں خطرناک نتائج اور غیر پسندیدہ نمائش لازمی ہے۔ میری رائے میں اول تو عورت کو ان میں شرکت کی ضرورت ہی نہیں ہے پھر ان کی وجہ سے عورت کو اور سوسائٹی کو جو عظیم الشان نقصان برداشت کرنا پڑے گا وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض مغربی خواتین ان امور میں حصہ لیتی یا اُس کا مطالبہ کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود میری رائے اپنی جگہ پر قائم ہے کیونکہ ان کی حالت ہمارے یہاں کی خواتین کی حالت سے قطعاً مختلف ہے۔

"بنات وطن" کو ہماری سب سے بڑی نصیحت

اور فضائل سے مزین ہونے کی کوشش کریں اور

کریں نیز اُن میں سے جو عورتیں ان نازیبا صفات سے متصف ہوں

خودداری اور آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے جائز آزادی سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس طرح وہ معززین کی

احترام کی مستحق اور اکرام و اعزاز کی اہل ثابت ہوں گی۔

چینی جمہوریت پسندوں کا گیت

۱- ہم نشینو! ہم نشینو! آؤ ہمت باندھ کر آؤ۔ سب مل کے انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو

مٹاؤ، مٹاؤ، مٹاؤ اہلِ شہنشاہیت کے ظلم و جبر

مٹاؤ، مٹاؤ، مٹاؤ اہلِ عسکریت کے غلبہ و قہر

مٹاؤ، مٹاؤ، مٹاؤ، اہلِ سرمایہ کے حرص و مکر

ہیں دوست ہمارے انقلاب کے موافقین، دشمن ہیں ہمارے اس کے مخالفین۔

روح ہماری، ہے جدوجہد، استقلال، ایثار و ایمان۔

۲- ہم نشینو! ہم نشینو! آؤ ہمت باندھ کر آؤ۔ سب مل کے انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو

گراؤ، گراؤ، گراؤ ذات پات کی حدود و درجات،

گراؤ، گراؤ، گراؤ بے کار اور پامال عقائد و خیالات،

گراؤ، گراؤ، گراؤ وحشیانہ رسوم و عادات۔

ہو گئے جو پرانے ان کو توڑو تخریب سے، ہیں جو نئے ان کو جوڑو تعمیر سے

مطالبات ہمارے، ہیں مساوات، خود مختاری اور محبت نوعِ انسان۔

۳- ہم نشینو، ہم نشینو! آؤ ہمت باندھ کر آؤ۔ سب مل کے انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو، انقلاب پیدا کرو

واپس لے لو، واپس لے لو، واپس لے لو قوم کی مساوی حیثیت،

واپس لے لو، واپس لے لو، واپس لے لو جمہوری حکومت کے حقوق و طاقت،

واپس لے لو، واپس لے لو، واپس لے لو مزدوروں کی زندگی کی نعمت،

انقلاب مبارک خیال ہے، انقلاب جائز اور فطری کام ہے۔

اصول ہمارے، ہیں عوام کے حقوق، عوام کی حکومت، اور عوام میں امن و امان

خفقان

(سید وہاج الدین صاحب پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد نے روس کے مشہور افسانہ نگار چیخوف نے
چند افسانوں کو اس طرح اپنایا ہے کہ بالکل اپنا کر لیا۔
ان میں سے ہم پہلا افسانہ ذیل میں شائع کرتے ہیں)

مرزا منعم بخت، تیمور کے گھرانے کے چشم و چراغ
رات کو ۹ بجے اپنے دوستوں سے ملتے ملاتے گھر واپس آئے
مع بڑے بچے اور گود کی لڑکی کے اپنی بڑی بہن کے یہاں بڑے پیر کے کونڈوں میں گئی ہوئی تھیں۔ اور
زنانے مکان میں سوائے منجھلے لڑکے اور اس کی آیا کے اور کوئی نہ تھا۔

مرزا منعم بخت نے اکیلے بیٹھ کر کھانا کھایا اور پھر جلدی سے کپڑے بدل اپنے اکیلے اور سنسان کمرے میں جا کر پڑ رہے۔ لیٹے تو ایک ایک کر کے دن بھر کی باتیں یاد آنا شروع ہوئیں، لیکن اس فانوس خیال میں ایک تصویر ایسی تھی جو ان کے دماغ پر ایسی مسلط ہوئی کہ ہزار اسے ہٹاتے ہیں، دل بہلاتے ہیں، گنگناتے ہیں کروٹیں لیتے ہیں، لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی۔ واقعہ یہ تھا کہ شام کو جب مرزا صاحب اپنے والد مرحوم کے ملاقاتی مولوی زین العباد الچشتی القادری کے یہاں بیٹھے تھے تو جیسا کہ مولوی صاحب قبلہ کا دستور تھا، رویائے صادقہ، القا، الہام، غیب دانی وغیرہ کا ذکر چھڑا اور خدا معلوم کس طرح ہوتے ہوتے سلسلۂ سخن ارواح خبیثہ، اجنہ، عفریت، بھوت وغیرہ تک پہنچا۔ کئی سن رسیدہ بزرگوں نے سر ہلا ہلا کر اپنے "چشم دید" بھوتوں کے واقعات بیان کئے، ایک صاحب نے کسی اور صاحب کی معرفت، جنھوں نے ایک صاحب کے حوالے سے کسی اور کے متعلق سنا تھا، بیان کیا کہ ماہ ربیع الاول کے اموں کی روح عین شب برات کے روز ظاہر ہوئی اور اپنے حصے کا حلوا کھا گئی، اب حلوا چاہے بلی نے کھایا ہو یا ماما کے لڑکے نے، لیکن واقعہ یہ تھا کہ ان مرحوم کے نام کی مٹی کی رکابی خالی پائی گئی تھی۔ جب یہ سب باتیں ہو چکیں تو مرزا صاحب

نے بھی روایتی روحانیت کے کرشمے مثلاً سلیٹ یا کاغذ پر ارواح کی تحریروں کا آنا، کنڈلی کھٹ کھٹانا، میز اٹھا
وغیرہ بیان کئے، اور ان سب باتوں کا اچھا خاصہ اثر دل پر لئے ہوئے وہاں سے اٹھے۔

اب جو رات کو مرزا صاحب لیٹے تو ہزار چاہتے ہیں کہ ان کی نظریں ان کے چچا مرحوم کی تصویر سے
جو پائینتی کی طرف دیوار پر لگی ہوئی تھی، ہٹیں، لیکن نہیں ہٹتیں۔ ہزار خیال کو ہٹاتے ہیں لیکن نہیں ہٹتا۔ ارادہ
کر لیا کہ نہ تصویر کو دیکھیں گے نہ اس کا خیال کریں گے، لیکن تھوڑی دیر بعد خیال کو ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ دل
ہی دل میں چچا کی برسی کی تاریخ کا حساب لگا رہے تھے۔ اس کش مکش میں ۱۲ بج گئے، زور سے کئی مرتبہ
آیۃ الکرسی پڑھی، کھانسے، کھنکارے، کچھ شعر یاد تھے وہ پڑھے کہ اور کچھ نہیں تو اپنی ہی آواز سن کر ہمت
بندھے لیکن توبہ کیجئے، تخیل کا رہوار، برق رفتار کس کے روکے رکا ہے جو ان سے رکتا۔ لیمپ کی ہلکی
نیلی روشنی چچا جان مرحوم کی تصویر پڑ رہی تھی۔ سرہانے گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی اور مرزا صاحب
کا دل اس کی ٹک ٹک پر بلیوں اچھل رہا تھا۔

اب مرزا صاحب کے دل میں خیال گزرا کہ کہیں "چچا جان کی روح اس وقت کمرے میں داخل
ہو جائے تو"! پھر خود ہی اس خیال پر لاحول پڑھی۔ دل کو سمجھایا کہ بھوت پریت، ارواح وغیرہ کے سب
قصے محض ناقص العقل لوگوں کے بنائے ہوئے ہیں، لیکن احتیاطاً تصویر کی طرف سے کروٹ بدل کر
اپنا منہ زور سے دُلائی کے اندر لپیٹ لیا، اور دلائی کو چاروں طرف سے سمیٹ کر بدن کے نیچے
دبا لیا، غرض کہ ہر طرح سے اس کا انتظام کر لیا کہ چچا جان کی روح دلائی کے اندر داخل نہ ہو سکے۔ ذرا
پلک جھپکی تھی کہ تھوڑی دیر بعد جھٹکے سے آنکھ کھل گئی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دھم سے پلنگ کے
نیچے پھینک دیا۔ ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار تھے، دل اچھل رہا تھا، مرزا صاحب کو ایسا معلوم ہوا
کہ جیسے کوئی ان کی مسہری کے اوپر جھکا ہوا زور سے سانس لے رہا ہے۔ بس سمجھے کہ چچا جان مرحوم کی
روح برسی کا تقاضا کرنے آئی ہے۔ مرزا صاحب نے دانت بھینچ لئے، خوف کے مارے اندر کی سانس
اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔

خدا معلوم اس کش مکش کا انجام کب اور کیا ہوتا لیکن اتنے میں ایک شامت کا مارا بھونرا کہیں سے کمرے کے اندر داخل ہو گیا اور لگا بھنبھنانے۔ مرزا صاحب نے اب تک عنان صبر ہاتھ سے نہ دی تھی لیکن جب وہ اپنی عادت کے موافق سیدھا ان کے لیمپ کی چمنی پر گرا اور چھن سے آواز آئی تو مرزا صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا۔ جیسے کہ ہونہ ہو تصویر کا شیشہ ٹوٹ کر گرا ہے اور اب کوئی دم میں روح آیا ہی چاہتی ہے۔ انھوں نے ولائی کے اندر ہی سے کئی مرتبہ زور زور سے تالی بجائی اور بھرائی ہوئی آواز میں پکارا۔ "آیا۔ آیا!"

ذرا دیر بعد ان کے کمرے کے باہر سے آیا آئی

کیا حکم ہے؟"

مرزا جی کی جان میں جان آئی۔ دل ہاتھ بھر کا ہو

کیوں تکلیف کی حضور کو بھیجو تیں" آیا جی تنک کر بولیں "حضور کو تو حضور نے خود رضا دی۔ یا بھی طرح یاد ہے میں کوئی بھی نہیں ہے۔ کیا حکم ہے؟"

مرزا صاحب رک کر بولے "حکم . . . . نہیں کوئی ایسا کام ––– ہاں مگر ذرا اندر چلی آؤ، اندھیرا ضرور ہے، کوئی ہرج کی بات نہیں ہے"

آیا جی اپنی سفید ساری پہنے کمرے کے اندر داخل ہو گئیں اور دروازے سے لگ کر حکم کی منتظر کھڑی رہیں، مرزا صاحب نے کہا "ذرا بیٹھ جاؤ آیا جی، دیکھو ہاں میں کیا کہتا تھا، بات یہ ہے کہ . . . ."

پھر دل ہی دل میں کہنے لگے "لاحول ولا قوۃ اب میں اس وقت اس کمبخت سے کیا کہوں کہ کس کام کے لئے بلایا ہے"، لیکن کنکھیوں سے چچا جان کی تصویر کو برابر دیکھتے جاتے تھے۔ پھر ہمت کر کے بولے "ہاں آیا جی، دیکھو، صبح جب آدمی بازار جائے تو اس سے کہنا کہ وہ، دیکھو۔ کیا نام ہے اس کا . . . . سگرٹ لیتا آئے"

آیا جی نے حکم سنا۔ بولیں "اچھا حضور سگرٹ، اور کوئی کام"، مرزا صاحب نے جواب دیا "ہاں کام ہے مگر تم ذرا کی ذرا بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی ایک منٹ میں یاد کر کے بتائے دیتا ہوں

سب تو آپا جی کی خودداری کو بہت صدمہ پہنچا، صاحب لوگوں کے یہاں نوکری کر چکی تھیں۔ کئی بار لوگ ان کے ڈوپٹے کے سایۂ عاطفت میں پل کر پروان چڑھے تھے اور امروز فردا میں مجسٹریٹ بن کر لاکھوں آدمیوں پر حکومت کرنے والے تھے۔ پھر کر بولیں "واہ حضور واہ، آپ غریب جان کر دل لگی کرتے ہیں۔ ہم سب سمجھتے ہیں۔ رات کو ایک بجے کوئی سگرٹ کے لئے نہیں جگاتا، ہم سب جانتے ہیں" یہ کہہ کر آپا جی فوراً گھوم کر سیدھی دروازے کے باہر یہ جا وہ جا۔

کچھ تو باتیں کرنے کی وجہ سے اور کچھ اپنی کج دلی کے احساس کی وجہ سے مرزا صاحب کو ذرا اطمینان ہو گیا تھا۔ اسلئے لیمپ بجھایا، کروٹ پھیر کر اچھی طرح سے رضائی لپیٹ کر منہ چھپا کر لیٹ رہے۔ تھوڑی دیر تو سکون رہا۔ لیکن پھر وہی خرافات، بھوت پریت، شب برات، چچا جان کی روح وغیرہ کا خیال دماغ میں چکر لگانے لگا۔ مرزا صاحب نے کئی مرتبہ اپنے اوپر لعنت بھیجی، عربی زبان میں شیطان کو بھگایا، آخر کو تکیے کے نیچے سے دیاسلائی نکالی، بغیر آنکھ کھولے پاس میز پر سے موم بتی اٹھائی اور اس طرح آنکھیں بند کئے ہوئے اسے روشن کیا۔ لیکن اس روشنی سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا، ہر کونے سے کوئی جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور تو اور غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چچا جان کی آنکھیں تصویر کے اندر سے حرکت کر رہی ہیں اور غضب ہوا۔

مرزا صاحب کو بے اختیار اپنی بیوی یاد آ گئیں "وہ آج ہی انھیں بھی جانا تھا اور اس آپا کم بخت کو دیکھو، ذرا دیر بھی تو نہیں ٹہرتی، میں اسے پھر بلاتا ہوں، کہہ دوں گا کہ دورہ ہو رہا ہے جلدی سے ٹھنڈے پانی میں انار کا شربت بنا لائے"

یہ تصفیہ کر کے پھر زور سے دستک دی لیکن جواب ندارد، دوبارہ اس سے بھی زور سے مسلسل کئی مرتبہ تالیاں بجائیں، پکارا، لیکن صدائے برنخاست۔ گھڑی نے گویا ان کی دستک کے جواب میں ٹن ٹن! دو بجائے۔ آندھی کا جھونکا زور سے آیا، دیوار پر تصویر ہلی اور کھڑکھڑائی۔ مرزا صاحب مارے خوف کے بے حال ہو گئے، پسینے چھوٹ گئے، بے تحاشا پلنگ سے کودپڑے اور ننگے پاؤں دعائیں پڑھتے، اپنی کم ہمتی پر لاحول بھیجتے، لڑکھڑاتے، ہانپتے ہوئے بھاگے تو سیدھے آپا جی کے کمرے کے سامنے پہنچ کر دم

لیا دروازہ دھم دھمایا۔ بھرائی ہوئی آواز میں پکارا "آپا جی۔ آپا جی کیا سو گئیں۔ آپا جی۔ مجھے دورہ ....
طبیعت خراب .... شربت انار ...."

لیکن کوئی جواب نہ ملا، مکان میں ہُو کا عالم تھا، دور سے پہرے دار کی آواز مکانوں اور درختوں
سے ٹکراتی ہوئی آرہی تھی "جاگتے رہو!" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے عالمِ ارواح سے کوئی کسی کو پکار رہا ہے
پھر دروازے کے باہر سے گڑگڑا کر منت سماجت کرنے۔ "آپا جی، دیکھیے خدا کے واسطے، بھلا یہ بھی کوئی شرم اور
تکلف کا موقع ہے، یہاں جان پر بنی ہوئی ہے۔ تم خدا معلوم کیا سمجھے ہوئے ہو۔ آپا تم کہاں ہو؟"
اندر سے آپا جی کی آواز آئی۔ آواز میں رقت اور غصہ ... ...
سے کہیں گے۔ غریب عورتوں کی نیند حرام کردی ہے۔"
وہ بھی آدھی رات گئے پانی مانگنے آتے تھے۔ ہم نے ...
آئے۔ غریبوں کی بھی آخر عزت آبرو ہوتی ہے۔ واہ
اب مرزا جی کو اپنی انتہائی بے چارگی کی وجہ سے واقعی غصہ آگیا۔ بولے "خدا کی ... ...
عزت آبرو پر۔ یہاں جان پر بنی ہوئی ہے، روح پرواز کرنے کو ہے"۔ روح کا لفظ منہ سے نکلتے ہی جھجک
پڑے، نرمی سے کہا "ارے بھائی میں سخت بیمار ہوں"۔
اندر سے پھر آواز آئی "بیگم صاحب خدا رکھے بہت اچھی آدمی ہیں ہمارا رونگٹا رونگٹا دعائیں
دیتا ہے۔ لو صاحب ہم ان کے لئے ان سے برے بنیں" مرزا صاحب نے پھر طیش سے کہا۔ اس عورت
کی تو جیسے عقل سلب ہوگئی ہے، بالکل بیوقوفوں کی سی باتیں کر رہی ہے کم بخت"
پھر سناٹا چھا گیا۔ مرزا صاحب نے مایوس ہو کر آپا جی کے دروازے سے سہارا لگا لیا، دونوں ہاتھ
سینے پر باندھ لئے، آنکھیں بند کرلیں اور کھڑے ہوئے حواسوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ اپنے کمرے
میں واپس جانے کی، جہاں موم بتی کی روشنی میں چچا جان مرحوم کی آنکھیں حرکت کر رہی تھیں — تو
ان کی ہمت پڑ ہی نہ سکتی تھی۔ پھر کرتہ پہنے، تہمد باندھے، ننگے پاؤں، آپا جی کے کمرے کے سامنے کھڑا
رہنا بھی کوئی ایسا مستحسن فعل نہ تھا لیکن کریں کیا رات بھیگتی جا رہی تھی، کہیں روشنی کا نام نہ تھا، ہر کونے

سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی لال لال آنکھوں والا جھانک رہا ہے۔ مرزا جی نے دروازے کی طرف منہ کر لیا، لیکن ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے ان کا کرتا پکڑ کر جھٹکا، اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مرزا جی گلا پھاڑ کر چیخ اٹھے۔

"ارے توبہ! یا الٰہی!! آپا جی، آپا جی!!" لیکن کوئی جواب نہ ملا، آخر کو رکتے رکتے انھوں نے کمرے کا دروازہ کھولا، اور جھانک کر دیکھا۔ لالٹین کی بتی کم تھی، اس کی ہلکی روشنی آپا جی کے آبنوسی خدوخال پر پڑ رہی تھی۔ ان کی ناک کی چاندی کی کیل چمک رہی تھی اور وہ سو رہی تھیں، قریب ہی منجھلا لڑکا اپنے کھٹولے پر معصومیت کی نیند میں غافل تھا۔ مرزا جی کمرے میں داخل ہوئے، دبے پاؤں چلے اور آہستہ سے بچے کے کھٹولے پر بیٹھ گئے۔ ایک چھوڑ دو دو جانداروں کی موجودگی سے ہمت بندھی، دل کو اطمینان ہوا۔ ایسی حالت میں تو ایک آدمی کا سہارا بہت ہوتا ہے، دن میں فیصلہ کیا کہ "اس آپا کم بخت کو تو سونے دو، بندہ یہیں رت جگا کرتا ہے، کوئی دم میں سویرا ہوا چاہتا ہے، اس وقت اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا" ساتھ ہی اپنی حماقت پر غصہ آیا: "یہ تعقان بھی بہت برا مرض ہے۔ بھلا ایک سمجھ دار، لکھا پڑھا شخص تین تین بچوں کا باپ اور ارواح پر یقین، لا حول ولا قوۃ" تھوڑی دیر میں اچھی طرح سے حواس برجا ہو گئے۔

⁂ ⁂ ⁂

صبح کے چھ بجے ہیں، مرزا صاحب کی بیوی اپنی بڑی بہن کے یہاں سے ابھی واپس آئی ہیں۔ بہن نے بہت روکا، لیکن انھوں نے عذر کیا کہ "آپا ان کے ناشتے کا انتظام کرنا ہے" گھر پہنچیں تو دیکھا کہ موم بتی جل رہی ہے اور مرزا صاحب کا بستر خالی ہے، سوچیں کہ آپا کو جگا کر ڈولی کا کرایہ دلوا دیں، اور "ان" کا حال بھی پوچھیں کہ کیوں نہیں آئے۔ دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوئیں تو دیکھا کہ آپا جی تو اپنے پلنگ پر دراز ہیں، پاس ہی "منجھلے" کے کھٹولے پر سکڑے سکڑائے، مرزا جی کرتہ پہنے، تہمد باندھے پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔

اس کے بعد کیا گزری، اور مرزا صاحب کے ناشتے اور دفتر کی حاضری کا اس روز کیا حشر ہوا، یہ تو ہمیں معلوم نہیں لیکن ان کے ایک معتبر دوست کی زبانی اتنا بے شک معلوم ہوا کہ اس روز شام کے وقت مرزا جی اپنے ایک دوست کے یہاں جو حکیم بھی ہیں بیٹھے نقصان کا نسخہ لکھوا رہے تھے اور ساتھ ہی یہ کہتے جاتے تھے کہ اگر یہ مرض اچھا نہ ہوا تو سنکھیا کھا لوں گا۔

حشرِ جذبہ

وہ ترا حسن کو خود بیں و خود آرا کرنا
وہ مرا [illegible]

دار پر چڑھ کے ترے حسن کو رسوا کرنا
خام عاشق میں تسلیم کا دعویٰ کرنا

کتنا بے سود ہے یہ خوفِ مکافاتِ عمل
عیش امروز میں اندیشۂ فردا کرنا

کہیں مٹ جائے نہ اس دہر سے تقلیدِ وفا
دل سے تم شکوۂ اربابِ وفا کا کرنا

اسی صورت سے ہے ممکن کہ ہو تکمیلِ حیات
خونِ دل خونِ جگر صرفِ تمنا کرنا

آ و سن لو مری بربادیٔ دل کی روداد
مجھے منظور ہے اب شرحِ تمنا کرنا

عجب افسانۂ عبرت ہے یہ سعیٔ ناکام
مرے جذبات کا خود ہی مجھے رسوا کرنا

اللہ اللہ یہ مجبوریٔ پاسِ الفت
حشر میں بھی نہ مرا خون کا دعویٰ کرنا

ہو مبارک تمہیں اس موسمِ گل میں ثاقبؔ
دل کے ہر ذرے کو ہم وسعتِ صحرا کرنا

کوپر اور انتخاب پارلیمنٹ

جب سمندر میں طوفان آتا ہے تو اس کا پانی اچھل کر کنارے کی چٹانوں کے درمیان کے سوراخوں اور غاروں تک میں آجاتا ہے لیکن سمندر جب ساکن رہتا ہے تو یہ مقامات بالکل خشک رہتے ہیں۔ اسی طرح جب سیاسی فضا میں طوفان اٹھتا ہو تو میرے گوشۂ عافیت تک بھی اس کے چھینٹے پہنچ جاتے ہیں حالانکہ ہم تو دنیا سے دور ایک غار میں اس طرح رہتے ہیں جس طرح چھوٹی مچھلیاں اور مینڈک آبادی سے دور گڑھوں میں رہتے ہیں۔

کل کھانا کھا کر ہم اور ہمارے گھر کی دو لیڈیاں بڑی عافیت سے اپنے کنج تنہائی کے صحن میں بیٹھے ہوئی تھیں۔ ایک لیڈی کاڑھ رہی تھی اور دوسری کپڑا بن رہی تھی اور میں اپنے افکار میں غرق تھا۔ ہم لوگوں کو گمان بھی نہ تھا کہ ہمارے امن و سکون میں کوئی خلل پڑنے والا ہے اتنے میں ہم لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے گھر کے سامنے سے آدمیوں کی بھیڑ چلی آرہی ہے۔ اس کو دیکھ کر ہماری پریشانی کی انتہا نہیں رہی کیونکہ ہمیں بھیڑ سے کیا واسطہ ہم تو دنیا سے دور ایک گوشۂ عافیت میں سکن گزین تھے۔

دروازے کو کسی نے زور سے کھٹکھٹایا۔ پھر دروازے پر لونڈوں نے غل مچایا۔ ہماری دایہ نے آکر کہا کہ مسٹر گرینوائل تشریف لائے ہیں۔ لونڈوں کے غل غپاڑے سے ہماری بڑی بلی اپنے مسکن سے اٹھ کر بھاگی اور دروازے پر کھڑی ہو کر غرانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسٹر گرینوائل امیدوار نشست پارلیمنٹ مع اپنی جماعت (مددگاروں کی جماعت) سامنے کے دروازے سے ہمارے مکان میں داخل نہ ہو سکے اور ان کو پیچھے کے دروازے سے ہمارے کمرے میں داخل ہونا پڑا کیونکہ ہمارے مکان میں دو ہی دروازے تھے۔

امیدواران انتخاب میرے خیال میں توہین اور تذلیل کی بالکل پروا نہیں کرتے۔ اگر ان کو مکان کے دروازے سے نہ آنے دیجئے تو کھڑکی اور دیوار سے ترپ کر آپ کے مکان میں داخل ہو جائیں گے۔

اور آپ سے بات کئے اور وعدہ لئے بغیر ہرگز آپ کے مکان سے نہیں ٹلیں گے۔ ایک منٹ میں ہمارے
مکان کا آنگن صحن اور باورچی خانہ، مختصر یہ کہ کل مکان آدمیوں سے بھر گیا۔ یہ امیدواران انتخاب کی
تہذیب ہے۔

مسٹر گرینوائل ہماری طرف بڑھے اور انھوں نے مسز گرینوائل محبت کے ساتھ بڑے تپاک سے مجھ سے
ہاتھ ملایا! ان کے ساتھیوں میں سے جس کو جو کرسی ملی اس پر وہ بغیر ہماری اجازت کے جھٹ کر بیٹھ گئے
اور مسٹر گرینوائل بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور بیٹھنے کے
سے اس خاکسار کو آگاہ فرمایا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں ممبر
کے لئے امیدوار کھڑا ہوا ہوں امید ہے کہ آپ از راہ
مجھے اپنا ووٹ دے کر زندگی بھر کے لئے مشکور فرمائیں گے۔ میں
سے کہا کہ جناب والا میں ووٹر ہی نہیں اس کو سن کر وہ حیران ہو گئے۔ور خیریت یہ ہوئی کہ انھوں نے
ہمارے اس بیان کو سچ سمجھ لیا اور اس مسئلہ پر زیادہ گفتگو نہیں کی۔

لیکن اس کے بعد بھی گفتگو ختم نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے سلسلہ کلام کو دراز کیا اور فرمایا کہ خیر
اگر آپ کا ووٹ نہیں ہے تو آپ اپنے اثر سے ووٹ دلوانے کا وعدہ فرمائیں میں نے کہا کہ بھائی میرا کوئی اثر
بھی اس علاقے میں نہیں ہے کیونکہ میں دنیا سے الگ تھلگ ایک گوشہ عافیت میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہا ہوں
لیکن اس بیان کو انھوں نے بالکل صحیح تسلیم نہیں کیا کیونکہ ان کے ذاتی خیال کے علاوہ مسٹر اشبرنر نے اسی
وقت مجھے مخاطب کر کے کہا کہ آپ کا اس علاقے میں بہت اثر ہے اور چونکہ میری اس علاقے میں پارچہ فروشی
کی دوکان ہے لہذا میں اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اس علاقے لوگوں پر آپ کا بہت اثر ہے۔ اس کا
جواب میں نے یہ دیا کہ میرا اثر بالکل نہیں ہے اور اگر ہے تو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کہاں ہے۔
اس کے بعد مسٹر گرینوائل نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور گفتگو ختم ہو گئی۔

مسٹر گرینوائل نے چلتے وقت بڑی شفقت سے ہمارا ہاتھ دبایا۔ انھوں نے ہماری لیڈیوں کا محبت
کے ساتھ بوسہ لیا اور چلے جب وہ باورچی خانہ کی طرف سے گزرے تو انھوں نے ہماری دایہ کا بھی اسی محبت

کے ساتھ پوسہ لیا جس محبت کے ساتھ ہماری لیڈیوں کو چوما تھا۔

مسٹر گرینوائل مجھ کو بہت محبت کرنیوالے ، ملنسار ، نیک دل خلیق اور بوسہ لینے والے امیدوار معلوم ہوئے۔ وہ ابھی بالکل نوجوان ہیں ، مہذب ہیں اور خوبصورت بھی ہیں۔ ان کی دونوں آنکھیں بھی بہت خوبصورت ہیں لیکن ابھی ان کی آنکھوں سے ممبر پارلمنٹ کی متانت نہیں ظاہر ہوتی ہے گو متانت پیدا کرنے کے لئے وہ چشمہ لگاتے ہیں جو ان کے کوٹ کے سامنے کے بٹن میں لٹکا ہوا تھا۔

جب وہ ہمارے مکان سے واپس جانے لگے تو پھر لونڈوں نے غل مچایا۔ کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ اس ہیٹر کو دیکھ کر ہماری بلی تڑپ کر بھاگی اور یہ امیدوار صاحب ہمارے یہاں سے روانہ ہوگئے اور مجھ پر رحم کر کے ہماری جان ہم کو بخش گئے۔

ہم لوگوں نے اس جلوس بدتمیزی پر بہت دیر تک مضحکہ کیا اور اس کے بعد سابق سکون اور امن ہم لوگوں کے گوشہ عافیت کی فضا پر طاری ہوگیا۔ میں یہ سمجھ کر بہت خوش ہوا کہ میں نے امیدوار صاحب کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اس علاقے میں میرا کوئی اثر نہیں اور اگر واقعی میرا اثر بھی ہوتا تو میں ان کو ہرگز اپنے اثر سے فائدہ نہیں ہونے دیتا کیونکہ بادشاہ اور جمہور کے درمیان جو اصلاحی مسائل ملک اور پارلیمنٹ میں چھیڑے ہوئے تھے اس میں میرے خیالات جمہور کے ساتھ تھے اور امیدوار صاحب جو میرے یہاں تشریف لائے تھے وہ بادشاہ کے حامیوں میں تھے۔

بعض وقت کسی اثر اور کسی طاقت کا نہ رکھنا بھی بڑا مفید ہوتا ہے جیسا کہ اس مصیبت کے وقت میرے لئے ثابت ہوا۔ کیونکہ انسان جب اثر اور طاقت رکھتا ہے تو اس کو ایک جماعت کو خوش اور دوسری کی ناخوش کر کے دشمن بنانا ہوتا ہے۔ لہذا دشمنی خریدنے کے بدلے بہتر یہی ہے کہ اس نعمے سے محروم رہو جس سے انسان کو دشمن دنیا کے بازار میں زبردستی خریدنے پڑتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوا کہ اس وقت نہ میرے پاس ووٹ تھا اور نہ اثر۔

تنقید و تبصرہ

افادات مہدی - یہ کتاب نامور انشا پرداز، ایم مہدی حسن مرحوم ایم۔ اے، بی الاقتصا . ی" کا مجموعہ مضامین ہے جس کو مہدی بیگم نے اُن کے انتقال کے بعد ترتیب دیا ہے ... ق ... اگرچہ جدت سے خالی ہے۔ فہرست مضامین نے صرف دو صفحے پر ...
نے چند صفحوں کا دیباچہ لکھا ہے۔ پھر ان کی یاد ...
مضمون نگار کے سوانح حیات تحریر کئے ہیں۔ اس ...
پہ جاکر ختم ہوتے ہیں۔ آخر میں " اردو کے ایک نامور ...
صاحب موصوف کا مضمون درج ہے جو روزنامہ ہمدم لکھنؤ سے منقول ہے۔ بعد ازاں ...
اور قطعات تاریخ طبع کتاب ہذا درج ہیں اور اس طرح کتاب زیر تنقید ۲۰۰ صفحات پر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ کتاب معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپی ہے جس کی لکھائی اور چھپائی خود عمدگی کی ضامن ہے۔ کاغذ سفید دبیز لگایا گیا ہے۔ قیمت صرف ۲ ہے۔ دوسری بار باضافہ مضامین جدید طبع ہوئی ہے اور دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

مولوی عبد الماجد صاحب نے اپنے دیباچے میں مرحوم کی تحریر کی خوبیاں بلند آہنگی کے ساتھ اور کمزوریاں دبی آواز سے بیان کی ہیں۔ ایک جگہ یہاں تک سفارش کی ہے کہ "جب شاعر کے لئے برہنہ رقاصی کا جواز بڑے بڑے ثقات نے تسلیم کر لیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس نثر کے شاعر پر انشائے عریاں حرام رہے" اگر " سودا کی ہجو گوئی " کا جواب " ولایتی کی گالیاں"[1] ہو سکتا ہے تو شاعر کی " برہنہ رقاصی کا جواز " تو ثقات ہی نے تسلیم کیا ہے، یہ نثر کی شاعری خود فطرت جائز قرار دیتی ہے جو ثقات

(۱) آبحیات میں لکھا ہے کہ ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہل سیف میں معزز ملازم تھا عجب تماشا کیا یعنی سودا نے (...)

بھی گراں ہو اور اس سے جناب مہدی مرحوم جو بقول عبدالماجد صاحب نثر کے شاعر تھے "انشائے عریاں" لکھنے پر کیوں کر مجبور ہو جاسکتے۔ مگر آج بیسویں صدی میں ہزل گوئی یا وہ اشعار جو اخلاقی نقطۂ نظر سے گرے ہوئے ہیں ہرگز مقبول نہیں بلکہ مردود ہیں۔ جناب مہدی مرحوم کی ثقاہت اور خودداری خود سفارش کرتی ہیں کہ اُن کا دامن "انشائے عریاں" سے پاک رہنا چاہیے تھا۔

سوگوار مہدی بیگم نے مرحوم کے جو حالات زندگی لکھے ہیں ان میں ایک قسم کا درد ہے جس کی چوٹ دل پر لگتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مرحوم کی بیوہ کی تحریر واقعی دردانگیز ہونی چاہیے تھی۔

جناب مہدی مرحوم نے ۱۸۸۹ء سے لکھنا شروع کیا اور وفات سے دو سال قبل تک یعنی ۱۹۱۹ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ مدت جو تیس سال پر حاوی ہے ظاہر کرتی ہے کہ مہدی مرحوم کو اردو زبان کے ساتھ نہایت شغف تھا اور ان کو "ادب العالیہ" اور "انشاپردازی" کا بیحد شوق تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ محض "سخن فہم" تھے "سخن گو" نہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے بقول اُن کے "تنقیدات" میں داخل ہونے کے لائق ہے لیکن انھوں نے تنقید کے دائرہ سے نکل کر "تصنیف" میں قدم نہیں رکھا۔ اگر شاعری کے لحاظ سے یہ مقولہ "سخن گوئی سے سخن فہمی زیادہ مشکل ہے" تسلیم کر لیا جائے تو بے شک مہدی مرحوم نے بھی بڑا کام کیا ہے مگر ہمارے نزدیک عمارت کا تیار کرنا مشکل کام ہے اور اس کے نقائص بیان کر دینا بہت آسان ہے۔

جناب مہدی اُردو کے عمدہ انشاپرداز ہیں اور اردو کا صحیح اور اعلیٰ مذاق بھی رکھتے ہیں۔ آپ کے مضامین زیادہ تر تنقیدی ہیں اور بہ لحاظ جدت اپنی آپ نظیر ہیں۔ لیکن آپ کا دماغ عرش معلیٰ پر

---

(۱) اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کر دی۔ ولایتی بیٹھا سنا گیا۔ جب ہجو ختم ہوئی تو اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور اُن کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا بچھاڑ باندھ دیا۔ انھیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا۔ حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد! جناب آغا! این مقالات شایان شان شما نیست۔ ولایتی نے پیش قبض کمر سے کھینچ ان کے پیش رکھ دی اور کہا۔ قطعہ خود گفتی۔ حالا این نثر را گوش کن۔ ہرچہ تو گفتی نظم بود۔ نظم از ما نمی آید بنثر ادا کردیم۔ صفحہ ۱۷۱ آبحیات

۔ مگر کوئی آپ پر معترض ہوا ہو تو اُس کو " دوم درجہ کی خلقت " تصور کرتے ہیں۔ تعلّی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مگر آپ کے یہاں تعلّی اور غرور و تکبر میں کوئی حد فاصل نہیں ہے۔ غالب نے بھی اپنے معترضین کو " عنوانِ کمال " کہا تھا اور ان کو ادنیٰ درجے کی مخلوق تصور نہیں کیا تھا آپ سے بھی شائستگی کی توقع کی جا سکتی تھی مگر ناکامی ہوئی۔

رسالہ الناظر میں احسن صاحب مارہروی نے رسالہ ... حضرت نے

ترجمہ کیا ہے اور غالباً کچھ اس میں اپنی طرف سے بھی ...

میں آپ لکھتے ہیں :-

" حضرت مارہروی نے " فلسفۂ حسن " ...

ان کا علوم مشرقی و مغربی دونوں سے " امی محض " ہونا ...

میں تضیعِ اوقات پسند نہ کرتا "

" لیکن ہندوستان اپنی مفروضہ دماغی ترقیات کے ساتھ بھی ان باریکیوں کو سمجھ نہیں سکتا " اس ہیر پھیر میں اچھے خاصے شاعر ہو گئے کچھ اور ترقی کی تو کسی اگلے پچھلے شاعر کے خواہ مخواہ جانشین بن بیٹھے "

" حضرتِ مارہروی کو یہی خلش ہے کہ دوپٹہ، آنچل، محرم اور چوڑیاں، صاحب فلسفہ کے اختراعات ہیں، یونانیوں میں یہ چیزیں کہاں ؟ اُن کی سمجھ پر کسی کو رونا آئے، تو میری خطا نہیں! لیکن میں اپنے امی دوست کو بتانا چاہتا ہوں ... "

" افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے بھونڈے اور ذلیل اظہارِ خیال اور بے باکانہ اظہارِ رائے سے جس کو خیر سے آپ تنقید سمجھتے ہیں، صرف اپنا جہل مرکب ثابت کر سکے "

" سچ یہ ہے کہ جن صاحبوں کی ابتدائی تربیت " چوک کے کوٹھوں " پر ہوئی ہو وہ اُن نکتوں کو کیا سمجھ سکتے ہیں جو فلسفۂ حسن کا مایۂ خمیر ہیں "

" حجروں کی تاریکی میں اگر آپ شپرانہ کچھ دیکھ بھی سکے تو آپ کی قاصر النظری، راز ہائے سربستہ فطرت کو پھر بھی آپ کے لئے سربمہر رکھے گی "

"جناب ارہروی کی اس فریب کاری کو دیکھئے کہ جہاں عورت کی اذیت پہ آپ چلا اٹھے ! مگر بھگتے اس کی اخلاقی اور جذباتی کیفیات سے جو فلسفے کی جان ہیں دانستہ آنکھیں موند لی ہیں۔"

"جہل مرکب آشکار ہو۔"

"ان کے ناقابل التفات خیالات و مقالات کی گندگی کا ایک جامع ثبوت ہے جس سے ان کے اصلی خصائل اور مذاق طبع کی پوری غمازی ہوتی ہے" "شرم شرم"

"ایڈیٹر صاحب الناظر کی روانیٔ قلم کی بھی داد دینا چاہتا ہوں۔ آپ کا تنقیدی نوٹ تمام تر جناب ارہروی کے جہل مرکب کا کورانہ تتبع ہے یا یوں سمجھے کہ حضرت ارہروی کے دل کی سیاہی جو ان کے قلم سے ٹپکتی تھی حضرت نے اسی کو لے کر پھیلایا ہے۔"

"اسی میں "خادم الملک" (یہ اپنے منہ میاں مٹھو ظفر الملک کا قافیہ ہے) حضرت دستگیر کا افتاد بھی آگیا، جس کا وجود اس کے دشمنوں کی چھاتی کا تیر ہو رہا ہے۔"

"لیکن مجتہدانہ ایک حرف نہیں، اندھے کی لاٹھی! جناب ارہروی کے ساتھ کبھی غار میں! کبھی دلدل میں!"

"تاہم لائق شرم غلط بیانی سے آپ نہیں چوکے اور جناب ارہروی کے ساتھ مجبوراً مجھے آپ کی خبر لینی پڑی۔"

"میری رائے ہے کہ دوئم درجے کے اظہار خیال کی بہترین داد یہ ہے کہ وہ ایک دم سے نظر انداز کیا جائے۔"

"لیکن تنگ خیال اور بے درد مارہروی اور ان کے یاران طریقت کے نتائج فکر جو ننگ انشا پردازی ہیں، بھٹیاریوں کی "تو تو میں میں" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔"

"میں ان کی تمام خرافات کا استقصار نہ کرسکا۔"

کیا یہ الفاظ اور ذاتی حملے کسی نقاد کی تحریر کے لئے موزوں خیال کئے جاسکتے ہیں جن میں سنجیدگی کا پہلو نظر انداز کیا گیا ہے؟ معترض کو گالیاں دینا اعتراض کا جواب نہیں ہوسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ لائق مضمون نگار نے دلائل کے ساتھ بھی کہیں کہیں بعض اعتراضات کی تردید کی ہے لیکن ذاتی حملوں اور الفاظ نا ملائم نے

اس کا لطف کھو دیا ہے۔ آپ نے اسی مضمون میں اپنے مخالفین کے لئے جو بعض خیالات ظاہر کئے ہیں وہ
خود آپ پر بھی منطبق ہوتے معلوم ہوتے ہیں مثلاً "اپنے منہ میاں مٹھو، ظفر الملک کے جواب میں کہا جا سکتا
ہے کہ یہ "افادی الاقتصادی" جو آپ کے نام کا جزو لاینفک ہے کیا خود ساختہ نہیں ہے؟ ظفر الملک تو غریب
اڈیٹر الناظر کا تاریخی نام ہے۔ یہ "افادی الاقتصادی" تو تاریخی نام بھی نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ آپ نے
لکھا ہے "آپ کا غیر ضروری اظہار خیال بے معنی فصاحت کا دھوکا ہے" جو شخص [illegible] ظفر الملک
کو جانتا ہے وہ ہرگز یہ تسلیم نہ کرے گا کہ ان سے نتائج فکر
ایک جگہ آپ مخالفین کا فقرہ نقل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:
"بڑی نرمی سے فرماتے ہیں "جنبش لطیف
ہے" فقرہ تو اچھا ہے لیکن دیکھئے پھر وہی بے معنی فصاحت۔
گرم گرم فقرے لکھنے کے عادی ہیں۔ ان کے مفہوم اور حقیقت حال میں باہمی تطبیق اکثر نہیں ہوتی۔ لہٰذا ایسے
محل میں۔ بنا اور دوسروں پر پتھر پھینکنا کہاں تک تقاضائے عقل کہا جا سکتا ہے۔
"شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر" کے عنوان سے جو آپ نے مضمون لکھا ہے اس میں مولانا اسلم کے
اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ لیکن اسلم صاحب کے متعلق جو ذاتی جملے اور رکیک الفاظ استعمال کئے ہیں ان کو پڑھ کر
یہ خیال ہوتا ہے کہ "تنقید عالیہ" کا لکھنے والا جو اپنے آپ کو اول درجے کی مخلوق سمجھتا ہے ابھی تک اس
ابجد سے بھی ناواقف ہے کہ تنقید میں ذاتیات کو مطلق دخل نہ دینا چاہئے اور تنقید صرف وہیں تک محدود
رہنا چاہئے جہاں تک تحریر زیر تنقید اجازت دیتی ہو۔ ذاتیات کو قطعی بھلا دینا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ "کیا
لکھا ہے" نہ یہ کہ "کس نے لکھا ہے"

مرد باید کہ گیرد اندر گوش — ور نوشت است پند بر دیوار

گالیاں دینا کبھی تعریف کے لائق نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ملک کا مذاق بگڑا ہوا ہو اور لوگوں کو اس
میں لطف آتا ہو کہ ایک مضمون نگار دوسرے کی تضحیک کرے اور وہ اسے برا کہے اور پیٹے۔
جناب مہدی رقمطراز ہیں "ملک میں اچھے لکھنے والے دو چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان میں بھی تھوڑے

ہی ایسے ہیں جو کسی موضوع پر "تنقید عالیہ" کی صلاحیت رکھتے ہوں "

" اس لئے بے معنی جنبش لب سے خاموشی اچھی، آپ میرے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں!
لیکن بولے اور آدمی کی طرح نہ بولے تو مجھے ضرور شکایت ہوگی، اس خلوص اور سچ کا کیا ٹھکانا ہے کہ شعر العجم
کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھائے جائیں تو ایک دوسری کتاب
تیار ہو سکتی ہے "

رسالہ اُردو اورنگ آباد میں شعر العجم پر جناب محمود شیرانی کے اعتراضات دو تین نمبر میں نکل چکے
ہیں۔ اگر صرف ان کو طبع کرایا جائے تو وہ بھی ایک کتاب بن سکتے ہیں۔ مرحوم اگر زندہ ہوتے تو دیکھتے
کہ ان کے طنزیہ الفاظ " خلوص اور سچ " بیجا استعمال ہوئے ہیں۔

آگے چل کر مرحوم لکھتے ہیں " یہ میرا قصور نہیں! خود اُن کے دل کا کھوٹ ہے جو بگڑی ہوئی زبان
پر آ ہی گیا، اور جس سے ایک کافی حد تک ان کی پاک طینتی کی غمازی ہوتی ہے "

" اسلم کی یہ شیرانہ چشم پوشی ہے کہ وہ چار آنکھیں رکھ کر بھی دیکھ نہیں سکتے "

" اسلم کی غیر سادہ تمندانہ اپیچ میں سب سے زیادہ مجھے جس بات پر لطف آیا وہ حکمت بہ لقمان آموختن "
کی جدت بے محل ہے "

" جن مغربی تصنیفات کی طرف اسلم نے اشارہ کیا ہے وہ ایک ایک کرکے شبلی کے ناخنوں میں ہیں۔
اسلم نے علی گڑھ کے صدقے میں ایک آدھ کتاب کا صرف نام سن پایا "

" اسلم اگر اپنی تنگ نظری کے ساتھ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

" جو کچھ شکایت ہے یہ ہے کہ " وہ نہیں جانتے کہ کچھ نہیں جانتے "

" خود اسلم کہہ اٹھے کہ گر لڑکا بھٹکا فضائے دہر پر معترض ہو بار بار ساتی کیڑا ازمانے کے حدوث و قدم پر
رائے زنی کرے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا "

" میرے معصوم دوست نے جو کچھ خامہ فرسائی کی وہ محض قصور استعداد ہے "

" شبلی کی مسلم الثبوت فارسیت کا اعتراف نہ کرنا، مولانا حالی کے ساتھ حسن ظن کے افراط کو صرف تحسین

"ناشناس" بہت کرتا ہے۔"

"اسلم اور اُن کے یارانِ طریقت کو یہ ناچ ناچنا (افعالِ صوفیانہ) مبارک!"

"یہ اسلم کے بھونڈے مذاق کا پھوہڑ پن ہے۔"

"ایک رنگی تصویر جو اسلم دکھانا چاہتے ہیں وہ اُن کے [illegible]"

"اسلم نے ساری عمر میں لے دے کر حیات [illegible]"

علی گڑھ پریس میں ان کے پیشِ نظر تھے وہ تصنیف [illegible]

منہ نہ آنے [illegible]

"یہ چند سطریں مجھے امید ہے ایک شیدائے ادب [illegible]

ہیں"

"اچھا ہوتا اگر اسلم میری خاطر سے آئندہ اس فقرے کو عنوانِ زندگی بنا لیتے "ایاز قدرِ خود بشناس"
مرحوم اگر زندہ ہوتے تو اُن سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ اگر آپ متذکرہ بالا فقرے اپنے مضمون میں نہ لکھتے تو کیا ہرج واقع ہوتا؟ شاید یہی کہ پھر رونق و کان کہاں؟ الغرض مولانا شبلی کی حمایت میں مرحوم کو جو کچھ لکھنا تھا بے تامل لکھتے لیکن فقرے بازی سے احتراز کرتے اور مدلل جواب دیتے تو بہتر ہوتا۔
آپ نے اس مضمون میں صرف لفاظی سے کام لیا ہے دلائل کو مطلق جگہ نہیں دی۔

آپ کا ایک مضمون "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک" ہے اور یہ آخری مضمون ہے جو اُن کے قلم سے نکلا۔ مجھ کو بذاتِ خود یہ عنوان دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ مولانا حالی مرحوم ایسے پاک طینت تھے کہ وہ ہرگز کسی پر حملہ کرنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ مضمون پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے مضمون کا عنوان غلط قائم کیا ہے۔ صحیح عنوان "شبلی کی معاصرانہ چشمک" ہونا چاہئے تھا کیونکہ جس قدر مثالیں لائق مضمون نگار نے پیش کی ہیں وہ سب کی سب مولانا شبلی کی معاصرانہ چشمک کی ہیں یا دوسرے اشخاص کی ہیں۔ لیکن مولانا حالی کی کوئی مثال ایسی نہیں جو مولانا شبلی کے ساتھ ان کے ضرر انگیز برتاؤ کو یاد دلاتی ہو۔ صرف ایک مثال ہے جس پر لائق مضمون نگار کو غالباً چشمک کا دھوکا ہوا ہے یا انہیں کوئی مثال اس

کے سوا نہیں ملی اور کھینچ تان کر اسی مثال کو چشمک قرار دینا پڑا تاکہ عنوان غلط نہ ہو چنانچہ حالی کے اظہار خلوص کی مثالیں دے کر جناب مہدی مرحوم خود ارشاد فرماتے ہیں۔

"آپ کہیں گے کہ ان مسلسل انکشافات میں سوائے بہکی ہوئی باتوں کے مقصود اصلی یعنی "چشمک" کا اب بھی پتہ نہیں . . . . . بہر حال اظہار خلوص کی حد ہو چکی، کچھ اصل موضوع یعنی چشمک کی مثالیں لیجئے۔"

"حیات جاوید میں ایک موقع پر حالی فرماتے ہیں "اعلیٰ تعلیم کی حمایت کے جوش میں "سر سید" کے قلم سے بعض مواقع پر ایسے الفاظ نکل گئے ہیں کہ ترجموں کی غرض سے سوسائٹی قائم کرنے کو وہ اپنی غلطی تسلیم کرتے تھے، اور اسی بنا پر شمس العلما مولانا شبلی نے "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" میں اس غلطی کا جس کو سر سید "۔۔ برس پہلے ایجوکیشن کمیشن میں تسلیم کر چکے تھے ذکر کیا ہے، اور اس بنا پر کہ مغربی علوم و فنون کا دیسی زبان میں ترجمہ ہونا ممکن نہیں ہے، سائنٹفک سوسائٹی قائم کرنے کو سر سید کی ایک غلطی قرار دیا ہے، اور اپنے اس دعوے پر کہ ترجمہ ممکن نہیں زیادہ تر وہی دلیل جو سر سید نے بعض مواقع پر بیان کی تھیں پیش کی ہیں۔"

"حالی کہتے ہیں کہ اگر مولانا (یعنی شبلی) کی یہ اصلی رائے ہوتی تو ہم کو اس سے تعرض کی ضرورت نہ تھی، لیکن چونکہ انھوں نے خود سر سید کے بعض بیانات سے یہ رائے استنباط کی ہے، اس سے ہم کو سر سید کے خیالات کا اصل منشا ظاہر کرنا ہے، حالی نے ایک ایک کر کے اعتراضات کی تردید کی ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے کہ شبلی کے اعتراضات کا زیادہ تر حصہ خود سر سید کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ "چشمک" کی یہ پہلی مثال ہے جس میں حالی کی حیثیت منفی اقدامی نہیں بلکہ دفاعی ہے اور جس میں ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے۔"

ہم تو خاک نہ سمجھے کہ یہ مثال "چشمک" کے تحت میں کیونکر آسکتی ہے۔ مولانا حالی نے سر سید کے بیانات کی تردید کی ہے اور وہی ان کا اصلی منشا تھا۔ خود جناب مہدی کو تسلیم ہے کہ "ناقدانہ اظہار خیال کے سوا در پردہ کوئی چوٹ نہیں ہے" پھر یہاں چشمک کا لفظ بالکل غیر ضروری اور بے معنی ہے۔

اسی مضمون میں آپ مولوی عبدالحق صاحب کی نسبت تحریر فرماتے ہیں :-

"مولوی عبدالحق کے ذمہ دار قلم سے نکلی ہوئی سیاہی جس طرح پھیلی ہے ایک نظر دیکھنے کے لائق ہے جس طرح ناممکن ہو کہ کسی مکمل، اسٹینڈرڈ کتاب پر ان کا مقدمہ نہ ہو، یہ بھی ناممکن ہو کہ کسی نہ کسی حیثیت سے حالی کی پاسداری میں وہ شبلی پر چوٹ نہ کرتے ہوں . . . . لیکن میں اگر غلطی نہیں کرتا تو یہ جو کچھ لکھتے ہیں نکتہ سنجانہ لکھتے ہیں، یعنی شبلی کی تنقیص مقصود بالذات نہیں ہوتی . . . جو دلالت مضمون کا ہے کہ شبلی کی مدح میں اُن کا قلم کبھی نہیں رکتا ۔ یہ مگر منہ

مضمون میں تو کسی قدر ان کے خیالات - مدد مدے اندر

ذکر آیا ہے، نثر کا بالکل قصیدہ مدحیہ پیش کیا گیا ہے :

شبلی کا ماہوار رسالہ، "آدھ گھنٹے علامہ شبلی کے ساتھ" اور . . .

شبلی نعمانی، یہ مضامین پڑھ جائیے - ناممکن ہے آپ بھی میری طرح اسی نتیجہ پر پہنچیں - پس جناب مہدی مرحوم کو اگر "نقیب شبلی" کہا جائے تو بیجا نہیں ہے اور اگر مولانا شبلی مرحوم کے وہ الفاظ جو انھوں نے مہدی مرحوم کی نسبت ارشاد فرمائے ہیں کہ "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے بھی لکھنے نصیب ہوتے ۔ دارہ اور یہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو، یقین کرنے کی بات نہیں" ذہن میں رکھے جائیں تو یہ مصرع موزوں ہو جاتا ہے "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"

جناب مہدی مرحوم کے مضامین میں ایک ہی خیال کو بار بار بیان کرنے کا نقص بھی پایا جاتا ہے مثلاً صفحہ ۴۰ پر جو عبارت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے کہ "یورپ کو شکایت ہو کہ مسلمانوں میں متقدمین بلکہ متاخرین میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہوا" اور صفحہ ۵۰ پر ان الفاظ کے ساتھ ان کی تحقیقات کی گرد کو نہیں پہنچتے" ختم ہوتی ہے بعینہ یہی عبارت دوسرے مضمون میں صفحہ ۲۰۵ سے شروع ہوتی ہے اور صفحہ ۲۱۲ پر ختم ہو جاتی ہے - قریب قریب وہی خاص الفاظ ہر مضمون میں پائے جاتے ہیں - اور بعض فقرے تو ایسے اُن کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں کہ اُن کو مرحوم کا تکیہ کلام کہلا جا سکتا ہے مثلاً "گول خانہ میں چوکھٹی چیز"، "لحاف کی تیاری میں کچھ استر سے لیا اور کچھ ابرے سے اور دونوں کا جھول جھال لے کر برابر کر دیا" وغیرہ

آپ کے یہاں زبان کی بعض غلطیاں بھی موجود ہیں مثلاً "ساری کتاب میں کہیں سے چھپی گئی نہیں (صفحہ ۳۹)، کہیں سے، کی بجائے صرف کہیں ہونا چاہیے۔ سے بالکل زائد اور خلاف محاورہ ہے۔ صفحہ ۲ پر "لٹریچر میں سب سے اعلیٰ اور رشک انگیز کرنے کے لائق ہے" یہاں صرف "انگیز" کا استعمال غلط ہے۔ صفحہ ۵۵ پر جہاں بالائی طور پر لکھا گیا ہے، اگر سطحی طور پر لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ ہندوستانیوں کے لئے "نقالی" استعمال کرنا صاحبان ذی شان کی تقلید کے سوا اور کچھ نہیں چنانچہ صفحہ ۲ پر "ہمارے دیسی رئیسوں کو دیکھو" لکھا ہوا ہے اس سے بھی احتراز لازم تھا۔ صفحہ ۱۰ "پر ان کی طبع آزمائی کا جولانگاہ ہوگا" کی جگہ طبع آزمائی کی جولانگاہ ہوگی" ہونا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ کے یہاں بعض انگریزی الفاظ ہی نہیں بلکہ جملے تک تحریر میں آگئے ہیں مثلاً ٹو دی پوائنٹ اگرچہ اب مجبوری کے سوا انگریزی الفاظ کا استعمال بھی جائز نہیں سمجھا جاتا تاہم جملوں کے استعمال کی پہلے اجازت تھی اور نہ اب ہے۔ بعض جرمن الفاظ کا غلط تلفظ لکھا ہے حالانکہ آج کل اردو داں بھی ان ناموں سے بخوبی واقف ہیں اور ان کا صحیح تلفظ جانتا ہے گوئیتہ (صفحہ ۴۲) کی جگہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے لکھنا چاہیے۔ افاجات وان کریمر (صفحہ ۱۳۲) کی جگہ افادات فان کریمر ہونا چاہیے۔ ایک جگہ (صفحہ ۷۸) کریم آف دی سوسائٹی لکھا ہے، مارشل اسپرٹ (صفحہ ۷۷)۔ ریٹائرڈ لسٹ (صفحہ ۹۰)۔ ٹرکش لائف (صفحہ) لٹریری ڈائری (صفحہ ۱۰۱)۔ ان سب انگریزی الفاظ کی بجائے اردو میں الفاظ موجود ہیں یا گھڑے جاسکتے تھے۔

محاورات کی تحریف کسی طرح جائز نہیں ہے۔ آپ کے یہاں صفحہ ۴۴ پر تحریر ہے "لیکن یہ کھینچا تانی صرف ایک طرح کی من سمجھوتی ہے" "یہ سمجھوتی" کیا بلا ہے۔ سمجھوتہ کا مونث۔ خوب! اصل محاورہ قائم رہنا چاہیے تھا یعنی ایک طرح کا من سمجھوتہ ہے۔

صفحہ ۱۹۶ پر لکھا ہے "لیکن اگر" "گھر کی مرغی کو ساگ کے برابر" "نہ سمجھے" یہ کوئی ضرب المثل نہیں بلکہ اصل "گھر کی مرغی دال برابر" ہے آپ نے ضرب المثل میں بھی تحریف فرمادی جو کسی طرح جائز نہیں۔

مولوی عبدالماجد صاحب نے آپ کی انشا پردازی سے اپنے دیباچہ میں چند اقتباسات

سکے ہیں۔ دیگر اقتباسات سے مجھے کوئی تعرض نہیں لیکن پہلا اقتباس کم از کم مجھ کو پسند نہیں جناب مہدی نے ہماری اردو زبان کو زنیرِ بازاری یعنی گل کی چھوکری اور فاحشہ عورت سے مثال دی ہے جو کبھی کسی کے تصرف میں ہو اور کبھی کسی کے تصرف میں [illegible] آخر کار اس کو اپنے ممدوح شبلی کی کنیز بنا دیا ہے۔ بلکہ اسی تعلق کا ایک ثمر بیش رس "الندوہ" کو قرار دیا ہے۔ اگر کوئی اس کے طور پر آپ کی اس انشا پردازی کا خاکہ کھینچا جائے تو یقیناً نفرت انگیز ہو گا کہ بوڑھے شبلی [illegible]

اس تعلق سے ایک بچہ "الندوہ" پیدا ہو رہا ہے۔ [illegible]

افسوس اور صد افسوس کہ اُردو زبان کی تیش [illegible]

اس سے بڑھ کر افسوس یہ ہے کہ عبدالماجد صاحب نے [illegible]

کرتے ہیں کہ اگر یہ عبارتیں حسن انشا کا بہترین نمونہ نہیں تو مجھے نہیں معلوم [illegible] پرستارانِ شبلی کو کم از کم "نادان دوست" نہ ہونا چاہیے۔ مولانا شبلی مرحوم کی مدح [illegible] اور الفاظ میں بھی ہو سکتی تھی اور اس سے زیادہ دلکش پیرایہ، زوردار الفاظ کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا تھا۔

لیکن جہاں ہم نے جناب مہدی مرحوم کے نقائص بیان کئے ہیں، ہمیں صاف صاف اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ خامیاں ایسی نہیں جو ان کے کمالِ انشا پردازی پر پردہ ڈال سکیں۔ دل چاہتا ہے کہ ان کی انشا پردازی میں یہ معمولی عیوب بھی نہ ہوتے۔ مگر وہ بقول مہدی بیگم "مجسم جذبات تھے" لہٰذا وہ جذبات سے مغلوب ہو کر لغزشِ قلم کو روک نہ سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مرحوم نے تیس سال کے عرصے میں بہت کم لکھا اور جو کچھ لکھا وہ بھی وقتی مسائل پر لکھا۔ کاش وہ کوئی مستقل تصنیف چھوڑ جاتے جو "ادب العالیہ" میں شمار ہوتی۔ ان کا سرمایۂ حیات یہی مجموعۂ مضامین ہے جو فی الواقع ادبِ اردو میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ جو لوگ ادبی مذاق رکھتے ہیں ان کے لئے افاداتِ مہدی کا مطالعہ ناگزیر ہے اور کوئی اُردو کا ادبی کتب خانہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں افاداتِ مہدی نہ ہو۔ خدا مرحوم کو جزائے خیر دے اور ان کی مغفرت کرے۔

محمد یحییٰ تنہا

رسائل :-

دستکاری - یہ رسالہ زیر ادارت ڈاکٹر محمد شفیع پی ایچ. ڈی - بلیماران دہلی سے ماہانہ شائع ہوتا ہو حجم کم و بیش تین جزو. قیمت سالانہ سے ؎ر

ہندوستان میں دستکاری کی جس قدر ضرورت ہو اس قدر کسی چیز کی ضرورت نہیں - یہ رسالہ اُن دستکاریوں کو جو اس وقت دنیا میں رائج ہیں بہت آسان طریقے سے لکھ دیتا ہے جس کو اردو خواں طبقہ سمجھ سکتا ہے اور اس پر عمل بھی کرسکتا ہے - ایسے ہی رسائل کی ضرورت ہو جو کاروباری آدمی پیدا کرسکیں - کاش اس قسم کے اور بھی رسالے ہمارے ملک میں نکلتے -

---

تسنیم - جدید ماہانہ رسالہ آگرہ سے ہونا شروع ہوا ہے - بدایوں کے مشہور شاعر شوکت علی خاں فانی کی نگرانی اور رمانی جانسی اور محمود اکبر آبادی کی ادارت میں شائع ہوتا ہے - مقاصد ادبی - تاریخی اور علمی ہیں - چھپائی اور کاغذ عمدہ - حجم ساڑھے چار جزو قیمت سالانہ پانچ روپیہ - مضامین سب کے سب اچھے ہیں خاص کر نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ -

رسالہ کی ادارت ان ہاتھوں میں ہو جو اس وقت ادب اردو کے علمبرداروں میں ہیں اس لئے ہم کو امید رکھنی چاہئے کہ یہ رسالہ اردو ادب کی اچھی خدمت کرے گا - کیا عجب ہو کہ شہر آگرہ قدیم دالخلافہ جو ادبی تحریک کے فقدان سے آج ملک میں گمنام ہو رہا ہے اس رسالے کی بدولت شہرت پاجائے اگر مدیران رسالہ نے توجہ سے کام کیا تو یہ امر کچھ بعید نہیں -

---

چمنستان - اکثر رسائل اپنے اپنے خاص نمبر نکالتے ہیں - چمنستان امرت سر کا بھی سالنامہ ۱۹۳۰ء نہایت آب و تاب کے ساتھ نکلا - اس میں متعدد تصاویر کے علاوہ ادب عالیہ کے نظم و نثر کے اچھے نمونے فراہم کئے گئے ہیں - چھپائی - لکھائی بھی نہایت دیدہ زیب ہو - اس نمبر کی قیمت ۱۲ ہے - ہم چمنستان کے جوشیلے نوجوان مدیر محمد افضل خاں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنی کوشش میں کامیابی حاصل

کی اور نہایت دلچسپ سالنامہ نکالا۔

ہندوستانی اکیڈیمی کا تماہی رسالہ ۔ یہ سہ ماہی رسالہ صوبہ متحدہ الٰہ آباد کی ہندوستانی اکیڈیمی کی طرف سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کا پہلا نمبر ریویو کے لئے موصول ہوا ہے۔ حجم ۲۰×۳۰ تقطیع پر ۲۰۰ صفحے ہے اور اچھے صاف ٹائپ میں عمدہ کاغذ پر چھاپا گیا ہے۔
اکیڈیمی کی طرف سے جیسے رسالہ کی ہم تو [illegible]
ہے۔ اس کے کل مضامین عالمانہ اور محققانہ [illegible]
لکھا گیا ہے۔
مجلس مدیران میں جن حضرات کے اسماء گرامی [illegible]
رسالہ اور بھی بہتر ہوتا جائے گا۔ قیمت سالانہ آٹھ روپے ہے۔ (ا - ج)

شذرات

ابھی پچھلے مہینے ہم مولانا محمد علی کا ماتم کر چکے تھے کہ اس مہینے کے شروع میں ایک اور جانگداز حادثہ گذرا یعنی فخر ہندوستان پنڈت موتی لال نہرو ہمیں داغ جدائی دے گئے۔ خدا ہی جانے کہ ایسے نازک وقت میں ان رہنماؤں کو دنیا سے اٹھا لینے میں اس کی کیا مصلحت ہے۔ ہمارے لئے سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ نہیں۔

پنڈت جی وہ شخص تھے جن کے تدبر، دانشمندی، خلوص اور جرأت پر ہندوستان کو ناز تھا۔ جن کی ذات سے اسمبلی کے قوم پسند ممبروں کو ہمیشہ تقویت رہتی تھی اور سرکاری ممبروں کے دل میں رعب بیٹھا رہتا تھا۔ اس شان اور دبدبے کے لوگ بھی اب مشکل سے پیدا ہوں گے۔ اس کے علاوہ پنڈت جی کا طرز معاشرت ہندو مسلم تہذیب کے امتزاج کا بہترین نمونہ تھا اور ان کی زندگی کا بڑا حصہ ان دونوں فرقوں کے اتحاد کی کوشش میں گذرا۔ کاش وہ اتنے دن زندہ رہتے کہ اپنی سعی کو مشکور ہوتے دیکھ لیتے۔

ہم پنڈت جواہر لال سے اس دلدوز صدمے میں دلی ہمدردی رکھتے ہیں اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ملک اور قوم کے لئے اپنے والد کے نعم البدل ثابت ہوں گے۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری کشتی کے ناخدا ڈاکٹر انصاری صاحب قید محن سے رہا ہو کر آگئے مگر ابھی تک مولانا شوکت علی صاحب دہلی نہیں پہنچے ہیں اس لئے مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار کا مسئلہ ہنوز طے نہیں ہوا۔ ہمیں امید ہے کہ مارچ کے شروع میں یہ تصفیہ ہو جائے گا کہ ملت اسلامی کو اپنا یہ اہم فرض کس صورت میں ادا کرنا چاہئے۔

ابھی تک ہم جامعہ کا جوہر نمبر نکالنے کا انتظام بھی نہیں کر سکے ہیں مگر امید ہے کہ مئی تک یہ کام انجام پا سکے گا۔

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپئے

مثنوی مخزن الاسرار

فارسی زبان کے ادب عالیہ میں جو درجہ شیخ نظامی کی مثنویوں کو حاصل ہوا وہ کسی دوسرے کے کلام کو نصیب نہ ہو سکا۔ زبان کی شستگی۔ بندش کی پختگی۔ خیالات کی بلندی اور شاعرانہ لطافت میں وہ جملہ ادبیات ایران سے فائق تر ہیں۔ متاخرین میں سے اکثر نے ان کی پیروی بھی کی لیکن بالعموم ناکامیاب رہے۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ ان کی مثنوی مخزن الاسرار پر ایک نگاہ ڈالیں۔

ان کی پانچ مثنویاں ہیں۔ مخزن الاسرار۔ شیریں خسرو۔ لیلیٰ مجنوں۔ ہفت پیکر اور سکندر نامہ۔ یہی خمسہ یا پنج گنج کہلاتی ہیں۔ نظامی کے بعد سے آج تک جملہ مثنوی گو شعرا مثلاً امیر خسرو۔ مولانا جامی۔ ہاتفی اور فیضی وغیرہ نے اسی خمسہ کو پیش نظر رکھ کر جواب لکھنے یا چربہ کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔

مخزن الاسرار خمسہ نظامی کی اولین مثنوی ہے۔ انھوں نے سکندر نامے میں اپنی مثنویوں کی ترتیب کو لکھ دیا ہے

سوئے مخزن آوردم اول بسیج	کہ سستی نکردم دراں کار ہیچ
از و چرب و شیریں تر انگیختم	بہ شیرین و خسرو در آو یختم
وزا نجا سرا پردہ بیروں زدم	در عشق لیلے و مجنوں زدم
چو از عشق مجنوں بہ پرداختم	سوئے ہفت پیکر فرس تاختم
کنوں بر بساط سخن گستری	زنم کوس اقبال اسکندری

مخزن الاسرار ۵۷۰ھ میں جب کہ نظامی کی عمر[1] ۴۰ سال کی تھی فخر الدین بہرام شاہ رومی والی

---

(۱) نظامی کی ولادت کا صحیح سن اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے لیکن چونکہ انھوں نے ۶۴ سال کی عمر میں انتقال کیا ہے اور ان کا سن وفات معتبر بیانات کے مطابق ۵۹۹ھ ہے اس لئے ان کی ولادت ۵۳۵ھ میں سمجھنی چاہئے۔ سکندر نامہ بحری کے خاتمے میں وہ لکھتے ہیں۔ (ص ۱۷۱)

ارزجہان کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ ہاشمی کرمانی اپنی مثنوی مظہر الآثار میں جو اس نے مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی ہے اس کی وجہ تالیف اس طرح بیان کرتا ہے۔

دادگرے بود ہمایوں خصال — عادل و دریا دل و صاحب کمال
شاہِ فلک مسند و انجم سپاہ — خسروِ جم کوکبہ بہرام شاہ
بسکہ نکو طبع و خرد مند بود — در طلب حکمت و پند بود
داشت وزیرے بہ نسب نامدار — عارف و [illegible]
طرفہ شبے آں شہ روشن ضمیر
گفت چہ سازم کہ در ایام من
گفت وزیرا از رہِ تدبیر و رائے
آنکہ ازو زندہ بود نام کس
یا خلفے بعدِ تو در روزگار — از تو و نام تو بود یادگار
شاہ ازیں نکتہ چو گل بر شگفت — برگ گل از غنچہ بر آورد و گفت
آنچہ تو گفتی ہمہ سنجیدہ است — دلکش و مطبوع و پسندیدہ است
زیں دو سخن آنچہ مرا آرزوست — شہرت و آوازۂ نام نکوست
بوئے خلف در گل ایام نیست — گر خلفے ہست بجز نام نیست
حمدِ خدا را کہ دریں روزگار — شیخ نظامیست ز مردان کار
بہ کہ باخلاص روم سوئے او — دیدہ منور کنم از روئے او
چوں بسوئے پیر سخن رو کنم — روئے سخن را بسوئے او کنم

فزوں بود سنش ز شصت و سہ سال — کہ بر عزمِ رہ بر دہل زد دوال
اور اسی کے بعد ان کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

کلک سخنت در همه عالم سند — نظم خوشت گوهر یکسر ابد
لطف کن و بهر دل چون منے — ساز کن از گنج هنر مخزنے
تا بود از نظم تو نامی شوم — در همه آفاق گرامی شوم
بر سر پا خاست وزیر از نشاط — گفت به سلطاں ز رہ انبساط
خضر رہت ہادی توفیق باد — جلوہ گہت وادی تحقیق باد
شاہ بخیل و سپہ نامدار — شد ز رہ صدق و کرامت سوار
رفت سوئے شیخ ز بہر طواف — با نظر بینش و مرآۃ صاف
بہر ہدایا بہ طریق جمیل — زر بہ شتر برد و جواہر بہ پیل
سادہ غلاماں کہ بحسن و جمال — یافتہ بود از ہمہ جاں جاں خال
مشک سرشتان سواد جمال — مردمک دیدۂ ارباب حال
چوں بحضور آمد و ممتاز شد — محترم زاویۂ راز شد
مکرمت بیحد و اندازہ شد — عہد قدیم از سر نو تازہ شد
چوں سخن از ہر طرفے گفتہ شد — گرد تکلف ز میاں رفتہ شد
شاہ سخنداں سخن آغاز کرد — قصۂ پوشیدۂ خود باز کرد
کرد پس از مکرمت بیقیاس — از کرم حضرت شیخ التماس
تا رقم نسخۂ مخزن کشد — گنج نہاں بر ہمہ روشن کند

---

(۱) نظامی نے سلسلہ طریقت میں شیخ اخی فرخ زنجانی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ صاحب علم تھے اور درویش اور ان سب سے بڑھ کر، یہ کہ خوش کلام شاعر جس کی وجہ سے اطراف و دیار میں ان کی شہرت پھیل گئی تھی۔ اور ان کی غزلوں اور قصیدوں نے ان کا نام اچھال دیا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

ملک الملوک فضلم بہ فضیلت معانی — زمی و زماں گرفتہ بہ مثال آسمانی

وہ گوشہ نشین تھے اور دوسرے شعرا کی طرح غلبۂ حرص و ہوا سے ملوک و امرا کے پاس نہیں جاتے تھے بلکہ سلاطین خود انکی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

شیخ مدد خواست ز فیاضِ جود — ملتمسِ شاہ اجابت نمود
از پئے ایں فرّ دہ شہِ نامدار — کرد پے نقدِ گرامی نثار
ساخت یکے منظرِ فیروزہ فام — تا بکند شیخ درآنجا مقام
بود مہیا ہمہ اسبابِ او — منعم و خوش دل ہمہ احباب او
باہمہ قدر و عدم احتیاج — یافتہ از گنجہ [illegible]
چوں دلش از قیدِ جہاں سادہ شد — [illegible]
خیمہ بروں زد ز گل و آب تن
ساخت کتابے کہ ز اوجِ بریں
نامۂ خود بر ہمہ فرخندہ ساخت
نسخۂ او معدنِ امید شد — مخزنِ گنجینۂ جاوید شد

اسی زمانے میں حکیم سنائی نے بہرام شاہ بن مسعود شاہ غزنوی کے نام پر اپنی مثنوی حدیقہ لکھی تھی۔ نظامی کہتے ہیں۔

نامہ دو آمد ز دو ناموس گاہ — ہر دو مسجل بدو بہرام شاہ
آں زرے از کانِ کہن ریختہ — ویں درے از بحرِ نو انگیختہ

یعنی حدیقہ حکیم سنائی کے اشعار مثل زر کے ہیں اور پرانی زبان اور پرانے طرز پر ہیں اور مخزن کے اشعار مثل گوہر کے ہیں جو جدید بحر میں نئے طرز پر لکھی گئی ہے۔

آں بدر آورد ز غزنیں علم — ویں زدہ بر سکۂ رومی رقم
گرچہ دراں سکہ سخن چوں زر است — سکۂ نظمِ من ازاں بہتر است

یہ فیصلہ کوئی تعلّی نہ تھی بلکہ حقیقت تھی جس کو انھوں نے بے جھجک ظاہر کر دیا۔

مخزن کے اشعار کی تعداد ۲۲ اور ۲۳ سو کے درمیان ہے۔ نظامی نے اس کو صرف چند روز میں لکھ ڈالا تھا۔ چنانچہ کہا ہے۔

اینچہ دریں مجاز تر گاہی است جلوہ گرچند تر گاہی است

• آغاز اس شعر سے ہوتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ہست کلید در گنج حکیم

ایک حدیث بیان کی جاتی ہے کہ "واللہ تحت العرش کنز مفاتحہ السنۃ الشعراء" یعنی اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے ایک خزانہ ہے جس کی کنجیاں شعراء کی زبانیں ہیں۔

صاحب مخزن الفوائد نے اس کے متعلق یہ دلچسپ قصہ لکھا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے تو عرش کے نیچے ایک مقفل مکان دیکھا۔ جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ یہ کیسا مکان ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ معانی کا خزانہ ہے جس کی کنجی آپ کی امت کے شعراء کی زبانیں ہیں۔ فرمایا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی ہدیہ کرو۔ جبریل نے دو شعر نکال کر پیش کئے۔ آپ اس کو اپنے دل میں رکھتے تھے۔ ایک روز حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جو دربار نبوی کے شاعر تھے آپ نے ایک سادہ قرطاس عطا فرمایا اور کہا کہ اس پر ایک قصیدہ حمد و نعت میں لکھ کر جمعہ کے دن سناؤ۔ انھوں نے آپ کے دست مبارک سے وہ قرطاس لے کر جیب میں رکھ لیا۔ اور قصیدہ لکھنا بھول گئے۔ جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ آپ نے حکم دیا کہ حسان قصیدہ سناؤ۔ اب ان کو یاد آیا۔ قصیدہ تو لکھا نہیں تھا مگر پاس ادب سے منبر پر کھڑے ہو گئے اور وہی سادہ قرطاس ہاتھ میں لے کر فی البدیہہ حمد و نعت میں اشعار پڑھنے شروع کر دئے۔ اتفاقاً وہ دونوں شعر بھی جو حضرت جبریل نے ہدیہ میں دئے تھے اور سوائے آنحضرت صلعم کے اور کسی کو ان کا علم نہ تھا اس وقت حسان کی زبان سے نکلے۔ آپ نے فرمایا کہ ان شعروں کو سوا میرے کوئی جانتا نہ تھا۔ تم جو اس وقت تمثیل فرمان کے خیال سے فی البدیہہ قصیدہ پڑھنے لگے تو جبریل نے تمھارے دل پر القا کر دئے۔ پھر حضور نے ان کے حق میں دعا فرمائی کہ "اللھم ایدہ بروح القدس بہ"

اس شاعرانہ قصہ کو نظامی نے آغاز مثنوی میں ان اشعار میں ادا کیا ہے۔

قافیہ سنجان کہ علم بر کشند گنج دو عالم بہ سخن در کشند

ز آتش فکرت چو پریشاں شوند　　　با ملک از جلوہ خورشاں شوند

اس دلچسپ تلمیح کی وجہ سے نظامی کے بعد ان کی مثنوی کے جواب لکھنے والے شعرا نے بسم اللہ پر مصرع لگانے شروع کئے اور یہ طبع آزمائی کا میدان بن گیا ہم اس جگہ چند مصرعے درج کرتے ہیں۔

امیر خسرو	بسم اللہ	الرحمٰن	الرحیم	خطبۂ قدس است بملک قدیم
مولانا جامی	〃	〃	〃	هست صلائے سر خوان کریم
ہاشمی کرمانی	〃	〃	〃	
غزالی مشہدی	〃	〃	〃	
فیضی	〃	〃	〃	
عرفی	〃	〃	〃	[illegible]
شفائی	〃	〃	〃	تیغ الٰہی ست بدست حکیم
ملا شیدا	〃	〃	〃	آمدہ سرچشمۂ فیض عمیم
زلالی	〃	〃	〃	مطلع دیباچۂ نظم قدیم
آزاد بلگرامی	〃	〃	〃	تیغ سیہ تاب رسول کریم
میر الٰہی	〃	〃	〃	قافلہ سالار کلام حکیم
صفا	〃	〃	〃	ہست عصائے رہ امید و بیم
وحید	〃	〃	〃	کعبۂ جان و دل اہل نعیم
تمنا	〃	〃	〃	ہست علاج از پئے قلب سقیم
عالم	〃	〃	〃	خال رخ آرائشِ عروس قدیم
کامی	〃	〃	〃	مطلع انوار کلام قدیم
وحدت	〃	〃	〃	مصرع برجستۂ نظم قدیم
معنی	〃	〃	〃	حاصل ہر چار کتاب قدیم

آزاد   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم   آیت الطاف خداست کریم

یعنی جوابات نظامی کے مصرعہ "ہست کلید در گنج حکیم" میں ہے وہ ایک میں بھی نہیں پیدا ہو سکا۔
نظامی نے مثنوی کے دیباچہ کے واسطے چند چیزیں لازمی کر دی ہیں۔ توحید۔ مناجات نعت
معراج۔ مدح سلطان وقت۔ تعریف سخن و سخنوراں اور سبب تصنیف مثنوی۔ امیر خسرو نے ان
کے اوپر پیر کی مدح اور شیخ نظامی کی استادی کا اقرار بھی اضافہ کر لیا جس کی تقلید ان کے بعد کے مثنوی
نگاروں ہاتفی اور جامی وغیرہ نے بھی کی۔

مثنوی مخزن الاسرار میں نہ حسن و عشق کی داستان ہے نہ رزم و بزم کا افسانہ اور نہ سلسلہ دار کوئی
قصہ۔ صرف مذہبی اور روحانی جذبات کو ابھارنے والے چند مضامین شاعرانہ تخیل کے قالب میں ڈھالے
گئے ہیں۔ تین خلوتیں ہیں اور بیس مقالے جن میں مختلف نصائح اور صوفیانہ باتیں ہیں۔ آخر میں خاتمہ
ہے جس پر مثنوی تمام ہو جاتی ہے۔

اس مثنوی سے ادبیات ایران کا ایک نیا باب شروع ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس کی اہمیت
نہایت عظیم الشان ہے۔ پچاسوں جوابات لکھے جانے کے بعد بھی وہ اب تک لاجواب ہے۔ اور بعض اساتذۂ
سخن نے تو اس کو شاعری کا معجزہ قرار دیا ہے جس کا مقابلہ ناممکن ہے۔

اس جگہ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ مخزن اور اس کے پہلے جواب مطلع الانوار سے بعض بعض عنوانات کے
ہم مضمون اشعار بالمقابل نقل کر دیں تاکہ ناظرین اصل اور جواب دونوں کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

نظامی نے مخزن الاسرار میں جوانی کی غفلت سے تنبیہ کی ہے۔ خسرو نے بھی اس مضمون کو ستر ہویں
مقالے میں لیا ہے۔

نظامی	خسرو
عہد جوانی بسر آمد مخسپ	راہ مخوفست مخسپ اے جواں
شب شدہ اینک سحر آمد مخسپ	خیز کہ بگذشت ز پل کارواں
صبح بیامد چہ شوی مست خواب	خواب تو بسیار شب اندر گریز

کز سر دیوار گزشت آفتاب
تات سپیدہ نہ دمیدا ست خیز

رفت جوانی بتغافل بسر
آہ کہ ایام جوانی گزشت

جائے دریغ است، دریغ بخور
[illegible]

چشمۂ مہتاب تو سردی گرفت
[illegible]

لالۂ سیراب تو زردی گرفت
[illegible]

شیفتہ شد عقل و تبہ گشت رائے

آبلہ شد دست و ورم گشت پائے

غافلی از قدر جوانی کہ چیست

تا نشوی پیر ندانی کہ چیست

نظامی نے ایک باغ کا بیان لکھا ہے خسرو نے بھی خلوت دوم میں ان کی تقلید کی ہے۔ میں دونوں کا منظر دکھاتا ہوں۔

نظامی	خسرو
قافلہ زن یاسمن و گل بہم	خندۂ گلہائے چمن رو برو
قافیہ گو قمری و بلبل بہم	نغمۂ مرغان ہوا سو بسو
فاختہ فریاد کناں صبح گاہ	فاختہ شیفتانہ دم از حق زدہ
فاختہ گوں کردہ فلک را ز آہ	گردِ گریباں زہِ ازرق زدہ
چنگل دراج بخون تدرو	زاغ کہ باکبک نمودہ خرام
سلسلہ آویختہ برپائے سرو	خندہ فرو خوردہ شگوفہ بکام
چشمہ درخشندہ ترا ز چشم حور	آب زمہتاب زمین گردتر
بردہ ز سر چشمۂ خورشید نور	چشمہ ز خورشید جواں مرد تر

لالہ بہ آتش گر راز آمدہ | لالہ کہ شد یادِ دہن بوسِ او
چوں مغ ہندو بہ نماز آمدہ | دیدۂ نرگس شدہ جاسوسِ او
خواب سگے بود سمن زار او | رفتہ ازیں روضہ بفردوس بوئے
خواب کناں نرگس بیمار او | غالیہ نو زدہ حوراں بہ موئے
خواست پریدن چمن از چابکی | تازہ شد از ابر بہاری چمن
خواست چکیدن سمن از نازکی | خندہ زد از بوئے ریاحین سمن

اس قسم کی بہت سی مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ بالعموم ان مضامین کو جن کو نظامی نے لکھا ہے جواب نگاروں نے بھی لکھنے کی کوشش کی ہے۔ امیر خسرو یہ جانتے تھے کہ میں نظامی کا مدمقابل نہیں ہو سکتا۔ اس کا انھوں نے جابجا اپنی مثنویوں میں اعتراف بھی کیا ہے۔ ان کا دعوے صرف یہ تھا کہ میں نظامی کی چربہ کشی کر سکتا ہوں اور بس۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں | فرق ندانند ازیں تا بداں

لیلیٰ و مجنوں میں اس کو اور واضح طور سے کہا ہے۔

زاں سکہ کہ مردِ پر ہنر داشت | بہ زیں نتواں نمونہ برداشت

مثنوی مخزن الاسرار ایشیا اور یورپ میں مختلف مطابع میں چھپ چکی ہے۔ اس کی تین شرحیں قلمی دہلی کے کتب خانہ میں ہیں۔ ایک محمد بن رستم بن احمد بن محمود بلخی کی۔ دوسری ابراہیم تتوی کی۔ اور تیسری امان اللہ کی۔ ایک شرح مولوی ظہور الحسن کی لکھنؤ میں ۱۸۶۹ء میں چھپ چکی ہے۔

انگریزی زبان میں اس مثنوی کے دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک ہنڈلے نے کیا ہے جو برٹش میوزیم میں قلمی رکھا ہوا ہے۔ دوسرا بلینڈ کا ہے جو ۱۸۴۴ء میں لندن میں چھپا تھا۔

مثنوی مثنوی کا لفظ اصل میں مثنیٰ تھا جس کے معنی ہیں دو۔ دو۔ مولوی کے قاعدے کے مطابق یائے نسبتی لگا کر مثنوی بنایا گیا۔ چونکہ اس کے ہر ہر شعر میں دو دو قافیے ہوتے ہیں اس لئے اس کا نام مثنوی رکھا گیا۔

اصناف شاعری میں سے قصص، حکایات اور تواریخ وغیرہ کے لئے مثنوی کا شعبہ مخصوص کر لیا گیا۔ اس لئے کہ طویل واقعہ یا افسانے کو قصیدہ یا غزل کی طرح ایک ہی قافیہ کی پابندی کے ساتھ منظوم کرنا سخت مشکل ہو۔ نیز آسانی کے لئے مثنوی چھوٹی بحروں میں لکھی جاتی ہے۔ بڑی بحریں مثلاً رجز، رمل ہزج تام وغیرہ اس میں نہیں استعمال کی جاتیں۔

عربی زبان میں مثنوی نہیں تھی۔ صرف متاخرین شعرا نے بتتبع عجم مثنویاں لکھی ہیں جو بالعموم غیر متداول ہیں۔

اساتذہ فن کا قول ہے کہ شاعری کی ...
شعر کے لئے وہی الفاظ لانے پڑتے ہیں جو ...
ہے۔ بخلاف قصیدہ یا غزل کے کہ ان میں ...

فارسی زبان کا پہلا مشہور شاعر حافظ ابو ... اور غزل گوئی شروع ہوئی وہاں مثنوی کا بھی آغاز ہوا۔ اس نے امیر نصر بن احمد سامانی کے حکم سے [illegible] میں کلیلہ و دمنہ کا قصہ عربی زبان سے لے کر فارسی میں منظوم کیا اور چالیس ہزار درم انعام پایا۔ عنصری نے یہ جمیل تذکرہ لکھا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش　　عطا گرفت بنظم کلیلہ و دمنہ

رودکی سے نظامی کے زمانے تک حسب ذیل مثنویاں لکھی گئیں

نام مثنوی	نام مصنف	سنہ وفات ہجری
گشتاسپ نامہ	دقیقی منصور بن احمد	۔
گرشاسپ نامہ	اسدی طوسی	۴۰۹
شاہنامہ و یوسف زلیخا	فردوسی طوسی	۴۱۱
ویس و رامین	فخر الدین اسعد گورگانی	۴۲۹
وامق و عذرا	عنصری	۴۲۱

روشنائی نامہ و سعادت نامہ	ناصر خسرو علوی	۴۸۱
مونس نامہ	حکیم قطران بن منصور	۴۸۵
حدیقۃ الحقیقہ وغیرہ	حکیم سنائی غزنوی	۵۲۵
قصۂ یوسف	عمعق بخاری	۵۴۳
وامق و عذرا	فصیحی جرجانی	۰

ان کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں نظامی عروضی سمرقندی اور بعض دوسرے شعرا نے لکھی تھیں۔ ان مثنویوں کا عام انداز یہ تھا کہ قصہ یا واقعہ منظوم کر دیا جاتا تھا مگر کلام کی فصاحت، شوکت، ترکیب کی چستی اور تسلسل نہ لطافت اور نزاکت پیدا کرنے کا خیال کم کیا جاتا تھا۔

جب نظامی گنجوی کا زمانہ آیا تو ان کی دوربیں نگاہ نے ان نقائص کو تاڑ لیا۔ انھوں نے شاعری کے تمام اصناف سے منہ موڑ کر زیادہ تر اسی شعبہ مثنوی کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ اور اس میں بہت سی اصلاحیں کیں۔

قدما کی مثنویوں میں جو نامانوس اور غیر فصیح الفاظ مستعمل تھے ان سے زبان کو پاک کیا۔ اور رائج الوقت زبان جو عربی الفاظ کے اختلاط سے نہایت لطیف ہو گئی تھی استعمال کی۔ بندشوں اور ترکیبوں میں چستی کا خیال رکھا۔ کلام کو بلند اور شاندار بنایا اور استعاروں اور تشبیہوں کے زیوروں سے اس کو آراستہ کرکے ایک نئی شکل و صورت میں جلوہ گر کیا۔ ناپسندیدہ قوافی چھوڑ دیے۔ اور نامطبوع اوزان کو خارج کرکے صرف پانچ بحریں اس کے لئے مخصوص کیں(۲)۔ مخزن الاسرار اور ہفت پیکر کی بحروں میں سب سے پہلے

---

(۱) پنج گنج کے علاوہ نظامی نے قصیدہ اور غزل کا بھی ایک دیوان چھوڑا ہے۔ دہلی میں باوجود تلاش اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ مگر ایک مدت ہوئی کہ میری نظر سے ایک مختصر مجموعہ نظامی کے قصائد اور غزلیات کا جو تقریباً ایک ہزار اشعار پر مشتمل تھا گزرا ہے۔

(۲) متاخرین نے ان پر دو وزن اور اضافہ کرکے مثنوی کے سات اوزان قرار دئے۔ امیر خسرو نے جدت پسندی سے اس کے اوزان اور بڑھا کر ایک مثنوی نو بحروں میں لکھی اور اس کا نام نہ سپہر رکھا۔ لیکن محققین نے سات ہی اوزان باقی رہنے دئے چنانچہ مولانا جامی نے سات مثنویاں [illegible] کا نام ہفت اورنگ رکھا۔

انھیں نے مثنوی لکھی۔ ان سے پیشتر کسی نے ان بحروں میں قدم نہیں رکھا تھا۔

قدما کی شاعری میں عشق مجازی تھا اور شاہد دمی کا راگ گایا جاتا تھا۔ انھوں نے ان چیزوں کو نکال کر تصوف اور فلسفے کو شامل کیا۔^(۱) اگرچہ ان سے پہلے حکیم سنائی نے حدیقۂ وغیرہ کئی مثنویاں تصوف میں لکھی تھیں لیکن ان کا انداز صوفیانہ اور واعظانہ تھا۔ شاعرانہ روش پر نظامی ہی نے ان مضامین کو ڈالا۔

الغرض شیخ نظامی نے مثنوی کا نہ صرف نیا قالب تیار کیا بلکہ نئی روح بھی اس میں پھونکی۔ وہ اپنے اس کارنامے کو کس مستانہ انداز میں مخزن الاسرار میں لکھتے ہیں۔

منکہ دریں شیوہ مصیب آمدم

شعر بمن صومعہ بنیاد شد

زاہد و راہب سوئے من تاختند

اپنی تجدید فن کو سراہتے ہیں کہ میں صرف پیدا

نہیں کی ہے۔

عاریت کس نہ پذیرفتہ ام
انچہ دلم گفت بگو گفتہ ام

شعبدۂ تازہ بر انگیختم
ہیکلے از قالب نو ریختم

صنعت من بردہ ز جادو شکیب
سحر من افسون ملائک فریب

یہی وجوہ ہیں جن سے وہ فن مثنوی کے امام تسلیم کئے گئے۔ اور کہا گیا ع

امام مثنوی گویاں نظامیست

مخزن الاسرار کے جوابات | یہ مثنوی بحر سریع مطوی موقوف "مفتعلن مفتعلن فاعلات" میں سب سے پہلی ہے جس کو نظامی نے ۵۷۰ھ میں لکھا۔ اس وقت سے امیر خسرو کے عہد تک جہاں تک ہمارا علم ہے کسی نے اس کا جواب یا اس بحر میں کوئی دوسری مثنوی فارسی زبان میں نہیں لکھی۔ ایک صدی سے زائد گزر جانے کے بعد ۶۹۸ھ میں امیر خسرو نے اس کے جواب میں اپنی مثنوی مطلع الانوار تصنیف کی۔ خسرو نے نہ صرف

---

(۱) نظامی فن نجوم کے ماہر تھے اس لئے لازمی طور پر ان کے کلام میں جابجا اس کا بھی اثر آگیا ہے۔

مخزن الاسرار بلکہ پورے خمسۂ نظامی کا جواب لکھا۔ ان کے بعد سے مثنوی گو شعرا نے خمسۂ نظامی کو اپنے پیش نظر رکھ لیا اور ان کی تقلید شروع کی بعض شعرا مثلاً زیدی شیرازی نے خمسہ کے دو جواب لکھ ڈالے۔
لیکن مثنوی مخزن الاسرار خود نظامی کی مثنویوں میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے۔ صاحب ہفت اقلیم نے تو اس کو شاعری کا معجزہ قرار دیا ہے اور بعض بعض اساتذہ مثلاً ہاتفی اور ہلالی وغیرہ نے بھی جنہوں نے خمسۂ نظامی کے جواب لکھے ہیں اس کا جواب ناممکن سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے جتنے جواب لکھے گئے سب اس سے فروتر رہے۔
اب تک مشہور شعرائے فارس نے مخزن کے جواب میں جو مثنویاں لکھی ہیں ان کی فہرست بہ ترتیب زمانہ ہم یہاں درج کرتے ہیں۔

نام مثنوی	مثنوی نگار	سنہ وفات ہجری
مطلع الانوار	امیر خسرو	۷۲۵
روضۃ الانوار	خواجو کرمانی	۷۵۳
مونس الابرار	خواجہ عماد فقیہ کرمانی	۷۷۳
گلشن ابرار	مولانا کاتبی نیشاپوری	۸۳۹
تحفۃ الاحرار	مولانا جامی	۸۹۹
منظر الابصار	قاضی سنجانی	•
مظہر الآثار	امیر ہاشمی کرمانی	۹۴۸
مشہد انوار و ندرت آثار	غزالی مشہدی	۹۸۰
منظور انظار	رہائی مروی	۹۸۴
مظہر الآثار	حکیم ابوالفتح دوائی	•
مجمع الابکار	عرفی شیرازی	۹۹۹
زبدۃ الافکار	نکی اصفہانی	۱۰۰۰

مرصد الاسرار	ابو اسحاق گازرونی	۰
مرکز ادوار	شیخ فیضی فیاضی	۱۰۰۴
مثنوی نامی	میر محمد معصوم نامی	
مثنوی شانی تکلو	آقا شانی تکلو	۱۰۲۳
منبع الانہار	ملک قمی، مولانا ظہوری	۱۰۲۴
دیدہ بیدار	حکیم شفائی	
حسن گلو سوز	زلالی	
مظہر الانوار		
مثنوی طاہر وحید		
مخزن والہ	درویش حسین والہ ہروی	۰
مطلع الانوار	میر محمد باقر داماد اشراق	۱۰۴۱
دولت بیدار	ملا شیدا	۱۰۸۰
مشرق الانوار	مولوی عبد الرحیم دہری	۱۲۰۳

ان کے علاوہ اور مثنویاں جو اسی بحر میں لکھی گئی ہیں مثلاً جلال اسیر۔ مولانا وحشی شیخ علی حزیں یا قاآنی وغیرہ کی اگر ان سب کو ہم شمار کریں تو یہ فہرست ۷۰ تک پہنچتی ہے جن کو صاحب ہفت آسمان نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔

جوابوں پر ایک نظر مخزن الاسرار کے جواب میں جس قدر مثنویاں لکھی گئیں بالاتفاق اساتذہ کے نزدیک کوئی بھی اس کے درجہ کو نہ پہنچ سکی۔ خلد بریں میں مولانا وحشی کہتے ہیں۔

بانیِ مخزن کہ نہاد ایں اساس	پایۂ او بود بروں از قیاس
خانہ پر از گنج خداداد داشت	عالمے از گنج خود آباد داشت
ہر کہ بہمسائگی او شتافت	غیرت شاہی جگرش را شگافت

لیکن عام طور پر امیر خسرو کی مطلع الانوار ان جوابوں میں سب سے بہتر تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے بعد مولانا جامی کی تحفۃ الاحرار۔ عاصم کہتا ہے۔

بود نظامی بسریر سخن | بادشہ طرز جدید و کہن
نمک سخن بلکہ نظامی بود | تشنگی از خسرو و جامی بود

ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ بعض ان جوابوں کی نسبت جو بڑے بڑے استادوں کے ہیں نقادان فن کی رائیں درج کریں۔ عرفی شیرازی جو قصیدہ اور غزل کا نامور استاد ہے اس کی مثنوی مجمع الابکار کی نسبت آذر اصفہانی لکھتا ہے۔

"عرفی در باب استعارہ اصرار دارد۔ بحدیکہ مستمع از معنی مقصود غافل می شود۔ از انجملہ مثنوی کہ در برابر مخزن الاسرار گفتہ شاید بر بیوقوف مشتبہ باشد۔ امّا استاد و ماہر می داند کہ بیجا گفتہ"

حکیم ہمام کی رائے بھی اس مثنوی کی بابت یہی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عرفی اگر در غزل استاد بود | خانہ خراب و دہش آباد بود
مثنویش طرز فصاحت نداشت | کان نمک بود و ملاحت نداشت

ملک قمی اور مولانا ظہوری نے جو دربار دکن سے ملک الشعرائی کا خطاب پائے ہوئے تھے۔ جب مخزن کے جواب میں منبع الانہار لکھ کر پیش کی تو ابراہیم عادل شاہ نے ایک شتر بار زر ان کو انعام دیا۔ وہبی کاشی اس عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس سے بھی اس قسم کی مثنوی لکھنے کا اشارہ ہوا اس نے یہ رباعی لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔

در مدح و ثنایت اے شہنشاہ دکن | معذورم دار اگر نگویم مخزن
چند کہ بہر یک شتر زر گیرم | خون دو ہزار بیت بدور گردن

مرزا جلال اسیر خیال بندی کا موجد ہے۔ اس کی مثنوی کی بابت والہ داغستانی لکھتا ہے کہ

اکثر ابیاتش از لباس معنی عور ماندہ

مولانا زلالی خوانساری کی مثنوی حسن گلوسوز کے متعلق داغستانی کی رائے ہے

"زلال افکارش اکثر درد آمیز است"

حکیم ابوالفتح دوانی کی مثنوی مظہر الاسرار پر تنقید کرتے ہوئے محمد طاہر نصر آبادی یہ لطیفہ بیان کرتا ہے:

"مثنوی کہ در بحر مخزن گفتہ اسرار خفیہ دراں درجست۔ چوں نسخہ تا بہ بیت فہم آں معانی ندارم اکثر نافہمیدہ ماند"

ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ زاہد نے جب مخزن کی ... میں ... لکھی تو ... کے پاس جو شاہیر شعراء اکبری میں سے تھے سنانے گئے

کنگرہ سین چو خنداں شدہ

میر موصوف نے کہا کہ کنگرۂ سین چیست۔

شیخ فیضی فیاضی نے مخزن کے جواب میں مرکز ... معانی کے بڑے بڑے دعوے کئے۔ چنانچہ اپنے کو خطاب کرتے ہیں

تازہ تو آراستہ گرد سخن	معنی نو باید و لفظ کہن
تصفیۂ باطن مرتاض کن	روبسوے مبدء فیاض کن
دز دسخن راہ بجائے نبرد	کز کف او بازقفائے نخورد
چند خیال دگر اندوختن	کیسہ پئے نقد دگر دوختن
قطع نظر کن زخیال دگر	زانکہ پسر خواندہ نگردد پسر
ہرچہ خدا داد بہ آں شاد باش	طالب معنی خدا داد باش

لیکن اسی مثنوی کی بابت مولانا نشانی نے جو فیضی کے ہمعصر ہیں لکھا ہے۔

چند زنی لاف کہ در ساحری	سامریم سامریم سامری
دعوے ایجادِ معانی مکن	شمع نۂ چرب زبانی مکن
طبع تو ہرچند درہوش زد	یک سخن تازہ نہ شد گوش زد

انچہ تو گفتی دگراں گفتہ اند ۔ در کہ تو سفتی دگراں سفتہ اند
خانہ کہ از نظم بیارا ستی آب و گلش از دگراں خواستی
سقف منقش کہ دراں خانہ است نقش وے از خانۂ بیگانہ است
طبع تو دار د روش باغباں ساختہ باغے ز نہالِ کساں
سبزۂ آں باغ ز راغ دگر ہر گل رعناش ز باغ دگر
غنچۂ آں گرچہ رواں پرورست لیک ز خونِ جگرِ دیگر است

یہاں تک کہ آخر میں کہتے ہیں۔

یک سخن از نظم تو نبود درست مضحکۂ اہل سخن نظم تست
گرچہ بروئے تو نگوید کسے عیب تو پیش تو نجوید کسے
لیک بعیبِ تو ملامت گراں انجمن آرائے سخن پروراں
شعر ترا گر بمیاں آورند عیب تو یک یک بزباں آورند
شعر ترا پیش تو تحسیں کنند وز پس تو لعنت و نفریں کنند

اگر چہ مولانا نشانی کی رائے میں کسی قدر معاصرانہ عداوت شامل ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ فیضی دوسروں کے مضامین عمداً اخذ کرتا ہے۔

ملا شیدا شاہجہانی عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی مثنوی دولت بیدار کی نسبت ریاض الشعرا میں لکھا ہے کہ

"اکثر اشعارش ماخوذ از دیگرانست نہ اینکہ بعنوان توارد بلکہ دریں امر عامد و مصر بود"

غزالی مشہدی کا اگر چہ یہ وتیرہ نہیں تھا لیکن بعض بعض اشعار اس کی مثنوی میں بھی ایسے ہیں جن سے یہ شبہ ہوتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتا ہے۔

نام خود و نام پدر زندہ کن مردۂ خود را بہنر زندہ کن
از پدر مردہ مگو ہر زماں گر نہ سگی دم مزن از استخواں

بعینہ یہی مضمون امیر خسرو کی مطلع الانوار میں موجود ہے۔

زندہ بہ مردہ مشو اے ناتمام ‏ ‏ ‏ زندہ تو کن مردہ خود را بنام

از پدر مردہ ملاف اے جواں ‏ ‏ ‏ گر نہ سگی چوں خوشی از استخواں

ایک تذکرہ نویس نے تو یہاں تک جرأت کی ہے کہ خسرو اور مولانا جامی نے بعض اشعار جو نظامی سے اڑا لئے ہیں یا ہم مضمون ہیں اس کی وجہ سے لکھا ہے کہ

"خانہ شعر و شاعری نظامی گنجوی تاراج کردہ مولوی"

اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کی مثنویوں میں نظامی کا شعر یا مصرعہ نہ آ گیا ہو مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ نظامی کا کلام کی ترکیبیں اور جملے ان کی زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے کو جا بجا خلط ملط کر دیا ہے۔

ان سب رایوں کے پڑھنے کے بعد یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ مخزن الاسرار کا میدان نہایت سنگلاخ اور دشوار گزار تھا۔ اور سوائے امیر خسرو اور مولانا جامی کے کوئی بھی نظامی کا تتبع نہیں کر سکا۔ امیر ہاشمی کرمانی نے اس بات کو اپنی مثنوی مظہر الآثار کے دیباچہ میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ہم اس جگہ مختصراً اس کو درج کرتے ہیں۔

نقش کنم بر ورقِ روزگار ‏ ‏ ‏ وصف ہنرمندیِ مردانِ کار

ہم نفسانِ دمِ روح الامیں ‏ ‏ ‏ نکتہ سرایانِ سخن آفریں

خاصہ یکے کہ بسحر حلال ‏ ‏ ‏ بست زبان ہمہ اہل کمال

---

(۱) غالباً کسی حاسد نے مولانا جامی ہی کو جب وہ حج کو جا رہے تھے ان اشعار میں مخاطب کیا ہے۔

اے دزد سخنوران نامی ‏ ‏ ‏ غارت گر خسرو و نظامی

اکنوں کہ رہِ حرم گرفتی ‏ ‏ ‏ می گیر از انچہ کم گرفتی

دیوان ظہیر فاریابی ‏ ‏ ‏ در کعبہ بدزد اگر بیابی

شیخ نظامی در دریاے بود   گوہر شہوار محیط وجود
چہرہ کشاے صورِ معنوی   مخترع خال و خط مثنوی
نکتہ سراے کہ بحسن کلام   ملک سخن یافت ز نظمش نظام
ساخت طلسمے بہزاراں خیال   سر بسر از صنعت شعب کمال
گشت چو آں درج لآلی تمام   کرد ورا مخزن الاسرار نام
ملکِ سخن گشت مسلم برو   کرد ثنا جملۂ عالم برو
مہر زد از خاتم و تم الکتاب   بست بروے ہمہ راہ جواب

لیک در فیض ازل بستہ نیست   ہیچ درے بستہ پیوستہ نیست
چوں ز قضا لائحہ نو رسید   کوکبۂ نوبت خسرو رسید
خامۂ خسرو چو گہر بار شد   نامۂ او مطلع الانوار شد
کرد دراں نامۂ مکلف بسے   گفت جوابے کہ چگوید کسے
گفتۂ او در نظرِ نکتہ داں   می دہد از علمِ لدنی نشاں

چوں مے خسرو بہ تمامی رسید   دور بہ مئے عشق بجامی رسید
قلزم طبعش چو گہر بار شد   نامۂ او تحفۃ الاحرار شد
ختم سخن گشت بنامش درست   گفت جوابے ہمہ شیریں و چست

بعد دو قرن از کرم ذوالمنن   عشق بمن داد کلید سخن
با ہمہ محتاجی و عجز و نیاز   ساختم از بسملہ مفتاح راز
درج ہر گنج کہ بشگافتم   چون کف آزادہ تہی یافتم

پیشتر از مرتبۂ اہلِ فکر　　مصطبۂ گنج سخن بود بکر
چوں درِ آں مصطبہ مفتوح شد　　گنج معانی ہمہ مشروح شد
آنچہ تواں گفت نظامی ربود　　باقی آں خسرو و جامی ربود
از گہر و گنج دراں سرزمیں　　ماند ہمیں جائے تہی بر زمیں
من بچنیں خشک زمیں کردہ جا　　بستہ دلِ خویش بفضلِ خدا

اس فضلِ خدا پر بھروسہ کرنے کا یہ انجام ہوا کہ مولانا جامی کی مثنوی کے بعد کا درجہ سیصرتی فن نے اس مثنوی کو دے دیا۔

الغرض فن مثنوی کا آغاز اور اس کا خاتمہ
ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود نظامی کو
میں کئی جگہ اس خیال کو ظاہر کیا ہے۔ مخزن میں ہے

راہ روانے کہ دریں رہ روند　　گر
پیش نظامی بحساب ایستند　　او دگر است ایں دگراں کیستند
خنکہ دریں منزل شاں ماندہ ام　　مرحلۂ پیشترک راندہ ام
تیغ ز الماسِ زباں ساختم　　ہر کہ پس آمد سرش انداختم

یعنی الماس زباں سے میں نے تیغ بیان تیز کی ہے کہ جو کوئی شیوۂ سخنوری و مثنوی گوئی میں میرا تتبع کرے اس کا سر اڑا دوں۔

نظامی وخسرو | دولت شاہ لکھتا ہے کہ امیرزادہ بایسنغر خمسۂ خسروی کو خمسۂ نظامی پر ترجیح دیتا تھا اور خاقان الغ بیگ خمسۂ نظامی کا معتقد تھا۔ ان دونوں بادشاہوں میں اس اختلاف کی وجہ سے کئی بار مخالفت بھی پیدا ہوگئی۔

افسوس یہ ہے کہ دولت شاہ نے وہ وجوہات نہ لکھے جو خمسۂ خسروی کی ترجیح کو ثابت کرتے۔
خانِ آرزو نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے بعض شعرا نے محض اس ایک شعر کی وجہ سے جو خسرو

نے مطلع الانوار میں لکھا ہے۔

قطرۂ آبے نہ خورد ماکیاں   تا نہ کند رو بسوئے آسماں

خمسۂ خسروی کو خمسۂ نظامی سے بہتر قرار دیا ہے:

اس میں شک نہیں کہ یہ شعر توحید میں نادر ہے لیکن صرف اس ایک شعر کی وجہ سے پورے خمسہ کو ترجیح دینا عجیب بات ہے۔ قوسی ایرانی لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے سخن فہموں پر تعجب ہے کہ خمسۂ نظامی کے ۲۰ ہزار اشعار میں سے کہ ہر ایک عقد ثریا سے برابری کا دعویٰ رکھتا ہے اس پایہ کا ایک شعر بھی ان کو نہ مل سکا یہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مضمون بھی خسرو کا نہیں ہے بلکہ ان سے پہلے خاقانی شروانی نے اس کو اپنے رنگ میں کئی جگہ باندھا ہے ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

مرغ کہ آبکی خورد۔ سر سوئے آسماں برد   گوئی اشارتیست ایں۔ بہر دعائے شاہ راہ

برخلاف دولت شاہ کے جملہ آشنایان فن کی بالاتفاق یہ رائے ہے کہ جتنے خمسے نظامی کے جواب میں لکھے گئے کوئی بھی اس کے درجہ کا نہ ہوا۔ یہ مشہور ہے۔ ع

خمسۂ او ہست ایں پنج گنج

خود امیر خسرو کے متعلق انہیں کے زمانہ کے ایک شاعر عبید نے کہا تھا ؎

غلط افتاد خسرو را ز خامی   کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

ایک دوسرے شاعر نے بھی کہا ہے اور امیر کے لفظ سے امیر خسرو کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

گر دیگراں امیر بسیم و زر اند لیک   ایں سکہ را بنام نظامی زنند و بس

مولانا جامی کے بعض معتقدوں نے ان کے خمسہ کو خسرو کے خمسہ سے بہتر قرار دیا ہے۔ لیکن خود جامی نے بہارستان میں لکھا ہے کہ خمسۂ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ مگر خسرو کے خمسہ کو وہ زر خالص قرار دیتے ہیں اور نظامی کے خمسہ کو جواہر۔ اور ان دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

نظامی کہ استاد ایں فن دیست   دریں بزمگہ شمع روشن دیست

زد برپا زگنجوسہ گنج پنج | رسانید گنج سخن را بہ پنج
چو خسرو بداں پنج ہم پنجہ شد | ازاں بازوے فکرتش رنجہ شد
کفش بود زانگونہ گوہر تہی | زرش ساخت لیکن زر دہ دہی
زر از سیم اگرچند برتر بود | بسے کمتر از در و گوہر بود

تمام نقادان فن اس فیصلے کے ساتھ متفق ہیں۔

عاشقانہ مثنویاں مثلاً شیریں و خسرو و لیلیٰ و مجنوں وغیرہ بھی بردستہ ہم لکھی ہیں لیکن مطلع الانوار کو مخزن سے نسبت دینا مشکل ہے۔ استادوں کی بھی رائے ہے کہ [illegible]
السعدین میں اپنا اور نظامی کا مقابلہ تفصیل کے ساتھ
آپ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں۔

از ہوس مثنویت در دلست
در روشی کز تو نیاید مرد | گفت بدم مثنوی [illegible]
نظم نظامی بہ لطافت چو در | وز در او سر بہ سر آفاق پر
پختہ ازو شد چو معانی تمام | خام بود پختن سودائے خام
زیں دو خیالے کہ ترا اکنوں فراست | جستن آں مایہ خیال کژ است
بگزر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست | ویں رہ باریک بپائے تو نیست
تا بود ایں سکہ بہ عالم درست | بر تن تو کے بود ایں شقہ چیست
ہر کہ دریں جنبش طبع آزمائے | سر بنہی اول و آں گاہ پائے
گفتہ او را شنو و گوش باش | گفتہ من بشنو و خاموش باش
سحر ورانے کہ درو دیدہ اند | خامشی خویش پسندیدہ اند
مثنوی او راست ثنائے بگو | بشنو و از دور دعائے بگو

این ہمہ ز انصاف گزندہ نیست — گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

گر نہ بود این نمطم جاں نواز — پیکر دلم را بتو بودے نیاز

لیک چو سرا بہ زاں پر نوشست — عود تو آنجا علف آتش است

تا بود آوازۂ قمری بباغ — کس ندہد گوش بر آواز زاغ

در ہوست می نگزارد عناں — می کشدت دل بخیال جناں

کوشش آں کن کہ دریں راہ تنگ — زاں گل تر بوئے و ببندت نہ نیم رنگ

از پئے بخشش بخدا آر روئے — لیک عنایت ز بزرگاں بجوئے

سوز سخن را نہ بگامی طلب — پختگیش ہم ز نظامی طلب

لیک اگر پند من آری بگوش — مصلحت آنست کہ مانی خموش

ان باتوں کے جان لینے کے بعد اب ہر شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ انھوں نے مطلع الانوار میں جو یہ شعر کہا ہے۔

دبدبۂ خسروم شد بلند — زلزلہ در گور نظامی فگند

محض ایک سخن گسترانہ تعلی اور شاعرانہ شوخی ہے۔ نظامی کی تحقیر ہرگز اس سے منظور نہیں۔ حاشیہ چڑھانے والوں نے اس پر عجیب و غریب حاشیہ چڑھایا ہے۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ امیر خسرو شعرا متقدمین پر جرح کیا کرتے۔ ان کے پیر حضرت نظام الدین اولیاءؒ اس بات سے ان کو منع فرماتے لیکن وہ کہتے کہ جب میں آپ کے سایۂ حمایت میں ہوں تو مجھے کسی کا خوف نہیں۔ جب نظامی کی شان میں انھوں نے یہ شعر کہا تو غیب سے ایک برہنہ تلوار نکلی اور ان کی طرف بجلی کی طرح لپکی۔ اسی وقت غیب سے ایک ہاتھ پیدا ہو گیا جس نے اس تلوار کو اپنی آستیں پر روک لیا۔ امیر خسرو اس واقعے سے خوف زدہ ہو کر دوڑتے ہوئے اپنے پیر کے پاس گئے قبل اس کے کہ کچھ کہیں پیر نے اپنی پھٹی ہوئی آستین دکھلائی۔ اسی وقت انھوں نے سرِ نیاز زمیں پر رکھ کر آئندہ بزرگوں کی جناب میں بے ادبی کرنے سے توبہ کی۔ اس واقعہ کو ایک شاعر نے نظم کر دیا۔

تیغ نظامی کہ بر آمد چو برق — از سر خسرو سرِ مو بود فرق

ماه زنعل راست دو پیکر شده   گر نه شده پنجه پریش چو ورق

۲۱ ہو تتبع پر خسرو کی مطلع الانوار اور ان کے مذکورہ بالا شعر کی شاعرانہ توجیہ پر راقم الحروف بھی ایک نظم لکھتا ہے ۔

اے قلم شیدائے طراز سخن   خیزد بیں جلوهٔ ناز سخن

بیں کہ چہ حوریست بر آراسته   جاں پئے نذر قدمش خواسته

نور رخش بیں کہ بزیر نقاب   روشنیش خیره کند آفتاب

مطلع الانوار کہ نامش بود   چشمہ خو ر ش

معنی او در تہ حرف سیہ   چو

روشنیش رنگ زدائے دلست

گلشن معنی است کہ جاں پرورست

مطلع الانوار خدائیست ایں

شیوهٔ اعجاز نمائیست ایں

خسرو سرمست زجام سخن   آنکہ بکف داشت زمام سخن

آنکہ بسر پنجگی کلکِ خویش   ملک سخن ساخته در ملک خویش

کرد نوآئیں ہمہ ساز سخن   پرده برانداخت ز راز سخن

رسم نظامی ز سر آغاز کرد   مخزنِ اسرارِ سخن باز کرد

کرد بزیر قلمش پنج گنج   گشت باقلیم سخن گنج سنج

ہر زر گنج نظامی شکست   سکہ خود را بسرش نقش بست

ملک سخن کرده بزیر قلم   میزند از خسروی خود علم

"دبدبهٔ خسرویم شد بلند

زلزلہ در گورِ نظامی فگند"

معنیش آں نیست کہ از رشک و تاب   سوخت نظامی چو بر آتش کباب

بلکہ ز اعجاز دم خسروی | زندہ شدش رسم درہ مثنوی
دید چو شاگرد عقیدت سرشت | کرد ز جدا و حرکت ز بہشت
زلزلہ از ہیبت و از خوف نیست | زانکہ بگرد حرمش طوف نیست
کس نتوانست ز اہل سخن | تا بنہد پائے دراں انجمن
نیست کسے محرم آں بارگاہ | خسرو اگر ہست دگر بادشاہ
ہر کہ نگہ کرد بسویش ز دور | خیرہ شدش دیدہ ز انبوہ نور

بارگہ اوست بغایت بلند
زلزلہ کس می نتواند فگند

بادشہ نظم نظامیست و بس | خام بود از دگراں ایں ہوس
لیک کسانیکہ دریں تنگنائے | گام نہادند بفرہنگ ورائے
خسرو از آنجملہ دریں داوری | بر فضیلت بز باں آوری
گرچہ نہ ہم سنگ نظامیست او | لیک بہ از فیضی و جامیست او
مطلع الانوار ز آیات اوست | معجزہ گر نیست کرامات اوست
دبدبہ درانیکہ دریں رہ روند | جملہ بزیر علم خسرو اند
یافت ز سر از قلم خسروی | قاعدۂ نظم نظامی نوی

بر گلش باد ہزاراں درود
از من و از جملۂ یاراں درود

نظامی کا رتبہ تذکرہ نویسوں اور شعراء نے جس قدر نظامی کے کلام کی مدح سرائی کی ہے اتنی کسی اور کے کلام کی نہیں کی۔ شیخ آذری اسفرائینی نظامی کے متعلق لکھتے ہیں۔

اگرچہ شاعران نغز گفتار | زیک جامند در بزم سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں | خمار چشم ساقی نیز پیوست

مبیں یکساں کہ در اشعار این قوم　　　وراے شاعری چیزے دگر ہست

مولانا جامی بہارستان میں لکھتے ہیں۔

"گنجہ کے شعرا میں سے شیخ نظامی ہیں جن کے فضائل اور کمالات اس قدر روشن ہیں کہ ان کی تشریح کی حاجت نہیں جس قدر لطائف۔ دقائق اور حقائق انھوں نے پنج گنج میں درج کئے ہیں اس قدر کسی دوسرے کو میسر نہ ہوئے۔ بلکہ انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔"

صاحب مرآۃ الخیال نے لکھا ہے۔

"شیخ نظامی کے فضل و کمال بیان کرنے کی جو تیاست میں گنجائش کہاں!"

آذر اصفہانی کا قول ہے۔

"جو کچھ بھی میں لکھ سکوں شیخ نظامی کا رتبۂ شاعری اس سے بلند تر ہے میرے نزدیک چار ارکان سخن میں سے ایک وہ ہیں"

صاحب سلم السموات کہتا ہے۔

"شیخ نظامی گنجوی شہرۂ عالم اور شعراء عجم کے لئے نمونہ ہیں۔ ان کو لوگوں نے امیر خسرو پر فضیلت دی ہے اور ان کے خمسہ کو خمسۂ خسروی پر مرجح مانا ہے"

علی قلی خاں داغستانی قول فیصل میں لکھتا ہے۔

"شیخ نظامی شعراء زمان اور بلغاے دوران میں فائق تر ہیں۔ حق یہ ہے کہ آغاز آفرینش سے تا حال ایسا کوئی سخنور پیدا نہیں ہوا۔ وہ آدم فصاحت اور نوح بلاغت ہیں۔ گو عرب اور عجم میں بہت سے بلند مرتبہ شعرا گزرے ہیں جو ملک سخن میں صاحب تاج و علم تھے لیکن فن غزل گوئی میں شیخ نظامی سب سے فائق اور بالاتر ہیں"

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی خزانۂ عامرہ لکھتے ہیں۔

"شیخ نظامی استاد آفاق اور مثنوی گویوں میں بالاتفاق سب سے بڑھ کر ہیں"

مخزن الفوائد میں ہے۔

"اساتذہ کے نزدیک مثنوی گوئی تمام اقسام سخن میں مشکل ہے اس میں فردوسی اور نظامی کمال رکھتے تھے۔ دوسرے مثنوی گو شعرا مثلاً خسرو۔ جامی اور ہاتفی وغیرہ ان کے پیرو ہیں"

شرح الشعرا کا مصنف کہتا ہے۔

"شیخ نظامی پختہ کلامی میں بے بدل اور مثنوی گوئی میں بے مثال ہیں۔ شعرا متقدمین و متاخرین متفق ہیں کہ ایسا پختہ گو آج تک عالم ظہور میں نہیں آیا"

شیخ احمد جام ژندہ پیل مدح سرائی کرتے ہیں۔

منشی سخن کان خرد خواجہ نظامی کو خیمۂ گفتار بہ بستان ارم زد
سلطان سخنداں و سخنگوے سخنور کو سکہ خود را ہمہ بر ملک عجم زد

شیخ فیضی فیاضی لکھتے ہیں۔

ز سحر کاری گنجور گنجہ خیز مپرس کہ داشت گلکش بر گنج غیب قبانی
نظم او برسد نظم غیر۔ اگر برسد تخیل متنبی بہ نقش قرآنی

مولانا عصار شیرازی کا یہ قطعہ ہے۔

ولیکن شیخ عیسیٰ دم نظامی کہ بر وے ختم شد شیریں کلامی
بہ فکر بکر داد مثنوی داد کہ ہم صاحب دروں بود و ہم استاد
دریں صنعت سخن گر ہست آنست دگر ہا جملہ لعب کودکانست

ہاتفی نے کہا ہے۔

توانم کرد از معجز کلامی سخن با ہر کہ باشد جز نظامی
خدنگش را پر پیغمبری ہست و لے دانم ز شست شاعری نیست

یہ قطعہ مشہور ہے۔

در شعر سہ کس پیمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی

اوصاف و قصیدہ و غزل ما — فردوسی و انوری و سعدی

معیار البلاغت کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ کسی نے اس کے قائل سے کہا کہ تم نے صرف تین شاعروں کے نام لئے اور استاد نظامی کا جو بے بدل ہیں ذکر نہ کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو پیغمبران سخن کا ذکر کیا ہے اور نظامی تو خدائے سخن ہیں۔

صاحب شرفنامہ نے یہ رباعی کہی ہے۔

سلطانِ سخن بجز نظامی نبود

پیش سخن بے نخش عرش سخن

صاحب ہفت آسمان لکھتے ہیں۔

"نظامی کا شیوۂ سخن گزاری فردوسی سے لیا ۔ نے نظامی ہی کی پیروی کی ہے نہ کہ فردوسی کی ۔ انصاف یہ ہے کہ فردوسی صرف رزمیہ کلام اچھا لکھتا ہے اور اس میدان میں سوائے نظامی کے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہیں ہے۔ لیکن عشقیہ وغیرہ میں فردوسی ہیچ ہے چنانچہ اس کی یوسف زلیخا حد درجہ بے مزہ ہے۔ اس طرز میں وہ نظامی کے شاگردوں خسرو اور جامی کی بھی برابری نہیں کر سکتا۔ جمہور اہل سخن نظامی کو فردوسی پر ترجیح دیتے ہیں۔"

آشوب تورانی صاحب صولت فاروقی، فردوسی اور نظامی پر محاکمہ کرتے ہوئے فردوسی کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

نظامی بہ شعر از تو بس برتر است	کہ شعر تو شعر است و او ساحر است
چہ سحرے بہر دین و مذہب حلال	نہ سحرے کہ بر ساحر آرد وبال
مضامین رنگیں عبارات بیں	ہماں شوخیٔ استعارات بیں
زیک رنگ صد نقش انگیختن	بیک لفظ صد معنی آمیختن

بہ تعریف آں ناظم نکتہ سنج　　　زگفتار او شاد دم چہ گنج
غرض ہر چہ او گفت کارِ تو نیست　　　چنیں شاعری با شعارِ تو نیست

واقعہ یہ ہے کہ فردوسی کے استعمال کئے ہوئے ہزاروں الفاظ اور سینکڑوں محاورے بعد میں متروک ہو گئے۔ لیکن نظامی نے جس رنگ اور زبان کو اختیار کیا اس میں فرق نہ آسکا۔ یہ ان کے کمال دیدہ وری کی دلیل ہے۔ انھوں نے خود سکندر نامے میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔

منم سرو پیرائے باغ سخن　　　بخدمت کمربستہ چوں سرو بن
سخن چوں گرفت استقامت بمن　　　اقامت کند تا قیامت بمن
ہمہ خوشہ چین اند ومن دانہ کار　　　ہمہ خانہ پرداز ومن خانہ دار

کیا اردو شاعری محض نقالی ہے؟

سر چارلس لائل نے "برطانوی دائرۃ المعارف" (انسائکلوپیڈیا برٹانیکا) کے نئے ۔۔۔ ہندوستانی ادبیات" پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ

کرتی ہے اور انھی مضمونوں کو بار بار دہراتی ہے جو ایرانی شعر
مضامین و الفاظ دونوں ابتدا سے آج تک ایک ہی طرح
پائی جاتی ہے اور نہ اصلیت۔ اسی کمی کو پورا کرنے کے
کی بنیاد رکھنی پڑی۔ کیونکہ جو بات ہزاروں شعرا پہلے کہہ چکے ہوں اسی کو ہر دار ۔۔۔ اسلوب بیان مقرر کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ پس یہی اسلوب یا بہ الفاظ دیگر علم معنی و بیان اردو شاعری کا مایۂ ناز بن گیا"

"اردو ادبیات پر انگریزی ادبیات کے اثرات" اور "تاریخ ادبیات اردو" کے مؤلفین نے بھی سر چارلس لائل کی ہمنوائی کی ہے اور ان کی دیکھا دیکھی بہت سے تحقیق ناآشنا معترضین اردو شاعری کو محض تقلیدی، رسمی اور مصنوعی قرار دینے لگے ہیں۔ انکا بیان ہے کہ اردو شاعری میں صحیفۂ فطرت کے مشاہدہ کا کہیں پتہ نہیں جدت و ندرت کا کہیں نام نہیں۔ مضامین میں تازگی و شگفتگی مفقود ہے اور کوئی نیا پیغام مفقود وجہ یہ ہے کہ اردو کے شاعروں نے جزئیات تک میں صرف فارسی شاعری کی کورانہ تقلید کی ہے۔ انھوں نے نہ کوئی اپنے جداگانہ اصول و قواعد منضبط کئے اور نہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کی بلکہ فارسی علم عروض کو جو دراصل عربوں کی ایجاد تھا اپنا رہبر بنایا بغیر اس امر کا لحاظ کئے ہوئے کہ اردو زبان کی اصل کیا ہے اور اس میں استعداد کس قدر ہے۔ انھوں نے وہی تشبیہیں، وہی استعارے، وہی مضامین۔ وہی تلمیحات، وہی خیالات، وہی جذبات اخذ کر لئے جو فارسی شاعری میں بہ کثرت پائے جاتے تھے اور جن کو ہندوستان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فارسی ہی بندشیں۔ ترکیبیں اور صنعتیں بھی اردو

شاعری کی روح روال بن گئیں۔ اگر اردو شعرا بھاشا کی خوبصورتی اور شیرینی سے بھی لطف اندوز ہوتے اور [illegible] سے تشبیہیں اور استعارے اخذ کرتے تو اردو شاعری میں کچھ نہ کچھ اصلیت اور واقعیت ضرور باقی رہ جاتی۔ لیکن بدیسی سرمایہ کی کثرت کی وجہ سے اردو شاعری اپنی اصلیت کو بھول گئی۔ اور وطن کی حسین سے حسین چیزوں کی قدر کرنے کا احساس بھی کھو بیٹھی۔ اردو شاعری بحالت موجودہ محض رسمی تقلیدی، مصنوعی اور لکیر کی فقیر ہے۔ اس کے مضامین اور الفاظ بھی مقرر ہیں۔ پرانے شعرا جو کچھ کہہ گئے ہیں انہیں کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ اس تکرار و اعادہ نے اردو شاعری کو بالکل بے لطف و بے مزہ بنا دیا ہے۔

مگر چہ یہ خیال ملک کے سطح آشنا حلقہ میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے لیکن فی الحقیقت وہ تاریخی حقائق ارتقائے لسانی کے اصول اور ملک کے سیاسی و معاشرتی حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ سب سے پہلے لفظ "نقالی" پر غور کرنا چاہیے۔ "نقالی" میں ہمیشہ غیریت کا عنصر و مفہوم شامل رہتا ہے، نقالی کسی غیر یا بیگانہ چیز کی ہوتی ہے۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے عادات و خصائل کی تقلید کر سکتا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کی تہذیب و معاشرت کا اتباع کر سکتی ہے۔ ایک انشا پرداز دوسرے انشا پرداز کے طرز بیان کی پیروی کر سکتا ہے۔ ایک شاعر دوسرے شاعر کے رنگ و انداز کا چربہ اتار سکتا ہے۔ لیکن کسی فرد کسی قوم کسی ادیب کسی شاعر پر خود اپنے ہی شعائر یا طرز و روش کی نقالی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ ابتداً وہی شعرا جو فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے کبھی کبھی محض تفنن طبع کی غرض سے ریختہ کے چند اشعار بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ غرض کہ اردو اور فارسی شعرا کی شخصیتیں واحد تھیں۔ دونوں قسم کی شاعریاں ایک ہی دماغ کی پیداوار تھیں اس لئے ناقل و منقول کی تفریق ہی نہ تھی۔ ایسی صورت میں نقالی کا سوال ہی بالکل لغو و مہمل معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اس کی تشریح و توضیح کے لئے اردو زبان اور اردو شاعری کی پیدائش اور اٹھان پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

ماہرین لسانیات نے دنیا کی تمام قدیم و جدید مہذب زبانوں کو تین مجموعوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول مذہبی، دوم حربی، سوم بزمی۔ مذہبی زبانوں کے حلقے میں وہ تمام السنہ داخل ہیں جن کا تعلق قدیم تہذیب

وتعلق سے ہو۔ ان کی ہیئت تمام تر مذہبی ہو۔ زمانہ قدیم میں مذہب نے زندگی کے ہر شعبہ کو بال بال جکڑ رکھا تھا۔ سیاست و معاشرت۔ صلح و جنگ۔ تجارت و زراعت۔ رسم و رواج اور شادی وغم کے معاملات میں سے کوئی شے ایسی نہ تھی جو مذہبی تصرف سے آزاد ہو۔ اس لئے زبان کی ہیئت بھی بالکل مذہبی تھی حسب حکم مذہبی تعلیم کا زور و شور قائم رہا۔ مذہبی زبانیں عروج پر رہیں لیکن جب کسی مذہب میں کمزوری رونما ہوئی تو اس سے متعلقہ زبان بھی گمنامی میں پڑ گئی چنانچہ سریانی۔ عبرانی [illegible]
زبانیں بالکل مذہبی تھیں لیکن جب قدیم مذاہب جوان السنہ [illegible]
یہ زبانیں بھی مردہ و متروک ہو گئیں عربی اور سنسکرت [illegible]
چونکہ ہندو مذہب ابھی تک زندہ ہو اس لئے سنسکرت زبان
وفا نہیں ہوئی۔ اگر مذہب کو سنسکرت سے کوئی تعلق نہ ہوتا یعنی [illegible]
زبان میں نہ ہوتیں تو باوجود اپنے تمام علمی و فنی خزانوں کے یہ زبان کب کی فنا ہو گئی ہوتی۔ عربی زبان کی قدر و منزلت بھی بڑی حد تک اس کی مذہبی ہیئت حیثیت کی رہین منت ہو۔ اسلام کے قرون اولیٰ میں عربی کو مذہبی و سیاسی دونوں قسموں کے اقتدار حاصل تھے۔ لیکن اب کئی صدیوں سے اس کو شاہان باجبروت کا سایۂ عاطفت نصیب نہیں ہو اور نہ اس کو کسی عظیم المرتبت کی درباری زبان ہونے کا شرف حاصل ہو۔ اگر وہ مذہب اسلام کی متبرک زبان نہ ہوتی اور اس میں وہ مقدس کلام الٰہی نازل نہ ہوتا جو دنیا کی چالیس کروڑ آبادی کے لئے مشعل ہدایت ہو تو اس زبان کی عزت و وقعت بھی کبھی کی رخصت ہو گئی ہوتی۔

دوسرا مجموعہ حربی زبانوں کا ہے جن سے زیادہ تر سیاسی ضروریات۔ ملکی انتظامات اور تجارتی و اقتصادی کاروبار انجام پاتے ہیں۔ ان زبانوں کو مذہب سے اگر کوئی لگاؤ ہے تو محض ضمنی حیثیت سے کیونکہ موجودہ زمانۂ مادیت میں قومیت کی بنیاد صرف مذہب پر قائم نہیں ہو بلکہ جن مختلف و متعدد عناصر سے قومیت تشکیل پاتی ہو ان میں سے مذہب بھی بعض حالتوں میں ایک معمولی عنصر شمار کیا جاتا ہے بعض قومیتیں ایسی بھی ہیں جن کی تشکیل میں مذہب کو کوئی دخل نہیں ہو۔ السنہ حربیہ کی بنیاد روتہ الکبریٰ

سکریاں عسکریت اور استیلا سے بری و بحری سے پڑی تھی۔ آج کل انگریزی۔ فرانسیسی۔ جرمنی۔ روسی
ترکی اور جاپانی زبانیں السنہ حربیہ کی بہترین مثالیں ہیں۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے مذکورہ
بالا السنہ حربیہ کا ستارۂ اقبال اوجِ کمال پر ہے۔ ان کے سرپرست موجود ہیں جو انہیں ہر طرح کے
علمی و فنی خزانوں سے مالا مال کرنے میں سرگرم کار ہیں۔ السنہ حربیہ بالعموم اپنی سیاسی طاقت۔ حاکمانہ
اقتدار اور حربی استیلا کے باعث دوسری مفتوحہ زبانوں پر تفوق حاصل کر لیتی ہیں۔

تیسری قسم بزمی زبانوں کی ہے جب مختلف قوموں کا باہمی تصادم ہوتا ہے تو آپس میں لین دین
جاری رکھنے اور ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے میں آدھی
اپنی اور آدھی دوسروں کی زبان ملا جلا کر بولتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے باہمی کاروبار۔ آپس کا میل جول
اور معاشرتی معاملات بڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے ان کی مخلوط زبان میں استقلال و استحکام پیدا ہوتا
ہے۔ اس قسم کی زبان کو اصطلاحاً بزمی زبان کہتے ہیں۔ اردو بھی ایک بزمی زبان ہے جو تہور شعار
سلاطین اسلامی کے ہندوستان پر حملوں کے دوران میں حربی ہل چل اور عسکری ہیجان کے نتیجے کے طور پر ظہور
پذیر ہوئی تھی۔ مدت دراز تک یہ زبان صرف آپس کے لین دین اور تجارتی کاروبار میں استعمال ہوتی رہی
اور اس کا دامن علم و ادب کے جواہر پاروں سے خالی رہا۔ یہ زبان عربی۔ فارسی۔ ترکی اور ہندوستان
کی مختلف پراکرتوں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی۔ ابتداءً وہ لشکر کے بازاروں میں بولی جاتی
تھی اسی لئے اس کا نام اردو رکھا گیا جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ اس کو علمی و ادبی زبان ہونے کا شرف
کئی صدیوں کے بعد حاصل ہوا۔

واضح رہے کہ بول چال کی زبان اور ادبی زبان میں بہت بڑا فرق ہے۔ ہندوستان میں ایک
مخلوط و مشترک بول چال کا خاکہ آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے تیار ہونے لگا تھا جب کہ محمد قاسم
نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔ اسی وقت سے عربی الفاظ ہندی زبانوں میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس کے
بعد دسویں صدی عیسوی میں سبکتگین نے ہندوستان پر یورش کر کے پنجاب کو اپنا باجگزار صوبہ بنا لیا۔ اس
وقت سے فارسی زبان نے بھی ہندی زبانوں پر حاکمانہ اثر ڈالنا شروع کر دیا۔ بعد ازاں محمود غزنوی اور

سلطان محمود غزنوی کے پے در پے حملوں اور کامیابیوں نے فارسی کے عز و وقار کو اور ترقی دی۔ بعد ازاں
قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک مستقل و مستحکم حکومت قائم کی جس کا دارالسلطنت
دہلی قرار پائی۔ اب مسلمانوں نے ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ
دن رات کے تعلقات نے ان کی مخلوط زبان کو خوب تقویت پہنچائی۔ رفتہ رفتہ چودھویں صدی عیسوی
کے آغاز ... اس ... بولی نے ایک مستقل ہیئت اختیار کر لی جیسا کہ امیر خسرو کے ہندی کلام سے
واضح ہے۔ غرض کہ اردو بولی کی ابتدا آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوئی ... صدی
کے آخر تک اس میں ہر قسم کی کاروباری ضروریات کے ادا
شاعری کی تاریخ اس مخلوط بولی کی تاریخ سے بالکل جداگانہ
عیسوی میں ہوا۔ اور دکن کا ملک اس کا مولد و منشا
حکمرانوں کی علم دوستی و معارف پروری کی شرمندۂ احسان ہے
یعنی پندرھویں صدی عیسوی میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی۔ بول چال کی زبان اور ادبی
زبان میں تمیز نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اردو بولی مختلف قسم کی دیسی اور
بدیسی زبانوں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی لیکن اردو شاعری براہ راست فارسی شاعری سے
نکلی ہے لہذا اس کے عروضی اصول اور شاعرانہ خصوصیات میں ہندی عناصر کا فقدان ایک فطری امر
ہے۔ اردو شاعری میں ہندی تشبیہوں۔ استعاروں یا تلمیحوں کا پیوند اسی وقت لگ سکتا تھا جب فارسی
شاعری ہندی عناصر سے متاثر ہوتی۔ لیکن کئی اسباب نے فارسی شاعری پر ہندی رنگ
چڑھنے نہ دیا۔

جب دو قوموں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک قوم دوسری پر غالب آتی ہے تو بالعموم قوم
مغلوب کے افراد فاتح قوم کے خیالات و افکار۔ وضع قطع۔ رسم و رواج۔ لباس و پوشاک اور
تہذیب و معاشرت وغیرہ کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح فتحمند قوم نہ صرف حربی و سیاسی حیثیت کے
بلکہ تمدنی و معاشرتی لحاظ سے بھی محکوم قوم پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی زبانوں پر بھی اثر

قواعد کا عمل جاری ہوجاتا ہے۔ اگر دونوں السنہ میں اتحاد لسانی کے لوازمات مثلاً مخارج کی ہم آہنگی۔ اسلوب املا کی یکسانی۔ نظام ہجائی کی یک رنگی۔ ترکیب نحوی کی یکجہتی وغیرہ موجود ہوں تو مفتوحہ زبان کی ہیئت فاتح زبان کی ہیئت میں بالکل مدغم ہوجاتی ہے۔ چنانچہ ایران پر جب عربوں کو سیاسی۔ حربی اور مذہبی برتری حاصل ہوئی تو عربی زبان بھی اپنے تمام حاکمانہ اقتدارات اور فاتحانہ اختیارات کے ساتھ اس ملک میں داخل ہوئی۔ فارسی کو ایک محکوم زبان ہونے کی حیثیت سے اپنا دامن جبراً کشادہ کرنا پڑا جس میں عربی الفاظ بھرنے لگے۔ چونکہ دونوں زبانوں میں اتحاد لسانی کے لوازمات موجود تھے اس لئے ایرانی زبان پر عربی رنگ چڑھتا گیا یہاں تک کہ اس کی ہیئت لسانی عربی میں مدغم ہوگئی۔ چنانچہ فارسی زبان کے حروف تہجی۔ نظام ہجائی۔ رسم خط۔ طرز تحریر۔ اسلوب بیان۔ نحوی وعروضی اصول معنی و بیان سب کے سب عربی کے متبع بن گئے۔ اس جدید فارسی کو ساسانیوں کے زمانے کی قدیم ایرانی زبان سے کوئی تعلق نہ رہا۔ جدید فارسی ایک اسلامی زبان ہے جو عربی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چنانچہ بہت عرصے کے بعد اس عربی آمیز فارسی کے عروج کا زمانہ بھی آیا اور اس نے اپنی پوری عسکری طاقت سے دوسرے السنہ کو مغلوب کرنا شروع کیا۔

اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ فاتح قوم محض اکھڑ اور وحشی ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنی جسمانی قوت کی بنا پر شائستہ و مہذب ملکوں کو فتح کرلیتی ہے لیکن آگے چل کر اسے مفتوحہ قوم کی علمی و فنی برتری کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب گاتھ کی جاہل اور وحشی قوموں نے سلطنت روما کے بخیے ادھیڑ دیے تو اپنی فاتحانہ حیثیت کے باوجود انھیں مفتوح رومیوں کے اعلیٰ تہذیب و تمدن سے روشنی حاصل کرنی پڑی۔ اسی طرح وحشی تاتاریوں کو بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کے بعد مفتوحہ قوم کی مذہبی برتری اور علمی و ادبی تفوق کے آگے زانوئے ادب تہ کرنا پڑا۔ لیکن ہندوستان کے مسلمان حملہ آور گاتھی یا تاتاری قوموں کی طرح وحشی و جاہل نہ تھے بلکہ وہ نہایت اعلیٰ تہذیب و تمدن کے سرمایہ دار تھے۔ وہ ہندی اقوام پر سیاسی۔ حربی۔ علمی۔ ادبی اور تمدنی ہر قسم کی فوقیت رکھتے تھے۔ ان کی علمی ادبی اور درباری زبان فارسی تھی جس کی شستگی۔ لطافت۔ پاکیزگی۔ حلاوت اور روانی کا کوئی ہندی زبان مقابلہ

نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے ان مسلمان حملہ آوروں کا سر نیاز کسی حیثیت سے محکوم و مفتوحہ اقوام کے آگے خم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی سیاسی، مذہبی، علمی، ادبی اور تمدنی برتری کے لحاظ سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ محکوم ہندی زبان حاکم فارسی زبان میں اسی طرح پیوست ہو جائے گی جیسے قدیم ایرانی زبان فاتح عربی زبان میں مدغم ہو گئی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندی اور فارسی زبانوں میں تقارب فی کے لوازمات مفقود تھے۔ دونوں میں انتہا درجے کی اجنبیت و مغائرت تھی۔ ہندی یا برج بھاشا حروف تہجی، نظام ہجائی، ترکیب و بندش، خصائص نحوی، اصوات و مخارج، اسلوب بیان، امثال و محاورات وغیرہ کے لحاظ سے بالکل جداگانہ ہیئت رکھتی تھی۔ جب فارسی نے ہندی کو مغلوب کرنا چاہا تو اس نے اپنی مجلسی کثرت سے پیش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی سپر انداز ہو کر فارسی رکھی۔

اگرچہ پراکرت زبانوں نے اپنی ہیئت قائم رکھی لیکن فاتح زبان کی سالمیت اثر اندازیوں سے وہ محفوظ نہ رہ سکیں۔ محکوم ہونے کی حیثیت سے انھیں مجبوراً عربی و فارسی الفاظ قبول کرنے پڑے۔ قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل حکومت قائم کی۔ لیکن اس سے بہت قبل ہی محمد قاسم بیکتگین، محمود غزنوی اور محمد غوری کے کامیاب حملوں نے دیسی زبانوں کو متاثر کر دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک مشہور ان پڑھ شاعر زپت لال نے ۱۱۵۵ء میں نظم کی ایک کتاب "وِسل دیو راسو" لکھی تھی جس میں عربی و فارسی کے حسب ذیل الفاظ بگڑی ہوئی صورت میں موجود ہیں کلا (کلاہ)، جرہ (ذرہ)، نیجا (نیزہ)، لواجوا (لوازمہ)۔ تاجی (تازی)، پاگا (پائگاہ)۔ کنگ (قسمت) باجا باجا (بعض بعض)۔ چابکو (چابک)۔ تاجنرو (تازیانہ)۔ کھرسان (خراسان) وغیرہ۔ اس کے بعد جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین محمد غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو "چاند کوی" نے "پرتھوی راج راسا" تصنیف کی۔ مولانا آزاد نے "آبحیات" میں اس کتاب سے چند سطریں نقل کی ہیں جن میں محل پروردگار، پیغام، کریم، سلطان، بادشاہ، دیوان، خلق، عالم، حضرت، ملک، فرمان وغیرہ فارسی و عربی

ہندوستان میں مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر فینز تس کے بیان کے مطابق کورا ۔ اننت داس اور چے نانک بھی بارھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں ہندی کے زبردست شاعر گزرے ہیں لیکن ان کے کلام میں اسلامی اثرات کے بہ کثرت شواہد پائے جاتے ہیں۔ جب تیرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی مستقل و مستحکم اسلامی حکومت کا دارالسلطنت بنی تو مسلمان جوق جوق ہندوستان میں آکر بود و باش اختیار کرنے لگے۔ یہ نو وارد مسلمان سکندر اعظم کے ساتھیوں یا موجودہ انگریزوں کی طرح ہندوستان کے باشندوں سے بالکل الگ تھلگ نہیں رہتے تھے بلکہ ان میں مکمل مل کر شیر و شکر بن گئے۔ آپس کے گہرے تعلقات اور ہر وقت کے میل جول کی وجہ سے ہندوؤں کی زبان پر کثرت سے عربی و فارسی کے الفاظ چڑھ گئے۔

علاوہ بریں تمام مسلمان فرمانروا اور خصوصاً سلاطین مغلیہ بڑے علم دوست۔ معارف نواز اور شعرا پرور تھے۔ انکا دربار بڑے بڑے علما فضلا حکما اور شعرا کا ماویٰ و ملجا تھا۔ ان کو اپنی قومی و درباری زبان کے علاوہ دیسی زبانوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہندی زبان و ادب کی ترقی بھی ان کی سیاسی حکمت عملی میں داخل تھی۔ وہ ہندی شاعروں کو بھی انعام و اکرام سے مالا مال کرتے تھے اور کوی راج (ملک الشعرا) کے خطاب سے انہیں سرفراز فرماتے تھے۔ انکی دیکھا دیکھی تمام امرا۔ شرفا۔ رؤسا اور حکام عالی مقام نے بھی خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے اپنے درباروں میں ہندی کے شاعر مقرر کر رکھے تھے جو اپنے سرپرستوں کی تعریف میں اشعار کہتے تھے۔ چنانچہ جو ہندی شعرا مغل دربار سے وابستہ تھے ان میں راجہ بیربل۔ تان سین گنگا پرشاد۔ سندر اور ترپاٹھی برادران خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ شعرا اپنے سرپرستوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے مذاق و پسند کا لحاظ رکھتے تھے اور اپنے کلام میں کثرت سے ایسے الفاظ۔ اسالیب بیان۔ تشبیہات و تلمیحات اور خیالات و افکار استعمال کرتے تھے جو فارسی شاعری کی خصوصیات میں شامل تھے تاکہ ان کے سرپرست انھیں آسانی سے سمجھیں اور ان سے محظوظ ہوں۔ اس زمانے میں ہندو اور مسلمانوں میں اس قدر اتحاد و اتفاق تھا اور ایک دوسرے کے ادب و شاعری سے اتنی دلچسپی رکھتے تھے کہ بعض مسلمان شعرا نے بھی اپنے اشہب قلم کی جولانی کے لئے ہندی شاعری کا میدان انتخاب کرلیا

تھا ڈاکٹر جعفر نے اپنی کتاب "ہندوستانی لٹریچر" میں مسعود۔ اکرام فیض اور قطب علی کا ذکر کیا ہے جو ہندی کے زبردست شاعر تھے اور بارھویں صدی عیسوی میں وہ ہندو راجاؤں کے دربار سے وابستہ تھے۔ لیکن سولھویں اور سترھویں صدی میں کثرت سے ہندی کے مسلمان شاعر پیدا ہوئے جن میں قاضی محمود۔ ملک محمد جائسی۔ شیخ دانیال چشتی۔ شیخ عثمان۔ قاسم۔ شیخ پیر محمد اور ... ی وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان شاعروں کے ذریعے ہندی شاعری فطری طور پر نہ صرف عربی و فارسی الفاظ سے بلکہ اسلامی خیالات و افکار۔ جذبات و احساسات، رموز ... و معتقدات ... ہوئی

بہرکیف درباری شعراء نے توقصداً و مصلحتاً اور اسلامی شعرا ... رنگ چڑھایا لیکن جن ہندی شاعروں کو کسی دربار سے کوئی ... کرنا چاہتے تھے جن کی رسائی سنسکرت کے سرچشمے تک نہ ... کے لفظوں اور فقروں سے گرانبار پایا جاتا ہے۔ یہ بعض حاکم قوم ...

واقتدار کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کا لسانی ماحول اور ادبی فضا بالکل فارسی آمیز بن گئی تھی۔ چنانچہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی کے چند مذہبی شعرا مثلاً کبیر داس۔ نانک۔ تلسی داس۔ سورداس اور جیب جی کے کلام کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

کبیر داس۔

دین گنوایو دنی سے دنی نہ آیو ہاتھ ۔ پیر کلھاڑی ماریو گافل اپنے ہاتھ (غافل)

پوتھی کتابیں بانچیا اوروں کو نت سمجھاؤ تا ۔ کو تمی مل کھو جے نہیں یک یک مرا تو کیا ہوا

کبیر سرا یہ سرا سے ہے کیوں سوئے سکھ چین ۔ کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین (نقارہ)

نانک

سانس ماس جب جیو تمھارا۔ تو ہے کھرا پیارا ۔ نانک شاعر ایو کہت ہے۔ سچے پروردگار ا

تلسی داس۔

گنی گریب گرام نر ناگر ۔ پنڈت موڑھ ملیں اجاگر (غنی غریب)

دام اینک گریب نواسبے ۔ لک بید بربر ویر اسبے
مایا کو مایا ملے کر کر بہے ہاتھ ۔ تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھا بات (غریب)
سنکلے سیوک سکل سپچلے سواحی رکھ پالے ۔ گھر ترو تروبن و بات برڈ یرا دیو لگالے (امرت)
گھر سواس بچن مہت ہوے ۔ کتنی بھنگ تلہ بھی کھوے (اکلاہ)

سورداس :-

مایا دھام دھن دھنستا ۔ باندھوں ہوں اس ساج (سماج)
سنت سبھی جات ہوں ۔ نو نہ آیا باج (باز)
دیونہ جات پار اتر آئے ۔ چاہت چڑھیں جہاج (جہاز)
کھیت بہت کا ہے تم تلنے ۔ سین سنی آواج (آواز)
تیں کرت کہت پربھو تم سوں ۔ سدا گریب نواج (غریب نواز)

جپ جی :-

وارن جاؤں ان ایک بار ۔ تو سدا سلامت جی نر نکار

جب درباری نہیں بلکہ مذہبی شاعروں کے کلام کا یہ رنگ ہو اور اس میں عربی و فارسی الفاظ کی ایسی کثرت ہو تو معلوم عوام کی زبان پر کتنے فارسی کے لفظ، فقرے، محاورے اور اصطلاحیں جاری ہوں گی۔ اگرچہ اتحاد لسانی کے لوازمات کے فقدان اور مذاق و پسند کی مغایرت و بیگانگی کے باعث ہندی زبان اپنی ہیئت کھو کر فارسی میں مدغم نہ ہوئی۔ اگرچہ اپنی مجلسی کثرت، قدامت پرستانہ جذبات کی شدت اور معاشرتی طاقت کی بنا پر ہندی نے اپنا وجود قائم رکھا تاہم ایک مفتوح و مغلوب زبان ہونے کی حیثیت سے اُسے فارسی کے حاکمانہ اقتدار کے آگے سپر انداز ہونا پڑا۔ وہ اپنے دامن میں فارسی الفاظ و اصطلاحات بھرنے اور غالب و فاتح زبان کا انداز بیان اور طرز ادا قبول کرنے پر مجبور ہوئی اور فطری اصول اسی کے متقاضی بھی تھے۔

اس کے برعکس فارسی زبان ہندی آمیزش سے بالکل پاک رہی جس کے متعدد اسباب تھے۔

[illegible] تاتاری قوموں کی طرح جاہل اور وحشی نہ تھے کہ وہ مفتوحہ قوم کی علمی و فنی برتری کے آگے سر تسلیم خم کرتے۔ وہ نہ صرف جسمانی قوت۔ حربی مہارت اور انتظامی قابلیت کے لحاظ سے ہندی قوموں پر فوقیت رکھتے تھے بلکہ ذہنی۔ اخلاقی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ علمی۔ ادبی۔ فنی غرض کہ ہر اعتبار سے ان کو مفتوحہ قوم پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔ اگرچہ نو وارد مسلمان مختلف تورانی نسلوں کے تھے اور ان کی بول چال کی زبانیں بھی متفرق تھیں لیکن سب کی علمی ادبی [illegible] درباری زبان فارسی تھی۔ اس وقت تک یہ زبان نہایت شستہ۔ ترقی یافتہ اور پختہ بن چکی تھی۔ [illegible] قواعد و ضوابط نہایت مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ اس کی اشاعت [illegible]
زبان علمی و ادبی حیثیت سے اس کی حریف نہیں بن [illegible]
بھی تو مفتوح و مغلوب ہونے کی حیثیت سے وہ اپنا [illegible]
کرنے پر مجبور ہوتی۔ لیکن اس وقت تمام پراکرتیں ارتقا [illegible]
قوت کہاں تھی کہ فارسی جیسی پختہ بشستہ۔ ترقی یافتہ اور حاکم زبان پر [illegible] الیتیں۔ ہندوستان کا سارا علمی خزانہ سنسکرت کی تجوری میں مقفل تھا جس کے واحد کلید بردار برہمن پنڈت تھے لیکن یہ قدیم مہذب زبان مدت سے مردہ و متروک ہو چکی تھی۔ چنانچہ چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گوتم بدھ اور مہاویر جیسے مصلحین کو اپنے مذہبی اصول کی نشر و اشاعت کے لئے پالی زبان کا توسط اختیار کرنا پڑا تھا۔ اگرچہ گپتا عہد میں اس کی نشاۃ ثانیہ نے ہر قسم کے علمی و فنی جواہر پاروں سے اس کا دامن بھرا لیکن سوائے برہمنوں کے اور کسی کو اس کی حریم ناز میں باریابی حاصل نہ ہو سکی۔ مسلمانوں کی آمد کے وقت تو سنسکرت کے علمی دفینوں پر امتداد زمانہ کا ایسا گہرا اور تاریک پردہ پڑا ہوا تھا کہ خود ہندوستان کی عامہ خلائق ان سے بالکل نا آشنا تھی ایسی حالت میں نو واردوں کو استفادہ کا موقع کہاں تھا؟

ایک ننھا پودا تربیت قبول کر سکتا ہے۔ اس کی ٹیڑھی شاخیں سیدھی کی جا سکتی ہیں۔ اس پر کاٹ چھانٹ کا عمل جاری ہو سکتا ہے لیکن تناور درخت اپنی صورت شکل نہیں بدل سکتا۔ اس کی خمیدہ شاخ کو سیدھا کرنا ممکن نہیں۔ وہ ردو بدل قبول نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کوئی زبان اپنے ارتقا کی ابتدائی

منزلوں میں خارجی اثرات سے متاثر ہو سکتی ہے لیکن پوری طرح نشو و نما پانے کے بعد اس میں رد و بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی قوم کسی ترقی یافتہ اجنبی زبان کو سیکھنا چاہے تو اس زبان کے مسلمہ اصول و ضوابط کی پیروی اس پر لازم آئے گی۔ آج کل ہندوستان میں انگریزی کا دور دورہ ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی انگریزی زبان میں ہندی محاورات ٹھونسنا چاہے یا ہندی اسلوب بیان اختیار کرے تو اس کا یہ فعل مضحکہ انگیز متصور ہوگا۔ آج کل اسی شخص کی انگریزی قابل ستائش سمجھی جاتی ہے جس کی انشا و تحریر اہل زبان سے ملتی جلتی ہو۔ اسی پر سے فارسی زبان کا قیاس کر لینا چاہئے۔ جب اول اول مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو کر یہاں سکونت پذیر ہوئے۔ اس وقت فارسی زبان اپنے تمام ارتقائی مدارج طے کر کے ترقی کی معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ اس کے ادب و شاعری کے سارے اصول و قواعد منضبط ہو چکے تھے۔ غرض کہ اس نے مستقل و مستحکم ہیئت اختیار کر لی تھی جس میں کسی قسم کی رد و بدل یا ترمیم و اصلاح کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ جو شخص فارسی سیکھنا چاہتا تھا اس کو مسلمہ اصول و ضوابط اور مقررہ زبان و محاورہ کی پیروی کرنی پڑتی تھی۔ اگر کسی ہندوستانی سے زبان و محاورہ کی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تھی تو اس پر لا رجی ہنوز بوے کچوری می آید کے آوازے کسے جاتے تھے۔ اس لئے اجنبیوں کو بھی بڑی احتیاط کے ساتھ اتباع کرنا پڑتا تھا۔ ان حالات کے مد نظر فارسی پر ہندی رنگ کا چڑھنا ناممکن تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ہندوستان کی علمی زبان سنسکرت تھی جو مدت سے مردہ و متروک ہو چکی تھی اور ملک کی مختلف پراکرتیں محض بول چال کی زبانیں تھیں جو ضروریات زندگی کے پورا کرنے اور آپس میں لین دین جاری رکھنے کے لئے بولی جاتی تھیں۔ دیسی زبانوں کو ادبی زبان بننے کا فخر مسلمانوں کے عہد حکومت میں حاصل ہوا۔ مسلمان حکمرانوں کی علمی و ادبی سرپرستی صرف عربی و فارسی زبانوں ہی تک محدود نہ تھی بلکہ وہ دیسی زبانوں کی ترقی کے لئے بھی کوشاں تھے۔ مسلم فرمانرواؤں کی دیکھا دیکھی ہندو راجاؤں، صوبے کے حکمرانوں اور دونوں قوم کے امراء و رؤسا نے دیسی زبانوں کی حمایت کرنی شروع کی۔ ہندی شعراء مختلف درباروں سے وابستہ تھے اور شاہانہ فیاضیوں سے بہرہ ور ہوتے

تھے۔ اگر فارسی شعرا کو ملک الشعرا کا خطاب ملتا تھا تو ہندی کے سربرآوردہ شاعر بھی کوی راج کے خطاب سے سرفراز کئے جاتے تھے۔ دونوں پر انعام واکرام کی بارش ہوتی تھی۔ اگر مسلمان فرمانرواؤں کی توجہ دیسی زبانوں کی طرف مبذول نہ ہوتی تو انھیں علمی وادبی زبان بننے کا کبھی شرف حاصل نہ ہوتا۔ غرض کہ ہندی زبانوں میں ادب وشاعری کی ترقی علم دوست ومعارف نواز مسلمان فرمانرواؤں ہی کی سرپرستی وسایہ عاطفت کی شرمندہ احسان ہے۔ ایسی حالت میں فارسی شعرا کی غیرت وحمیت کب گوارا کرتی کہ وہ ان نیم مہذب پراکرتوں کے اسالیب بیان اور تشبیہ و استعارات کی تقلید کرتے جو خود انھیں کے ظل عاطفت میں نشوونما پا رہی تھیں۔ وہ ... کے منافی تھا۔

ان کے علاوہ ایک اور وجہ تھی جس سے ... ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں کی علم دوستی، معارف پروری ... اقطاع عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ شعرا کبھی سونے میں تولے جاتے تھے کبھی جواہرات سے ان کا منہ بھرا جاتا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی غیر معمولی داد ودہش دور دور ملکوں کے علما وشعرا کی دامن کش تھی۔ ان کی بے نظیر فیاضیوں نے بے شمار ایرانی شعرا کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ صرف یہی نہیں کہ جن شاعروں کی اپنے ملک میں قدر نہ ہوتی تھی وہ ہندوستان کا رُخ کرتے تھے اور یہاں انعام واکرام سے مالا مال ہو جاتے تھے بلکہ اکثر شعرا ایرانی درباروں سے قطع تعلق کرکے ہندوستان آتے تھے اور یہاں کی بے نظیر قدردانیوں اور فیاضیوں سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر خسرو، فیضی، غنی کشمیری، مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی کے سوا اور تمام سربرآوردہ شعرا ایرانی الاصل تھے۔ الغرض دہلی میں ایرانی شعرا برابر آتے رہے۔ نووارد ہونے کی وجہ سے وہ یہاں کی ملکی زبانوں سے بالکل ناواقف تھے۔ لیکن فارسی شاعری کا چمن زار انھی کی آبیاریوں سے سرسبز وشاداب تھا۔ فارسی چمن سخن کے کسی تختہ میں ہندی پھول پودے لگانے سے ان مالیوں کی اجنبیت وناواقفیت مانع تھی۔ اس لئے فارسی شاعری کی کسی شاخ میں ہندی تشبیہوں یا استعاروں کا

پیدا نہ ہو سکا۔

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوؤں نے کس بنا پر اور کس حد تک فارسی زبان میں مہارت پیدا کی تھی۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جب دو قوموں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک قوم دوسری پر غلبہ حاصل کرلیتی ہے تو محکوم قوم حاکم قوم کے خیالات و جذبات۔ وضع قطع۔ لباس و پوشاک۔ رسم و رواج۔ تہذیب و معاشرت اور آداب و مراسم کی تقلید کرنے لگتی ہے۔ حکام سے ملنا جلنا باعث فخر سمجھتی ہے۔ ان کی سوسائٹی میں رسوخ پیدا کرنے کے لئے ان کی زبان سیکھتی ہے۔ چنانچہ آج کل بھی زندگی کے ہر شعبے میں حاکم قوم کی تقلید موجب افتخار خیال کیجاتی ہے۔ اگرچہ ابتدا ہی سے انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ کم آمیزی کی روش اختیار کی ہے۔ وہ ان سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہیں اور اپنی سوسائٹی میں انھیں شریک نہیں کرتے۔ تاہم تحریک ترک موالات کے قبل تک انگریزی میں بات چیت کرنے والا انگریزی لباس پہننے والا اور انگریزی طرز رہائش قبول کرنے والا ہندوستانی اپنی سماج میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن مسلمان فاتحین انگریزوں کی طرح کم آمیز نہ تھے۔ مسلمانوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنالیا اور وہ ہندوؤں کے ساتھ آزادی سے ملنے جلنے لگے۔ اس لئے پہلے ہندو امرا و شرفا نے فارسی زبان سیکھی اور رفتہ رفتہ عوام بھی فارسی سے آشنا ہونے لگے۔ میل جول کے بڑھنے سے عامیوں کی زبان پر بھی عربی و فارسی کے بے شمار الفاظ چڑھ گئے۔ اور بفحوائے اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ہندوؤں نے تمام معاشری معاملات میں حاکم قوم کا اتباع شروع کردیا۔ کچھ دنوں کے بعد فارسی کو بسہولت سمجھنے کے لئے لغت و فرہنگ کی ضرورت محسوس ہونے لگی جسے امیر خسرو نے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں "خالق باری" لکھ کر پورا کیا۔ اور بچوں سے بوڑھوں تک کے لئے عربی و فارسی الفاظ کے معنی سمجھنے میں سہولت پیدا کردی۔ پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب سکندر لودی تخت نشین ہوا تو اس نے عام طور پر ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ دفتری کاروبار انجام دے سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر کایستھ فارسی کی تعلیم پاکر شاہی دفتروں میں داخل ہوئے۔ ہر وقت کے کام کاج کی وجہ سے عربی و فارسی الفاظ و اصطلاحات ان کی زبان پر کثرت سے جاری ہوئے اور ملک کے ہر

صوبہ میں تھے۔ اس کے بعد سولہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اکبر اعظم کے مشہور وزیر راجہ ٹوڈرمل نے فارسی کو عام دفتری زبان قرار دیا اور تمام سرکاری حسابات فارسی ہی میں رکھنے کے لئے حکم نافذ کیا۔ اس وقت سے فارسی کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے بچوں کی ابتدائی تعلیم بھی فارسی ہی میں ہونے لگی۔ ایسا شاید ہی کوئی خوش حال ہندو ہوگا جو اپنے دروازے پر ایک مولوی صاحب کو مقرر کرکے اپنے اور اپنے ہمسایہ کے بچوں کو فارسی کی تعلیم نہ دلاتا ہو۔ پہلے تو ہندوؤں نے سرکاری ملازمت حاصل کرنے کے لئے فارسی تعلیم شروع کی تھی لیکن بعد میں فا...

کی جانے لگی۔ اس وقت ہندوستان آج کل کی طرح نفاق

کی فضا فرقہ واری جھگڑوں۔ مذہبی کشیدگیوں اور بزم...

مسلمانوں کے درمیان رشتۂ اتحاد وارتباط اور سلسلہ ...

پر قائم تھا۔ ہندو امراء اور رؤسا بھی فارسی کے ویسے ہی زبردست حامی تھے جیسے مسلمان۔ نتیجہ یہ ہوا ہندوؤں میں بھی فارسی کے بڑے بڑے ادیب۔ انشاپرداز اور شاعر پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں فارسی کو جو قبول عام حاصل تھا اس کا عشر عشیر بھی آج تک انگریزی کو باوجود عظیم الشان یونیورسٹیوں۔ کالجوں اور اسکولوں کے نصیب نہ ہوسکا۔ آج کل یونیورسٹیاں منشی اور کلرک پیدا کرنے کی مشین ہیں۔ اہل ہند میں سے ایک شخص بھی انگریزی کا زبردست شاعر یا ادیب نہ بن سکا لیکن فارسی کے بیسیوں عظیم المرتبت ہندو شاعر گذرے ہیں۔ نہ صرف مسلمانوں کے عہد حکومت میں بلکہ سلطنت انگلشیہ کے قیام کے بعد بھی ۱۸۳۵ء تک فارسی دفتری زبان بنی رہی اور اس کا ملک میں اس قدر چرچا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں کے نزدیک اسے اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ نہ صرف سنجیدہ علمی وفنی تصنیفات کے لئے یہ زبان استعمال کی جاتی تھی بلکہ ریختہ کے تذکرے۔ تمسکات۔ رسیدیں۔ طبی نسخے۔ دعوتی رقعے۔ دستاویز۔ ہنڈی۔ کرایہ نامے تجارتی وکاروباری مراسلے۔ معمولی نامہ وپیام اور خانگی خطوط بھی فارسی ہی میں لکھے جاتے تھے۔ حروف شناسی کے بعد ہی بچے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان کریما مقیما شروع کرتے تھے۔ بچپن ہی سے فارسی ادب وشاعری کی تمام خصوصیات۔ تشبیہات۔ استعارات۔ تلمیحات۔ اسالیب بیان اور محاورات وغیرہ

کانوں میں رچ جاتے تھے جس کے باعث اساتذہ فارسی اشعار کے سمجھنے اور ان سے حظ اندوز ہونے میں بڑی سہولت ہوتی تھی۔

اقلیم سخن میں سودیشی اور بدیسی کی بحث ایک لایعنی سی چیز ہے۔ ادب و شاعری کی دنیا جغرافیائی حدود بندیوں سے بالاتر ہے۔ شاعری کو تخیل سے سروکار ہے۔ تخیل کسی محل میں سانس کی طرح بند ہو کر اشیا کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ وہ ملکی و جغرافیائی حدود بندیوں کو توڑتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔ کبھی وہ ملک چین میں نگار خانۂ مانی کا نظارہ کرتا ہے۔ اور کبھی مصر پہنچ کر دریائے نیل میں لشکر فرعون کی غرقابی کا تماشہ دیکھتا ہے کبھی وہ وادی ایمن میں انوار ربانی کی تجلی ریزیاں ملاحظہ کرتا ہے اور کبھی دشت نجد میں مجنوں کی بادیہ پیمائیوں اور مایوسیوں پر اشک بہاتا ہے۔ کبھی ایران میں رستم و سہراب کو مصروف ستیز پاتا ہے اور کبھی کوہ قاف میں پریوں کے رقص سے محظوظ ہوتا ہے۔ کبھی اس کی پرواز بلندی میں سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ جاتی ہے اور کبھی نیچے اترتا ہے تو قلس ماہی کو شمع شبستاں کی طرح روشن پاتا ہے۔ غرض کہ کبھی وہ مشرق میں ہے تو کبھی مغرب میں۔ کبھی اعلیٰ علیین اس کا مسکن ہے تو کبھی اسفل السافلین۔ شاعرانہ تخیل ان لوگوں کی تنگ نظری پر ہر وقت ہنستا رہتا ہے۔ جو ادبی تشبیہات و استعارات کو محض ہندی پیداوار تک اور تلمیحات و اشارات کو صرف اپنی ہی دیو مالا کے قصص و روایات تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ادب و شاعری میں ملکی و غیر ملکی کی بحث کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ البتہ یہاں مانوس اور غیر مانوس کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ غیر مانوس تشبیہوں۔ استعاروں یا تلمیحوں کا استعمال معائب شعری میں داخل ہے انگریزی ادب و شاعری میں یونانی و رومی صنمیات کے ابطال و رجال اور واقعات و مقامات کے بیشمار حوالے زینت کلام کے لئے دئے جاتے ہیں جن کو کسی انگریز متعلم نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے اور نہ وہ اس کے وطن یعنی انگلستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تمام صنمیاتی واقعات انگریزی شاعری کا جزو بدن بن چکے ہیں اور ہر انگریز متعلم ان سے مانوس ہے اس لئے وہ ان سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ اسی طرح لیلیٰ مجنوں کا عشق۔ شیریں و فرہاد کی محبت۔ رستم و اسفندیار کی بہادری۔ مانی و بہزاد کی مصوری۔ دجلہ و فرات کی طغیانی۔ الوند و بیستون کی بلندی۔ گل و بلبل کا تعلق۔ یوسف کی

خوبصورتی اور معشوق کی قامت چشم۔ دہن۔ زلف و زنخداں وغیرہ کی شمشاد۔ نرگس۔ غنچہ۔ سنبل اور سیب وغیرہ سے تشبیہہ یہ تمام چیزیں فارسی شاعری کا سرمایہ تھیں اور اس کے خمیر میں داخل ہو گئی تھیں۔ اگرچہ ان چیزوں کو ہندوستان کی سرزمین سے کوئی تعلق نہ تھا تاہم جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت فارسی زبان کی وسعت و ہمہ گیری۔ حاکمانہ [illegible] اور عام شہرت و مقبولیت نے ہندوستان کے بچے بچے کو ان تمام تشبیہات و تلمیحات سے روشناس کر دیا تھا۔ ادبی سرمایہ کو جسمانی آنکھوں سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف چشم تخیل سے دیکھنا اور [illegible] تصور کر لینا کافی ہے۔ ایک متعلم ادبیات کے لئے بلبل کے متعلق ضرورت نہیں جو علم حیوانات یا علم طیور کا ماہر ہم پہنچایا [illegible] بلبل ایک خوشنما و خوش الحان پرندہ ہے اور [illegible]طرح ایک شاعر کو سکندر اعظم کے تمام تاریخی کارناموں اور کشور کشائیوں [illegible] جاننے کی ضرورت ہے کہ اس نے دارا کو شکست دی۔ آئینہ کا موجد تھا اور سد سکندری کا قائم کرنے والا۔ اسی پر دوسری تلمیحات و تشبیہات کا قیاس کر لینا چاہئے آنکھوں سے دیکھنے کی شرط تو ملکی چیزوں سے بھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اگر آنکھوں نے لیلیٰ و مجنوں کو نہیں دیکھا ہے تو نل اور دمینتی یا دشینت اور شکنتلا کو کس نے دیکھا ہے۔ ملک دکن کے طالب علم کے لئے کوہ ہمالیہ یا رود گنگ ویسی ہی ان دیکھی چیزیں ہیں جیسے کوہ الوند یا دریائے فرات۔ بہرحال شاعری میں جسمانی آنکھ سے چشم تخیل کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور غیر مانوس ملکی اشیا سے مانوس بدیسی چیزیں زیادہ دلچسپ و مسرت بخش ہوتی ہیں۔ جن باتوں کو ہم بچپن سے بار بار سنتے آئے ہیں ان کا ہمارے ذہن میں ایسا صاف تصور قائم ہو جاتا ہے اور ان سے اس قدر دلچسپیاں وابستہ ہو جاتی ہیں کہ ان سے گوش آشنا ہوتے ہی تمام تلازمات و تلمیحات حافظہ کی نیم شعوری سطح سے ابھر ابھر کر ہماری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی واقعہ ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ فارسی شاعری کی گرم بازاری نے ہر ہندوستانی بچہ کو تمام تشبیہات و تلمیحات سے مانوس بنا دیا تھا۔ آگے چل کر یہی بچے فارسی شاعری سے صرف حظ

ا ممنوع بھی نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں سے اکثر میدان سخن کے شہسوار بھی بنتے تھے۔ اگر ہندوؤں کی نظر آج کل کی طرح اس وقت بھی ملکی تقسیم وجغرافیائی حدود بندیوں کی پابند ہوتی اور فارسی شاعری کی خصوصیات انھیں اجنبی و نامانوس معلوم ہوتیں تو ان کے ہاں فارسی کے زبردست ادیب و شاعر پیدا نہ ہوتے۔ بہرکیف یہ حقیقت واقعہ ہے کہ عہد مغلیہ میں ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی فارسی ادب و شاعری کی تمام خصوصیات۔ ادبی نکات و کنایات۔ نحوی و عروضی اصول و ضوابط۔ شاعرانہ تشبیہات و استعارات۔ اشارات و کنایات۔ تمثیلات و تلمیحات اور امثال و محاورات سے اچھی طرح واقف تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتنی اجنبیت و مغایرت نہ تھی جتنی موجودہ دور تہذیب میں پائی جاتی ہے۔ وہ شیر و شکر کی طرح گھل مل کر رہتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ تہذیب و معاشرت۔ وضع قطع۔ لباس و پوشاک۔ خیالات و افکار۔ تعلیم و تربیت مجلسی آداب و مراسم وغیرہ کے لحاظ سے یکساں تھے۔ فرق تھا تو صرف مذہب کا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے انتہا درجے کی رواداری کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ادب و شاعری میں دونوں قدیم اصول و وضع کے پابند تھے چنانچہ ہندو مصنفین کی قلمی یا نثری کتابیں بھی حمد۔ نعت اور منقبت سے شروع ہوتی تھیں۔ آج یہ دیکھ کر تعجب ہوگا کہ اکثر قدیم شعرا نے نعت و منقبت میں ایسے پرجوش اور گرم شعر نکالے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی عاشق رسول یا جاں نثار اہل بیت کا کلام ہے۔ کئی ہندو شعرا نے اعلیٰ درجے کے معراج نامے اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک مخلوط زبان پیدا ہوئی جو آگے چل کر اردو کہلائی۔ بہت دنوں تک وہ صرف بول چال کی زبان بنی رہی جس سے صرف آپس کے لین دین اور تبادلۂ خیالات کا کام چلتا رہا۔ اس میں انشاپردازی اور شاعری تو کجا معمولی خط و کتابت کرنا بھی معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیسی زبانوں کی علمی و ادبی ترقی مسلمانوں کی حمایت و سرپرستی کی رہین منت ہے۔ ان میں اتنی قوت و صلاحیت نہ تھی کہ وہ فارسی زبان پر اثر انداز ہوتیں۔ اس کے برعکس وہ مفتوح و مغلوب اور مسلمانوں کی

دست پروردہ ہونے کی حیثیت سے اپنا دامن کشادہ کرکے فارسی علم و فن کے خوش آب موتی حاصل کرلی رہیں۔ تیسرا قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ فارسی نہایت شستہ۔ پختہ۔ ترقی یافتہ اور حاکم زبان تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس کے دلدادہ تھے۔ فارسی دانی تہذیب و شائستگی کی علامت اور عزت و وقعت کا ذریعہ تھی۔ ہندوؤں کا خوش باش طبقہ فارسی علوم و فنون کی تحصیل میں منہمک و مشغول تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں بھی فارسی کے زبردست انشا پرداز اور شاعر پیدا ہوئے فارسی شاعری کی تشبیہات و تلمیحات سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف تھا۔ ادبی دنیا میں اس وقت ملکی و غیر ملکی عناصر کا جھگڑا نہ تھا۔ ہر شخص خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان فارسی ادب، شاعری [illegible]
واقف و مانوس تھا اور فارسی شاعری سے لطف گیر و حظ [illegible]
اب غور طلب امر یہ ہے کہ اردو شاعری کس طرح معرض وجود [illegible]
اور کون کون سے ارتقائی مدارج طے کرکے یہ معراج کمال [illegible]

چاہیئے کہ اردو بولی اور اردو شاعری کی ہیئت و نوعیت یکساں نہیں ہے۔ ممکن ہے اردو بولی کی ریڑھ ہندی ہو اور اس پر صرف عربی و فارسی کے بیل بوٹے بنائے گئے ہوں۔ ممکن ہے کہ اردو بولی برج بھاشا یا دہلی بھاشا سے نکلی ہو اور اسی کی دختر کہلاتی ہو لیکن یہ حقیقت واقعہ ہے کہ اردو شاعری راست فارسی شاعری سے نکلی ہے۔ اس کو ہندی بھاشاؤں کی شاعری سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو شاعری فارسی شاعری کے نہال بلا آوری کی ایک شاخ ہے۔ یہ شاخ اپنے مادری تنے سے کس طرح پھوٹی۔ اس سے کیسے غذا اور تقویت حاصل کرتی رہی اور کیسے نشوونما پاکر پھولی پھلی۔ ان تمام مراحل و مدارج کا استقصا نہایت دلچسپ ہے۔

جدید علمی اصولِ تحقیق کا تقاضا ہے کہ کسی مسئلے کی توضیح و تشریح کے لئے پہلے اس کے تمام عناصر کی تحلیل یا تجزیہ کیا جائے۔ اردو شاعری کے ارتقائی مدارج کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا پہلا زینہ فارسی اشعار میں کہیں کہیں ہندی الفاظ کا ادخال ہے۔ مسلمان حملہ آوروں اور ہندوستان کے باشندوں کے میل جول سے جو مخلوط زبان تشکیل پذیر ہوئی تھی اور جس نے آگے چل کر اردو کا نام پایا

تھا جو ابتدا از صرف بازاروں ہیں بولی جاتی تھی۔لیکن مرور زمانہ و امرا و شرفا کے گھروں میں بھی جگہ پانے لگی۔ گو یہ محض بول چال کی زبان تھی اور ادبی و دربار ی زبان فارسی تھی تاہم فارسی شعرا غیر ارادی طور پر اپنے کلام میں کہیں کہیں اس مخلوط زبان کے ایک آدھ لفظ بھی استعمال کرنے لگے جیسا کہ حسب ذیل اشعار سے واضح ہوتا ہے۔

امیر خسرو۔

اے دہلی واے بتان سادہ ۔ پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ
سر آں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن ۔ ہمہ را بنوک مژگاں زدہ برچگر کٹارہ

عرفی۔

در چاشت گر از شبنم گل گرد فشاں است ۔ آں باد کہ در ہند اگر آید بکر آید (جھکڑ)

اشرف۔

چو کھنڈی فکر بش اگر سایہ افگند ۔ فیل سپہر شانہ بدوزد و بزیر پا

محسن کشمیری۔

در چمن ہر صبح مینا میکند راگ بسنت ۔ نیست طوطی را بجز کلیاں چو بلبل بر زباں

طغرا۔

شوخ سوسن را بگو دل می رباید تختہ ات ۔ ذات ریحو تست ترسم دست رجو تر کند

جعفر زٹلی۔

تحقیق کلاں ترکہ پر کھنڈ کرد ۔ ہمہ کار و بار پدر بھنڈ کرد

کبھی فارسی شعرا ایک لفظ کے بجائے اردو کا پورا فقرہ اپنے شعر میں داخل کر دیتے تھے۔ اسے ارتقاء کا دوسرا زینہ سمجھنا چاہیے۔اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

امیر خسرو۔

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی ۔ آں دیگ دہی بر سر تو چتر شہی

ہر جو بست قند و شکر می ریزد   ہرگاہ گوئی کہ دہی کیو دہی

شیخ جنید۔

چو دزد اندر کمیں باشد کرے جو کیند نجارا   نہ باشد سو داک جیبل گنولے سودھی سارا

اسعد گجراتی۔

گر طفلکے بازیگرے خوانندہ و عالم شود   اچلیکہ وا دسکے رود آخر نبو را مہسے پہ

سعدی دکنی۔

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ دُر ریختہ   شیر

میر معز۔

از زلف سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے

حامد۔

عزم سفر چوں کردی ساجن نینوں نیند نہ آئے جی   قدر وصالت نا دانستم تم بن برہ ستانے جی

بعض وقت شعرا ایک مصرع فارسی کا اور دوسرا مصرع اردو کا کہتے تھے۔ اسے اردو شاعری کے ارتقا کا تیسرا زینہ تصور کرنا چاہیے۔ اس کی دو تین مثالیں درج ذیل ہیں:۔

امیر خسرو۔

شبان ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چوں شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ز مہر آں مہ بگشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

نوری۔

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد　　　بیچارۂ نوری نہ کرے ہو نہ ڈرے ہو

بیجا ئی یار قلی۔

رخسار نو بہار چمن رونق چمن　　　یا گل گلاب کا کہوں یا لالہ یا سمن

کسی نے خواجہ حافظ شیرازی کی ایک مشہور غزل کی تضمین کہی ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

انکھیاں نے جو نگا یار سوا کریں گی آخر　　　دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

دو دن کی زندگانی مت کر جفا کسی پر　　　نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا

اس سے جو آگے قدم بڑھا تو فارسی کے اچھے اچھے اشعار کا اردو میں ترجمہ ہونے لگا۔ ترجمہ کرنے والے بھی فارسی کے پرگو شاعر تھے۔ مشق سخن کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اساتذہ کے اعلیٰ کلام کو پیش نظر رکھ کر شعر کہا جائے۔ اور اس میں کوئی نئی بات یا مزید لطافت و دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ شعرا اساتذۂ کا سبق کا بہتر سے بہتر کلام لیتے تھے اگر فارسی میں اسی خیال کو زیادہ پر لطف و موثر طریقے سے ادا کرنا ممکن نہ ہوتا تو وہ اسے اردو شعر میں ظاہر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کو اردو شاعری کی ترقی کا چوتھا زینہ سمجھنا چاہئے۔ ترجمے کی چند مثالیں ذیل میں درج ہیں۔

(۱) حافظ۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو　　　کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

سلطان محمد قلی۔

دنیا کی حکمت نا پوچھیں ہرگز حکیماں علم سوں　　　کا دو نرانا عیش کا لس دن پیا کے نام پر

(۲) نظیری۔

بچناں گرفتہ جا بمیان جان شیریں　　　نتواں ترا و جاں راز ہم امتیاز کردن

ولی دکنی۔

ایسا بسا ہو آکر تیرا خیال جیو میں　　　مشکل ہے جیو سوں تجھ کو اب امتیاز کرنا

(۳) فغانی۔

فصل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست　　اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کند

میر تقی میر۔

پایا نہ یوں کہ کرئے اس کی طرف اشارہ　　یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

(۴) قدسی۔

آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را　　اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا۔

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو　　اختر ۔

(۵) نظیری

دیدہ ام دفتر پیان و فا حرف بہ حرف　　نام

قائم۔

فہرست میں خوبان وفادار کے پیارے　　دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ پایا

اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ اگرچہ فارسی کو علمی۔ ادبی۔ درباری اور دفتری زبان ہونے کا فخر باقی تھا لیکن ہندوستان میں مدت سے قیام ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام ہی کی نہیں بلکہ امرا اور شرفا کی بھی مادری زبان اردو ہو گئی۔ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ گھرانوں کا بھی یہی حال تھا۔ دارالسلطنت کے باشندے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان گھروں میں اردو بولتے تھے لیکن تصنیف و تالیف فارسی میں ہوا کرتی تھی۔ شعرا کا عظیم الشان کارنامہ ان کا فارسی کلام ہی سمجھا جاتا تھا لیکن چونکہ اس میں دماغ پر بار زیادہ پڑتا تھا اس لئے فارسی شعرا کبھی کبھی محض تفنن طبع کی غرض سے یا کسی کی فرمائش پر اردو شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے اسے اردو شاعری کی ترقی و ارتقا کا پانچواں زینہ تصور کرنا چاہئے۔ علمی قابلیت۔ شاعرانہ لیاقت اور فنی مہارت کا معیار و ذریعۂ اظہار ابھی تک فارسی شاعری تھی۔ اردو شاعری یا ریختہ گوئی محض ایک ضمنی شے اور تفریحی مشغلہ شمار کی جاتی تھی۔ بعضوں کے دماغ میں یہ خیال بہت زمانے بعد تک قائم رہا۔ چنانچہ انیسویں صدی عیسوی کے اواسط تک جو تاریخ ادبیات اردو کا "دور متوسطین" کہلاتا ہے۔ بعض شعرا اپنی

فارسی شاعری پر نازاں تھے۔ مرزا غالب اسی دور کے شاعر ہیں اور ریختہ کو محض تفنن طبع کا ذریعہ خیال کرتے رہے۔ وہ منشی نبی بخش کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "بھائی صاحب تم میری اردو غزلوں کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں۔ یہ غزلیں کاہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ میرے فارسی کے وہ قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا۔ اب قدردانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرماتے ہیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے یعنی نیا ریختہ۔ ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی اردو غزل کہہ کر لیتا ہوں۔" ایک طویل فارسی قطعہ میں بھی وہ اس خیال کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

لیکن عام طور پر اردو شاعری نے یہ ارتقائی مرحلہ میر و مرزا کے زمانے سے پیشتر ہی طے کر لیا تھا۔ تاہم یہ حقیقت واقعہ ہے کہ پانچویں ارتقائی دور تک کسی شاعر نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا بلکہ اظہار قابلیت کا اصل ذریعہ فارسی شاعری تھی۔ فارسی کے شعرا محض تفریح طبع کے طور پر یا اپنے دل کی امنگ سے یا دوستوں کی فرمائش سے یا بادشاہ۔ ولی عہد۔ حاکم یا کسی امیر کے حکم سے ایک آدھ ریختہ کی غزل کہہ لیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شاعر ریختہ گوئی کو اپنا فن سمجھتا تو منفرد فارسی شاعر اس پر بہ ایں الفاظ اپنی فوقیت و برتری جتاتا تھا۔

راست میگویم من و از راست سر نتواں کشید   ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

سرورِ کائنات کی حکومت

اس کا قیام اور انتظام

(ایک مقالہ جو بزم تاریخ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے خصوصی جلسے میں ۔۔۔ اگر
نے ایک اشرفی کا "سعیدیہ انعام" عطا کیا۔)

مندرجہ عنوان بحث پر روشنی ڈالنے سے پہلے چند ا۔۔۔
کیا آنحضرت صلعم کی حکومت قائم کرنی چاہتے تھے یا اس ۔۔۔
حکومت کا قیام ایک ناگزیر چیز تھا؟ عام طور پر حکومت کے قیام کے ذرائع کیا سمجھے جاتے ہیں؟ آنحضرت صلعم کا ماحول جس میں حکومت قائم کی گئی کیا تھا؟

آنحضرت صلعم کا ماحول چودہ سو برس پہلے عرب کی سیاسی حالات کا عام نقشہ یہ تھا کہ گو عرب طبعاً ایک ہی ملک تھا۔ جغرافی، لسانی، نسلی یکجہتی موجود تھی۔ رسم و رواج یکساں تھے مگر کوئی متحد کرنے والی مرکزی قوت موجود نہ تھی۔ ڈاکہ۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، جوا، زنا، شراب نوشی ہر قسم کی برائیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ (تفصیل صبح الاعشیٰ از قلقشندی وغیرہ میں دیکھئے) خانہ جنگیاں عام تھیں جن کے باعث ساحلی و سرحدی مقامات پر طاقتور ہمسایہ حکومتوں کی حمایتیں (Protectorates) قائم ہو گئی تھیں[1] ایک حصہ پر رومن اثر تھا تو دوسری طرف ایرانی گرفت بھی تھی[1] اور یہ اجنبی تسلط و نفوذ ہر قسم کے اثرات ڈال رہا تھا۔ چنانچہ ملک میں عیسائی مذہب کی تبلیغ ہو رہی تھی۔ عربی زیر حمایت حکومتوں میں شاہانہ طمطراق اور کروفر پیدا ہو گئے تھے۔ مگر گورنر یمن ابرہہ حبشی کی تباہی کے بعد (جو عربوں کے روایات اور قومی معبد کو تباہ کرنے آیا تھا[2]) "یوم ذی قار" میں اجنبی استعمار کو ایک زبردست دھکا لگا تھا جس سے عربوں کے دلوں میں ایک

(۱) جملہ حوالے نمبروں کی ترتیب سے مضمون کے آخر میں دئے گئے ہیں۔ (م۔ح۔ا)

مملکت اسلامیہ

بعہد نبوی

خاموش محرک پیدا ہو گیا تھا اور وہ اپنی برتر قابلیتوں کو محسوس کرنا شروع کر چکے تھے۔ قسمت سے ان استعماری قوتوں (روم و ایران) میں مسلسل جنگیں ہوتی رہیں جس سے دونوں کمزور ہو گئے۔ قبیلہ واری حکومت تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے اثر سے ملک میں ایک طرح کی مرکزیت بھی تھی۔ چنانچہ سب حج کو مکہ معظمہ آتے تھے۔ جہاں قریش اور قریش میں عبد مناف کا خاندان سب سے با اقتدار تھا۔ حج اور دیگر میلے وحدت لسانی و خیالی میں بہت مددگار رہتے تھے۔ ان میں ایک طرح کی جمہوریت موجود تھی

وقت ضرورت ان کی " پارلیمان " کا اجلاس ہوتا تھا[۲] ان کے

وغیرہ بھی منتخب ہوتے تھے[۱]۔ ملک میں پہلے ہی چیچک، ذہبیت

وغیرہ سے ان کے چند اعلیٰ تر دماغوں میں تلاش حق پیدا ہو

متعدد لوگ بت پرستی سے خود بخود نفور ہو گئے تھے۔

تھی اور ایسی محنت کا معاوضہ سوا اونٹ مقرر ہو چکے[۲] تھے۔

اور متعدد قبائل نے معاہدہ " حلف الفضول " کے ذریعے ایک انجمن مظلوموں کی مدد کے لئے قائم کی تھی۔ غرض اس قوم کی قابلیت ملک میں پیدا ہو چکی تھی کہ انہیں ایک متمدن اور منضبط قوم بنا کر ان کی عملی قوتوں سے کام لیا جائے اور ساتھ ہی ہمسایہ اجنبی حکومتیں اوج کمال کو پہنچنے کے بعد تیزی سے روبہ انحطاط تھیں۔

ظہور قدسی | ان حالات میں ۹ ربیع الاول ۵۳ قبل ہجرت (۲۰ اپریل ۵۷۱ء) کو مولانا شبلی کے الفاظ میں " شاہ حرم، حکمران عرب، فرمانروائے عالم، شہنشاہ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا اللھم صل علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم[۱] "۔

سرور کائنات صلعم کا مقصد رسالت | عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس کو باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں — کہ آنحضرت صلعم کی پوری کوشش اور جد و جہد کا منشا فقط یہ تھا کہ " خدائے واحد ہی کا بول بالا ہو[۲]" اور ایک ایسی حکومت کا قیام عمل میں آئے جس میں ظلم معدوم ہو۔ ہر شخص اعتقاد کی کامل آزادی سے بہرہ ور ہو، دنیا سے بدامنی و فساد دور ہو، تاکہ ہر شخص کو اپنی قابلیت کے مطابق خدا کی پیدا

کردہ چیزوں سے زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع ملے۔ اور نیز محتاجوں کو ممکنہ حد تک حکومت کی جانب سے امداد دی جائے۔ پس محمد رسول اللہ صلعم کا مشن اسی طرح پورا ہو سکتا تھا کہ تمام انسان ایک مذہبی و سیاسی معاشرے یعنی حکومت کے تحت لائے جائیں جس کے بغیر امن، انتظام اور خودداری ممکن نہیں۔ آپؐ کی مشن کے خاص مذہبی اغراض سے یہاں ہمیں بحث نہیں ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ابتدائی دور رسالت میں اہل مکہ نے آنحضرت صلعم کو مال و دولت کی، حسین عورتوں کے ساتھ عقد کی اور امارت و حکومت کی چاٹ دی تاکہ آپ نبوت کے دعوے سے باز آجائیں۔ مگر آنحضرت صلعم نے اسے ٹھکرا دیا اور کہا کہ اگر چاند سورج بھی مجھے توڑ کر لادے جائیں تو میں تبلیغ حق سے باز نہیں آسکتا۔" اس واقعے سے کم از کم اتنا ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ چالیس پچاس برس کی عمر تک آنحضرت صلعم کو دنیا کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس کے بعد بھی آپ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور بقیہ چند سالہ زندگی گو سیاسی واقعات سے پُر ہے لیکن آنحضرت صلعم آخر تک یہی فرماتے رہے کہ "میں مکارم اخلاق کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں اور بس"۔

حکمرانی کی تربیت | پیدائش سے چند ماہ قبل باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانا، بچپن کا قبیلہ بنی سعد کے پہاڑوں میں گزارنا، چند ہی سال کے اندر ماں اور دادا کا بھی دنیا سے کوچ کر جانا، ایک جنگ (حرب فجار) میں بعض بزرگ رشتہ داروں کے تیر بردار کی حیثیت سے شریک ہونا، دو ایک تجارتی سفر شام کے اختیار کرنا، ایک معمر بیوہ سے شادی کرنے کے بعد غریب پروری اور نکوکاری کرتے کرتے بلند تر جذبات کے اثر سے خلوت گزینی پر مائل رہنا[۲] یہی وہ چند باتیں ہیں جو اس دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ البتہ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ کے دادا قبیلۂ قریش کے سردار تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں آباد تھا جو قدیم سے ملک عرب کا مرکز تھا۔ آپؐ کے دادا کے انتقال پر سرداری دوسرے خاندان میں چلی گئی۔ آپؐ کے متعدد چچا بھی زندہ تھے۔ اس لئے آپ کو سرداری حاصل کرنے کا خیال نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے بظاہر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سلطنت کے قیام کی تحریک اس زمانے میں دل میں پیدا ہو گئی تھی۔

حکومتیں کس طرح قائم ہوتی ہیں؟
آنحضرت صلعم کی حکومت

قیام حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے شاہی پھر شہنشاہی بنتی ہے۔ قبائلی دور تک تھا جیسی ہوتی ہے اور بلا مخالفت۔ لیکن قبائل کے شیوخ کو کسی مرکز (بادشاہ) کی اطاعت پر جمع کرلینا آسان نہیں۔ شاہی سے شہنشاہی مملکت مختلف طور سے بن سکتی ہے۔ اور یہ یا اضافہ ملک یا تو اپنے ملک کا ہوتا ہے جس میں کوئی حکومت اور انتظام پہلے سے موجود ہوتے ہیں یا محض خود ... قبائل کے مقبوضات ہوتے ہیں۔

دوسرے قبائل کے ملک کا الحاق دو طور سے ہو سکتا ہے یا تو ...
موروثی طور سے کسی کو تاج شہریاری حاصل ہو جائے تو اس کو
نوئی مملکت قائم کرنا۔ اسی طرح جدید مملکت ذلیل ذرائع سے نہیں ...
قائم کرنا، مملکت قائم کرکے اسے مستحکم اور پائدار کرنا حکومت عدل و انصاف سے کرنا اور نیک نام چھوڑ جانا بہرحال ان کے برعکس امور سے بہتر ہیں ا... تر بھی۔

محض حسن ظن سے نہیں بلکہ استقراء و تفحص کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں عرب میں کسی مملکت کا قیام ایک واقعی مشکل کام تھا۔ ملک میں کوئی حکومت نہ تھی بے شبہ بعض خطوں پر چھوٹی چھوٹی شاہی حکومتیں حکمراں تھیں اور وہ بھی اجنبی استعماریت کا شکار۔ ان کو اپنے ماتحت بنانا، ان کی حامی و محافظ قوی استعماری شہنشاہیتوں سے مقابلے کرنے کے بغیر ناممکن تھا)۔ ان حیرہ وغیرہ کی حکومتوں کے قطع نظر عرب میں عام طور سے صرف قبائلی حکومت تھی جن میں آپس میں سخت رقابتیں اور موروثی جھگڑے صدیوں سے بیش از بیش ہی ہوتے چلے آرہے تھے۔ غرض آنحضرت صلعم کو قبائل کی ان مرکز گریز قوتوں کو یکجا کرنا، ان میں معاشرتی اور اخلاقی کایا پلٹنے والے اصلاحات کو رائج کرنا، عرب کی غیر ملکی ریاستوں (Protectorates) کو آزاد کراکے ان کا الحاق کرنا، ایک حکومت کے جملہ ضروریات قانونی و انتظامی کو بالکل نئے سرے مہیا کرنا اور اندرون ملک کی یہودی اور نصرانی مخالفتوں سے دو چار ہونا تھا۔ (یہودی مخالفتیں، مذہبی، معاشی، سیاسی ہر قسم کی

رہیں اور بہت سخت جیسا کہ آئندہ بھی اشارۃً ذکر ہوگا)۔ اس مہم کو سر کرنے اور مملکت عرب کو قائم کرنے کے ساتھ آنحضرت صلعم اس کو مضبوط اور گہری بنیاد پر مستحکم حالت میں چھوڑ جاتے ہیں۔ رہا آپ کا نیک نامی سے مملکت کو قائم کرنا اور نیک نامی سے حکومت کرنا اور اپنے بعد بھی نیک نام چھوڑ جانا اس سلسلے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

ان سب کے علاوہ قیام کے دو بڑے ذریعے یعنی زر اور زور (فوج) سے ایک بھی آپ کے پاس نہ تھا اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ حکومت کا قیام حکومت کرنے کی غرض سے نہیں چاہتے تھے آپ کا پہلا اور آخری مقصد برے رسم و رواج کو مٹانا اور مذہب اسلام کی تبلیغ کرنی۔ غرض مقصد وحید اصلاح قوم تھا۔ اسی وجہ سے لوٹ مار، ظلم، طمع، لالچ، مکر و فریب، دغا وغیرہ (جن سے اپنے گرد جتھے جمع کئے جا سکتے ہیں اور دولت جمع کی جا سکتی ہے) آپ کے طریق عمل سے خارج تھے۔ آپ کو تبلیغ دین کرکے متبعین فراہم کرنے تھے۔ اور اصولاً اور حسب معمول یہ متبع ابتداً عموماً مفلسوں، غریبوں، مسکینوں وغیرہ پر ہی مشتمل تھے۔ جن سے معمولی امداد تو کجا خود ان کی جانی و مالی حفاظت مشکل تھی۔ ان سب امور کے باعث قیام حکومت میں آپ کے لئے بے اندازہ اور بے انتہا مشکلیں پیش آتی تھیں اور آئیں بھی۔ ان پر آپ کس طرح غالب آئے آئندہ مذکور ہوگا۔

ابتدائے کار | چالیس سال کی پختہ عمر میں عرفان سے مالا مال ہو کر اور ربانی ہدایت کے ماتحت (جس کا دعوے فرماتے ہوئے) آنحضرت صلعم نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس سے سخت تر کام نہ کبھی ہوا اور نہ ہوگا: عربوں کی سی اجڈ اور پر نفاق قوم کو خدائے واحد کی پرستش پر یکجا کرنا، مکارم اخلاق سکھانا اور تمام ساتھ دینے والے متبعین کو بھائی بھائی بنا دینا(۱) یہ آپؐ کا منشا تھا۔ متلاشیانِ حق دوڑ پڑے کہ چشمۂ حیات کا پتہ لگ گیا۔ غرض چند سال کی خفیہ اور پھر علانیہ کوشش اور تبلیغ سے دنیا کے چند اعلیٰ ترین دماغ مل گئے جو آپؐ کی تعلیم کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ تن من دھن سے اس کی توسیع پر آمادہ ہو گئے۔ زبردست ہم خیالوں کا پیدا کرنا آئندہ ہونے والے کام کی مضبوط بنیاد تھی۔

جب اس کا چرچا پھیلا اور کچھ اہل مدینہ آنحضرتؐ کے پاس حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے ان

سے عہد لیا کہ اگر آپ کو مدینہ آنا پڑے تو یہ لوگ پوری امداد دیں گے اور حفاظت کریں گے"۔

حریت خیال اور آزادی تبلیغ میں جب مزاحمت ہوئی تو اس کی شدت کے باعث آنحضرت صلعم ترک وطن پر مجبور ہوئے اور بظاہر یہ واقعہ حکومت کے قیام کی تحریک کا پہلا باعث ہوگا یعنی دشمنوں کو شکست دے کر فاتحانہ وطن کو لوٹنا ہر ایسے جبری تارک وطن کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ غرض جو بھی ہو مکۂ معظمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ میں قیام اختیار کیا گیا جہاں کے [illegible] تھے۔ اور جن سے مدد کا معاہدہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کو وطن [illegible]
ایک اعلان جنگ تھا۔ اس پر مستزاد انھوں نے اسلا [illegible]
حالات سے ثابت ہوتا ہے۔

آپ کی مخالفت جو اہل مکہ کر رہے تھے اس میں بنو امیہ پیش پیش تھے کیونکہ عبد مناف کی زندگی میں ان کے فرزند اکبر عبد شمس کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے فرزند اصغر اور ان کے بعد ان کی اولاد نے سرداری حاصل کی۔ لیکن عبد شمس کی اولاد کا دعویٰ باقی رہا۔ اور ہاشم کو ان کا جھگڑا عبد مناف کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا آخر عبد المطلب اور ابو طالب کی وفات پر بنو امیہ نے مکمل اقتدار حاصل کر لیا۔ اب آنحضرت صلعم کی اطاعت گویا دوبارہ بنو امیہ کے لئے بنو ہاشم کی اطاعت پر مجبور ہونا تھا۔ چونکہ بنو امیہ اب قریش کے سردار تھے اس لئے ان کا مخالفت پر تلنا گویا پورے اہل مکہ کا تلنا تھا۔

عبد مناف
عبد شمس — ہاشم
امیہ — عبد المطلب
ابو سفیان — ابو طالب
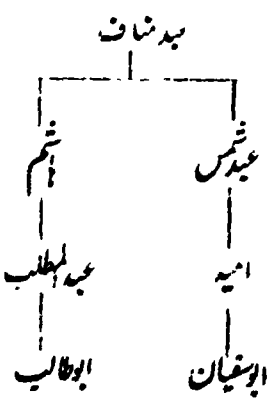
آنحضرت صلعم نے مدینہ منورہ آتے ہی اس بات کی کوشش کی کہ اپنے تمام ساتھیوں میں اتحاد و اتفاق کی روح کو ترقی دیں۔ اس سے پہلے عربی قبائل میں باہم جنگ رہا کرتی تھی خصوصاً اہل مکہ تو سب کو حقیر سمجھتے تھے لیکن آنحضرت صلعم نے یہ انتظام فرمایا کہ تمام اہل مکہ کا جو مدینہ منورہ ترک وطن

کو سکھائے تھے مسلمانان مدینہ کے ساتھ بھائی چارہ (عقد مواخات) کرا دیا۔" یہ فقط برائے نام نہ تھا۔ یہ
کارروائی اس جوش و خروش سے قبول کی گئی کہ اہل مدینہ نے اہل مکہ کو ہر چیز میں اپنا شریک بنا لیا
اپنی دولت کا آدھا حصہ انہیں دے دیا۔ ان میں سے کوئی مرتا تو اس کا ساتھی وارث بھی ہوتا۔"

اس سے متعدد فائدے ہوئے۔ بے گھر و بے بس اہل مکہ مدینہ میں بس گئے۔ قبائلی تعصب اور
علیحدگیوں کا ایک قلم خاتمہ ہو گیا اور تمام مسلمانوں میں بلا امتیاز رنگ و زبان اخوت اور امداد باہمی کی
حقیقی روح کام کرنے لگی۔

لیکن پھر بھی جو بے اطمینانی اور خوف و دہشت پھیلی ہوئی تھی اس کا کسی قدر اندازہ اس سے
ہو سکتا ہے کہ مسلمان مسلح سر بکف رہتے تھے۔

غرض آنحضرت صلعم نے اپنی تمام موجودہ قوتوں کو نہ صرف ایک مرکز کے تحت قائم کر لیا بلکہ ان میں
اعلیٰ درجے کا ضبط (ڈسپلن) اور مل کر کام کرنے اور ابھرنے کا غیر مختتم جوش بھی پیدا کر دیا۔ عرب یوں
بھی ایک جنگجو قوم تھی۔ اب ان کی قابلیتوں کو ابھار کر ان سے بہتر فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی آس پاس کی اجنبی قوتوں سے (یعنی یہودی و دیگر عرب قبائل سے) معاہدے
کرنے شروع کر دئے۔" ان معاہدوں کا مقصد یہ تھا کہ قریش کے منصوبوں کے خلاف حلیف پیدا کر کے
قومی حفاظت کا مقصد حاصل کیا جائے۔ چنانچہ یہودیوں کے معاہدے کا متن یہ تھا:۔

"(۱) خون بہا اور فدیہ کا جو طریقہ پہلے سے قائم چلا آتا ہے اب بھی قائم رہے گا۔
(۲) یہود کو مذہبی آزادی حاصل رہے گی اور ان کے مذہبی امور سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔
(۳) یہود اور مسلمان باہم دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
(۴) یہود یا مسلمان کو کسی سے لڑائی پیش آئے گی تو ایک فریق دوسرے کی مدد کریگا۔
(۵) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا (شبلی نے امداد کی جگہ امان لکھا ہے)
(۶) مدینہ پر کوئی حملہ ہوگا تو دونوں فریق شریک یکدگر ہوں گے
(۷) کسی دشمن سے اگر ایک فریق صلح کرے گا تو دوسرا بھی شریک صلح ہوگا لیکن مذہبی لڑائی

اس سے ... ہوگی"[1]

بنی ضمرہ کے معاہدے کے یہ الفاظ تھے:۔

"یہ محمد رسول اللہ (صلعم) کی تحریر ہے بنو ضمرہ کے لئے ان لوگوں کا جان اور مال محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص ان پر حملہ کرے گا اس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی۔ بجز [illegible] صورت کے کہ یہ لوگ مذہب کے مقابلے میں لڑیں اور پیغمبر (صلعم) ان کو مدد کے لئے بلائیں گے تو [illegible]

اسی زمانے میں عیدِ رمضان کے دن فطرہ [illegible]

ان انتظامات کے ساتھ آنحضرت صلعم کا [illegible]

اور روز بروز حلقہ بگوشوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا

ان کے ہاتھ سے صحیح و سلامت نکل گئے تھے اور اس سے [illegible]

کسی نہ کسی دن مکہ معظمہ پر حملے کا باعث ہوگی۔ اس لئے سرداران قریش مخالفت کا [illegible] ان لوگوں سے [illegible] بھی کوئی غفلت نہیں برتی گئی تجسس اور خبر رسانی کا کافی انتظام قائم کیا گیا۔ پتہ چلا کہ مکے والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام جا رہا ہے جس کے سردار طے کر چکے تھے کہ جملہ منافع "خلاف مسلمانان مہم" کی سربراہی کے لئے مخصوص کر دیا جائے گا۔ دستہ کافی تھی اس کو روکنے کی کوشش کی گئی مگر اسلامی دستہ دیر سے پہنچا۔ اس سے مکے اور مدینہ کے سیاسی تعلقات کی فضا اور بھی مکدر ہوگئی۔ وہ ایک چھوٹی مقامی جھڑپیں رہیں مگر آنحضرت صلعم جنگ کو برابر ٹالتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر جب مسلمانوں کے ایک خبر رساں دستے نے لوٹ مار کی اور دو ایک آدمیوں کو مار ڈالا تو آنحضرت صلعم ناراض ہوئے۔"[2]

آخر جب شام سے قریش کا مذکورۂ بالا تجارتی قافلہ واپس ہونے لگا (جس کا نفع مسلمانوں کے خلاف مہم کی تیاریوں میں صرف کیا جانے والا تھا) تو خطرے کے احساس سے آنحضرت صلعم مدینہ منورہ سے چل پڑے اور چاہا کہ اسے روک لیں۔ قافلے کی مدد کو مکے سے کمک پہنچ گئی۔ قافلہ راستہ کترا کر نکل گیا لیکن اس کی مدد کے لئے جو فوج آئی تھی اس کی آنحضرت صلعم کے ہمراہیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی باوجود ایک اور تین کے تناسب کے اعلیٰ ترحربی انتظام اور فوجی ضبط کے باعث آنحضرت صلعم کو شاندار

فتح ہوئی (۱۲) اہل مکہ شکست کا بدلہ لینے کے لئے بے چین ہو گئے۔ جلدی ہی وہ مدینۂ منورہ پر چڑھ دوڑے وہاں بھی خبر لگ گئی تھی اور گو اس مقابلے میں مسلمانوں کو شکست ہوئی (۱۳) لیکن مکے والے اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور ان کے لئے فتح شکست برابر رہی۔

اس عرصے میں حلیف یہودیوں کی بدعہدی ناقابل برداشت ہو گئی اور ان کی اچھی طرح سرکوبی کی گئی (۱۴) مگر اس کے بعد ایک خطرناک ترین دور شروع ہوا۔ شکست خوردہ یہودیوں نے قریش کے ساتھ اتحاد کر لیا اور ایک انتہائی آخری کوشش مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لئے شروع ہوئی۔ اس واقعہ کو جنگ احزاب یا جنگ خندق کہتے ہیں۔ اس کی شدت کا خود قرآن شاہد ہے (۱۵)۔ مگر آپ کی بھی برتر فوجی قابلیت اور سیاست دانی سے حریفوں کو محاصرہ اٹھا کر واپسی پر مجبور کر دیا گیا (۱۶) اور مدینہ منورہ سے غدار یہودی عنصر کو بھی اس کے بعد ہی خارج کر دیا گیا (۱۷)۔

مگر یہودیوں کا غرور اور ان کی قوت پوری طرح نہ ٹوٹی تھی اور وہ خیبر کی نو آبادی میں آمادۂ جنگ ہو رہے تھے۔ اس لئے ایک طرف تو ان کی قوت کا قطعی طور پر استیصال کر دیا گیا (۱۸) اور دوسری طرف "صلح حدیبیہ" میں قریش سے ایک معاہدۂ امن ہو گیا (۱۹)۔ لیکن چند روز میں ادھر سے بدعہدی ہوئی تو ادھر سے ایک لشکر جرار نے جا کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا — ظالم مگر بے بس حریفوں کو عام معافی دے دی گئی اور یہ آنحضرت صلعم کی تعلیم کا اثر تھا کہ فاتح لشکر نے (جسے کبھی دیس سے نکلنا اور انتہائی تکالیف و آلام کو برداشت کرنا پڑا تھا) اپنے سابقہ دشمنوں کے قصوروں کو یک لخت نسیاً منسیاً کر دیا (۲۰)۔ اس کی نظیر سے ہمارے علم میں تاریخ عالم تہی مایہ ہے۔

مکہ معظمہ کی فتح حکومت عرب کے بنیادی استحکام کا آخری مرحلہ تھا۔ اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں طوعاً و کرہاً (۲۱) سب عربوں کو مرکزی حکومت کا فرماں بردار بننا پڑا۔ ہر طرف سے اطاعت کے وفود آنے لگے اور مرکزی حکومت کی جانب سے ہر جگہ ٹیکس یا مالگزاری (زکوٰۃ) وصول کرنے والے اور مذہبی و سیاسی فرائض انجام دینے والے افسر مقرر کئے جانے لگے (۲۲)۔ اور آپ کے تدبر و انتظام کا نتیجہ تھا کہ عرب جیسے ملک میں ہر طرف امن و امان کا دور دورہ ہو گیا۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت صلعم کا اقتدار جزیرۂ عرب پر پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے صلح حدیبیہ کے دوران میں اپنی عالمگیر تعلیم سے دنیا کو مستفید کرنے کے لئے آپ نے سفارتیں روانہ فرمائیں۔[۱۱] اور بین الاقوامی (یا صحیح تر اصطلاح میں بین الممالک) تعلقات کی بنا پڑی۔

اجنبی استعمار پر حملہ | عربی سلطنت پر اب اجنبی استعمار کی نظریں پڑنے لگیں۔ یہ تصادم ناگزیر تھا۔ اس کی نمایاں صورت جنگ تبوک و موتہ میں ظاہر ہوتی ہے جس کے ذریعے عرب کی آزادہ سیاست معین ہو گئی۔

اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت صلعم کی وفات کے وقت اور ایک دستۂ ہم کشورکشائی کے لئے فلسطین روانہ ہونے ہی کو تھی[۱۲]

حقوق بشریت کا منشور اعظم | حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت ... اہم درجہ رکھتے ہیں۔ ان میں تفصیل سے رعایا کے حقوق ... تاریخ ذہبی، ابن ہشام وغیرہ میں ملے گی۔ مختصراً تمام جاہلیت ... ہیں عرب کو عجم پر، عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ فقط پرہیزگاری وجہ کرامت ہے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہو۔ غلاموں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاؤ، وہی پہناؤ جو خود پہنو۔ موروثی جاہلانہ انتقام باطل ہیں۔ جاہلیت کے سود لغو ہیں۔ عورتوں سے برتاؤ میں خدا سے ڈرو۔ تمھارا ان (عورتوں) پر، ان کا تم پر حق ہے۔ ہر شخص کا جان و مال و آبرو محفوظ ہے۔ ضابطۂ قرآنی کو ملحوظ رکھ کر گمراہ نہ ہوگے۔ حقوق ترکہ ذیراث متعین ہو گئے وارث کے لئے (مزید) وصیت نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے زانی کے لئے پتھر ہیں۔ جو بچہ اپنے باپ کے سوا غیر اور جو غلام اپنے مالک کے سوا دوسرے کا ہونے کا دعویٰ کرے اس پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت اپنے شوہر کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ نہ دے۔ قرض ادا کیا جائے عاریت واپس کی جائے۔ عطیے کا بدلہ دیا جائے۔ ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے۔ باہمی خونریزی نہ کرو۔ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے۔ بیٹا باپ کا، باپ بیٹے کا جوابدہ نہیں۔ اپنے امیر کی اطاعت کرو چاہے وہ نکٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ خدا کی عبادت کرو۔ پانچ وقت نماز پڑھو۔ مہینہ بھر کے روزے

رکھو۔ میرے احکام کی اطاعت کرو جنت میں جاؤ گے
اسی زمانے میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی "آج تمہارا دین کمل ہو گیا"

(باقی)

حوالے

---

(۱) شبلی سیرۃ النبی جلد اول Das Leban Muhammed Noldke
سدیو کی (فرنچ) تاریخ عرب باب ۸ -
(۲) ابن ہشام نیز صبح الاعشیٰ قلقشندی
(۳) عرب اور ایران کی مشہور جنگ جو عین زمانۂ ولادت نبوی میں "ذی وقار" نامی چشمے کے کنارے ہوئی اور جس میں عرب کامیاب رہے دیکھئے سدیو۔ Sedillot کی کتاب
Historie generale des Arabes, leur Empire, leur civilisation
اور ایام عرب مؤلفہ شرر وغیرہ
(۴) شبلی وغیرہ
(۵) عرب قبل اسلام، شام، ہند، چین وغیرہ سے تجارت کرتے تھے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے تمدن عرب مترجمہ سید علی بلگرامی، اور مضمون حکیم شمس اللہ قادری "تجارت العرب قبل الاسلام" رسالہ دبدبۂ آصفی بابتہ رجب و شعبان ۱۳۲۳ھ
(۶) قرآن مجید : لِتَکُونَ کَلِمَۃُ اللہِ ہِیَ العُلیا۔
(۷) ابن ہشام۔
(۸) حدیث : بُعِثتُ لِاُتَمِّمَ مَکارِمَ الاَخلاقِ۔

(۹) قرآن مجید: اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۤءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا الخ۔

(۱۰) ابن ہشام

(۱۱) تفسیر بیان القرآن از محمد علی آیت: واولوا الارحام بعضہم اولی ببعض الخ۔

(۱۲) تحیلی صفوا سنہ میں یہودیوں سے اور سنہ میں بنی ضمرہ و بنی مدلج وغیرہ سے معاہدے ہوئے۔

(۱۳) ابن ہشام۔

(۱۴) قرآن مجید: اذ جاؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا: ہنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالاً شدیداً"

(۱۵) اشارہ ہجرت شکنی کی مہموں اور جنگ حنین وغیرہ کی طرف۔

(۱۶) فوائد بدریہ از قاضی الملک بدر الدولہ۔ شبلی وغیرہ۔

امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم

گیارہ سال سمرقند میں عبدالرحمٰن خاں کا روسی اور برطانوی سیاست کا مطالعہ کرنا

اگر ہم عبدالرحمٰن خاں کی زندگی پر ہم ایک عمیق نظر ڈالیں تو بالکل صاف معلوم ہوگا کہ روسی ترکستان کے قیام نے عبدالرحمٰن خاں کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا اور اسی گیارہ سال کے عرصے میں عبدالرحمٰن خاں نے خاص طور پر روسی اور انگریزی سیاست کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا۔ عبدالرحمٰن کی سوانح حیات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص نے کس قدر عمیق نظر سے اپنے دونوں ہمسایوں یعنی برطانیہ اور روس کی سیاست کا گہرا مطالعہ کیا، وہ دونوں قوموں کی ہر سیاسی چال کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ اپنی تزک کی دوسری جلد میں " روس انگلستان وافغانستان " کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہیں :-

"جو کچھ اس باب میں بیان کروں گا وہ میری تمام زندگی کے تجربے کا نتیجہ ہے اور زندگی بھی کیسی جو مشکلات وترددات، عجیب وغریب واقعات، سیاحی اور مختلف اقسام کی ذمہ داریوں سے پر رہی ہے، ایام طفولیت سے ۱۸۸۰ء تک میری زندگی کے تقریباً چالیس سال روس میں، سرحد روس پر یا روسی چینی وایرانی وروسی سرحد کے قریب سفر میں بسر ہوئے اور ۱۸۸۰ء سے اس وقت تک میں نے اپنا تمام وقت ان دو مضبوط ہمسایوں انگلستان اور روس کی پالیسی اور خواص کے سمجھنے اور پہچاننے میں صرف کیا ہے"

ایک دوسری جگہ پر عبدالرحمٰن خاں اپنی خود نوشت سوانح حیات میں برطانوی اور روسی تعلقات کو اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"مجھے معلوم ہے کہ اس صدی میں یہ قاعدہ ہو گیا ہے کہ بڑی طاقتیں چھوٹے ملکوں کو ہضم کرتی جاتی ہیں اور کمزور ملکوں کے لینے کے لئے مختلف طریقے اور تدبیریں اختیار کی جاتی

ہیں مثلاً پہلا طریقہ یہ ہے کہ کمزور حکومتوں کو آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں اور ہر زبردست غاصب
کو اس سے حصہ ملتا ہے، جو انصاف کہ یہ زبردست سلطنتیں ناتوان قوموں کے ساتھ کرتی
ہیں اس سے مجھے ایک غریب شخص کا قصہ یاد آیا جس کی گھڑی ایک چور نے لی تھی۔ وہ
بیچارہ چوروں کے ایک سردار کے پاس جو کہ اپنے تئیں مجسٹریٹ کہتا تھا گیا اور داد رسی
چاہی۔ مجسٹریٹ نے کہا "میں تمہاری گھڑی واپس نہیں دلا سکتا۔ لیکن یہ بتاؤ کہ میرا
حصہ کہاں ہے مجھے کیا دوگے؟" اس مظلوم نے ... کی اور ... میں
اور کچھ دینے کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ جو چیز جاتی رہی ...
نے جواب دیا "لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ تم اپنی گھڑی ...
میں اپنے حصے سے محروم رہوں" یہ کہہ کر اس نے ...
کی۔ اس لئے وہ بیچارہ حاکم اعلیٰ کے پاس گیا جس نے ...
اس نے خیال کیا کہ اگر اب حاکم بالا کے پاس جاؤں گا تو اس کے حصے کے لئے ... تو کچھ باقی
نہیں ہے یہ دستار اور پوشاک جو پہنے ہوئے ہوں یہ بھی کھو بیٹھوں گا اور تن پر کپڑا نہ رہے
گا۔ اس لئے وہ شخص صبر کر کے مکان چلا گیا۔ مجھے یقین ہے اگر ناظرین اس قصے
واقعاتِ چین کا مقابلہ کریں گے تو انھیں معلوم ہوگا کہ میں بہت زیادہ غلطی پر نہیں ہوں۔
دوسرا ڈھنگ یہ ہے کہ دول عظام آپس میں خفیہ سازشیں اور اتفاق کر لیتی ہیں جسے
وہ تدبر و پالیسی کے نام سے پکارتی ہیں اور اس طرح باہم تصفیہ ہو جاتا ہے، کہ اگر تم فلاں
ملک لوگے تو ہم اس کے مقابلے میں فلاں حصہ لیں گے اور ایک دوسرے کے معاملات
میں دخل نہ دیں گے"

اس واقعے کے ثبوت میں عبدالرحمٰن خاں نے آگے چل کر روس اور انگلستان کی پیش قدمی کے
واقعات پیش کئے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"اسی انداز سے گورنمنٹ روس نے اولاً حکومت بخارا اور ان صوبجات کو جو کہ سرحد افغانستان

پر دریائے جیحون کے شمال و مغرب میں واقع ہیں اپنے اثر و حفاظت میں لیا اور آخر ش
انہیں ہضم کر لیا دوسری جانب گورنمنٹ ہند نے اُن تمام صوبجات پر جو کہ جنوب و مشرق اور
جنوب و مغرب میں واقع ہیں اور زمانہ قدیم سے حکومت افغانستان کے تھے اپنا
اثر جما لیا۔

غرض کہ قیام سمرقند میں عبدالرحمٰن خاں نے برطانوی اور روسی سیاست کا نہایت عمیق مطالعہ کیا اور
آئندہ چل کر عبدالرحمٰن خاں اپنے عہد حکومت میں انگلستان اور روس کے ساتھ ہر بات میں سوچ سوچ کر
معاملہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان دونوں حکومتوں کے مرض جوع الارضی کو وہ اچھی طرح جانتے تھے اور اُن کی
اغراض شہنشاہیت سے واقف تھے۔

عبدالرحمٰن خاں کی مراجعت کابل | دوسری برطانوی افغانی جنگ میں شیر علی خاں کابل سے بھاگ کر روسی
سرحد پر روسی امداد کا منتظر تھا۔ اسی انتظار میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد یعقوب خاں پسر شیر علی
خاں نے دب کر انگریزوں سے صلح کر لی لیکن باشندگان افغانستان انگریزوں سے راضی نہ تھے انھوں نے
انگریزی سفیر کو مع عملے کے قتل کر کے سفارت خانے کو لوٹ لیا اور یعقوب خاں نے اپنی مجبوری ظاہر کر کے
اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا یہ تمام واقعات روسی اخبارات کے ذریعے امیر عبدالرحمٰن خاں
کے کانوں تک پہنچے اور بعض روسی اخبارات نے اپنے مقالات افتتاحیہ میں عبدالرحمٰن کی توجہ واقعات
افغانستان کی طرف مبذول کرائی اور نہایت واضح الفاظ میں لکھا کہ عبدالرحمٰن خاں کو چاہئے کہ موقع کو
غنیمت سمجھ کر تخت کابل کے لئے قسمت آزمائی کریں۔ علاوہ ازیں روسی مدبرین نے عبدالرحمٰن خاں کو
ترغیب دی کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

غرض کہ تین دن سوچنے کے بعد عبدالرحمٰن خاں نے افغانستان لوٹنے کی تیاریاں کیں۔ اور خدا
پر توکل کر کے روس سے افغانستان کو روانہ ہوئے۔ روسی گورنمنٹ نے عبدالرحمٰن کو پچیس ہزار نقد اور
دو سو بندوقیں دیں، اُن کے پاس دو لاکھ روپئے کی رقم پہلے سے موجود تھی جو انھوں نے کفایت شعاری
سے اپنے وظیفے میں سے جمع کی تھی۔ جب عبدالرحمٰن خاں حدود افغانستان میں داخل ہوئے تو تمام افغانی سردار

عبدالرحمٰن خاں کے جھنڈے کے تلے جمع ہو گئے۔ اب عبدالرحمٰن خاں نے افغانی ترکستان اور بدخشاں پر قبضہ کر لیا۔

۱۴ مارچ ۱۸۸۰ء کو لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے وزیر ہند کو اس مضمون کا ایک تار دیا کہ "عبدالرحمٰن خاں جو دوست محمد خاں کا پوتا ہے اور افغانستان کا جائز وارث ہے اس کو افغانستان کا بادشاہ بنایا جائے کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی شخص نظر نہیں آتا جو حکومت کابل کو سنبھال سکے"

چنانچہ لارڈ لٹن نے سرلیپل گریفن سفیر کابل کو ہدایات بھیجیں کہ عبدالرحمٰن خاں سے خط و کتابت کر کے اس کا مافی الضمیر معلوم کرو۔ ان ہدایات کے مطابق سرلیپل گریفن نے عبدالرحمٰن خاں کو ایک خط [illegible] کیا جس کا مضمون یہ تھا۔

"اب یہ ہر ایک کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ افغانستان
لئے خفیہ قاصد کے ہاتھ یہ خط آپ کو بھیجا جاتا ہے تاکہ
سے آگاہ کریں"

سرلیپل گریفن کا قاصد عبدالرحمٰن خاں کا جواب لے کر واپس آیا اور تمام کیفیت عبدالرحمٰن خاں کی برطانوی سفیر کو بتائی۔ اب برطانوی سفیر نے عبدالرحمٰن خاں کو ایک اور تاکیدی خط لکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ "جلد سے جلد آ کر تخت کابل سنبھالو" اس کے جواب میں عبدالرحمٰن خاں نے برطانوی سفیر سے مندرجہ ذیل سوالات دریافت کئے۔

۱۔ افغانی عملداری کے حدود کیا ہوں گے؟

۲۔ قندھار بھی افغانی حکومت میں شامل کیا جائے گا یا نہیں؟

۳۔ کیا کوئی یورپین سفیر یا انگریزی فوج افغانستان میں رہے گی؟

۴۔ کیا سلطنت برطانیہ کے کسی دشمن کی مدافعت اور اس سے مقابلہ کرنے کی حکومت کابل سے امید کی جائے گی؟

۵۔ سلطنت برطانیہ شاہ افغانستان اور اس کے وطن کو کیا کیا فائدہ پہنچانے کا وعدہ کرتی ہے؟

۶۔ ان فوائد کی عوض حکومت برطانیہ شاہ افغانستان سے کیا چاہتی ہے !
سر گریفن نے عبدالرحمن کے سوالات کا جو جواب لکھا تھا وہ یہ تھا۔

"چونکہ برٹش گورنمنٹ کے نزدیک بیرونی سلطنتوں کو حق نہیں ہے کہ افغانستان میں مداخلت کریں مزید برآں روس و ایران نے اقرار کیا ہے کہ افغانستان کے معاملات میں ہر قسم کی سیاسی دست اندازی سے باز رہیں گے اس لئے ظاہر ہے کہ فرمانروائے کابل سوائے انگریزوں کے اور کسی طاقت سے سیاسی تعلقات نہیں رکھ سکتا ہے۔

باقی افغانی حکومت کے حدود کے متعلق مجھے یہ کہنے کہ ہدایت ہوئی ہے کہ کل صوبہ قندھار ایک علٰحدہ حاکم کے ماتحت کیا گیا ہے ہرات اور بقیہ افغانستان پر آپ اپنی دستی سلطنت قائم کر سکتے ہیں حکومت برطانیہ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کرے گی۔

حکومت برطانیہ اور حکومت افغانستان دونوں ملحق سلطنتوں میں معمولی اور دوستانہ ربط وضبط کی آسانی کے لئے دونوں حکومتوں کے اتفاق سے ایک مسلمان ایجنٹ کا سلطنت برطانیہ کی طرف سے کابل میں رہنا مناسب سمجھا جائے گا۔

۲۲ر جون ۱۸۸۰ء کو عبدالرحمن خاں نے سر لیپل گریفن کو ایک مختصر جواب تحریر کیا۔ اس میں صاف اور واضح الفاظ میں قندھار کی علٰحدگی پر نارضگی ظاہر کی۔ اس کے بعد عبدالرحمن خاں نے کابل کی طرف پیش قدمی کی اور چارہ کار میں داخل ہوا عبدالرحمن خاں کی کثیر التعداد فوج دیکھ کر انگریز پریشان ہوئے اور کابل میں ایک دربار منعقد کر کے تخت کابل عبدالرحمن خاں کے سپرد کیا اور اس موقع پر سر لیپل گریفن نے مندرجۂ ذیل تقریر کی۔

چونکہ واقعات کی رفتار سے سردار عبدالرحمن خاں کے لئے ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے جو گورنمنٹ کی خواہشات اور امیدوں کے مطابق ہے اس لئے گورنمنٹ برطانیہ اور وائسرائے ہند خوشی سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے سردار عبدالرحمن خاں نبیرۂ امیر دوست محمد خاں والا مرتبت کو امیر کابل تسلیم کیا۔ گورنمنٹ کے لئے یہ ایک بڑا خوشی اور اطمینان

کا موقع ہے کہ تمام سرداروں قبیلوں نے خاندان بارکزئی کے ایک ایسے نامور رکن کو پسند کیا جو مشہور سپاہی اور دانا تجربہ کار شخص ہے ان کے خیالات حکومت برطانیہ کی طرف نہایت ہی دوستانہ ہیں اور جب تک کہ اُن کی حکومت سے یہ ظاہر ہوتا رہیگا کہ اس قسم کے خیالات ان کے دل میں جاگزیں ہیں حکومت برطانیہ ان کی ضرور امداد کریگی"

۲۹ جولائی ۱۸۸۰ء کو وائسرائے ہند کا برطانوی فوجی افسروں کو کابل میں ایک [illegible] مضمون [illegible] کہ انگریزی فوج نے بمقام میوند ایوب خاں سے شکست کھائی ہے اس [illegible]

معرکے کے بعد عبدالرحمن اور سرلیپل گریفن کی باقاعدہ کانفرس ہوئی [illegible]

سے حکومت برطانیہ کی باضابطہ تحریری دستاویز مانگی [illegible]

تسلیم کرتی ہے چنانچہ چند روز بعد سرلیپل گریفن نے وائسرائے [illegible]

وائسرائے اور گورنر جنرل باجلاس کونسل کو یہ سن کر خوشی ہوئی [illegible] برطانیہ [illegible]

پر آپ کابل کی طرف روانہ ہوئے اس لئے آپ کے دوستانہ خیالات اور ان فوائد کا لحاظ کر کے جو آپ کو مستقل سلطنت قائم ہونے سے سرداروں اور رعایا کو حاصل ہوں گے۔ حکومت برطانیہ آپ کو امیر کابل تسلیم کرتی ہے۔

غرضکہ چند روز کے بعد عبدالرحمن خاں نے انگریزی فوجوں کی واپسی کا مکمل انتظام کر دیا۔ اور فوجی افسروں کو رخصت کیا۔

عبدالرحمن خاں کی تخت نشینی کے وقت افغانستان کی حالت

عبدالرحمن خاں جس وقت تخت کابل پر بیٹھے اس وقت افغانستان کی حالت ہر پہلو سے گری ہوئی تھی ایک طرف دعویداران حکومت کی کثرت تھی، دوسری طرف فوج کی حالت بہت ہی بُری تھی، تیسری طرف خزانہ خالی تھا اس پر مستزاد یہ کہ تمام افغانستان ملاؤں اور سیدوں کے اشاروں پر چلتا تھا، یا بالفاظ دیگر تمام افغانستان پر ملاؤں اور سیدوں کی حکومت تھی، ان حالات میں عبدالرحمن خاں کو تخت کابل پیش کیا گیا تھا۔ عبدالرحمن خاں اپنی تزک میں ان دشواریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

۔ لوگوں کو خیال ہوگا کہ جس روز سے میں نے تخت پر قدم رکھا اسی دن سے میرے آرام و خوشی کا دور شروع ہوا لیکن یہ صحیح نہیں، برخلاف اس کے اسی دم سے میری آزادی رخصت ہوئی اور دقت و دشواری و تردد و تفکرات اور رنج و الم میں زیادتی ہو گئی۔ ناظرین کو معلوم ہے کہ اپنے والد اور چچا امیر اعظم کے زمانۂ حکومت میں بھی میں معاملات حکومت میں دخیل تھا اور ان میں حصہ لیتا تھا لیکن تمام ذمہ داری ان کے سر تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جتنی انسان ترقی کرتا ہے۔ اتنی ہی ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور تفکرات زیادہ ہوتے ہیں۔ ہمارا مذہب سکھاتا ہے کہ روز قیامت خداوند کریم کے روبرو ہر شخص اپنے افعال کا ذمہ دار ہوگا، لیکن بادشاہ صرف اپنے ہی افعال کے ذمہ دار نہ ہوں گے، وہ اپنی رعایا کے امن و آسائش کے بھی جواب دہ ہوں گے، جیسے کہ خداوند تعالیٰ نے ان کے سپرد کیا ہے یہ سوچ کر کہ قیامت کے دن اپنی رعایا کی حفظ و امان کے لئے جوابدہ ہونا پڑیگا اور یہ خیال کر کے کہ میرے ملک کی حالت کس قدر ابتر تھی میں نہایت افسردہ و غمگین ہوا۔

تمام واقعات اور ملک کی حالت دیکھکر مجھے خیال ہوتا تھا کہ تمام انتظام درست کرنا اور ترقی کرنا صرف مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اور اس کا تو خواب و خیال نہ تھا کہ اس رحمن الرحیم کی امداد سے افغانستان میری حکومت کے زمانے میں اتنے تھوڑے عرصے میں ایسی عجیب غریب ترقی کریگا جیسی کہ اس نے اب کی ہے .... میں نے ہمت نہ ہاری اور اس وعدے پر بھروسہ کیا جو کہ خدا اپنے کلام پاک میں اپنے رسول سے فرماتا ہے۔ والصابرین فی الباسا و الضرا و حین الباس اولئک الذین صدقوا و اولئک هم المتقون۔ غرضکہ اگر میں اس مصیبت اور بدبختی کا ذکر کروں جو ملک پر طاری تھی تو اس کے بیان کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ اس لئے صرف اختصار کے ساتھ بیان کروں گا۔ کہ میری تخت نشینی کے وقت ملک کی کیا حالت تھی۔

اس کے بعد عبدالرحمن خاں نے اپنی تزک میں سلسلہ وار ان تمام خرابیوں کا ذکر کیا ہے کہ جنکا تخت نشینی

سے کے وقت ان کو مقابلہ کرنا پڑا۔

۱۔شاہی عمارات اور دفاتر حکومت کا نہ ہونا۔

۲۔سرکاری خزانے کا خالی ہونا۔

۳۔اسلحہ و سامانِ حرب کا فقدان۔

۴۔طوائف الملوکی۔یعنی ہرات میں ایوب خاں کی حکومت تھی اور قندھار پر شیر علی خاں نامی ایک سردار قابض تھا۔

۵۔عوام الناس کے دلوں میں بادشاہ کی عزت ... دستور کے مطابق ہر شخص شاہ کے سامنے عرض و معروض ... درخواست کرنے والا شاہ کی ڈاڑھی اور دستار پکڑ لیتا تھا ... کی قسم جیسی فریاد سنو۔

۶۔امراء اور درباری تہذیب و آدابِ مجلس سے بالکل عاری تھے۔جب کسی جشن کے موقع پر شیرینی دربار میں تقسیم ہونے کیلئے آئی تو سب درباری اس پر ٹوٹ پڑتے تھے۔اور اس چھینا جھپٹی میں بعض لوگوں کے کپڑے بھی پھٹ جاتے تھے۔

۷۔جہالت تمام ملک میں چھائی ہوئی تھی امور سلطنت میں مفید مشورہ دینے والے مشیروں کا فقدان تھا بعض وقت مشیرانِ حکومت کا مشورہ مضحکہ انگیز ہوتا تھا۔عبدالرحمٰن خاں اپنی تزک میں ایک جگہ اپنے صلاح کاروں کا ایک مشورہ نمونے کے طور پر لکھ کر دکھاتے ہیں۔

"ایک مرتبہ روٹی و غلہ بازار میں نہایت گراں فروخت ہونے لگا اور قحط کا خوف پیدا ہوا میرے مشیر کاروں نے جن سے کہ میں نے اس وقت رائے لی نہایت زور سے صلاح دی کہ غلہ فروشوں کے کان ان کی دکانوں کے دروازوں پر کیلوں سے جڑ دئے جائیں وہ ڈر کر ضرور غلہ کا نرخ ارزاں کر دیں گے۔اس روز سے آج تک میں نے کسی معاملہ میں ان مشیروں سے مشورہ نہیں لیا ہے۔

۸۔ ہمسایہ سلطنتوں کی طرف سے بھی مجھے ہر وقت خطرہ رہتا تھا وہ اس لئے کہ سلطنتیں خود ہمسر
سرداران قبائل کو بغاوت پر آمادہ کرتی رہتی تھیں۔ غرضکہ مشکلات و تردوات کے موقع پر کسی ملک کی
محض حفاظت کرنا ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ چہ جائیکہ وہ ملک ترقی کرے لیکن میرے دور میں افغانستان
نے وہ ترقی کی ہے۔ جس کا مجھ کو خود خیال و گمان تک نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذمہ داری کے احساس نے
مجھے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ ایک طرف تو میں نہایت الحاح وزاری کے ساتھ خدا کی درگاہ میں دعا مانگتا
ہوں۔ اور دوسری طرف نہایت خلوص کے ساتھ امور سلطنت کی تدبیریں کرتا ہوں۔ خدا کا فضل تھا کہ
اس نے ملک کو تباہی سے محفوظ رکھا۔ ورنہ ملک تباہی کے اعلیٰ ترین اسباب صرف موجود ہی نہ تھے
بلکہ ترقی کے تمام ذریعے تنزل کی سب سے نیچی سطح پر پہونچ گئے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے وجود میں بھی شک تھا۔
لیکن قادر مطلق نے میری دردمندانہ دعاؤں کو سن لیا اور میں افغانستان میں امن وامان
قائم رکھنے میں کامیاب ہوا۔

حکومت افغانستان کی تنظیم

عبدالرحمن خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد ان مشکلات کے باوجود افغانستان
کی شاہراہ ترقی میں حائل تھیں سر توڑ کوششیں کر کے ملک کی حکومت کی از
سر نو تنظیم کی وہ اس طریقہ پر کہ تمام ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا۔ اور ہر صوبہ کو حکومتیٔ اعلائے کے نام
سے موسوم کیا۔ جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حکومتیٔ اعلائے سمت مشرقی
۲۔ حکومتیٔ اعلائے سمت جنوبی
۳۔ حکومتیٔ اعلائے سمت فراہ
۴۔ حکومتیٔ اعلائے سمت میمنہ

انتظامی سہولیت کے خیال سے عبدالرحمن خاں نے ان صوبوں کے علاوہ افغانستان کے بڑے
بڑے شہروں اور ان کے مضافات کا انتظام اس طرح سے کیا کہ ہر بڑے شہر کو مع اس کے ملحقات
کے ولایت کے نام سے موسوم کیا۔ اور چار حکومتیٔ اعلائے کے علاوہ پانچ ولائیتیں قائم کیں جن کے

نام یہ ہیں۔

۱۔ ولایت کابل

۲۔ ولایت قندھار

۳۔ ولایت ہرات

۴۔ ولایت بلخ

۵۔ ولایت قطغان

حکومتی اعلائے پر گورنر اور ولایتوں پر نائب گورنر مقرر
نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کئے ہر صوبہ میں از سر نو مندرجہ

۱۔ گورنر مع عملہ خود

۲۔ قاضی مع کوتوال و عملہ ضروری

۳۔ سپہ سالار افواج مع فوجی سکرٹری اور اراکین محکمہ پاسپورٹ

۴۔ قافلہ باشی یعنی وہ حاکم جو مسافروں کے بار برداری وغیرہ کے جانوروں کا انتظام کرتا ہے۔

۵۔ افسر مال جو تمام صوبہ کی مالیات کا منتظم ہوتا تھا۔

غرضکہ ان نئے انتظامات کے بعد عبدالرحمن خاں نے تمام سرداران قبائل اور عام رعایا کے نام احکام بھیجے جن میں ان لوگوں سے استدعا کی گئی کہ آپس میں محبت کا برتاؤ رکھیں اور امن وامان کے ساتھ رہیں۔ اور آخر میں عبدالرحمن خاں نے سرداران قبائل کو یقین دلایا کہ اگر یہ لوگ حکومت کے احکامات کی پوری پوری تعمیل کریں گے تو ان کو حکومت کی طرف سے انعام و اکرام دیا جائیگا۔

ان تمام انتظامات کے بعد عبدالرحمن خاں نے محکمہ مخبری "قائم کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام سرداران قبائل عمال حکومت اور شورش پسند ملاؤں اور پیروں کی روزانہ کارروائی سے مطلع رہے۔ یہ محکمہ اس قدر باقاعدہ اور منظم شکل میں تھا کہ عبدالرحمن کو ہر سردار اور ملا کی نقل و حرکت اور ارادوں سے مکمل واقفیت تھی۔

اور بیان ہو چکا ہے کہ عبدالرحمن خان کی تخت نشینی کے وقت حکومت کا خزانہ بالکل خالی تھا۔ اب عبدالرحمن خان نے محکمہ مال کی درستی کی طرف توجہ کی، وہ اس طریقے پر کہ سرکاری ٹکسال قائم کرکے افغانی سکہ ڈھلوایا۔ مزید برآں عبدالرحمن خاں نے اپنے اہل کاروں احکامات بھیجے کہ جس قدر ملک میں سونا چاندی ملے اس کو حکومت کے لئے خرید یں، اور جن لوگوں پر گذشتہ حکومت کا قرضہ ہے وہ وصول کریں، جب محکمہ مال کی اصلاح اس حد تک پہونچا دی کہ حکومت کا انتظام اچھی طرح چل سکے تو اس کے بعد عبدالرحمن خاں نے محکمہ فوج کی اصلاح کی۔ سب سے پہلے جبریہ فوجی خدمت کا دستور جو گذشتہ امیران کابل کے عہد میں جاری تھا، اس کو منسوخ کردیا۔ اب فوجی خدمت کے لئے صرف وہ آدمی لیا جانے لگا۔ جو اپنی مرضی سے یہ خدمت اختیار کرے، اور اس کے ساتھ اس چیز کا لحاظ کیا جانے لگا کہ آیا امیدوار جسمانی قویٰ کے اعتبار سے تنومند اور چست ہے کہ نہیں! پھر پرانی چھاؤنیوں کی اصلاح کرکے بعض اہم مقامات پر نئی چھاونیاں قائم کیں اور ان میں سپاہیوں کے لئے شفاخانے اور مدرسے قائم کئے۔

محکمہ فوج کی اصلاح کے بعد عبدالرحمن خاں نے ملک کی تمام سڑکیں درست کرائیں اور مسافروں کی حفاظت کے لئے محافظین مقرر کئے۔ تاکہ بلاخوف خطر لوگ سفر کرسکیں، الغرض ان نئے انتظامات کی وجہ سے ملک میں ایک اچھی فضا ہو گئی اور لوگ ایک حد تک امن وامان سے رہنے لگے۔ لیکن ابھی تک بعض قبائل اپنی شورش پسندی کو نہ چھوڑتے تھے، موقع پاکر بغاوت کر ڈالتے تھے۔

بغاوتیں اور ان کا استداد | عبدالرحمن خاں کے زمانے میں جو بغاوتیں ہوئیں ان میں سے بعض معمولی تھیں اور بعض بہت ہی خطرناک تھیں جو دو تین سال تک جاری رہیں ان بغاوتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ا۔ ۱۸۸۱ء میں جاہل ملاؤں نے قندھار کے عام لوگوں کو بہکایا اور مذہبی رنگ دے کر عبدالرحمن خاں کے خلاف بغاوت کرائی کیونکہ ملا لوگ سردار ایوب خاں کے حامی تھے اور ایوب خاں ہرات اور قندھار میں اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن باغی لوگوں کو سخت ناکامی ہوئی

۲۔ غلزئی بغاوت جو تقریباً دو سال تک جاری رہی۔
۳۔ ۱۸۸۸ء کی بغاوت جو محمد اسحٰق خاں والی ترکستان نے کی تھی۔
۴۔ ہزارہ جات کی بغاوت جو ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۳ء تک رہی

ان بغاوتوں کے اسباب و علل کیا تھے؟ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ پہلا سبب ملاؤں اور سردار ان قبائل کی مطلق [illegible]
آخر الذکر شہزادے تصور کرتے تھے۔ غلزئی ملا [illegible]
ہو گئے تھے۔

۲۔ عبدالرحمٰن خاں نے غلزئی باغیوں [illegible]
سے اس کے احباب حکومت سے ناخوش تھے۔

۳۔ ملا مشک عالم کی گرفتاری بھی بغاوتوں کی باعث بنی۔ یہ وہ شخص تھا جو لوگوں سے جبراً مال وصول کرتا تھا اس جرم میں عبدالرحمٰن خاں نے اس کو گرفتار کیا۔ جس کی وجہ سے اس کے پیروؤں نے علم بغاوت بلند کیا۔

۴۔ پیر اور ملا جو تقریباً حکومت کی آمدنی کا نصف وصول کرتے تھے۔ اب عبدالرحمٰن خاں نے ان کے وظائف بند کر دیے جس کی وجہ سے وہ لوگ مشتعل ہوئے اور انھوں نے عوام الناس کو بھڑکا دیا۔

لڑائیاں | جب عبدالرحمٰن خاں تخت نشین ہوا۔ اس وقت تمام ملک میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ وہ اپنی فوجی قابلیت سے اس طوائف الملوکی کو دور کر کے تمام افغانستان کو ایک جھنڈے کے ماتحت لایا۔ ان لڑائیوں میں حسب ذیل معرکے مشہور ہیں۔

۱۔ سردار ایوب خاں جو اپنے آپ کو ہرات اور اس کے مضافات کا حاکم خود مختار سمجھتا تھا۔ اور متعدد بار عبدالرحمٰن خاں کی فوجوں سے لڑا۔ آخر شکست کھا کر ایران میں جا کر پناہ گزیں ہوا اور وہاں سے اُسے انگریزوں نے لا کر ہندوستان میں بمقام راولپنڈی ٹھہرایا۔

۲- سید محمود باشندۂ علاقہ کنسر سے بھی عبدالرحمن خاں کو لڑنا پڑا کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو شاہی خاندان میں سے شمار کرتا تھا۔ اس نے علاقۂ کنسر میں اپنی حکومت کا اعلان کر دیا تھا۔ اور لوگوں کو عبدالرحمن خاں کے خلاف بھڑکا کر شاہی فوجوں پر حملہ کیا اور بُری طرح شکست کھائی۔ آخر ش مجبور ہو کر ہندوستان بھاگ آیا۔

۳- میر یوسف علی سردار روشن و شغنان نے روسیوں سے ساز باز شروع کیا۔ وہ خفیہ طور پر روسی گورنمنٹ سے معاملات طے کر کے اس کی ماتحتی میں جانا چاہتا تھا اس سلسلہ میں روسی سپاہیوں کی دعوت کی۔ جس میں یہ خیال ظاہر کیا۔ "کہ میں چاہتا ہوں کہ زیر سیادت حکومت روس رہوں" اس خفیہ سازش کی خبر مخبروں نے عبدالرحمن خاں کو دی۔ عبدالرحمانی فوجوں نے روشن شغنان پر حملہ کیا۔ تھوڑی سی لڑائی کے بعد یوسف علی خاں مع اپنے اہل وعیال کے گرفتار ہو کر کابل لایا گیا۔ عبدالرحمن خاں نے وہاں اپنا گورنر مقرر کر کے اس علاقہ کا تسلی بخش انتظام کیا۔

۴- شنواری قبائل جو جلال آباد کے قرب وجوار میں رہتے ہیں، اور جن کا پیشہ ہمیشہ سے قافلوں کی لوٹ مار تھا اور جو امیران کابل کے لئے ہمیشہ باعث تکلیف بنے رہے وہ علاقہ کے باشندوں کا مال ومتاع لوٹتے تھے۔ اور وہاں امن وامان کسی طرح قائم نہ ہوتا تھا۔ خود عبدالرحمن خاں نے شنواری سرداروں کو طلب کر کے گفتگو کی اور سمجھایا کہ خدا اور اس کے رسول کی مرضی کے خلاف ہے کہ تم دوسرے مسلمانوں کا مال لوٹو" باوجود اس دوستانہ گفتگو کے بھی انھوں نے اپنی روش کو نہ چھوڑا بقول شاعر ؎

گر دو صد سال کسی رنج وہی زحمت نوش
مار و شنواری و عقرب نہ شود دوست بتو

ان لوگوں کی فہمائش کے لئے ۱۳۰۳ھ میں عبدالرحمن خاں نے شنواری قبائل پر حملہ کیا اور ہمیشہ کے لئے ان شورش پسندوں کا خاتمہ کر دیا۔

۵- دلاور خاں والئ میمنہ نے طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر اپنی خود مختاری کا اعلان

کیا۔ اور لوگوں کو بغاوت کے لئے آمادہ کر کے شاہی افواج پر حملہ کیا اس کے سر کچلنے کے لئے عبدالرحمٰن خاں نے اس پر فوج کشی کی۔ اور ردلاور خاں کو شکست فاش دی اور اُسے گرفتار کر کے کابل لایا۔ اور روالی میمنہ اپنے ایک معتمد علیہ کو مقرر کیا۔

۲۔ حکومت برطانیہ اور افغانستان نے حکومت روس کے ساتھ ایک سرحدی کمیشن ۱۸۸۴ء میں مقرر کیا تھا۔ اس مقصد کے لئے کہ روسی اور افغانی سرحد کا فیصلہ کرے برطانوی سفارت کا افسر اعلیٰ سر پیٹر لمسڈن تھا مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر روسی عبدالرحمٰن خاں سے ناراض تھے۔

۱۔ روسی حکومت افغانوں کے انگریزوں سے

سے ناخوش تھی۔

۲۔ روسیوں کو بُرا معلوم ہوا کہ افغانوں کو مدد ...

۳۔ روسی چاہتے تھے کہ تصفیہ حدود صرف روسی و افغان ... ہو ... — انگریزوں کو دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔

۴۔ عبدالرحمٰن خاں کی وائسرائے ہند کے ساتھ ملاقات نے روسیوں کو عبدالرحمٰن خاں سے اور ناخوش کر دیا۔

غرضکہ ان وجوہ کی بنا پر اور مزید برآں روسی پالیسی کی وجہ سے جس کے مطابق روسی مشرق میں پیش قدمی کر رہے ہیں۔ روسی فوج کا ایک دستہ علاقہ پنجدہ کی طرف بڑھا۔ اور افغانی علاقے پر قابض ہو گیا۔ انگریز آخر وقت تک عبدالرحمٰن خاں کو یقین دلاتے رہے کہ روسی ایسی جرأت ہی نہیں کر سکتے اور اگر روسی پنجدہ پر قابض ہو گئے تو انگریز افغانوں کی مدد کے لئے تیار ہیں۔

لیکن باوجود ان مواعید و میثاق کے جب روسیوں نے پنجدہ پر قبضہ کر لیا تو انگریزوں نے کوئی مدد نہ کی۔ انگریزی سفارت کے لوگ روسی دستے کے حملے کے وقت بھاگ گئے اور افغانی مقابلہ پہ ڈٹے رہے۔ لیکن انگریزوں کے جھوٹے وعدوں کی بنا پر افغانی فوجوں کو شکست ہوئی اور روسی پنجدہ پر ہمیشہ کے لئے قابض ہو گئے۔

۷۔ کافرستان جو افغانستان کے شمال مغرب میں واقع ہے یہاں کے لوگ جہالت کی وجہ سے بہت ہی پست حالت میں تھے۔ ان میں بہت بری رسمیں تھیں جن میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ اپنے ہمسایہ افغانوں سے گائیں لیکر مبادلے میں اپنی بیویاں دیتے تھے نہیں۔ بری رسوم کو زائل کرنے کیلئے عبدالرحمن خاں نے یہ کوشش کی کہ ان کو زبانی سمجھائیں۔ چنانچہ وہاں کے سرداروں کو طلب کیا۔ اور سمجھایا لیکن واپس جانے کے بعد ان کی عادت میں کوئی فرق نہ آیا۔ مزید برآں عبدالرحمن خاں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کیونکہ روسی پامیر کے قریبی علاقہ کو فتح کر چکے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ کافرستان پر قبضہ جما کر اپنی پیش قدمی کا رخ افغانستان طرف کر دیں انہیں وجوہ کی بنا پر عبدالرحمن خاں نے موسم خزاں میں اس ملک پر حملہ کیا۔ اس لئے کہ اس زمانے میں کافرستان میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اور لوگ گھروں میں بند رہتے ہیں۔

عبدالرحمن خاں کی فوجوں نے تمام کافرستان پر قبضہ کر لیا اور آہستہ آہستہ وہاں کے سب لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اس کے بعد عبدالرحمن خاں نے کافرستان کے باشندوں کو علاقہ پغمان میں منتقل کر دیا۔ اور افغانستان کے بعض قبائل کو کافرستان میں بسایا تاکہ پامیر کی طرف سے افغانستان کی اچھی طرح حفاظت ہو سکے۔

اگرچہ انگریزوں کو عبدالرحمن خاں کا کافرستان پر قبضہ ناپسند تھا۔ لیکن عبدالرحمن خاں کی مدبرانہ پالیسی نے اس گتھی کو اچھی طرح سلجھا دیا۔

افغانستان کی حدود کا تصفیہ

افغانستان کے اندرونی انتظامات کے بعد سب سے مشکل مسئلہ عبدالرحمن خاں کے سامنے تصفیہ حدود افغانستان و روس و انگلستان تھا ۱۸۸۴ء میں انگریزی اور افغانی سفارتیں روسیوں سے افغانی اور روسی حدود کا مسئلہ طے کرنے کے لئے گئیں۔ لیکن روسیوں نے تصفیہ حدود سے انکار کر کے علاقہ پنجدہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد دوسری بار اس مسئلہ کو سلجھانے کے لئے انگریزی افغانی اور روسی نمائندے جمع ہوئے افغانی اور روسی حدود کا تصفیہ اس طریقہ پر ہوا کہ روسیوں نے ذوالفقار خالی کر دیا۔ اور مرو چک روسی اور افغانی سرحد متعین ہوئی عبدالرحمن خاں نے بھی اس

فیصلہ کو منظور کر لیا لیکن افغانوں اور روسیوں کے درمیان تیسری بار پھر تنازع ہوا آخر کار ۱۸۹۵ء میں سفارت
ڈیورینڈ نے حدود کا ہمیشہ کے لئے تصفیہ کر دیا۔

دوسری طرف ہندوستان اور افغانستان کی حدود کا معاملہ ابھی تک طے نہ ہوا تھا اور
انگریز آہستہ آہستہ افغانی علاقوں پر تصرف جماتے جاتے تھے چنانچہ عبدالرحمن خاں اس زیادتی کو
دیکھکر چاہتے تھے کہ جس قدر جلد ہو سکے حدود افغانستان و ہندوستان کا تصفیہ ہو جائے وائسرائے
ہند نے جنرل رابرٹس کو اس خدمت کے لئے منتخب کیا
کے باشندوں کے جذبات بہت ہی مشتعل تھے۔ کیونکہ
افغانوں پر وہ وہ مظالم کئے تھے۔ کہ اس کا نام سن کر
اس لئے عبدالرحمن خاں کو یہ انتخاب پسند نہ تھا۔ آخر
انگریزی تصفیہ حدود کے لئے آئی۔ سرمارٹیمر ڈیورینڈ انگلستان ... ریزیڈنٹ رہ چکے تھے
وہ معاملات افغانستان کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور فارسی بھی بول سکتے تھے۔ ۱۹ ستمبر ۱۸۹۳ء
کو ڈیورینڈ سرحد افغانستان میں داخل ہوئے۔ اور نہایت شاندار طریقہ پر ان کا استقبال کیا
گیا۔ کابل پہونچ کر افغانستان و ہندوستان کی حدود کا تصفیہ ہو گیا۔ اور مندرجہ ذیل سرحدی خط
قرار پایا۔ چترال و درۂ باروغل سے پشاور تک اور وہاں سے کوہ سیاہ تک، واخان، کافرستان
اسمار مہمند، لالپورہ، وزیرستان کا ایک حصہ عبدالرحمن خاں کے قبضہ میں آیا اور اپنے باقی تمام حقوق
یعنی بقیہ وزیرستان، باجور، بلند خیل، کرم آفریدی، سوات بنیر، دیر، چلاس چاغی، اور نومین سے
عبدالرحمن خاں کو دست بردار ہونا پڑا۔

اسی طرح بخیر و خوبی حدود افغانستان و ہندوستان کا فیصلہ ہو گیا۔ اور دونوں حکومتوں
میں معاہدہ دوستی ہوا دونوں حکومتوں کے نمایندوں نے دستخط کر کے اس معاملہ کو پایہ تکمیل تک پہونچا دیا

عبدالرحمن خاں کی وائسرائے ہند سے راولپنڈی میں ملاقات

لارڈ ڈفرن ہی کے عہد میں عبدالرحمن خاں کا ارادہ تھا کہ وائسرائے
ہند سے ملیں اور بالمشافہ گفتگو کر کے انگریزی و افغانی ضروری

مصالحت کریں۔ کیونکہ لارڈ ڈفرن کے عہد میں بعض انگریزی مدبرین کا خیال تھا کہ عبدالرحمن خاں کی دوستی پر یقین کرنا فضول ہے کیونکہ عبدالرحمن خاں نے ان لوگوں سے نہایت سختی کا برتاؤ کیا تھا۔ جنہوں نے جنگ ہائے افغانستان میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ ان شکوک کو رفع کرنے کے لئے عبدالرحمن خاں نے بنفس نفیس لارڈ ڈفرن سے بمقام راولپنڈی ملاقات کی۔ حکومتِ ہند نے نہایت شاندار طریقے پر بمقام راولپنڈی دربار منعقد کر کے عبدالرحمن خاں کا شاندار استقبال کیا۔ جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے راجہ نواب اور والیان ریاست موجود تھے۔ عبدالرحمن خاں نے اس دربار میں جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"میں ایسی نوازش اور توجہ کا نہایت مشکور ہوں جو وائسرائے اور ملکہ وکٹوریا نے میرے حال پر کی ہے اور اس نوازش کے عوض میں اپنی فوج اور لوگوں کے ساتھ جو خدمت سرکار دولتمدار چاہے کرنے کے لئے تیار ہوں اور چونکہ سرکار نے وعدہ کیا ہے کہ اگر کوئی غنیم افغانستان پر چڑھے تو اس کے دفع کرنے میں مدد کرے گی۔ اس لئے ہمارا بھی فرض ہے کہ استقلال کے ساتھ ہمیشہ سرکار عالی وقار کے ساتھ وفاداری کریں۔

اس دربار کے بعد وائسرائے نے یہ اعلان کیا کہ بارہ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ جو عبدالرحمن خاں کو دیا جاتا ہے۔ حکومت ہند کی خواہش ہے۔ کہ اسکو بڑھا کر اٹھارہ لاکھ سالانہ کر دیا جائے۔

(باقی آیندہ)

بادشاہ پور کی تحصیل میں آج صبح سے عجیب گہماگہمی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ قصباتی "عائدین" اور "معززین" اپنے اپنے گھروں سے نکل کر پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا چکے ہیں۔ دکاندار اور راہ گیر دوکانوں کے سامنے یا بیچ سڑک پر کھڑے ہوئے باتیں کر رہے ہیں [illegible]
رگھونندن سہائے انسپکٹر ڈاک خانہ نے آج صبح [illegible]
کو اچ کی فوری وجہ کیا ہوئی۔ لیکن قیاس یہی چاہتا ہے [illegible]
ہیں جو ہمارے ملک میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ یعنی [illegible]
سُرگباشی لالہ جی کی ارتھی قصبہ کے باہر مکان [illegible]
اشلوک پڑھے۔ دان پن کی آس لگائی۔ لڑکے نے آگ دی۔ پڑوسیوں نے اشاروں ہی اشاروں میں لالہ جی کی دولت اور اندوختے کی باتیں کیں اور اب سب لوگ مع لالہ جی کے بڑے بیٹے کے تعزیت کے جلسے میں شرکت کرنے کے لئے چلے۔

لالہ جی کے ایک ماتحت بابو ماتا پرشاد متصدی صبح ہی سے منشی کریم الدین کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ منشی جی خاص صفات کے آدمی ہیں۔ انگریزی میں مڈل تک پڑھے ہوئے ہیں۔ اردو فارسی میں پنجاب کے "منشی" تک تعلیم پائی ہے۔ بچپن میں کہانیاں شوق سے سنا کرتے تھے۔ شروع جوانی میں داستان گوئی کا شوق بھی رہ چکا ہے۔ غرض کہ ان سب صفات نے انھیں بادشاہ پور کا بہترین مقرر بنا دیا ہے۔ کیسا ہی موقع کیوں نہ ہو، کسی موضوع پر گفتگو کیوں نہ ہو رہی ہو کھدر کے پرچار سے لے کر صاحب کلکٹر بہادر کو ایڈریس دینے کی تجویز تک وہ ہر چیز پر بلا اطلاع اور بغیر جھجکے ہوئے تقریر کر سکتے ہیں۔ فن تقریر میں سوائے اس کے اور سب ہی کیا۔ ایک شعر شروع میں پڑھ دیا، ایک درمیان میں اور ایک خاتمے پر

اور سب سے بڑھ کے جو باتیں ذہن میں آئیں یا مادہ سروں کی تقریروں سے مل سکیں، کہہ ڈالیں، چلو چھٹی ہوئی، اس کے علاوہ دوسری حیثیتوں سے بھی اہل قصبہ کی علمی و ادبی خدمت بجالاتے ہیں، کسی کے یہاں ولادت کی خبر پائی اور چھٹی سے پہلے ہی مادہ تاریخ ڈھونڈھ نکالا، کوئی بیمار پڑا اور حالت مایوس کن ہوئی اور انھوں نے مریض کے سرہانے بیٹھے بیٹھے "مغفرلہ" "مغفور باد" "داخل خلد" وغیرہ وغیرہ کے اعداد جوڑنے اور ملانے شروع کر دئے، ان کا یہ شوق اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اب انھوں نے انسان کے متعلق ایک خاص نظریہ قائم کر لیا ہے، جس طرح درزی راہ چلتوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ اس پر کون سا لباس سجے گا، یا رنگروٹ بھرتی کرنے والا افسر ہر شخص کو فوج کی قابلیت کے نقطہ نظر سے دیکھتا ہے، اسی طرح ہمارے منشی جی ہر شخص کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ اس کی کیا علمی خدمت کی جا سکتی ہے ان کے نزدیک ہر شخص یا پیدا ہوا ہے، یا مرنے والا ہے، یا شادی کرنے والا ہے، یا اس کا تبادلہ ہونے والا ہے اور ہر موقع کے لئے ان کے پاس تقریریں، تاریخی مادے، تہنیت کے اشعار، الوداعی ایڈریس وغیرہ پہلے سے تیار رہتے ہیں۔ غرض کہ جلسہ ہائے تعزیت، جلسہ ہائے احتجاج، جلسہ ہائے خیر مقدم سب میں ان کی بڑی مانگ ہے۔

جب بابو ماتا پرشاد پہنچے ہیں تو کریم الدین صاحب سو کر اٹھے ہی تھے، بابو جی نے ان کو دور ہی سے للکارا، انھوں نے ادھر سے تواضع کی، پوچھا "کیوں بھئی کیسے آئے" بابو جی کہنے لگے "ارے منشی جی، انسپکٹر صاحب رحلت فرما گئے ہیں، مڈل اسکول میں جلسۂ تعزیت مقرر ہے، کوئی اہلکار، یا محرر مرتا تو ایسی بات نہ تھی لیکن یہ تو انسپکٹر کا معاملہ ہے، دو چار جملے کہہ کر ان کی ارواح کو بیکنٹھ پہنچا دو بس تمہارا ہی انتظار ہے۔

بھلا منشی کریم الدین جیسے حاضر دماغ، فی البدیہہ مقرر کو مزید تفتیش حالات کی کیا ضرورت تھی، انھوں نے بس ایک مرتبہ اتنا کہا "ارے انسپکٹر صاحب مر گئے" اور وہ بھی اس انداز سے گویا ان کے آج مرنے کا انھیں پہلے ہی سے یقین تھا اور مادہ تاریخی یا تعزیتی تقریر ان کے پاس پہلے سے تیار موجود

تھی۔ منہ ابھی دھویا نہ تھا۔ اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی، اس لئے کہ تعزیت کے جلسے میں متوفی کی صورت سے جتنی وحشت، اور افسردگی ظاہر ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ شیروانی پہنی اور پہلے ہی سے رونی صورت بنائے بابو جی کے ساتھ ہو لئے۔

راستے میں کہنے لگے "ارے یارما تا! وہ انسپکٹر تو کچھ اچھا آدمی نہ تھا" ماتا پرشاد نے جواب دیا "ارے منشی جی، اب ہم کو تم کو اس سے کیا مطلب، تم تو بس دو بول بھلائی کے کہہ دینا۔ باقی بھگوان جانے اور مرنے والے کا کرم"

مڈل اسکول پہنچے تو جلسہ جما ہوا تھا۔ صا۔
اول میں انسپکٹر پولیس، تحصیلدار، معزز زمیندار ن۔
بنائے بیٹھے ہوئے تھے۔

منصف صاحب بہادر نے مختصر سی تقریر کی۔ منشی جی کو اشارے سے بلایا، یہ فوراً چبوترے پر جا کھڑے ہوئے، مجمع پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی۔ دو ایک ٹھنڈی سانسیں بھریں اور داد فصاحت دینے لگے:۔

"صاحبان معز!

گر بر نود سالہ بمیرد عجب نیست   ایں ماتم سخت است کہ گویند جواں مرد

(اس شعر پر لالہ جی مرحوم کے فرزند و وارث جائز نے منشی جی کو گھور کر دیکھا لیکن وہ سمجھے نہیں)

"یہ آج کیسی اداسی چھائی ہے، "آسمان راحق بود گر خون ببارد بر زمیں،" الٰہی یہ خواب ہے یا عالم بیداری، "این چہ می بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب" میری آنکھوں نے یہ آج کیا دیکھا، میرے کانوں نے کیا سنا، افسوس صد افسوس کہ وہ دنیا سے اٹھ جائے جو کل تک ہمارا یار وفادار تھا، وہ نوجوان وہ مستعد وہ کارکن جو اپنی سرکار کا نمک خوار، رعایا کا شفیق، افسروں کا رفیق، ماتحتوں سے خلیق اور ہر حیثیت سے لائق تھا، قافیوں کا اثر دوبالا کرنے کے لئے منشی جی نے عینک اتاری اور شروانی

کے دامن سے پونچھی۔ میں کیسے یقین کروں کہ آج ہم سب نے اسے سپرد خاک (نہیں لاحول ولا قوۃ) نذر آتش کر دیا ہے۔ کیا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ یوں تو خدا کے فضل سے ہماری تحصیل سر تا پا کمیں ہیں سب ہی افسر اچھے ہیں فضلا بعد کرم علی بعض لیکن خدا بخشے لالہ نسا رام ان میں فرد تھے، ایسے فرض شناس، ایسے کارکن عدالت کے دو دو بجے تک کام دیکھتے تھے۔ اور ان لوگوں کے جو رشوت دے کر اپنا کام نکالنا چاہتے تھے تو وہ جانی دشمن تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لالہ نسا رام آنجہانی نے تنخواہ ملتے ہی اس کی ایک ایک پائی غریبوں اور مستحقوں کو بانٹ دی، اور جن جن بیواؤں اور یتیموں کی وہ دستگیری کرتے تھے، ان کی آہ و زاری سے آج چرخ چہارم کا سینہ پر کینہ و دیرینہ شبک ہو رہا ہے، بمصداق

ہو اغم سے شبک سینۂ سنگ

وہ سب آپ صاحبان ہوز سن چکے ہیں، عیاں راچہ بیاں۔ مرحوم اپنے کام کے ایسے عاشق تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا عیش سب کچھ اسی کی نذر کر دیا تھا۔

اور "موتو قبل ان تموتوا" کے بمصداق اخیر دم تک شادی نہیں کی (یہاں لالہ جی کے فرزند نے پھر گھورا) افسوس ایسا دوست اب کہاں ملے گا۔ مجھے اس وقت ان کا چہرہ منڈی ہوئی داڑھی۔ بڑی بڑی مونچھیں یاد آ رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ "لالہ نسا رام مرحوم، پرمیشور تھیں بیکنٹھ میں جگہ دے،" یہ کہہ کر منشی کریم الدین نے اس انداز سے چھت کی طرف دیکھا گویا مرحوم کی روح اس اجازت کے انتظار میں اب تک وہیں منڈلا رہی تھی۔

منشی صاحب کی فصاحت کا دریا زوروں سے لہریں لے رہا تھا، لیکن حاضرین میں کچھ سرگوشیاں شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی تقریر کے بعض جملوں کا اثر اچھا ہوا مثلاً "فضلا بعد کرم علی بعض" "موتو قبل ان تموتوا" والے جملوں پر مدرسے کے ہیڈ مولوی صاحب نے بڑے زور سے "حق ہے" کہا بعض لوگوں نے آنکھیں ملیں، رومال سے ناک صاف کی، لیکن اس تقریر کی بعض باتیں حاضرین کی سمجھ میں بالکل نہیں آئیں۔ شلاً سب سے پہلی بات تو وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ منشی جی "مرحوم" کا نام

بار بار " لالہ منسارام " کیوں بتا رہے ہیں۔ ان کا نام تو رگھونندن سہائے تھا، وہ سب ہر شخص جانتا تھا کہ مرحوم کی ساری عمر اپنی بیوی سے لڑتے گزری ہمیشہ کھٹ پٹ ہوا کی پھر تو خوشی تھی سنئے یہ کیوں کہا کہ " اخیر دم تک شادی نہیں کی " اور وہ بھی ان کے فرزند کی موجودگی میں [illegible] جہانی کی رشتہ مبارک برسوں کے ریاض اور خضاب کی وجہ سے ابھی [illegible]
نے ان کی تنی ہوئی داڑھی " کی یاد میں تاسف
کو ذرا پریشان کر دیا تھا۔ منصف صاحب نے کرسی
ہی آنکھوں میں ان سے کچھ کہا، چودھری علی بخش نے
صاحب کے تحت تکلم میں بار بار موجیں اٹھتی رہیں، وہ نہ سمجھے کہ ...
شور سے جاری رہا۔

" لالہ منسارام آنجہانی، اگرچہ قدرت نے تمھیں حسن ظاہری نہ دیا تھا، تمھاری رنگت کالی تھی شکل روکھی نقشہ بھونڈا اور تمھاری باتیں تلخ تھیں لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ اس بدنما غلاف کے اندر کیا اعلیٰ درجہ کا دل چھپا ہوا تھا اور ...... اور .... "

لیکن اب حاضرین نے دیکھا کہ خود منشی کریم الدین صاحب کچھ سٹ پٹائے ہوئے ہیں، کبھی سر کھجاتے ہیں، کبھی کھانستے ہیں، کبھی عینک کو ناک کی نوک پر لا کر اس کے اوپر سے دیکھتے ہیں، کبھی پھر اسے اوپر کھسکا لیتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ہیں اور پہلی صف میں ایک کرسی پر جمی ہوئی ہیں۔ آخر کو ایسے گھبرائے کہ خاتمے کا شعر تو کجا بغیر جلسہ ختم کئے ہوئے جلدی سے چبوترے سے اتر آئے۔

جلسہ برخاست ہوا تو یہ بابو ماتا پرشاد کو پکڑ کر ایک طرف لے گئے بہت غصے میں بھرے ہوئے تھے برس پڑے۔

" ک ... ک ... کیوں بابو ماتا پرشاد یہ کیا مذاق تھا۔ تم نے کہہ دیا کہ منسارام مر گیا ہے حالانکہ وہ کمبخت پہلی ہی صف میں بیٹھا ہوا مجھے برے تیوروں سے گھور رہا تھا، یہ کیا شرافت تھی تمھاری جو تم نے

کے اس طرح دھوکا دیا! "

بابو ماتا پرشاد سے منشی ضبط نہ ہو سکی جواب دیا " ارے منشی جی تم سے کس نے کہا کہ لالہ فسا رام مر گئے لالہ رگھو نندن سہائے مرے ہیں سنا کہ نہیں لالہ رگھو نندن سہائے " مگر منشی جی کا غصہ کم نہ ہوا کہنے لگے " تم ہی نے تو مجھ سے صبح آکر کہا کہ انسپکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا ہے " بابو ماتا پرشاد نے زچ ہو کر اپنا ماتھا ٹھونک لیا " ارے برادر ۔ لالہ رگھو نندن سہائے بھی تو آخر انسپکٹر ہی تھے نہ ۔ لالہ فسا رام پولیس کے انسپکٹر ہیں، لالہ جی مرحوم ڈاک خانے کے انسپکٹر تھے ۔ سمجھے کہ نہیں! واہ منشی جی واہ تم نے تو آج لٹیا ہی ڈبو دی، تعزیت کے جلسے کو مذاق بنا دیا، تب ہی تو میں حیران تھا کہ یہ آخر ہمارے منشی جی آج کس کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں ۔ واہ واہ واہ "

منشی کریم الدین ابھی اپنی غلطی کی ندامت سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ لالہ فسا رام جن کی روح کو بیکنٹھ کا پروانہ مل چکے تھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ان کی طرف آئے ، تحصیلدار صاحب ان کے ساتھ تھے ۔ کہنے لگے " آئیے منشی جی میں آپ کا تعارف کرا دوں ، آپ ہی لالہ فسا رام انسپکٹر پولیس ہیں جنھیں آپ اپنی تقریر کے زور سے بیکنٹھ بھیج رہے تھے ۔ دربان نے روک دیا تو یہ واپس چلے آئے ۔ ہا ہا ہا!!! " کریم الدین صاحب نے نادم ہو کر گردن جھکا لی ۔ کچھ کہنے کو تھے کہ خود لالہ فسا رام بول اٹھے ، بہت برہم تھے ۔

" منشی صاحب یہ آج کا مذاق کچھ ٹھیک بات نہیں ہے سمجھے آپ ، ایک مرے ہوئے شخص کے حق میں چاہے آپ کی تقریر اچھی ہو لیکن زندوں کے متعلق ایسی باتیں کرنا گویا اُن کی ہتک کرنا ہے ۔ آج کل کسی پولیس والے کے متعلق یہ کہنا کہ وہ رشوت نہیں لیتا ، اس کی ہجو ملیح ہے ۔ آپ کا خیال شریف میں اور کہاں جناب یہ میری صورت شکل کے متعلق آپ سے کس نے کہا تھا کہ گل فشانی کیجئے ، " کالی رنگت " " روکھی شکل " " بھونڈا نقشہ " کیا سراپا بیان کیا ہے ۔ آج بھرے مجمع میں آپ نے میری توہین کی بندہ اسے بھولے گا نہیں "

یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اور مونچھیں مروڑتے ہوئے چل دیئے ۔

اس واقعہ کو دو مہینے گزر چکے ہیں۔ اس عرصے میں ایک دفعہ کریم الدین صاحب کے گھر سے چوری کا مال برآمد ہو چکا ہے لیکن عدم ثبوت کی وجہ سے بچ گئے۔ اب سنا ہے کہ ایک دن وہ حسب عادت نمک بنانے کے متعلق تقریر کر رہے تھے کہ لالہ منسا رام نے وارنٹ دکھا کر انھیں گرفتار کر لیا۔ صاحب منصف بہادر نے انھیں چھ ماہ کے لئے قید کی سزا دی۔ منشی کریم الدین صاحب کو جیل جانے کا اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس بات کا کہ اپنی گرفتاری کا جو تاریخی مادہ انھوں نے نکالا تھا وہ اسے اپنے دوستوں کو بھی نہ سنا سکے۔

بادشاہ پورہ کے جلسے آج کل بغیر ان کے ہوتے

معرکہ سکون

جہادِ زندگی میں کیوں تلاش ہے سکوں کی
اے تغافل آشنا! یہاں عمل کا کام ہے
خراب آرزو نہ ہو یہ باتیں ہیں جنوں کی
عمل کی رزم ہے، جہاں جس کا نام ہے

یہ لفظ ہے مگر نہیں وجود اس کا دہر میں
ہزار اس کو ڈھونڈنے کبھی نہ آئے گا نظر
نہ بحر میں، نہ لہر میں، نہ دشت میں، نہ شہر میں
عبث نہ کھو عزیز جاں اس کے غم میں بے خبر

امیر ہو، غریب ہو، فقیر ہو کہ شاہ ہو
ہر ایک اس کا شیفتہ ہے بزمِ کائنات میں
ذرا بھی عقل و ہوش ہو تو کیوں کوئی تباہ ہو
کسے میسر آئی ہے یہ نعمت اس حیات میں

فراغِ خاطر و سکونِ قلب جس کا نام ہے
یہ سامعہ فریب ہے، یہ باصرہ نواز ہے
ہر ایک اس کی جستجو میں آج تیز گام ہے
کسے خبر کہ مرحلہ یہ سخت جاں گداز ہے

ملے گی بعد مرگ ہی اگر یہ چیز مل سکی
کہ گوشۂ قبور میں ملی ہے یہ جسے ملی
پھر اس دو روزہ زندگی میں اس کی جستجو ہے کیوں
ہزار حیف کھو دی تو نے اپنی زندگی یوں

سکوت کہتے ہیں جسے ہو ایک نام موت کا
وہی رہا، وہی جیا کہ جس نے کام کچھ کیا
کیا نہ جس نے کچھ یہاں وہ خوار ہے تباہ ہے
یہاں سکون کی آرزو بھی ہم نفس گناہ ہے

یہ شورشیں یہ ولولے ہی زندگی کی جان ہیں
اٹھ اور کر کے کچھ دکھا جو ہمتیں جوان ہیں
سکوت اور سکون میں کہاں فراغیات کا
نہیں تو چھوڑ معرکہ یہ بزم کائنات کا

فریب راحت و سکوں نہ کھا جو کامگار ہے
نہ دام یاس بیدلی میں آ جو ہوشیار ہے
شراب زہر دار ہے یہ آدمی کے واسطے
عذاب خوشگوار ہے یہ زندگی کے واسطے

نہ فکر راستے کی کر، نہ خوف مشکلات کا
ترا ثبات عزم خود کفیل ہے نجات کا
جو سعی و محنت و عمل ترے رفیق راہ ہیں
یہ نارسائیوں کے وہم دل میں خواہ مخواہ ہیں

بہادروں سے چھین لی ہیں اس نے ہمتیں
مبارزوں کی توڑ دی ہیں معرکوں میں قوتیں
خیال راحت و سکوں عدوئے عقل و ہوش ہے
جو اس کی دھن لگی تو پھر نہ ہوش ہے نہ جوش ہے

کیا ضعیف اس نے عزم رستم نبرد کو
اسی نے دی جگہ خیال گرم و سرد کو
اسی نے کھوئیں عظمتیں کلاہ تاجدار کی
اسی نے ڈھائیں طاقتیں سپاہ بیشمار کی

یہ رہزن حیات ہے، یہ دشمن نشاط ہے
قوی ہے عزم دل! اگر تو غم کی کیا بساط ہے
سنبھل! اٹھ! اپنی قوت نہاں کو آشکار کر
بہا کے اپنا خوں اس زمیں کو لالہ زار کر

شذرات

(۱)

اس مہینے کے وسط میں مولانا شوکت علی صاحب جامعہ میں تشریف لائے۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے ایک تعزیتی جلسے میں مولانا کو ان کے چھوٹے بھائی [illegible] مرحوم کا پرسا دیا۔ مولانا نے [illegible] نے مرض کی شدت کی حالت میں [illegible] مولانا نے اختصار کے ساتھ اس جوش عقیدت کا ذکر [illegible] اور جس کا اب ان کی وفات کے بعد اظہار ہو رہا ہے۔ [illegible] ہے کہ بیت المقدس کو اسلام کا تمدنی اور روحانی مرکز بنائیں اور اس غرض سے وہاں ایک بہت بڑا دار العلوم مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار کے طور پر قائم کریں۔

---

(۲)

مولانا نے اس محبت کا ذکر کرتے ہوئے جو مرحوم جامعہ ملیہ سے رکھتے تھے۔ فرمایا کہ وہ آخری وقت میں بھی اپنی اس محبوب درسگاہ کو نہیں بھولے اور یہ وصیت کر گئے کہ میرا پورا کتب خانہ جامعہ ملیہ کو دے دیا جائے۔ آخر میں مولانا نے ایک بے بہا ہدیہ جو وہ بیت المقدس کے مسلمانوں کی طرف سے جامعہ کے لئے لائے تھے امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب کو دیا۔ انھوں نے شیخ الجامعہ صاحب کو عطا فرمایا۔ یہ ایک مصر کا چھپا ہوا کلام مجید ہے جس کی جلد پر بیت المقدس کے مشہور یتیم خانے میں ہاتھی دانت کا نہایت خوشنما کام بنایا گیا ہے۔ جب مولانا محمد علی مرحوم آخری بار بیت المقدس تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے وہاں کے یتیم خانے میں یہ کام دیکھا تھا اور فرمائش کی تھی کہ اس نمونے کا ایک مجلد کلام مجید جامعہ ملیہ کو بھیجا جائے۔ اب ان کی وفات کے بعد یہ فرمائش پوری ہوئی اور مرحوم کی محبت اور بیت المقدس کے مسلمانوں کی اخوت کی یہ نشانی ہم تک پہنچی۔

۲۴ر اپریل کو مولانا شفیع داؤدی صاحب کے اہتمام میں مسلمانان ہند کے نمائندوں کا ایک جلسہ ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر منعقد ہوا کہ مولانا محمد علی مرحوم کی یادگار کے مسئلے پر غور کرے۔ جلسے کی صدارت جناب ڈاکٹر انصاری صاحب نے فرمائی۔ بہت سی تجویزیں پیش ہوئیں اور ان پر بحث کی گئی۔ آخر میں یہ تجویز منظور ہوئی کہ مرحوم کی بہترین یادگار یہ ہوگی کہ جامعہ ملیہ کی تکمیل اور توسیع کی کوشش کی جائے اور اس میں علوم اسلامی اور سیاسیات کی تعلیم کا ایک خاص شعبہ کھولا جائے۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے صدر ڈاکٹر انصاری صاحب اور سیکریٹری ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب منتخب ہوئے۔ مولانا شوکت علی صاحب نے وعدہ فرمایا کہ اپریل اور مئی میں سارے ہندوستان کا دورہ کرکے محمد علی میموریل فنڈ کے لئے چندہ کریں گے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شفیع داؤدی، ڈاکٹر محمد عالم اور دوسرے حضرات نے بھی پوری طرح مدد دینے کا وعدہ کیا۔

اس کے علاوہ دہلی کے اصحاب کی کمیٹی منتخب ہوئی کہ مرحوم کی مقامی یادگار کے طور پر ایک مسافرخانہ اور پبلک لکچر ہال تعمیر کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرے۔ اس کے صدر خان بہادر عبدالرحمن صاحب ایڈوکیٹ اور سیکریٹری محمد جعفری صاحب ایڈیٹر ملت منتخب کئے گئے۔ دہلی کے معزز تاجر عبدالخالق صاحب نے اس کام کے لئے دو ہزار روپیے کے چندے کا اعلان فرمایا۔

جناب شیخ الجامعہ صاحب نے یہ اعلان کیا کہ مولنا عبدالماجد دریابادی کے مشورے اور امداد سے مولانا مرحوم کی سوانح عمری جامعہ ملیہ کی طرف سے لکھوائی جائے گی۔

خدا کرے یہ تمام تجویزیں خیال سے عمل میں آسکیں اور مرحوم کی ایسی یادگار قائم ہوجائے جو ان کی قابل فخر شخصیت اور ان کی ملکی اور قومی خدمات کی یاد کو تمام ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھے۔

انشاء اللہ جامعہ کا محمد علی نمبر جون کے آخر تک شائع ہوگا۔ دیر کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نمبر کے لئے بعض چیزوں خصوصاً تصویروں کی ضرورت تھی جن کا حاصل ہونا بغیر مولانا شوکت علی کی امداد کے ناممکن تھا۔ اب مولانا کی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جانے کی امید ہے

خدا کا شکر ہے کہ جامعہ کے ہر دلعزیز معلمین حافظ فیاض احمد صاحب شفیق احمد صاحب قدوائی اور دیوداس صاحب گاندھی قید فرنگ سے رہا ہو کر آگئے اور عنقریب [illegible] معروف ہو جائیں گے۔ جامعہ کے چند مخلص اور پر جوش طلبہ بھی [illegible] کرنے کے لئے چلے گئے تھے اب واپس آگئے ہیں۔ [illegible] گرمجوشی سے کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے اپنے [illegible] ان کی محبت اور عزت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ان حضرات کی یہ وفاداری بھی دیکھنے کے قابل ہے لا بنیہا تک قید کی مصیبت جھیلنے کے بعد رہا ہوئے تو بجائے اس کے کہ پہلے اپنے گھروں کو جاتے سیدھے جامعہ پہنچے۔ سچ پوچھئے تو جامعہ والے اپنا گھر اسی طالب علموں اور استادوں کی برادری کو سمجھتے ہیں۔ جو دین، علم اور خدمت کے رشتے میں مربوط ہے اور جس کی محبت دنیا کی ہر چیز کی محبت سے بڑھ کر دل میں گھر کر لیتی ہے۔ بظاہر جامعہ میں ابھی کچھ بھی نہیں مگر کوئی کشش ایسی ضرور ہے کہ جو ایک بار یہاں آگیا اس کا جی جانے کو نہیں چاہتا۔

ہمارے پاس الہ آباد کے مسلم ہوسٹل کا میگزین ریویو کے لئے آیا ہے۔ اس کے اردو اور انگریزی کے حصوں میں طلبہ کے مضامین دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اب صحیح علمی اور ادبی مذاق پیدا ہو رہا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ رسالہ کامیابی کے ساتھ جاری رہے۔ اگر ہوسٹل کے منتظمین پوری مدد کریں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔

کچھ دن ہوئے مسلم ہوسٹل کی مجلس اسنا کی طرف سے پچاس ہزار روپے کا اپیل کیا گیا تھا۔ مسلم ہوسٹل کی اہمیت سے صوبہ متحدہ کے مسلمان خوب واقف ہیں۔ اس صوبے کی بہترین یونیورسٹی کے مسلمان طالب علموں کا یہی ایک گھر ہے۔ اس میں مطلق مبالغہ نہیں کہ اس کی چار دیواری کے اندر جتنے قابل اور ہونہار مسلمان نوجوان رہا کرتے ہیں، صوبہ متحدہ میں کیا سارے ہندوستان کے کسی لیک دارالاقامہ میں نظر نہ آئیں گے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ قومی سرمایے سے قائم کیا گیا ہے اور اس کا انتظام زیادہ تر ملت اسلامی کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ان معدودے چند اداروں میں سے ہے جن میں صحیح قومی تعلیم کا مرکز بننے کی پوری صلاحیت ہے۔ اگر مسلمانوں میں تعلیم کی یہی قدر کا مادہ ہو تو اس ہوسٹل کو ترقی دے کر آکسفورڈ اور کیمبرج کے کالجوں کا ہمسر بنا دیں۔

ہم ہوسٹل کی مجلس اسنا کو مخلصانہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہندوستان میں کسی ادارے اور خصوصاً کسی تعلیمی ادارے کی امداد کے لئے اپیل کرنا کافی نہیں، ضرورت اس کی ہے اسنا اور قدیم طلبہ میں سے کچھ یا اثر لوگ ایک وفد بنے کر سارے صوبے کا دورہ کریں۔ اگر کچھ حضرات ایک مہینہ اس کام میں صرف کر دیں تو پچاس ہزار کی رقم صرف ہوسٹل کے قدیم طلبہ سے وصول ہو سکتی ہے جن کی تعداد صوبے میں ہزار پندرہ سو سے کم نہیں۔ اور جن میں اکثر خدا کے فضل سے خوش حال ہیں۔

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عا[illegible]

جلد ۱۶ | بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۱ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپیہ (صہ)

کیا اردو شاعری محض نقالی ہے؟

(سلسلہ گزشتہ)

بہر حال اردو زبان منجھتی اور صاف ہوتی گئی۔ قدما کی پیہم کوششوں اور متواتر عرق ریزیوں کی بدولت تھوڑی ہی مدت میں اردو نے ہر قسم کے نازک خیالات اور لطیف جذبات کے ادا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کر لی۔ فارسی کا چرچہ روز بروز کم ہوتا گیا۔ شعرائے نامدار جو پہلے ریختہ گوئی کو کسر شان سمجھتے تھے اب زیادہ تر اردو ہی میں شاعری کرنے لگے۔ ان کی غیر معمولی کوشش و توجہ نے اردو شاعری کو فارسی کا مد مقابل بنا دیا۔ یہ اردو شاعری کی ترقی کا چھٹا زینہ تھا۔ ملک کی عام زبان اردو ہو گئی تھی فارسی زبان کے نکتوں اور خوبیوں کے سمجھنے والے بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے۔ اس لئے شعرا گیسوئے اردو کے سنوارنے میں پوری توجہ صرف کرنے لگے۔ جیسا ذیل اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے پسند و مذاق کا رُخ فارسی سے ہٹ کر ریختہ کی طرف مائل ہو گیا تھا اور سرآمد شعرا اپنے ریختہ کے کلام کو فارسی کا حریف سمجھنے لگے تھے۔

قائم۔

قائمؔ جو کہے ہیں فارسی یار اس سے تو یہ ریختہ ہی بہتر

مصحفی۔

مصحفیؔ فارسی کو طاق پہ رکھ اب ہے اشعار ہندی کا رواج

غالب۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

الغرض اردو شاعری کے یہ چھ مختلف مدارج تھے جن کو طے کر کے وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے۔ میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرے میں ریختہ کی چار قسمیں قرار دی ہیں (۱) اول یہ کہ ایک مصرع ہندی ہو

اور دوسرا فارسی۔ (۲) دوم یہ کہ نصف مصرع ہندی ہو اور نصف فارسی۔ (۳) سوم یہ کہ اس میں فارسی کا عنصر حرف و فعل کی صورت میں ہو (۴) چہارم یہ کہ اس میں فارسی کی ترکیبیں پائی جائیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ مذکورہ بالا چہار ارتقائی زینے یا میر صاحب کی قائم کردہ چار قسمیں باترتیب زمانہ کے بعد دیگرے معرض وجود میں نہیں آئی تھیں یعنی ہر زینے کے طے ہونے کے لئے علٰحدہ علٰحدہ زمانہ معین نہ تھا۔ یہ سمجھنا سخت غلطی ہوگی کہ ابتدائً کچھ مدت تک فارسی شعرا ہندی [illegible]

اپنے اشعار میں داخل کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ

کرتے رہے۔ پھر ایک زمانے تک ایک مصرع فارسی کا اور

باترتیب زمانہ بقیہ مدارج طے ہوئے۔ حقیقت الامر یہ ہے

میں عام طور پر ملتی ہیں۔ اوپر جو کچھ تجزیہ کیا گیا ہے وہ محض اصولی [illegible] ارتقا کے لغوی معنے تو چڑھنے اور ترقی کرنے کے ہیں لیکن اصطلاحاً یہ لفظ ڈارون کے اس مشہور و معروف نظریے کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے جس کے مطابق دنیا کی ہر شے۔ ہر مخلوق۔ ہر ایجاد۔ ہر تحریک مختلف مدارج و مراحل طے کر کے پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ڈارون کے نظریے کے مطابق ارتقا میں ترقی معکوس بھی شامل ہے۔ ارتقا کا قدم ہمیشہ آگے ہی نہیں بڑھتا بلکہ کبھی پیچھے بھی ہٹتا ہے اور کبھی ایک ہی حالت و مقام پر کچھ دنوں تک قائم رہتا ہے۔ ترقی کے مدارج ہر حال میں باترتیب زمانہ طے نہیں ہوتے بلکہ بوقت واحد کئی مراحل طے ہو سکتے ہیں لیکن کسی مسئلے کی تحقیق و تشریح کے لئے مختلف عناصر کی تحلیل اور مختلف مدارج کا احصا ضروری امر ہے۔ نظریہ ارتقا کی ان تمام خصوصیات کے مدنظر اردو شاعری کی ابتدا۔ اٹھان اور عروج کے جو مدارج اوپر بیان ہوئے وہ ترتیب زمانی کی قید سے آزاد ہیں تاریخی لحاظ سے ایک ہی زمانے میں مختلف قسم کے اشعار کہے گئے۔ تاہم اس علمی تحلیل و تجزیہ (سائنٹفک انالیسس) سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ ابتدائً اردو شعرا کی علٰحدہ کوئی جماعت نہ تھی جو فارسی شاعروں کے نقش قدم پر چلتی تھی بلکہ ریختہ کی داغ بیل انھی لوگوں کی ڈالی ہوئی ہے جو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ اردو محض بول چال کی زبان تھی جس سے کاروباری اور آپس کے

لیکن ان کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ ابھی وہ ضبط تحریر کی شرمندہ احسان نہیں ہوئی تھی۔ نثر کا تو کہیں پتہ ہی نہ تھا کیونکہ وہ بہت بعد کی چیز ہے۔ اردو ادب کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ اول اول جب فارسی شعرا نے اپنے کلام میں ایک آدھ لفظ یا فقرے یا مصرعے اردو کے داخل کئے تو یہ ضرور تھا کہ وہ فارسی رسم خط میں لکھے جائیں۔ ہر شخص جو اپنے کلام یا تحریر میں کوئی غیر زبان کا لفظ داخل کرتا ہے تو اسے اپنے ہی رسم خط میں لکھتا ہے لیکن اُردو زبان کے لئے تو اس وقت تک کوئی رسم خط مقرر ہی نہیں ہوئی تھی اس لئے اُردو الفاظ کا فارسی رسم خط میں لکھا جانا ایک فطری امر تھا۔ علاوہ بریں جن شعرا نے اساتذہ کے کلام کا اُردو میں ترجمہ کیا یا تفریح طبع کی غرض سے ایک آدھ ریختہ کی غزلیں لکھیں وہ بجز فارسی کے اور کسی رسم الخط سے واقف ہی نہ تھے لہذا انھوں نے اردو اشعار کے لئے وہی طرز تحریر اختیار کیا جس سے وہ مانوس تھے۔ الغرض اُردو زبان کے لئے فارسی حروف تہجی، فارسی نظام ہجائی، فارسی رسم خط اور فارسی طرز تحریر کا استعمال فطری اصول اور زمانے کی ضروریات کے تحت عمل میں آیا۔ اس پر تقلید و نقالی کا الزام معترض کی کم سوادی و کوتہ نظری کی دلیل ہے۔

سوائے اس کے جن حالات کے تحت اُردو شاعری وجود پذیر ہوئی جس فضا و ماحول میں اس نے نشو و نما پائی جن واقعات کے زیر اثر وہ پروان چڑھی۔ ان تمام امور کا فطری تقاضا یہی تھا کہ وہ نحوی و عروضی اصول کے لحاظ سے فارسی شاعری کے نقش قدم پہ چلے۔ اسی کے اوزان و بحور اختیار کرے اور نہ صرف تشبیہات و تلمیحات میں بلکہ خیالات و جذبات میں بھی اسی کی ہم رنگ ہو۔ اور ہندی شاعری کی خصوصیات سے بیگانہ رہے۔ اردو شاعری کے ابتدائی زینے کی سراغ رسانی کے لئے ہمیں امیر خسرو کے عہد یعنی چودھویں صدی عیسوی کے اوائل تک سفر کرنا پڑتا ہے۔ چونکہ یہ طویل سفر زحمت و دشواری سے خالی نہیں ہے اس لئے اگر ہم اپنی تحقیق اس زمانے سے شروع کریں جب سے ریختہ کے دیوان اور کلام عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں تو معلوم ہوگا کہ اردو شاعری کی ابتدا انھیں لوگوں سے ہوئی ہے جو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ سب سے قدیم ریختہ کا دیوان جو اب تک دستیاب ہوا ہے سلطان قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کا ہے وہ اکبر اعظم کا معاصر تھا اور ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک برسر حکومت تھا۔

وہ فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں کا زبردست شاعر تھا۔ فارسی میں قطب شاہ اور دکھنی میں معانی تخلص کرتا تھا۔ اس کا جانشین سلطان محمد قطب شاہ جس نے ۱۶۱۱ء سے ۱۶۲۵ء تک حکومت کی نہ صرف علم پرور معارف نواز فرمانروا تھا بلکہ خود بھی ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ اس کا تخلص فارسی میں ظل اللہ اور دکھنی میں قطب شاہ تھا۔ اس خاندان کا تیسرا فرمانروا سلطان عبداللہ قطب بھی جو ۱۶۲۵ء سے ۱۶۷۲ء تک سریر آرائے سلطنت رہا اپنے پیشروؤں کی طرح فارسی اور [illegible]
میں عبداللہ تخلص کرتا تھا۔

دہلی میں اردو شعرگوئی نے عالمگیر کے زمانے۔۔۔
فارسی شعرا ہی نے توجہ کی۔ اس وقت موسوی خاں فطرت

فارسی کے نامور شعرا تھے جو کبھی کبھی اُردو میں دو چار شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ مرزا محمد رضا امید۔ میر مرتضیٰ علی خاں فراق۔ سراج الدین علی خاں آرزو وغیرہ فارسی ہی کے سرآمد شاعر تھے جنھوں نے کبھی کبھی ریختہ میں طبع آزمائی کی علاوہ بریں شاہ نجم الدین آبرو۔ شیخ ظہور الدین حاتم۔ محمد شاکر ناجی۔ شیخ شرف الدین مضمون۔ مرزا جان جاناں مظہر جو ریختہ کے آبائے قدیم کہلاتے ہیں فارسی میں بھی خوب کہتے تھے۔ ہندوؤں میں بھی رائے سرب سنگھ دیوانہ۔ لالہ لچھمی نراین شفیق۔ مہاراجہ چندو لال شاداں وغیرہ فارسی کے زبردست شاعر تھے اور اُردو شاعری میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ رائے سرب سنگھ دیوانہ کے متعلق مولف "گلشن ہند" کا بیان ہے کہ وہ وضع مغلیت پر مرتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک رائے سرب سنگھ ہی نہیں بلکہ تمام ہندو امرا۔ روسا شرفا اور تعلیم یافتہ لوگ مغلیہ وضع قطع۔ مغلیہ تہذیب و تمدن۔ مغلیہ طرز رہائش کے شیفتہ و دلدادہ تھے بہر حال جب ثابت ہوچکا کہ ابتداءً اردو شعرا کی کوئی الگ جماعت نہ تھی بلکہ فارسی شعرا ہی گاہ بگاہ ریختہ کی ایک آدھ غزل لکھ لیا کرتے تھے تو یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونوں قسم کے اشعار میں یکساں خیالات۔ جذبات اور مضامین ادا کئے جائیں۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ جب دو چشموں کا منبع ایک ہی ہو تو دونوں کے پانی کی نوعیت و خاصیت ایک طرح کی ہوگی۔ فارسی اور اردو اشعار دونوں ایک ہی دماغ کی پیداوار۔ ایک ہی ذہن کا نتیجہ فکر۔ ایک ہی قلب کے جذبات و کیفیات کا آئینہ تھے اس لئے ان کے مضامین و اسلوب

بیان کی ہونگی یہ بالکل ایک قدرتی بات تھی اگر کوئی شخص اپنے خیالات کا اظہار ایک ایسی اجنبی زبان میں کرنا چاہے جو نمو یافتہ ہو اور جس کے نحوی و عروضی اصول و ضوابط مقرر ہو چکے ہوں تو اس کو اس زبان کے اصول و قواعد کی پیروی کرنی ہوگی۔ لیکن اردو بولی کوئی ادبی زبان نہ تھی اور نہ اس کے اصول و قوانین مرتب ہوئے تھے۔ اس لیے جب اول اول فارسی شعرا نے اسے اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا آلہ بنایا تو ان کو فارسی ہی کے علم بیان و معنی کی پابندی کرنی پڑی اور انھوں نے فطری طور پر وہی وزن وہی بحریں۔ وہی ردیف۔ وہی قافیے۔ وہی تشبیہیں۔ وہی استعارے۔ وہی تلمیحیں۔ وہی تمثیلیں۔ وہی کنائے اور وہی محاورے اختیار کئے جو فارسی شاعری کے لوازمات تھے اور جن سے نہ صرف شعرا بلکہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف تھا۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اردو شعرا نے فارسی کی نقالی کی، ٹھیک ویسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے قلی قطب شاہ نے قلی قطب شاہ کی آرزو نے آرزو کی۔ مضمون نے مضمون کی۔ مظہر نے مظہر کی۔ لچھمی نراین نے لچھمی نراین کی اور سرب سنگھ نے سرب سنگھ کی تقلید و نقالی کی جو بالکل مہمل اور بیوقوفی کی بات ہو۔ اردو شاعری جن حالات و واقعات کے تحت معرض وجود میں آئی ہے اُن کے مدنظر اس پر تقلید یا نقالی کا الزام عاید ہو ہی نہیں سکتا۔ اردو شاعری فارسی سے پیدا ہوئی اسی کے دامن میں تربیت پائی اسی کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا۔ اسی سے تغذیہ و تقویت کا مواد حاصل کیا۔ جو شخص جس معاشری فضا اور سماجی ماحول میں تربیت پاتا ہے وہ اس کے جذبات و خیالات اور عادات و خصائل سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح اردو شاعری کے لئے جو فارسی شاعری کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاکر پروان چڑھی اپنی مادر مہربان کے خصائص اختیار کرنا ایک قدرتی فعل تھا۔

اگر بفرض محال فارسی کو اردو سے اس بیٹی کا تعلق نہ ہوتا بلکہ دوسری دیسی زبانوں کی طرح اُردو بھی فارسی سے بیگانہ ہوتی تو بھی اردو شعرا فارسی ہی کو اپنے لئے مشعل راہ بناتے۔ کیونکہ فارسی ہندوستان میں سب سے مہذب۔ شستہ۔ پختہ۔ ترقی یافتہ۔ وسیع۔ حاکم و مقبول زبان تھی۔ سنسکرت زبان مدت ہوئی مردہ و متروک ہو چکی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں اس سے بیگانہ و ناآشنا تھے۔ اس کے حریم ناز میں صرف چند برہمن علما کو باریابی حاصل تھی بھاشا کی شاعری ہندو و مسلمان امرا کی سرپرستی میں ترقی کے مدارج

گئی تھی اور اپنے سرپرستوں کے پسند و مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے محکوما نہ حیثیت سے فارسی کا رنگ و اثر قبول کرنے پر مجبور تھی۔ اس کا معیار فارسی بہت ادنیٰ و پست تھا۔ اردو شعرا ادنیٰ و پست معیار ترک کر کے فارسی کے اعلیٰ و ملوکانہ معیار کو پیش نظر رکھنے میں بالکل حق بجانب تھے جو ہندوؤں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی بھاشا سے ناآشنا اور فارسی کا دلدادہ تھا کیونکہ مہذب و اعلیٰ سوسائٹی میں عزت و وقعت حاصل کرنے کا ذریعہ فارسی تھی۔ یہاں ایک سوال یہ کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی دور کے ا

ریختہ گوئی تھی اور جو فارسی شاعری میں کافی مہارت

کیوں کیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے جس زمانے میں

چند غزلیں لکھ لیا کرتے تھے اسی وقت اردو شاعری کا پورا ...

ہوتے اردو شاعری نے مستحکم ہیئت اور مستقل صورت اختیار کر لی تھی جس میں تغیر و تبدل دشوار تھا۔ علاوہ بریں ارتقائی مدارج جلد سے جلد طے کر کے ترقی کی معراج کمال حاصل کرنے کے لئے کسی اعلیٰ نمونہ کو پیش نظر رکھنا ضروری تھا۔ فارسی کا رواج کم ہونے پر بھی ہیئت اجتماعیہ کی دلچسپیاں بھاشاؤں سے کہیں زیادہ فارسی ہی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ فارسی کے شاعر اگرچہ کم پیدا ہونے لگے لیکن اردو کے ساتھ اگر کوئی شاعر فارسی اشعار بھی کہہ لیتا تو معاشرہ کی نگاہ میں اس کو بڑی عزت و وقعت حاصل ہوتی تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک شعرا اپنی فارسی سخن سنجی پر ناز کرتے آئے تھے چنانچہ آزردہ۔ شیفتہ اور غالب اس بنا پر بڑی وقعت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں کہ وہ کلام ریختہ کے علاوہ فارسی دواوین بھی بطور یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ جب آخر آخر وقت تک فارسی کی اتنی قدر و منزلت تھی تو اردو شعرا بجز فارسی شاعری کے اور کسے اپنا خضر راہ بناتے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ شعرائے ابعد نے فارسی شاعری کو مشعل راہ کیوں بنایا۔ وہ آزادانہ نئی نئی راہیں نکالنے میں کیوں نہ مشغول ہو گئے اور بغیر تقلید کے صرف اپنے ذاتی تجربے و مشاہدے کی بنا پر کیوں نہ مدارج ارتقائی طے کئے؟ واضح رہے کہ کسی زبان کی ترقی کسی قوم کی تمدنی ترقی کے مشابہ ہوتی ہے۔ دنیا کی متمدن قومیں دو قسم کی ہیں، ایک وہ جو دور توحش سے نکل کر دور حجری۔ دور فلزی۔ دور شبانی۔ دور زرعی

دورِ وحشی۔ دورِ صنعتی۔ دورِ کارخانجاتی وغیرہ طے کرکے ہزاروں سال کے بعد تہذیب و تمدن کے اعلیٰ زینے پر پہنچی ہیں۔ دوسری وہ قومیں ہیں جو ممالکِ متمدنہ کے مہذب دستور و آئین کو پیشِ نظر رکھ کر تھوڑے ہی عرصے میں تمام ارتقائی مراحل طے کرکے شائستہ بن گئی ہیں۔ اول الذکر کی مثال انگریزی یا جاپانی قوم ہے۔ امریکی قوم ثانی الذکر کی بہترین مثال ہے۔ اس قوم نے ۱۷۷۶ء میں اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ جمہوریہ قائم کی دستور مرتب کئے۔ زراعت و تجارت اور صنعت و حرفت میں ترقی کی اور ڈیڑھ صدی میں تمام اقوامِ عالم پر سبقت لے گئی۔ اگر یہ قوم ممالکِ متمدنہ کے دستور و آئین کو اپنا راہبر نہیں بناتی بلکہ ابتدا سے ارتقا کا ایک ایک زینہ طے کرنے لگتی تو آج وہ زیادہ سے زیادہ ایک نیم مہذب قوم ہوتی۔ زبان کی ترقی کا بھی یہی حال ہے بعض زبانیں تمام تمدنی مدارج کے ساتھ ساتھ اپنے ارتقا کے مراحل طے کرتی ہیں اور صدیوں بلکہ قرنوں کے بعد پختہ و شستہ بنتی ہیں۔ مثلاً انگریزی زبان نے کئی صدیوں کی لگاتار ترقی کے بعد اپنی موجودہ حیثیت اختیار کی ہے۔ بالعموم ہیئتِ اجتماعیہ ترقی کے جس زینے پر ہوتی ہے اسی زینے پر اس کی ادبی زبان بھی رہتی ہے۔ اور جوں جوں معاشرتی معاملات ترقی کرتے ہیں اور جذبات و خیالات میں لطافت پیدا ہوتی ہے ویسے ویسے زبان بھی شستہ اور پختہ ہوتی جاتی ہے لیکن بزمی زبانیں اس قاعدے کی پابند نہیں ہوتیں۔ اردو زبان جن قوموں کے تصادم سے پیدا ہوئی تھی وہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ زینے پر پہنچ چکی تھیں ان کے خیالات میں لطافت اور جذبات میں پاکیزگی پائی جاتی تھی جن کے اظہار کے لئے زبان کا شستہ اور پاکیزہ ہونا لازمی تھا اردو بولی لین دین کی ضرورتوں کو تو پورا کرسکتی تھی لیکن نفیس و نازک خیالات لطیف و پاکیزہ جذبات اور ادق و پیچیدہ علمی مسائل کے اظہار کی اس میں صلاحیت نہ تھی اس لئے شعرائے ریختہ کو لامحالہ ایک ترقی یافتہ زبان کا سہارا ڈھونڈنا پڑا۔ انھوں نے فارسی کا اعلیٰ نمونہ پیشِ نظر رکھ کر ارتقائے لسانی کے تمام منازل حیرت انگیز سرعت کے ساتھ طے کرلئے اور دو ہی صدیوں میں اردو کو اس اعلیٰ زینے پر پہنچا دیا جہاں تک صعود کرنے میں دوسری زبانوں کو ایک ایک ہزار سال لگے ہیں۔ ہمارے قدیم شعرا کے اس محیر العقول کارنامہ کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اگر شعرائے متقدمین فارسی شاعری کو خضرِ راہ نہیں بناتے تو اردو زبان ابھی ارتقا کے ابتدائی مدارج طے کرتی رہتی اور زیادہ سے زیادہ اس میں

صرف قصہ کہانی بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہوتی۔ اس کی شاعری اعلیٰ امور ذہنیہ و روحانیات قلبیہ۔ کیفیات روحانی۔ جذبات لطیفہ و خیالات پاکیزہ سے یکسر خالی ہوتی۔

"تاریخ ادبیات اردو" کے فاضل مؤلف مسٹر بکسیلنہ نے اپنی کتاب کے تیسرے باب میں اردو شاعری پر فارسی کی نقالی کا الزام عائد کرتے ہوئے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو شاعری کے مضامین اور تلمیحات کو اس ملک سے کوئی تعلق نہیں اور
دیا جاتا ہے وہ ہندوستان کی پیداوار نہیں ہیں اور ان
ہو چکا ہے کہ سیاسیات کی طرح ادب و شاعری ملکی و جغرافی
یورپی ادبیات کی تلمیحات زیادہ تر یونانی و رومی صنمیات
یہ تلمیحیں عیسائی دنیا کے لئے بیگانہ ہیں لیکن مغربی ادبیات کا وہ سرمایہ ہیں۔ ادبیات کا ہر متعلم ان سے واقف ہے اس لئے وہ ان سے پوری طرح حظ اندوز ہوتا ہے۔ جس زمانے میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی تھی اس وقت ہندوستان میں فارسی کا اس قدر چرچہ تھا کہ ہر ہندوستانی متعلم اس کی تمام ادبی روایات و تلمیحات سے اچھی طرح واقف تھا۔ البتہ اب حالات بدل گئے ہیں۔ فارسی کا چرچہ ہی اٹھ گیا اور اردو کے مقابل میں سنسکرت آمیز ہندی کا اکھاڑہ قائم ہو گیا ہے۔ جن لوگوں کے باپ دادا فارسی و اردو کے زبردست شاعر اور انشا پرداز گزرے ہیں وہ بھی آج کل سیاسی و فرقہ واری جذبات کے زیر اثر اپنی اولاد کو ہندی کی تعلیم دینے لگے ہیں۔ ممکن ہے کہ اب ان لوگوں کو جو فارسی و اردو ادب و شاعری سے بالکل ناآشنا بن گئے ہیں۔ لیلیٰ و مجنوں۔ رستم و اسفندیار۔ کوہ طور و بیستون۔ سنبل و ریحان کے نام اجنبی معلوم ہوتے ہوں لیکن پہلے یہ نام تو بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ کسی عہد کے لٹریچر پر تنقید کرتے وقت اس زمانے کے سیاسی و معاشری حالات۔ علمی و ادبی تحریکات اور لوگوں کے پسند و مذاق اور رجحانات و میلانات وغیرہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ گزشتہ واقعات کو موجودہ معیار پر جانچنا تنقید نگار کی سب سے بڑی غلطی ہے۔ اردو کی قدیم شاعری کے مخالفین کی یہی بنیادی غلطی ہے کہ وہ اس وقت کے حالات و واقعات کو آج کل کی دھندلی عینک سے دیکھتے ہیں جس پر انجمن سازیوں۔ فرقہ آرائیوں۔ جماعت بندیوں۔ سیاسی

تنگ نظریوں اور تعصب و عدم رواداری کی گرد جمی ہوئی ہے۔

یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ شاعری میں جن چیزوں سے تشبیہ و استعارے کا کام لیا جاتا ہے وہ ملک ہی کی پیداوار ہوں اور لوگوں نے انھیں جسمانی آنکھ سے دیکھا ہو۔ مثلاً کسی شاہی محل کو قصر سلیماں یا ایوان سرے دیوار کی صفائی کو آئینہ سکندر یا جام جم سے۔ بیل بوٹوں کو نگارخانہ مانی سے۔ کمروں کی کشادگی کو دل عارف کی فراخی سے۔ پائین باغ کو روضہ جنان سے۔ حوض و نہر کو تسنیم و کوثر سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن کیا یہ چیزیں کسی خاص ملک کی پیداوار ہیں یا انھیں کسی شخص نے اپنی جسمانی آنکھ سے دیکھا ہے، شاعری سائنس کی ضد ہے۔ سائنس کا تقاضہ ہے کہ ہر شے آنکھ سے دیکھی جائے خوردبین سے اس کا معائنہ کیا جائے اور وہ معمل میں تجربے کے لئے لائی جائے لیکن شاعری کا تعلق تخیل سے ہے۔ یہاں جسمانی آنکھ اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی چشم تخیل۔ شاعری سے محظوظ ہونے اور لطف اٹھانے کے لئے تشبیہ و استعارے کی چیزوں کو چشم تخیل سے دیکھ لینا اور ذہن میں ان کا صاف تصور قائم ہو جانا کافی ہے جس زمانے میں اردو شاعری معرض وجود میں آئی اس وقت فارسی کا دور دورہ تھا اور ہندوستان کا ہر تعلیم یافتہ گھرانا اس کی تلمیحات روایات، تشبیہات و استعارات سے مانوس اور واقف تھا۔ اوپر بتایا جاچکا ہے کہ فارسی شاعری کا سرمایہ قدرتی قانون اور فطرتی اصول کے تحت اردو میں منتقل ہوا۔ اب یہ تمام سرمایہ اردو شاعری کا جزو بدن بلکہ روح رواں بن چکا ہے جو کسی طرح جدا نہیں ہو سکتا۔ اردو شاعری اب مستقل ہیئت اختیار کر چکی ہے جس طرح دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کا مخصوص سرمایہ ہوتا ہے اسی طرح اردو شاعری کی خصوصیات بھی معین و مقرر ہو چکی ہیں۔ اگر انگریزی یا سنسکرت زبان کسی اجنبی قوم کی سہولت کے لئے اپنے مقررہ اصول و ضوابط یا اساطیر و روایات سے دستکش نہیں ہو سکتی تو اردو زبان بھی ملکی سرمایہ اور ہندی تشبیہوں کے خواہشمندوں کے لئے اپنی شاعرانہ خصوصیات ترک کر کے اپنی مستقل ہیئت اور پاکیزہ صورت کو بگاڑنا گوارا نہیں کر سکتی۔

نقالی کے الزام کے ضمن میں اردو شاعری پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے مضامین اور الفاظ بھی محدود ہیں۔ وہی مضمون بار بار دہرایا جاتا ہے جسے اساتذۂ فارس اپنے اشعار میں ہزاروں بار باندھ چکے ہیں۔ نئے مضامین کے فقدان نے شعرا کو ایک عظیم الشان و مستقل علم معنی و بیان کی بنیاد رکھنے

پر مبذول ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو ایسی بات کہنی ہو جسے قدما ہزاروں بار کہہ چکے ہوں تو اس کو پھر ادا کرنے کے
لئے کوئی خاص اسلوب مقرر ہونا ضروری ہو۔ اس لئے ایک ہی بات کو نئے نئے انداز سے اور نئی نئی بندشوں
اور ترکیبوں کے ساتھ بیان کرنے کے لئے علم معنی و بیان کی سختی سے پیروی ہونے لگی جس سے اردو شاعری
کا بازار تصنعات و تکلفات سے بھر گیا۔ صرف یہی نہیں کہ اردو شاعری میں تکلفات و تصنعات کی کثرت ہو
بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ وہی استعارے وہی تشبیہیں ا . . . دہرائی جاتی ہیں۔ آئینہ فطرت کے
مشاہدے کا اس میں کہیں پتہ نہیں یعنی ذاتی تجربے و مشا
الغرض شاعری ایک بے تلی چیز ہوگئی جو کبھی کم ہوتی ہے
عرفی۔ قدسی وغیرہ کے مقابل کا یا ان کے رنگ پر
کی رفعت یا وسعت کی بجائے وہ صرف زبان کی صفائی ۔
بندش کی چستی۔ ترکیب کی درستی وغیرہ کا انھیں بڑا خیال رہتا تھا۔ الغرض ان کی پوری توجہ صرف زبان کی
کی صحت و صفائی پر مبذول رہتی تھی۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ان تمام پابندیوں کی وجہ سے حقیقی جذبات
کے اظہار میں رکاوٹ پیش ہوتی ہے اس لئے تمام تکلفات و تصنعات اور مقررہ تشبیہات و استعارات
کو ترک کر کے سیدھی سادی اور فطری زبان اختیار کرنی چاہئے تاکہ ہر قسم کے خیالات و جذبات کی ترجمانی
میں سہولت پیدا ہو۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو شاعری پر محدودیت و رسمیت۔ تقلید و نقالی اور تکلف و تصنع
کا جو الزام عاید کیا گیا ہے وہ بذات خود انگریزی خیالات کی کورانہ تقلید و نقالی اور غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ
ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے اواسط میں مغرب کی ادبی دنیا کلاسیت و رومانیت کی جنگ میں
مشغول تھی۔ قدیم شاعری کے خلاف ہر طرف علم بغاوت بلند کیا جا رہا تھا۔ پوپ کے زمانے کی شاعری شہری
زندگی۔ حیات انسانی اور معاشری معاملات کی ترجمان تھی۔ شعرا کی زبان نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ نحوی و عروضی
اصول کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اس لئے اس زمانے کے ادب و شاعری کو ادب العالیہ یعنی کلاسیکل
لٹریچر کا معزز لقب دیا گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد یہاں بغاوت و رومانیت کا دور آیا۔ شہری زندگی

سے بیزاری کا اظہار کیا جانے لگا۔ شعرا نیچر پرستی کی طرف مائل ہو گئے اور داخلی شاعری کو چھوڑ کر سب کے سب خارجی شاعری پر پل پڑے۔ وصف نگاری اور تصویر کشی شاعری کا اعلیٰ مقصد قرار پائی۔ کلاسیکل شاعری پر یکسانیت و بیت کا الزام عائد کیا جانے لگا۔ اصول و ضوابط کے سارے بندھن توڑ دئے گئے اور تمام شعرا نیچر کے اونٹ بن گئے۔ ورڈس ورتھ جیسے ملک الشعرا نے بھی مقررہ پوئٹک ڈکشن (شاعرانہ لفظیات) کو نہ صرف بے سود بلکہ مضر قرار دیا۔ فصاحت و بلاغت کو تکلفات و تصنعات کا مرادف خیال کیا جانے لگا۔ ہر شخص سادہ اور نیچرل زبان کا شیدائی بن گیا۔ یہاں تک کہ اس بغاوت و انقلاب نے ادبی معیار کو نہایت پست بنا دیا۔ بقول الفرڈ نائس شاعری وحشت و بربریت کی جانب راجع ہو گئی۔ ادبی لطافت و پاکیزگی خاک میں مل گئی۔ رسمی و روایتی اصول و ضوابط سے منہ موڑ کر انقلابی شعرا اپنے بے قاعدہ و بے ہنگام کلام کو "آزاد شاعری" تصور کرنے لگے جس پر مسٹر چسٹرٹن کا چبھتا ہوا فقرہ قابل ذکر ہے کہ "تم گڑھے میں سور رہو اور اسے آزاد محل سمجھ لو" بہرحال یہی وہ زمانہ تھا جب اہل ہند کے کان انگریزی ادب و شاعری سے "نیم آشنا" ہوئے۔ نیم آشنا اس لئے کہ ابتداءً صرف چند درسی کتابوں کا انگریزی سے ترجمہ ہوا تھا۔ اور ان درسی کتابوں میں گئے۔ بلی۔ کوئل۔ سمندر۔ خاور دیم وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں درج تھیں جن پر ہر عہد کے بلند پایہ انگریزی کلام کی نوعیت و ماہیت کا گمان کر لیا گیا۔ چنانچہ ۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ناظم تعلیمات پنجاب کے مشورے سے لاہور میں اس عجیب و غریب مشاعرے کی طرح ڈالی گئی جسے جدید اردو شاعری کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ صرف یہ تھا کہ شعرا بجائے کسی مصرع طرح پر طبع آزمائی کرنے کے کسی مضمون پر نظم لکھ کر لاتے تھے۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت وحدت خیال اور سادگی زبان تھی۔

بہرکیف انگریزی ادب سے صورت آشنا ہوتے ہی "دانایان فرنگ" کی لغت تراشنے والوں نے گدایانہ انجذاب و غلامانہ تقلید سے کام لیا۔ رومانیوں کے خیالات کو بمنزلہ وحی کے سمجھ لیا۔ کلاسیکل شاعری پر انگلستان میں جو کچھ اعتراضات کئے جاتے تھے اور پوپ اور اس کے دبستان پر جتنے الزامات قائم ہوئے تھے وہ سب کے سب قدیم شعرائے اردو پر عائد کر دئے گئے۔ لیکن اب خود "دانایان فرنگ" نے اپنی

پلٹ بدل دی ہے اور انگلستان میں اب قدیم شاعری کی حمایت کی جا رہی ہے۔ سر والٹر ریلے کا بیان ہے کہ "انسانی نسل اپنے فوری پیشرووں کے ساتھ ناانصافی کرتی آئی ہے۔ وہ بچہ نہایت خوش نصیب اور سعادتمند ہے جو اپنے باپ کی خوبیوں کو پہچانے اور سمجھے کہ اس کا باپ بھی جدید نظام تمدن کے ایک نمائندے کی حیثیت سے قومی ترقی کے ہزاروں کے ساتھ کوچ کر رہا تھا۔ ورنہ بالعموم لڑکے باپ کی کارگزاریوں کو بھول جاتے ہیں لیکن دادا کے کارناموں کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ... قربت بے وقعتی کا باعث ہوتی ہے اور قدامت کے ساتھ ...

ہمدردی ایک نسل اوپر اچھلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں ...

خلاف ایک ہنگامہ برپا تھا اور ہر شخص اسے برا کہتا تھا لیکن ...

اس کی خوبیوں کو پہچاننے لگی ہے۔" بہرحال انگلستان میں کلاسیکی ...

ومعاشری حالات وواقعات کی بنا پر اٹھایا گیا ہو خواہ سر والٹر ریلے کے بیان کردہ نظریہ ارتقا کا نتیجہ ہو لیکن ہندوستان میں قدیم شاعری سے بغاوت کی محرک محض حکوموں کی حاکم سے مرعوبیت اور غلامانہ ذہنیت تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری کے اور خصوصاً غزل کے الفاظ محدود، معین اور مخصوص ہیں لیکن یہ فارسی شاعری کی نقالی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ مقتضائے شاعری یہی ہے کہ جو الفاظ مدت سے استعمال ہونے کی وجہ سے کانوں میں رچ گئے ہیں اور زبانوں پر بار بار آنے سے شیریں اور خوشگوار ہوتے ہیں ان کی جگہ غریب و اجنبی الفاظ نہ لائے جائیں ورنہ شعر کی لطافت، دلچسپی، مزہ اور تاثیر میں فرق آ جائے گا۔ ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کی شاعری میں فصیح و بلیغ اور لطیف و پاکیزہ الفاظ کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ انگریزی میں بھی نظم کے الفاظ بہ مقابلہ نثر کے زیادہ شاندار و شیریں ہوتے ہیں۔ اسی لئے شاعری کی مخصوص زبان کو وہاں اصطلاحاً پوئٹک ڈکشن (الفاظ بندی) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں غزل چونکہ سب سے لطیف، رنگین، دلکش اور پر اثر صنف سخن ہے اس لئے یہاں غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال بدرجہ غایت ناگوار سمجھا جاتا ہے۔ غزل میں کسی نامانوس، ثقیل، کرخت، مبتذل، علمی، اصطلاحی، ادق یا

متعلق لفظ کا استعمال لطافت شعری کو زائل کر دیتا ہے خواہ وہ لفظ اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے کتنا ہی موزوں و مناسب کیوں نہ ہو اس سے اہل مذاق و ماہرین فن نے ایسے الفاظ کے استعمال کو معائب سخن میں شمار کیا ہے۔ یہ عیب زیادہ تر ان خشک شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے جن کا ذوق جمالیات بالکل بودا اور پست ہوتا ہے اور جن کی شاعری کو سوز و گداز سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس قماش کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

رشک۔

فتراک یار پر نہ پڑے میرے دھڑ کا بوجھ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جب ہو چکا شکار یہ دھڑ کا لگا رہا

ناسخ۔

عارفوں کو ہر در و دیوار ادب آموز ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مانع گردن کشی ہے انحنا دیوار کا

عرش۔

ہم جو مکاں میں آئیں گے لے یار ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ غیر ہیں کیا ان کے پدر جائیں گے

اختر۔

حلقۂ چشم کو پابوسی کی حسرت ہے بہت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ آنکھ میں بھی تع پاپوش سا دو صاحب

بیخود۔

حشر تک کیوں بات جائے کیوں پڑی غیروں کے منہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گھر میں سمجھوتا ہمارا آپ کا ہو جائے گا

نہ دبا غیر سے باتوں میں بڑی بات رہی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گو وہ نازک ہے مگر دل کا کرارا نکلا

عارف۔

عطا کر لذت درد جگر پھر اک دفعہ یا رب ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ دل ناشاد کو میرے کہیں پھر مبتلا کر دے

حالی۔

کاوش میں ہے الٰہی وگدا میں ہے طبیعی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا

یہاں خط کشیدہ الفاظ یعنی دھڑ۔ انحنا۔ پدر۔ تع۔ سمجھوتا۔ کرارا۔ اک دفعہ۔ وگدا اگرچہ معنی

کے لحاظ سے صحیح ہیں اور جس خیال کے اظہار کے لئے وہ استعمال کئے گئے ہیں اسے پورا پورا ادا کر دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ الفاظ بقول مولانا حسرت موہانی غیر شاعرانہ ہیں اس لئے ان کی وجہ سے غزل کی لطافت حلاوت، خوشگواری و دلپذیری کا خون ہو گیا۔ ایسے الفاظ شاعر کی بدمذاقی یا غفلت و لاپروائی پر دلالت کرتے ہیں۔ جو لوگ ثقہ و صاحب مذاق ہیں وہ اپنے کلام کا دامن غیر شاعرانہ الفاظ کے دھبے سے پاک رکھتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت شاعرانہ اور غیر شاعرانہ الفاظ کی فہرست [illegible]

غیر شاعرانہ نہیں ہوتا البتہ اس کا غلط استعمال غیر شاعرانہ
استعمال ہوئے وہاں وہ ضرور ناموزوں ہیں اور مذاق سلیم
موقع و محل پہچانتا ہے انھیں الفاظ کو ایسے انداز سے باندھے
مرادف وہاں رکھے جائیں تو کانوں کو کھٹکنے لگیں گے۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ کیا فی الحقیقت الفاظ کے محدود و مخصوص ہونے کی وجہ سے اظہار خیال میں رکاوٹ پیش ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ جو خیال اپنے اظہار کے لئے جن الفاظ کا متقاضی ہو انھیں کے ذریعے اسے ادا کر دینا نثر کا کام ہے نہ کہ شاعری کا۔ شاعر ہمیشہ ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو ذوق جمالیات پر بار نہ گزریں اور حسن کاری کے منافی نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ بعض موقعوں پر کسی خاص معنی و مفہوم کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی خوشگوار و نفیس شاعرانہ لفظ نہ ملے۔ لیکن ایسی صورت میں بھی شاعرانہ مذاق سلیم غیر شاعرانہ لفظ کے استعمال سے اجتناب کرتا ہے اور کسی قریب المطلب شاعرانہ لفظ کے مرادی معنی سے اظہار مدعا کرتا ہے۔ مثلاً مرزا غالب فرماتے ہیں ؎

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اسکو دم آگے

مطلب یہ ہے کہ ہم جسے پہلے دم یعنی سانس سمجھے ہوئے تھے وہ ایک موج خون کی پرافشانی ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خیر دل میں تو موجۂ خون پیدا ہوتا ہے لیکن دل و جگر کو سانس سے کیا تعلق؟ یہاں بجائے دل و جگر کے دل اور پھیپھڑا کہنا چاہئے تھا پھیپھڑے کو عربی میں "ریہ" اور فارسی میں "شش" کہتے ہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جب اردو کا کوئی لفظ غیر فصیح معلوم ہو تو شاعر اس کا عربی یا فارسی

مرادف استعمال کرتا ہے مگر یہاں تینوں لفظ غیر شاعرانہ ہیں لہٰذا نکتہ فہم و بلاغت شناس شاعر نے "جگر" کا صحیح و شاعرانہ لفظ استعمال کرکے اس سے "پھیپھڑا" مراد لیا۔ الغرض شاعر کبھی ایسا لفظ استعمال نہیں کرتا جو ذوقِ سلیم پر گراں گزرے۔ شاعری تمام فنونِ لطیفہ کی سرتاج ہے۔ یہاں ذوقِ جمالیات و شوقِ نفاست پسندی کی مقتضیات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

یہ امر ذہن نشین رہے کہ شاعر کا مقصد صرف ما فی الضمیر کو سیدھے سادے یا مناسب الفاظ میں ظاہر کر دینا نہیں ہے۔ یہ کام تو نثر نگار کا ہے۔ اپنے خیالات و جذبات کی ہو بہو تصویر کھینچ دینا بھی شاعری کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ افسانہ نگار کا فریضہ ہے۔ شاعر نہایت موزوں و منتخب الفاظ کے ذریعے سے مختلف ذہنی کیفیتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے انگریزی میں "سجیشن" (Suggestion) کہتے ہیں۔ الفاظ کے لغوی معنی کچھ ہوں لیکن اگر وہ اپنی اشارتی و ایمائی قوت سے شاعر کے مفہوم کو ادا کر دیں اور سامع کے ذہن میں وہ کیفیت پیدا کر دیں جو شاعر کا مقصود ہے تو وہ کامیاب شاعر کہلائے گا۔ شاعری کی زبان نثری زبان کی طرح کسی جذبہ۔ خیال۔ منظر یا واقعہ کی عکسی تصویر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص کیفیت کی علامت ہوتی ہے خواہ وہ سرور و انبساط کی کیفیت ہو یا رنج و انقباض کی۔ حیرت و استعجاب کی ہو یا غیظ و غضب کی۔ حسرت و یاس کی ہو یا امید و نشاط کی۔ ہر چند شاعر کے الفاظ و کلمات لغت نحو اور منطق کے ترازو میں پورے نہ اترتے ہوں تاہم اگر وہ ان کے ذریعے سے سامع کے دل پر مطلوبہ کیفیت طاری کر دے تو اس کی شاعری کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ الغرض شاعری میں کمی الفاظ کی تلافی ان کی ایمائی قوت سے ہو جاتی ہے۔ اگر شاعری کے الفاظ محدود و مخصوص ہیں تو شاعر کو اس کی پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ ایک لفظ سے سامع کے ذہن کو بیسیوں معنی و مفہوم اور تلازمات و ایتلافات کی جانب منتقل کر سکتا ہے۔ مذکورہ بالا شعر میں مرزا غالب نے جگر کے لفظ سے پھیپھڑے کی طرف اشارہ کرکے اپنا مطلب اچھی طرح ادا کر دیا ہے۔

بعض اوقات بالکل بے ربط الفاظ کے اجتماع اور بے معنی جملے سے شاعر کسی خاص کیفیت کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ پروفیسر ابر کراچی نے اپنی کتاب "نظریہ شاعری" میں انگریزی شعراء کے کلام سے

اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ چنانچہ ایک مثال ولیم موریس کی اُس نظم کی ہے جس میں ایک مسحور لڑکی کی سانحہ درج ہے جب لوگ اس کو دیکھنے کے لئے جاتے تھے اور اس کی حالت پر افسوس کرتے تو وہ کہتی تھی کہ ؎

میرے لئے تم کیوں ہو ملول   چاند میں دیکھو سوسن کے پھول

معترضین کہتے ہیں کہ یہ شعر بالکل طفلانہ اور مہمل ہے جبلا چاند کو ... اس کا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ لڑکی یہ کا ... کا خیال ہے کہ اگرچہ یہ مصرع یعنی "چاند میں دیکھو سوسن کے ... ہوتا ہے تاہم شاعر اس مسحور لڑکی کے دماغی اختلال کی کیفیت ... موقع و محل کا تقاضا یہی تھا کہ لڑکی کی زبان سے بے ربط و بے سی جملہ ادا کرایا جاتے تا کہ قارئین کو معلوم ہو کہ وہ جادو کے اثر سے مخبوط الحواس بن گئی ہے اور چاند کے سیاہ دھبے اسے سوسن کے پھول معلوم ہوتے ہیں۔

چونکہ شاعر کا منشا یہ نہیں ہے کہ وہ کسی شے کے متعلق مناسب الفاظ کے ذریعے سے وافر معلومات بہم پہنچائے بلکہ اس کا مقصد کسی خاص حالت یا کیفیت کی طرف محض اشارہ کر دیتا ہے اس لئے شاعر بسا اوقات تمام واقعات کو سلسلے کے ساتھ بیان نہیں کرتا اور نہ تفصیلات و جزئیات میں الجھنا پسند کرتا ہے بلکہ صرف اہم و امتیازی امور کو لے کر انہیں باہم منسلک و مربوط کر دیتا ہے اور درمیانی کڑیوں کو ملانے اور کھانچوں کو پر کر لینے کی خدمت سامعین پر چھوڑ دیتا ہے اگر سننے والے کا ذہن فوراً محذوفات کی طرف منتقل نہ ہو اور چھوٹی ہوئی کڑیوں کو دریافت کرنے میں وقت پیش آئے تو سمجھنا چاہئے کہ شاعر نو مشق ہے اور اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا لیکن بلاغت شناس ماہرین فن کا کلام ہر قسم کی لفظی و معنوی تعقیدوں سے پاک ہوتا ہے۔ ان کا شعر سنتے ہی ہمارا ذہن آسانی کے ساتھ خلا کو پر کر کے اصل معنی و مفہوم تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ مومن کا ایک شعر ہے کہ ؎

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا   مجکو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

ممکن ہے کہ منطقی دماغ کو دونوں مصرعوں میں کوئی تعلق نظر نہ آئے اور وہ اس شعر کی گتھی سلجھانے سے قاصر رہے لیکن اہل نظر جانتے ہیں کہ باکمال شاعر نے صرف چند الفاظ میں معاملہ عشق کی ایک پوری داستان بیان کر دی ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے پاس بیٹھا ہوا نیاز عشق پیش کر رہا ہے۔ معشوق نے ایک رقیب کو بے قصور اور بلا وجہ پامال کر دیا ہے جس کی خبر عاشق کو ہو چکی ہے۔ معشوق عاشق کی طرف مائل تو ہے لیکن اس کو رہ رہ کے خیال ہوتا ہے کہ عدو کی بے وجہ و بے جرم پامالی کی وجہ سے ممکن ہے کہ عاشق میرے التفات کی قدر نہ کرے یا مجھ سے بدظن ہو جائے یا سمجھ لے کہ اس کا بھی وہی حشر ہونے والا ہے جو عدو کا ہوا۔ ان خیالات کے آنے سے معشوق عاشق سے رک رک کے مل رہا ہے۔ عاشق نے معشوق کی دلی کیفیتوں کا اندازہ کر لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ یہ خیال معشوق کے دل سے نکل جائے۔ وہ معشوق سے کہتا ہے کہ میں وفادار عاشق ہوں۔ تم میرے ساتھ کیسا ہی سلوک کرو میں کبھی عشق و محبت سے منہ موڑنے والا نہیں۔ اگر مجھے بھی عدو کی طرح بے جرم پامال کر دو تو اس کی مجھے مطلق پروانہ ہو گی۔ اس لئے تم التفات کئے جاؤ۔ تمہارے سر کی قسم مجھے نتیجے کا کچھ خیال نہیں۔ اتنی طویل داستان کو صرف دو مصرعوں میں بیان کر دینا کمال شاعری کی دلیل ہے۔ یہاں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ الفاظ کی کمی سے شاعر کے اظہار خیال میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں ہوئی جتنی کڑیاں چھوٹ گئی تھیں انھیں سامع کے ذہن نے دریافت کر کے پورے مفہوم پر عبور حاصل کر لیا۔ ایسا ہی مرزا غالب کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ہاں وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی   جس کو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

محذوفات کے باوجود اس شعر کے پڑھنے سے ایک خاص حالت کی مکمل تصویر چشم تخیل کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ عاشق کا شیشۂ دل مے عشق سے لبریز ہے۔ اس کو اپنی بھلائی برائی یا نیک نامی و بدنامی کا کچھ خیال نہیں ہے۔ اس کو اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں کہ معشوق باوفا ہے یا بے وفا۔ دوست احباب ناصح مشفق بن کر عاشق دلگیر کو سمجھانے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم نے جس سے دل لگایا ہے اور جس کی محبت میں دین و دنیا سب کچھ بھلا بیٹھے ہو وہ بالکل بے وفا ہے۔ اس کو تمہاری نیاز آگینیوں اور

چالوں شاریوں کی عشق قدر نہیں۔ ایسے ظالم سفاک۔ اور بیوفا معشوق سے دل لگانا کسی طرح مناسب نہیں عاشق کو نصیحت نہایت تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ وہ جھلا کر کہتا ہے کہ جو شخص اپنے دل و جان کو عزیز رکھتا ہے اس کو میدان عشق میں قدم رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں پہلے ہی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں تب عاشق بنا ہوں۔ میرا عشق وفا کا پابند نہیں معشوق [illegible] جو کچھ ہو، میں اس سے محبت ضرور رکھوں گا۔ شاعر نے شعر میں کہیں یہ بیان نہیں [illegible]

دیتے ہیں اور نہ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ عشق [illegible]

تاہم شعر سن کر ذہن خود بخود ان کھانچوں کو پر کر لیتا ہے

شاد لکھنوی کا ایک شعر بطور آخری مثال پیش

خدا مجنوں [illegible] — پس معشوق مرنا عاشق کو بدنام کرنا ہے

نحو اور منطق کی نگاہ ظاہر بیں میں یہ شعر تین بے ربط و بے تعلق جملوں پر مشتمل نظر آتا ہے۔ پہلے مصرعے میں مذہب عشق کا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے مصرعے میں اول تو مجنوں کے لئے مغفرت کی دعا کی گئی ہے اور پھر شاعر کہتا ہے کہ "مجھ کو ابھی مرنا باقی ہے"۔ بظاہر تینوں باتیں بے تعلق معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جو لوگ شاعرانہ طرز بیان کے رموز آشنا ہیں وہ انھی دو مصرعوں میں ایک طویل معاملۂ عشق کا مکمل نقشہ اور فصاحت و بلاغت کے بیسیوں نکات مضمر پاتے ہیں۔ شاعر نے پہلے دنیائے عشق کا ایک قانون بیان کیا ہے کہ عاشق کو معشوق سے پہلے یا اس کے ساتھ مرجانا چاہیے جو شخص عشق کا مدعی ہو کر اس قانون کی خلاف ورزی کرے گا وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا اور سب لوگ اسے مورد الزام و نشانۂ ملامت بنائیں گے۔ دوسرے مصرعے میں مجنوں کی مغفرت کے لئے جو دعا مانگی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ضرور کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ یہاں سامع کا ذہن فوراً اس واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ مجنوں نے لیلیٰ کے بعد وفات پائی تھی۔ معشوق کی موت کے بعد عاشق کا زندہ رہنا مذہب عشق میں جائز نہیں ہے۔ اس فقرے میں "خدا مجنوں کو بخشے" فصاحت و بلاغت کے کئی نکتے پنہاں ہیں۔ یہ عام معاشری تہذیب میں داخل ہے کہ جب کسی مرے ہوئے آدمی کا ذکر کیا

جاتا ہے یا نام لیا جاتا ہے تو بولتے ہیں کہ "حق مغفرت کرے۔ یا خدا بخشے یا غفرانہ تعالیٰ " وغیرہ۔ اس طرح کلام میں فطرت و اصلیت کی مطابقت کا عنصر بھی شامل ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مذہب عشق کے ایک قانون کی خلاف ورزی سے مجنوں پر جو گناہ لازم آیا اس کی بخشائش کے لئے دعا بھی ہو گئی۔ تیسرے یہ کہ مجنوں کا دنیائے عشق میں بہت بڑا درجہ ہے اسی لئے اس کو سید العاشقین کا معزز لقب ملا ہے۔ شاعر نے مجنوں کے ادب و احترام کا پاس رکھا ہے اور صاف لفظوں میں اس پر کوئی الزام عائد کرنے کے بجائے ایک لطیف پیرایہ میں اس کی لغزش کی طرف صرف اشارہ کر دیا ہے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے یہ فقرہ کہ "خدا مجنوں کو بخشے" معنی خیزی و بلاغت کا مخزن بن گیا ہے۔ دوسرا فقرہ کہ "ہم کو مرنا ہے" ظاہر کرتا ہے کہ کہنے والا بھی کسی کو دل دے چکا ہے اس کو ابھی عشق کی گوناگوں سختیاں اور صعوبتیں جھیلنی ہیں۔ وہ ڈرتا ہے کہ جب مجنوں جیسے عاشق کامل سے بھی غلطی سرزد ہو گئی تو میری کیا حقیقت ہے! کہیں مجھ سے بھی مذہب عشق کا کوئی اہم فریضہ ترک نہ ہو جائے۔ مجنوں تو خوش نصیب ہے کہ مرکر تمام آفتوں سے نجات پا چکا۔ لیکن مجھے ابھی نہ معلوم کتنی آفتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ شعر اشارہ کاری (سجسشن Suggestion) کی بہترین مثال ہے۔

ان تمام مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کو اپنے خیالات و جذبات کی ترجمانی کے لئے الفاظ کے بہت بڑے ذخیرے کی ضرورت نہیں ہے۔ اشعار کے الفاظ تو نہایت مختصر ہوتے ہیں لیکن ہر لفظ اپنے اندر گنجینۂ معنی پوشیدہ رکھتا ہے۔ شاعری میں الفاظ کے لغوی معنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کیونکہ ایک ایک لفظ بیسیوں حالات و کیفیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ غزل کے الفاظ معین محدود اور مخصوص ہیں تو کیا ہوا جب کہ ہر لفظ معنی خیزی، اثر انگیزی و کیفیت آفرینی کی لامتناہی قوت کا سرمایہ دار ہے۔ کوئی نیا لفظ سامع کے ذہن میں صرف وہی مفہوم پیدا کر سکتا ہے جو اس کے لغوی معنی سے مترشح ہوتا ہے لیکن جن الفاظ کو رسمی اور قدیم کہا جاتا ہے ان کے گرد صدیوں کے استعمال کی وجہ سے بے شمار خیالات و تصورات اور تلازمات و ایتلافات جمع ہو گئے ہیں۔ جس طرح جریب کی ایک کڑی کو کھینچنے سے تمام کڑیاں متحرک ہو جاتی ہیں اسی طرح ایک لفظ کے سننے سے ذہن اس کے تمام تلازم خیالات و

تصورات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور بہت سی بھولی بسری چیزیں یاد آجاتی ہیں صحت و صفائی کے لحاظ سے بھی جدید الفاظ قدیم الفاظ کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیونکہ ثانی الذکر الفاظ مدت دراز سے منجھتے اور جلا پاتے آرہے ہیں اور زمانے کی کسوٹی پر وہ کھرے ثابت ہو چکے ہیں۔ غالب اس بنا پر اپنے الفاظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم قرار دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

پروفیسر لیبورن کا بیان ہے کہ ایسے الفاظ کا

ہوں اہل کمال ہی سے انجام پا سکتا ہے شاعری کا

جائے۔ بڑے بڑے شعرا جو الفاظ استعمال کرتے ہیں وہ . . . . .

سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان کے سنتے ہی ہمارے تمام حواس میں سنسنی پھیل جاتی ہے کوئی باکمال شاعر الفاظ کے ذریعے سے جو کچھ کہتا ہے اس سے کہیں زیادہ کیفیتیں وہ ہم پر اشارہ و کنایہ کے ذریعے سے طاری کرتا ہے۔ کسی منظر کی تصویر کشی کے لئے جہاں معمولی آدمی کو سیکڑوں الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں شاعر کی چشم حقیقت بیں صرف امتیازی خصوصیات کا انتخاب کر لیتی ہے۔ ان خصوصیات کو شاعر کی عبارت فنی صرف دو تین لفظوں میں ظاہر کر دیتی ہے لیکن یہ الفاظ منتخب روزگار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ایمائی و ارشاتی قوتوں سے منظر کی تمام ظاہری و باطنی پہلوؤں کو ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں۔ مثلاً شاعر پہاڑ کی چوٹی پر سمندر کے کنارے کھڑا ہے۔ وہ نیچے سمندر پر نظر ڈالتا ہے۔ سمندر متلاطم ہے۔ زور زور سے گرج رہا ہے لیکن پہاڑ کی چوٹی اس قدر بلند ہے کہ وہاں گرج کی آواز بالکل دھیمی پڑ جاتی ہے۔ سماعت کام نہیں دیتی مگر آنکھیں دیکھتی ہیں کہ سمندر گھٹتا بڑھتا ہے۔ موجیں مارتا ہے۔ چمکتا ہے۔ تھرتھراتا ہے۔ کنارے سے ٹکراتا ہے۔ یہ سمندر کے مظاہر ہیں جو نظر آتے ہیں۔ ان کا کن الفاظ میں اظہار کیا جائے۔ ٹینی سن کی قادر الکلامی ہو۔ وہ صرف دو لفظوں اس کی مرقع کشی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ

پر شکن سمندر نیچے رینگ رہا ہے

یہ آخری اور اعجاز نما اختصار ہے جبتک زبان قائم ہے اور انسان آنکھ کی نعمت سے بہرہ ور ہے وہ سمندر

کی اس تصویر کو ہمیشہ سراہتا رہے گا۔ آبری بردسلی (Aubrey Beardsley) کی نسبت مشہور ہے کہ وہ پنسل کی صرف چند حرکتوں سے بہترین تصویریں کھینچ دیتا تھا لیکن ٹینی سن کی طرح صرف دو لفظوں میں سمندر کی متلاطم تصویر پیش کر دینا معجزے سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہی شاعر دوسرے وقت ایک جھیل کے کنارے کھڑا ہے یہاں کا پانی سمندر کے پانی کی طرح متحرک متلاطم اور چمکدار نہیں ہے جھیل نہایت تاریک۔ عمیق۔ خاموش اور پراسرار ہے۔ پانی ٹھہرا ہوا ہے اور شام کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی تصویر وہ حسب ذیل الفاظ میں دکھاتا ہے۔

"جھیل اپنے سیاہی مائل پانی کے ساتھ محوخواب ہے"

لفظ سیاہی مائل اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے تو صرف پانی کا رنگ ظاہر کرتا ہے لیکن یہ ایسا منتخب لفظ ہے جو جھیل کی گہرائی تاریکی۔ اسرار اور خوفناک اداسی کا بھی مظہر ہے۔ غرض کہ شاعر نے ایک لفظ سے جھیل کی مختلف کیفیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سکون ٹھہراؤ اور خاموشی کا مفہوم لفظ "محوخواب" میں مضمر ہے۔ ہمارے احساسات پر اس تصویر کا جو اثر پڑتا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ نقاشی کی اصطلاح میں اسے "فضا" (Atmosphere) کہتے ہیں جو محسوس ہونے کی چیز ہے۔ الفاظ اس احساس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ لفظ "محوخواب" میں تمام علمی دیویوں (Muses) کی دلفریبیاں بھی نہاں ہیں۔ ایسے الفاظ درجہ کمال کو پہنچے ہوتے ہیں جن میں مزید ترقی یا تبدیلی کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک بار استعمال ہونے پر وہ آخری اور عین فطری معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں بغور مشاہدہ یا وافر ذخیرۂ الفاظ کا کوئی سوال ہی نہیں کیونکہ واقعات روزمرہ کے ہیں جن کو ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے اور اور شاعر کے استعمال کردہ الفاظ بھی معمولی ہیں جن سے ہر شخص واقف و مانوس ہے۔ اہل کمال کا کمال تمام واقعات میں سے اہم و امتیازی خصوصیات کے انتخاب اور تمام ذخیرۂ الفاظ میں سے موزوں و مناسب الفاظ کے استعمال میں مضمر ہے۔ ان کو ہم الہامی الفاظ کہہ سکتے ہیں۔

ایک باکمال شاعر معمولی الفاظ میں جو کثرت استعمال سے ابتذال کی حد تک پہنچ گئے ہوں نئی

رمق۔ نئی تازگی۔ نئی شگفتگی اور نئی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔ الفاظ کے معنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے بلکہ اہم چیز ان کا محل استعمال ہے۔ شاعر کی طلسم کاری ادنیٰ الفاظ سے معجز نما تصویر تیار کر دیتی ہے چنانچہ معمولی الفاظ میں موسم خزاں کی عریانی اور اداسی کا منظر ملاحظہ ہو۔

"آخری سرخ پتی جھڑ گئی"

تصویر کی خوبی کا انحصار فقرے کی چست بندش یا معنی کی باریکی
پر ہے۔ شاعر کی نظر انتخاب موسم کی نمایاں خصوصیت
کیفیتوں کو صور متحرکہ کی طرح چشم تخیل کے سامنے پیش کر دیتی ہے
ایک ٹھوٹھ۔ بے برگ و بار اور ویران درخت کی تصویر کھینچ دی
اجڑ گئے ہیں۔ طائران خوش الحان کی نوا سنجی موقوف ہو گئی ہے۔ ایک سناٹا عالم ہے۔ ہر طرف اداسی چھائی ہوئی ہے۔ البتہ سرخ کا لفظ تاریک پس منظر تصویر پر شوخ رنگ کی ایک چھینٹ ڈال دیتا ہے جس سے بعض وقت پر اسرار طور پر پوری تصویر کی ہیئت ہی بدل جاتی ہے اور جھڑنے کا لفظ منظر کو جاندار و متحرک بنا دیتا ہے۔ شاخیں ہلنے لگتی ہیں۔ اور شوخ و رنگین داغ تصویر کے چہرہ پر سے گزر جاتا ہے۔ شاعر نے قدیم ٹکسال کے معمولی سکوں ہی سے کام لیا ہے۔ باکمال شاعر کو نئے الفاظ گھڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ فن تعمیر اور فن شاعری دونوں میں قدیم طرز کی پابندی ترقی کا بہترین ذریعہ ہے۔ کلاسیکل اسٹائل (قدیم طرز) سے روگردانی بار بار بربادی کی موجب ثابت ہو چکی ہے اسی روگردانی نے رومیوں کے ہاتھوں یونانی فن کو تباہ کرایا اور گوتھی فن کی تباہی بھی اسی سے عمل میں آئی۔ شکسپیر دیوتا تھا۔ وہ اپنے خاص قوانین کا پابند تھا۔ وہ ٹکسال کا مالک تھا۔ اس نے نئے سکے مسکوک کئے اس کی دیکھا دیکھی ہر کس و ناکس کو تشکیک الفاظ کا شوق چرایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وفات کے بعد انگریزی شاعری ایسی پستی و حضیض میں گر گئی کہ ابتدائے تاریخ سے وہ کبھی ایسے ادنیٰ درجہ کو نہیں پہنچی تھی۔ کیونکہ بے آئینی کا پھول تو خوشنما ہوتا ہے لیکن پھل نہایت تلخ ہوتا ہے۔ ہر شے کی زیادتی بری ہوتی ہے یہی حال شاعرانہ تصرف کا ہے جسے غلطی سے آزادی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصرف و آزادی زبان کو وسیع بنانے کے بجائے اپنے کھوٹے

سکوں سے بازار کا نرخ بگاڑ دیتی ہے۔ شاعری میں قدیم الفاظ کو ہر حال میں جدید الفاظ پر ترجیح دینی چاہئے
نئے الفاظ کی جانچ کے وقت ان کی قدر دانی۔ موزونیت اور شیرینی کی بجائے ان کی ضرورت پر نظر کرنی
چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ کیا شاعر کا مطلب قدیم الفاظ سے ظاہر نہیں ہو سکتا تھا۔ واضح رہے کہ تصرف
شعری اور الفاظ تراشی کی ضرورت اکثر کمزور اور نو مشق شاعروں کو پیش آیا کرتی ہے۔ باکمال شعرا زبان
کا دامن نئے الفاظ کی تشکیل سے وسیع نہیں کرتے بلکہ وہ قدیم الفاظ ہی کی قوتوں کو بڑھانے اور ان
کے معنی و مفہوم کو وسیع کرنے کی کوشش کرتے ہیں ٹینس کے تمام کھلاڑی ایک ہی گیند سے کھیلتے
ہیں لیکن بعض کا طریقہ واشت (   ) حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اساتذۂ سخن معمولی الفاظ سے
کام لیتے ہیں لیکن ان کا طریقہ استعمال محیر العقول ہوتا ہے۔ باکمال شعرا مبتذل الفاظ کو بھی معنی
خیز بنا دیتے ہیں اور ان کی مدد سے بہترین تصویریں تیار کرتے ہیں لیکن معنی خیزی سے زیادہ اہم چیز
الفاظ کا ماہرانہ و فن کارانہ استعمال ہے۔ راہبہ اپنے عبادت خانے میں اور زاہد اپنے صومعہ میں
جنت کا لطف اٹھاتا ہے۔ اسی میں وہ دو عالم کی پہنائی پاتا ہے اور راہ سلوک کے تمام مدارج
طے کر کے ملاء اعلیٰ کی قربت حاصل کر لیتا ہے لیکن مگس بے حیا تمام اچھی بری چیزوں پر اڑتی پھرتی
ہے۔ اسی کو آزادی سمجھتی ہے۔ ایک پھول پر قناعت سے بیٹھ رہنا اس کے لئے پابہ زنجیر ہونے
کے مرادف ہے۔

اوپر جو کچھ بیان ہوا وہ خلاصہ ہے ایک مشہور انگریز نقاد مسٹر گرننگ ٹیمورن کے خیالات کا۔ اس
اقتباس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جس مغربی آزادی کی ہوا سے متاثر و مرعوب ہو کر ہندوستانی
معترضین اپنے اسلاف کے لطیف ذوق جمالیات پر حملہ کر رہے تھے خود وہاں کی فضا اب بدل گئی۔ یورپی
نقاد بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ شاعرانہ خوبیوں کا انحصار قدیم و رسمی الفاظ ہی پر ہے۔ بات یہ ہے کہ جو الفاظ
صدیوں سے حسن قبول کی سند حاصل کرتے آئے ہیں ان کے مقابل میں نئے الفاظ ضرور اجنبی و ناگوار
معلوم ہوں گے۔ جب قدیم الفاظ سے کام چلتا ہی ہے اور اساتذہ کو اظہار خیال میں کوئی
دشواری پیش نہیں آتی تو خواہ مخواہ غیر مانوس و ثقیل الفاظ کے استعمال سے لطافت شعری کا خون

سرورِ کائنات کی حکومت

اس کا قیام اور انتظام

(بسلسلہ گزشتہ)

حکومت کے ادارے | حکومت اگر باقی نہ رہ سکے تو اس کے حصول سے کیا فائدہ ۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حکومت کس طرح اوامرِ الٰہیہ کے تحت عدالت و صداقت کے ذریعے قائم فرمائی اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی استواری اور پائداری کے متعلق کیا ادارے قائم کئے گئے ۔ اس بارے میں آنحضرت صلعم کی تعلیم پر ایک نظر ڈالنی چاہئے۔

استقرار سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت کی تعلیم "دنیا و آخرت" دونوں کی بھلائی پر مشتمل ہے اور اس کے ذرائع (۱) علم (۲) جسم (۳) اخلاق قرار دئے گئے ہیں۔ علم سے مراد اپنے حقوق و فرائض کا علم ہے یعنی ہر چیز تو فقط میری نہیں) ہماری ہے۔ لیکن ہم "اور میں بھی) خدا کے -

چنانچہ اسلام کے ارکان (ایمان کے بعد) پانچ ہیں - نماز ۔ روزہ ۔ حج ۔ زکوٰۃ ۔ جہاد ۔ ان میں آخر الذکر فرض کفایہ ہے ۔ یعنی اگر کافی تعداد اس میں حصہ لے تو باقی سے ساقط ہو جاتا ہے ۔ باقی چار فرض عین ہیں -

ان پر غور کرنے سے اس دعوے کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ دین و دنیا کی بھلائی ان سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ واضح رہے کہ یہ عمومی فرائض ہر مسلمان پر واجب ہیں ۔ ان کے علاوہ جو خصوصی فرائض حاکم وقت کے ہیں وہ علحدہ بیان ہوں گے۔

چونکہ ایک حکومت کے لئے افراد رعایا کے غالب حصے کا متحد ہونا ضروری ہے اس لئے اس اتحاد کی روح کو ابھارنے کا لحاظ ہر حکم میں شامل رہا اور مذہبی احکام میں بھی اسی چیز کی آبیاری کی گئی

چنانچہ عمومی فرائض سے سوائے بچوں اور دیوانوں کے جو مرفوع القلم طبقہ ہے کوئی مستثنیٰ نہیں بڑا سے بڑا بادشاہ اور ادنیٰ مزدور، سب کو ایک ہی قسم کے فرض کی ادائی کا حکم دیا گیا۔ ہر روز پانچ مرتبہ محلے والوں کو، ہر ہفتے شہر والوں کو، اور ہر سال دو مرتبہ شہر و مضافات کے باشندوں کو جمع ہونے کا حکم دیا گیا۔ ایک عربیاتی نے غالباً صحیح لکھا ہے کہ اسلامی نماز ایک طرح کی فوجی پریڈ، عسکری تربیت ہے۔ صف بندی، قائد (امام) کے احکام پر متفقہ حرکت، وقت کی پابندی [illegible] ایک حدیث میں (غالباً ابو داؤد میں) ہے کہ [illegible]

اکبر کہتے، نشیب آتا تو سبحان اللہ فرماتے۔ اسی پر نماز [illegible]

گئے یہ نماز ایک ورزش اور کسرت بھی ہے۔ کیونکہ

جنگی ضروریات میں سفری عادت بہت ضروری ہے [illegible]

ہر سال مکہ معظمہ میں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ یہ عالمگیر اخوت اور انسانی برادری، یا دوسرے الفاظ میں تمام رعایا کی یگانگی، کی یاد تازہ کرنے کا بھی بہترین وسیلہ ہے۔ جملہ صوبہ جات مملکت اور اقطاع عالم کے مسلمانوں کی ایک سالانہ موتمر بھی ہے۔ خلیفۂ اسلام کا ایک دربار عام بھی ہے جس میں ہر حصے کی بہترین نمائندگی کی گئی ہے۔ زکوٰۃ کو لیجئے۔ حکومت بغیر مالئے کے عضو معطل ہے۔ زکوٰۃ اور عشر زراعت حکومت اسلامیہ ہی نہیں ہر حکومت کے لئے لابدی اور ضروری ہیں۔ مگر تاریخ میں پہلی مرتبہ حکومت کی آمدنی کو بادشاہ کے صرف خاص کی جگہ ملکیت عامہ (Public Property) قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس کا مصرف یوں معین کیا گیا کہ صدقات (یعنی زکاۃ عشر خمس غنیمت وغیرہ) فقرا و مساکین کی امداد، عہدہ داران متعلقہ کی تنخواہ، غلاموں کو آزاد کرانے، قرضداروں کو قرض سے نجات دلانے اور فی سبیل اللہ یعنی فوجی تیاری، رفاہ عام، سڑکوں، پلوں کی تعمیر وغیرہ میں اور رہگزروں کی امداد میں صرف ہوں[۱]۔ انفرادیت و اجتماعیت کا بین بین، محنت اور سرمائے اور زمین کی صلح، سرمایہ داروں اور مزدوروں کے حقوق کا بہترین محافظ ملک سے افلاس کو دور کرنے اور معاشی حالت کو سدھارنے کا علاج، اگر کوئی اسلامی ادارہ کرتا ہے تو یہی ادارہ زکوٰۃ و صدقات، ہے

اور برنارڈ شا کے الفاظ میں اس سے بہتر کوئی امر ممکن نہیں (۴۱)"

جہاں دنیاوی کاروبار کی تمیں کے بہت سے ادارے قائم کئے گئے اور رہبانیت کو مردود ٹھہرایا گیا وہیں متعدد احادیث وآیات کے ذریعے خیرات کی انتہائی تاکید کرکے روحانی و مادی جذبات میں توازن قائم کیا گیا اور "فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ" "دین و دنیا کی بھلائی" عام طور پر ہر شخص کا مطمع نظر قرار دیا گیا اور اسی سلسلے میں ہر سال مہینہ بھر روزے رکھنے کا حکم دیا گیا جس میں خود ضبطی، ایثار، امیروں اور مفلسوں میں یکسانیت غرض بہت سے مصالح پوشیدہ ہیں۔ اور یہ سب امور شہریت کی تربیت کے لئے واجب قرار دئے گئے۔

فرائض ومقاصد حکومت کی انجام دہی | جدید اصول قانون (۱) میں حکومت کے اعلیٰ ترین فرائض صرف دو قرار دئے ہیں: جنگ اور عدل گستری۔ یہ دونوں دراصل حفاظت حقوق ہی کے دو ذریعے ہیں جنگ غیر عدالتی ذریعہ ہے اور عدل گستری عدالتی جنگ کے متعلق آنحضرت صلعم نے فوجی خدمات ہر مسلمان پر اسی طرح لازم کرئے جس طرح اب بھی conscription کے نام سے اکثر یورپی ممالک میں ہے۔ جسب معمول طبیعت میں راسخ کر دینے کے لئے اسے بھی مذہبی رنگ دے دیا گیا۔ ورنہ جنگی تیاریوں کے لئے قوم کو عام رغبت دلانا (۲) کوئی آزاد و خود مختار قوم بے جا نہیں ٹھہرا سکتی۔ الفاروق میں شبلی صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام سے قبل عام جبری فوجی خدمت کا طریقہ نہ تھا اس کی ابتدا آنحضرت صلعم ہی سے ہوئی۔ اس کا مزید تذکرہ آگے آئے گا۔ یہ یاد رہے کہ تبدیل مذہب کے لئے جنگ یا جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں لیکن حکومت الٰہیہ (سلطنت اسلامیہ) کے قیام کو مذہب سے (اس کے محدود معنوں میں) کوئی تعلق نہیں۔

حکومت کا دوسرا بڑا فریضہ عدل گستری ہے تاکہ "امن، انتظام اور تمدن کا دور دورہ ہو اور خوشحالی اور ترفہ کا زمانہ آئے۔ عدل گستری کے معنی یہ ہیں کہ "جماعت، قوم اور اس کے افراد کے صحیح حقوق کی نگہداشت"، آنحضرت صلعم نے عدالت کا جو مستحکم اور ترقی یافتہ ادارہ قائم کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ امیر و غریب سب کا قانون ایک رکھا گیا جس کے اصول غیر متبدل تھے۔ قاضی وقت کے روبرو خود بادشاہ اسلام پر مقدمہ دائر ہو سکتا تھا۔ تاریخ یہ واقعہ محفوظ رکھتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے اپنی آخری

عمر میں مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ جس کسی کا آپ پر حق ہو وہ طلب کرے۔ اور جس کسی کو آپ سے تکلیف پہنچی ہو وہ انتقام لے۔ صرف ایک شخص نے چند درہم کا مطالبہ کیا جس کی آپ نے فوری ادائی فرمادی شاید حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا اپنے دور خلافت میں قاضی کی عدالت میں حاضر ہو کر جواب دہی کرنا یہاں ایک تذکرہ ذی محل ہوگا۔ یہاں صرف اسلامی عدلیہ کے خدو [illegible]
تنفیذیہ سے مکمل اور قطعاً آزاد تھا۔ یہاں تک کہ قاضی کو [illegible]
روک سکتا تھا تا وقتیکہ قاضی کا فیصلہ شرع و قانون کے [illegible]
کو عدل کرنے کا حکم دیتا ہے "(۲۱) نیز "اور جب تم تو [illegible]
ایسی احادیث بے شمار ہیں جن میں عدل و انصاف کی تاکید اور [illegible]
میں امیر و غریب۔ آقا و غلام۔ مسلم و غیر مسلم سب عدالتی نقطۂ نظر سے برابر کے حقوق اور [illegible]
رکھتے ہیں۔

جس حکومت میں حقوق کی حفاظت اور انصاف ہو اور وہاں کی رعایا کے کلیات خمس(۲۲) (یعنی دین عقل، نفس، نسب، مال) کی آزادانہ اور مکمل نگہداشت ہو تو ان کی وفاداری اور امداد میں کیا شبہ رہتا ہے؟!

عدلیہ کے لازمی جزو "شرع اور تشریع" (قانون و قانون سازی) ہیں۔ اسلامی قانون "شخصی قانون" ہے یعنی مسلمان جہاں بھی ہو اسی کا پابند ہے۔ سالمنڈ "اصولِ قانون" میں لکھتا ہے کہ "مقامی قانون روز بروز بے وقعت بنتا اور کم ہوتا جارہا ہے۔ اور شخصی قانون بڑھتا جاتا ہے"۔

قانون کے استحکام اور تبدل پذیری کے متعلق ابھی تک بڑی بحث ہے۔ سالمنڈ کی رائے یہ ہے کہ قانون کا کچھ اصولی حصہ غیر تبدل پذیر ہونا چاہئے جس سے ذیلی قواعد حسب ضرورت بنائے اور بدلے جاسکیں تاکہ قانون ضروریات زمانہ کا ساتھ دے کر تمدن کی ترقی میں معاون ہو۔ کہ خالق اسلامی قانون آنحضرت صلعم نے اسی قسم کا تقسیم فرمایا۔ قرآن مجید میں غیر متبدل اصولی احکام ہیں۔ احادیث میں قطعی اور متواتر بہت ہی کم ہیں۔ اس لئے کتاب و سنت سے مسائل قیاس و اجتہاد کی پوری اجازت

دی گئی۔ مگر واضح رہے کہ متعدد قوانین و ضوابط کی آنحضرت صلعم ہی کے زمانے میں تدوین ہو چکی تھی چنانچہ تعزیرات، میراث (مہر اور دیتین) تحریری صورت پا چکی تھیں[۲۳]۔ انھیں چیزوں کو بعد میں ترقی دی گئی اور اس میں استنباطی ترقی کی پوری اجازت دی گئی۔ اسلامی ضابطۂ قانون و تشریع کی ابتدا اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جس میں معاذ ابن جبلؓ کو یمن کا عامل گورنر بنا کر بھیجتے وقت آنحضرت صلعم نے ان سے پوچھا کہ وہ بطور قاضی کس طرح فیصلے صادر کریں گے تو انھوں نے کہا کہ قرآن کے مطابق اور اگر اس میں نہ ہو تو سنت نبوی کے موافق اور اس میں بھی نہ ہو تو "اجتہدُ برائی" (یعنی، میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ آنحضرت صلعم نے اس کو صحیح قرار دیا اور ان کی تعریف کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ آپ کی امت میں ایسے صائب دماغ پیدا ہوئے ہیں (ترمذی) ظاہر ہے کہ مختلف حکام عدالت کا اجتہاد مختلف ہوگا اور ایک مسئلے کے متعلق متضاد احکام بھی ہو سکیں گے۔ اور غالباً اسی وجہ سے آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ اختلافُ اُمتی رحمۃٌ (یعنی، میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اور الدین یسرٌ۔ دین آسان چیز ہے۔ غرض یہ کہ اسلامی قانون میں ہر ملک اور ہر زمانے میں کارآمد ہونے کی صلاحیت ہے اور مسلمانوں کو آنحضرت صلعم نے شریعت کے ہر زمانے کا ساتھ دے سکنے کے متعلق یہ صریح خوشخبری بھی دی ہے کہ ہر سو برس کے بعد ایک مجدد پیدا ہوگا جو اس امت کے دین کی تجدید کرے گا[۲۴]۔ اور واقعۃً ایسا ہوتا رہا ہے۔

مزید برآں قانون کا تبدل پذیر ہونا گو نظریے کی حد تک اچھا ہو لیکن یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ علا قانون اسلامی کے اصول میں کسی ترمیم یا اصلاح کی ضرورت ہی اب تک نہیں پائی گئی۔ بلکہ دنیا اسی کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہے[۲۵]۔ اور مسئلہ توریث، ازدواج و طلاق اور ترک مسکرات میں خاص کر یورپ و امریکہ کا میلان طبع قابل ذکر ہے۔

قانون اور انصاف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بڑی ترقی دی تھی اور یہ امر کہ جوابدہ صرف خاطی اور مجرم ہی ہو سب سے پہلے توریت میں اس کا حکم ہوا[۲۶]۔ قدیم تر زمانے میں ملزم کے اہل خاندان بلکہ اہل قوم بھی جوابدہ ہوتے تھے۔ اسلام نے ایک اور زبردست نظریہ قانون میں پیدا کر کے گروہ ں

ہے جن ہوں کو محفوظ کر دیا اور وہ نیت کا مسئلہ تھا۔ حدیث کی کتابوں میں سب سے مشہور یہی حدیث مروی ہوئی
ہے کہ انما الاعمال بالنیات یعنی کام نیت کے مطابق ہیں۔ آنحضرت صلعم نے وقف، توریث، طلاق وغیرہ
متعدد نئی چیزوں کو قانونی حیثیت عطا فرمائی اور "جائداد" یا "دولت" کے متعلق ایسا انتظام فرمایا کہ
دولت کی تقسیم میں توازن ہو سکے لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم [illegible]
رہے) زکوۃ، مالگزاری، توریث، تحدید وصیت اس کے خاص

آنحضرت صلعم نے فصل مقدمات کا نہ صرف نقل۔

کا تعین اور ان کے لئے شہادت و قضا کے دستور العمل وضع
کو قانونی احکام دریافت کرنے پر مستند معلومات بہم پہنچانے [illegible]
جھگڑے رفع کرنے) کے انتظامات شروع فرمائے تھے۔ (یہ قول شبلی عفو [illegible]

عدالتوں کے ساتھ سزا دہندہ عملہ (جلاد وغیرہ) اور پولیس اور احتساب یعنی تجارتی و غیر تجارتی
قسم کے کاروبار کی نگرانی اور انسپکشن کی طرح بھی پڑ چکی تھی (ایضاً)

اسی سلسلے میں قانون شہریت اور رعایا کے باہمی برتاؤ پر روشنی ڈالنی چاہئے، جو حکومت کے
استحکام میں بہت اہم حصہ رکھتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے رعایا میں مسلمان اور ذمی (امان دادہ غیر مسلم) دو حصے قرار دئے۔ حفاظت
حقوق کی حد تک سب برابر تھے۔ البتہ مسلمانوں پر جنگی خدمات فرض تھیں اور ذمیوں کو اس سے نیز دیگر
بہت سے مسائل سے مستثنیٰ کیا گیا۔ صرف ان سے ایک حفاظتی ٹیکس لیا جاتا تھا۔ اسے جزیہ کہتے تھے۔
مسلمان رعایا کو اپنی قومیت کی فلاح و بقا کے لئے یہ تعلیم دی گئی کہ "غیروں پر سخت اور باہم رقیق القلب"
نیز "مومنوں پر نرم اور غیروں پر سخت"(۲) سیاسیات کے اس عام اصول پر مزید بحث غیر ضروری ہے۔
اسلام چونکہ محض خدا کا بول بالا کرنے کے لئے آیا تھا اس لئے اکثر فقہاء کا یہ خیال ہے کہ صرف خدا کے
قائل یعنی اہل کتاب کو اسلامی عملداری میں جزیہ دے کر رہنے کی اجازت ہے (مثلاً یہود، نصاری
مجوس) بت پرستوں کو اجازت سکونت نہیں۔ مگر اس پر عملدرآمد عرب کے باہر کبھی نہیں رہا۔ یہاں تک

کہ ہندوؤں تک کو مشابہ اہل کتاب قرار دے لیا گیا۔

رعایا کے فرائض "امداد، وفاداری و اطاعت حکومت ہیں"۔ آنحضرت صلعم نے نہایت احتیاط سے نہ صرف اس کے احکام اور ترغیبات دے بلکہ مسلمانوں کا ماحول ہی ایسا پیدا کر دیا کہ جس میں خود بخود ان فرائض کی تعمیل پر ابھارنے والے جذبات کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً نماز روزہ حج زکوٰۃ وغیرہ چار ارکان مذہب ہیں اس سے عملاً خود بخود امداد، وفاداری اور اطاعت کی تربیت ہوتی ہے نیز ایک جگہ قرآن میں ہے " اور نزاع نہ کرو ورنہ فشل پیدا ہو جائے گا اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"[۲۹]۔ اس کی فوجی اور ملکی سیاسی سول، ضبط یا "ڈزیپلن" میں جیسی اہمیت ہے ظاہر ہے۔ ان کے علاوہ تمدنی فرائض بھی ہیں۔ مثلاً حلال و حرام غذائیں۔ درست و غلط معاملات وغیرہ۔ ان کی تفصیل یہاں بے محل ہے۔ صرف اتنا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ ان کی سائنٹفک تقسیم کی گئی ہے یعنی حلال و حرام۔ مکروہ و مستحب اور مباح اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ انسان ملکی قانون سے زیادہ مذہبی اور ضمیری قانون کی تعمیل کرتا ہے اس لئے فرائض شہریت کو مذہبی رنگ دے کر ذہنیت میں رچا دیا گیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کی تعمیل حسب دلخواہ ہوتی ورنہ امریکا کا صرف قانوناً شراب حرام کر دینا عملاً بے اثر ثابت ہوا ہے۔ اسلام میں جس طرح شراب بند کی گئی اس نظر سے امریکا اور دنیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی حال ہر قسم کے اصلاحات کا ہے جس میں تدریج اور ذہنی تربیت کی ضرورت ہوتی ہو۔

حکومت کے لئے دستور لازمی چیز ہے آنحضرت صلعم نے ایک منتخبہ ذمہ دار ملوکیت " "Elected responsible monarchy." قائم فرمائی جو ایک بالکل نیا لیکن مسلمہ طور سے بہترین نظریہ ہے۔ کیونکہ موروثی کی جگہ منتخبہ ہونے سے بہترین صلاحیت و قابلیت کا فرد حاکم اعلیٰ بنے گا۔ اسی طرح ہر فرد رعایا کے روبرو بالراست ہو یا بالواسطہ جواب دہ ہونے کے فوائد ظاہر ہیں"[۳۰]۔ ملوکیت بالاتفاق اس طرز حکومت پر بلحاظ افادہ مرجح ہے جو ایک جماعت پر مشتمل ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ فرد مستبد نہ بھی خواہ وسیع نوعی ہو۔ ذمہ دار شاہی جو مشورے لینے کی پابند ہو وہ پروفیسر لاسکی کے الفاظ میں اس مقصد کو بہترین طور سے پورا کراتی ہے"[۳۱]۔ آنحضرت صلعم چونکہ عالمگیر

حکومت قائم کرنی چاہتے تھے اس نے ایک زبان بولنے یا ایک ملک میں رہنے یا ایک قوم سے ہونے کو ختم کر دیا اور ہر رنگ اور ہر ملک کے مسلمانوں میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی یا نسلی یا لسانی یا ملکی نسبتوں سے کہیں مستحکم اور دیرپا تھا اور بتا دیا گیا یہی حبل اللہ ہے اسی کو تھامے رہنے میں مسلمانوں کی فلاح دیتا ہے۔

آنحضرت صلعم نے سوائے (شرعی، قانون اور خارجہ سیاست کے جو [illegible] حکومت سے متعلق تھے اور امور میں بڑی حد تک صوبہ داری خو [illegible]

[illegible] جو بعد میں آنحضرت صلعم کی زندگی ہی میں فرائض کی [illegible]

تین افراد میں منقسم ہو گئی صوبے میں بالکل خود مختار [illegible]

آنحضرت صلعم نے نیابت اور نصرمی کا طریقہ بھی [illegible] کسی کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ جاتے تاکہ کاروبار عادی میں ابتری نہ پیدا ہو۔ مختلف انتظامی ادارے مثلاً خفیہ پولیس کا انتظام بھی قائم ہو گیا تھا چنانچہ فتح مکہ سے قبل حضرت عباسؓ مکہ معظمہ میں خفیہ پرچہ نویس مقرر تھے۔ دیگر اداروں کی بھی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ چنانچہ اسی سلسلے میں اوپر متعدد صیغوں کا تذکرہ ہو چکا ہے جن میں سے عدالت، احتساب، پولیس، افتاء وغیرہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ ان کے سوا تبلیغ، تعلیم، سیول و ملٹری سروس اور قوانین منضبطہ متعلقہ معاملات وغیرہ، فوج، صیغہ خارجہ (دارالانشاء وغیرہ) اور صیغہ داخلہ (جہانداری، عدالت، احتساب وغیرہ) اور صیغہ مالیہ کا مختصر تذکرہ کیا جائے گا۔

تبلیغ و تعلیم | اسلام کے سب سے مقدم ادارے رہے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے مسلمانوں کی مذہبی اور عام تعلیم کے لئے خاص ذرائع اختیار فرمائے چنانچہ علاوہ ترغیب و تشویق کے خود معلم جا بجا بھجوائے۔ تعلیم یافتہ جنگی قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں (تشویق کے سلسلے میں اطلبوا العلم ولو کان بالصین، طلب العلم فریضة علی کل مسلم و مسلمة۔ والذین اوتوا العلم درجات۔ فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔)

غیرمسلموں میں تبلیغ کے وسیع انتظامات مستقل طور سے قائم فرمائے چنانچہ سرکاری آمدنی کی ایک اہم مد اس کے لئے مختص تھی (قرآن)، وقت بے وقت جو غیر معمولی آمدنی ہوتی تھی اس سے بھی تالیف قلبی کی جاتی تھی۔ بے شبہ جبری اسلام پر کبھی کسی کو مجبور نہیں کیا گیا اور نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے البتہ مسلمانوں کا فریضہ قرار دیا گیا کہ ہر شخص تبلیغ دین کرے اور اعلائے کلمۃ اللہ میں حصہ لینے کی سعادت حاصل کرے۔ اس کے علاوہ آنحضرت صلعم نے نہ صرف عرب کے مختلف حصوں اور مصر و شام وغیرہ بلکہ کہتے ہیں کہ دور دراز ممالک مثلاً چین وغیرہ تک بھی تبلیغ کے لئے خاص خاص صحابہ کو روانہ فرمایا۔

مساجد مسلمانوں کی بزم گاہیں ہیں اور ان کی ہر قسم کی دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز اور جزو غیر منفک۔ ان کی تعمیر و ترمیم، ائمہ و موذنین کے تقرر وغیرہ کی طرف بھی خاص توجہ فرمائی اور خاص احکام دئے۔

سیویل سرویس | ان سب کے ساتھ سیویل سروس کا ادارہ بھی قائم ہوگیا، جہاں گورنروں، قاضیوں، اماموں، مبلغوں، معلموں وغیرہ کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی اور ان کا امتحان لیا جاتا تھا جن لوگوں کا کسی عہدے پر تقرر ہوتا تھا انھیں زبانی اور تحریری دستور العمل اور ہدایات دئے جاتے تھے۔ عہدیداران مال کو ہر قسم کے مداخل (زکوٰۃ، عشر، خراج، جزیہ وغیرہ) کی شرحیں تحریری طور سے لکھ کر دی جاتی تھیں۔ مخارج کا بھی ایک باقاعدہ دفتر تھا۔ چنانچہ ایک رجسٹر میں سرکاری وظیفہ یا تنخواہ پانے والوں کے نام تحریر تھے۔ مجرد و متاہل کی شرح میں ایک و دو کا تناسب تھا۔ بندوبست مالگذاری کی طرح پڑ چکی تھی اور جاگیرات نوآبادی بسانے کے لئے ملنے لگے تھے۔ اس میں اصول یہ تھا کہ چشمے وغیرہ مفاد عامہ کی چیزیں شخصی ملک نہ ہو جائیں۔ (شبلی صفحہ ۲) قاضیوں کو خاص کر فوجداری (تعزیری) اور دیوانی ضابطے مہیا کئے جاتے تھے۔ اور توارث (ہر جے اور دیت) کے متعلق معلومات بہم پہنچائے جاتے تھے جن امور میں متضرر قصاص معاف کر دے وہاں متضرر کو کیا معاوضہ دلایا جائے۔ معاملات و معاہدات (خرید و فروخت سود وغیرہ) اور سماجی تعلقات (مثلاً نکاح طلاق وغیرہ) کے متعلق بھی آپ نے اصولی طور سے قوانین و قواعد مرتب فرما دئے تھے۔ جن کی ضروری تفصیل و تشریح و ترمیم بھی وقتاً بوقتاً ہوتی گئی —— ان تمام

کی تدوین مسلمانوں نے بعد میں مکمل کی۔

فوج | حکومت کی بقا اور ترقی کے لئے فوج ناگزیر ہے۔ آنحضرت صلعم نے عام فوجی تعلیم اور مستعدی اور تیار باشی کے زبردست احکام دئے۔ وقت بوقت تیر اندازی، گھوڑدوڑ، نیزہ بازی وغیرہ میں حصہ لے کر شوق بڑھایا۔

سپہ سالاروں کو بھی آگاہ کیا جاتا تھا کہ غیر جانبداری، جنگ اور ۔۔۔ پہلے، اور اس کے بعد کیا امور ملحوظ رہیں۔ مثلاً آداب سفر و قیام، مختلف طبقوں کی مختلف ۔۔۔ کو پہلے اطاعت کی دعوت دینا، غیر جنگی عنصر کو قتل نہ کرنا۔ نذر۔۔۔ غنائم، تبادلۂ قیدیان، قیدیوں سے سلوک زخمیوں کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

دارالانشاء | میں فرامین و توقیعات۔ معاہدے۔ مراسلتیں، احکام وغیرہ لکھے جاتے تھے اور قرآن مجید مدون کرایا جاتا تھا۔ قرآن موجودہ خود آنحضرت صلعم کے زمانے میں پوری طرح مدون ہو چکا تھا۔ تاریخ القرآن۔ پروفیسر مفتی عبداللطیف جامعہ عثمانیہ)

صیغہ داخلہ | مہمانداری، مریضوں کی عیادت پر توجہ کی جاتی تھی۔ عدالت و قانون دخفیہ کا اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ یہ ہے حکومت اسلامیہ کے قیام اور اس کی تنظیم و تشکیل کا خلاصہ۔

حوالے

(۱۷) قرآن مجید: انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل الآیۃ

(۱۸) مضمون انگلستان کا مذہب آئندہ صدی میں حسب بیان برنارڈ شا بحوالہ رسالہ اشاعت الاسلام لاہور

(۱۹) سامنڈ کی کتاب " Jurisprudence " حصہ اول

(۲۰) قرآن مجید (الف) ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسہم واموالہم الایہ (ب) واعدوا لہم ما استطعتم من قوۃ الایہ (ج) لاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً الایۃ وغیرہ وغیرہ
حدیث کی کتابوں میں انگنت تشویقیں، ثواب، احکام وغیرہ ملتے ہیں۔ صحاح ستہ وغیرہ کا کتاب الجہاد ملاحظہ ہو۔ مثال کے طور پر آنحضرت صلعم نے فرمایا اگر ممکن ہوتا تو آپ اس بات کو پسند کرتے کہ بار بار راہ خدا میں شہید ہوں۔ آپ نے فرمایا موت پر ہر شخص کا عمل ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن شہید کا عمل قیامت تک جاری سمجھا جاتا ہے۔

(۲۱) قرآن مجید (الف) ان اللہ یامر بالعدل الایہ (ب) واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل الایۃ
(۲۲) مسلم الثبوت (اصول فقہ) از محب اللہ بہاری مسئلہ تقریر (سنت نبوی)
(۲۳) بدایۃ المجتہد از ابن رشد صفحہ کتاب الدیات
(۲۴) ان اللہ عزوجل یبعث لہذا الامۃ علیٰ راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا (حدیث) (ک۔ د ق کتب حدیث)۔

(۲۵) امریکا میں مطبوعہ شریف برنارڈ کی تصنیف انگلستان کا مذہب آئندہ صدی میں، رجحانات سیاسی میں مجلس اقوام کے ذریعے اتحاد وتعاون عالم اور نیز اشتراکیت، حج و زکوۃ اور اخوت اسلامی کی جانب مائل ہیں۔ روحانیات سے روزافزوں دلچسپی، مغرب کی عیسائیت سے بیزاری دنیا میں بت پرستی اور شرک سے عام نفرت، ہندی ذات پات اور چھوت چھات سے کراہت ملوکیت کی جگہ ذمہ دار جمہوریت اور پارلیمانی مشاورت وغیرہ وغیرہ

(۲۶) باب ہاوز کی کتاب ارٹس ان ایوالیوشن باب قانون اور انصاف
(۲۷) قرآن مجید (الف) ہوالذی ارسل رسولہ بالہدیٰ ودین الحق لیظہرہ علی الدین کلہ وکفی باللہ شہیدا۔ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینہم تریہم رکعا سجدا یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا سیماہم فی وجوہہم من اثر السجود ذلک مثلہم فی التوراۃ ومثلہم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فازرہ فاستغلظ فاستوی علی سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بہم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا

وعملوا الصالحات منهم مغفرۃ واجراً عظیما (ترجمہ: خدا نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا
تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے خدا کی گواہی کافی ہے۔ محمد رسول اللہ اور آپ کے ساتھی
کفار پر سخت اور باہم نرم، راکع و ساجد او. خدا کا فضل اور رضامندی کے طالب ہیں۔ ان کی
پیشانیوں پر سجدے کے نشان ہیں۔ توریت و انجیل [illegible]
پودا ہے جس کی شاخ نکلتی ہے جو رفتہ رفتہ مضبو
اور بونے والے کو باغ باغ کر دیتی ہے تاکہ کف
سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے ۔"

پر نرم اور کافروں پر سخت

(۲۸) قرآن مجید: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی الرسول الآیۃ

(۲۹) قرآن مجید: ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم الآیہ

(۳۰) حدیث: کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(۳۱) "... The nation of leaving the government of the State to decide and compelling it only to consult, seems preferable ..."

Grammer of politics by H. Laski. P. 82, ch. Sovereignty

ایچ لاسکی کی کتاب گرامر آف پالیٹکس باب ساورنٹی یعنی اقتدار اعلیٰ "... یہ خیال بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی حکومت کو فیصلے کا اختیار دیدیں اور اسے صرف مشورے لینے پر مجبور کیا جائے ..."

امیر عبدالرحمٰن خاں مرحوم

(بسلسلہ گزشتہ نمبر ۳)

باشندگان افغانستان کا عبدالرحمٰن خاں کے ساتھ اظہار وفاداری

جب ۱۸۹۶ء میں عبدالرحمٰن خاں نے تمام اندرونی انتظامات حکومت سے فراغت حاصل کی اور سارے افغانستان پر ان کا قبضہ ہوگیا تو تمام ملک کے سرداروں، ملاؤں اور تاجروں نے متفقہ طور پر ان کے لئے ایک تمغہ مکلل بجواہر تیار کرایا جس پر "ضیاء الملت والدین امیر عبدالرحمٰن خاں والی افغانستان" کندہ تھا اور مزید برآں تمام سرداران قبائل اور علمائے افغانستان نے عید الضحیٰ کے دن دربار عام میں عبدالرحمٰن خاں کے سامنے اپنی جاں نثاری اور وفاداری کا اقرار کیا اور متفقہ طور پر سب وکلائے قوم نے یہ تجویز پاس کی کہ چونکہ حدود افغانستان کا تصفیہ ہوچکا ہے۔ اس لئے افغان قوم کا فرض ہے کہ ہر آٹھ آدمیوں میں سے ایک آدمی حفاظت ملک کے لئے وقف کرے۔ اس موقعہ پر جو معاہدہ وکلائے قوم اور عبدالرحمٰن خاں کے درمیان ہوا تھا اس کی شرطیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عبدالرحمٰن خاں کو قوم ہمیشہ ضیاء الملت والدین کے خطاب سے مخاطب کرے گی۔

۲۔ عبدالرحمٰن خاں شریعت کے مطابق جو حکم صادر کریں گے قوم اس کی اطاعت کرے گی۔

۳۔ ہندوستان یا روس کی طرف سے افغانستان پر اگر حملہ ہوا تو افغانی قوم کا فرض ہوگا کہ ملک کی حفاظت کرے۔

۴۔ افغانی قوم کا فرض ہوگا کہ ہمیشہ پایندہ خاں بارکزئی (جد اعلیٰ عبدالرحمٰن خاں) کی نسل میں سے اپنا بادشاہ مقرر کرے گی اور کسی دوسرے شخص کی اطاعت نہ کرے گی۔

یہ معاہدہ نہایت اہتمام کے ساتھ چھاپ کر تمام ملک میں تقسیم کیا گیا اور تمام افغانی قوم نے اس معاہدے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

عبدالرحمٰن خاں افغانستان کو کس حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔

عبدالرحمٰن خاں کی ہمیشہ سے یہ تمنا تھی کہ افغانستان خود مختار رہے اور اس کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرے اور ملک تدریجاً ترقی کرتا جائے۔ عبدالرحمٰن خاں افغانستان [illegible]
چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے انھوں نے [illegible]
افغانستان کا معاملہ روس اور انگلستان سے [illegible]
نہ تھا بلکہ جو معاملہ طے کرنا ہوتا تھا وہ وائسرائے [illegible]
دشواریاں تھیں ان دشواریوں کو دور کرنے کے لئے عبدالرحمٰن نے اپنے بیٹے سردار نصراللہ خاں کو انگلستان بھیجا کہ جاکر خود ملکہ وکٹوریہ کے روبرو یہ مسلہ پیش کرے اور اپنی تکالیف دکھا کر درخواست کرے کہ حکومت افغانستان کو ایک سفیر انگلستان میں رکھنے کی اجازت مرحمت ہو تاکہ براہ راست انگلستان اور افغانستان کے معاملات طے ہوتے رہیں۔ نصراللہ خاں کے شاہانہ استقبال کے باوجود ملکہ وکٹوریہ نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا۔ اس واقعہ نے عبدالرحمٰن خاں کے دل کو دکھ پہنچایا لیکن مدبر ہونے کی وجہ سے اس رنج کو ظاہر ہونے نہ دیا۔ بلکہ صبر اختیار کر لیا۔

عبدالرحمٰن خاں کی یہ دلی آرزو تھی کہ افغانستان جاپان کی طرح جلد سے جلد عروج حاصل کرلے۔ عبدالرحمٰن کی زیادہ تر کوشش یہ تھی کہ افغان قوم کے بکھرے ہوئے دانوں کو ایک رشتۂ اتحاد میں پروئیں۔ ان کی زیادہ تر جدوجہد افغانی قوم کی تہذیب و تربیت کے لئے مخصوص تھی۔ وہ اپنے ملک کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح کرنا چاہتے۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ افغانستان طاقتور اور متمدن قوت ہو جائے جس کو نہ روسی اپنا آلۂ کار بنا سکیں اور نہ انگریز اس کو اپنے مقصد براری کے لئے اپنی قیادت میں لاسکیں۔

اصلاحات

عبدالرحمٰن خاں کی تخت نشینی سے پیشتر سرکاری محکمے باہم کچھ ایسے مخلوط تھے کہ ان میں تمیز کرنا دشوار تھا۔ وزیر اعظم کے ہاتھ میں تمام انتظام تھا وہی بیک وقت وزیر اعظم بھی تھا اور محاسب بھی تھا۔ اس کے سونے کے کمرے میں تمام انتظامات حکومت ہوتے تھے۔ غرض کہ بے قاعدگی اور بے ضابطگی کا دو۔

دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطنت کابل کے تمام انتظامات عبدالرحمٰن خاں کو از سر نو کرنے پڑے اُن کی سعیِ محنت سے افغانستان چند ہی سال میں منظم ہو گیا۔ حکومت کے دفاتر اور محکمے مناسب طریقے پر آراستہ و پیراستہ نظر آنے لگے۔

عبدالرحمٰن خاں نے سلطنت کے محکموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

۱۔ جنگی یعنی نظامی

۲۔ ملکی۔

محکمۂ جنگی | امیر دوست محمد خاں کے زمانے میں افغانی فوج بالکل غیر منظم تھی یعنی وہ ایک جماعت کثیر لڑنے والوں کی تھی جس میں سوار، پیدل دونوں ملے جلے ہوئے تھے اور کوئی باقاعدہ رجمنٹ اور پلٹنیں نہ تھیں سب سے پہلے افغانی فوج کو درست کرنے کی کوشش عبدالرحمٰن خاں کے والد امیر افضل خاں نے کی تھی۔ انہیں کے حکم سے فوجی قواعد کی چند کتابیں انگریزی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں اور فوج کو بٹالیوں، رسالوں اور رجمنٹ میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ تمام انتظامات ایک نومسلم انگریز شیر محمد خاں نامی کی ماتحتی میں ہوئے تھے یہ نومسلم جنرل عبدالرحمٰن خاں کا اتالیق تھا اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے لیکن سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے ان کو اطمینان نہ تھا اور حکومت کی طرف سے ان کو چند ایسے حقوق حاصل تھے کہ رعایا سے جبراً روپیہ وصول کرتے تھے علاوہ ازیں سستی، کاہلی اور طرح طرح کی برائیاں ان میں موجود تھیں۔

لیکن عبدالرحمٰن خاں نے تختِ کابل پر رونق افروز ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنی توجہ فوج کی طرف منعطف کی اور اس کو باقاعدہ منظم کر کے جدید آلات سے آراستہ و پیراستہ کیا۔ فوج کا پورا انتظام محکمۂ جنگی کے سپرد تھا جو ملک کی حفاظت کا ذمہ دار تھا۔ عبدالرحمٰن خاں نے اپنی فوج کی ترتیب جدید یورپین انداز پر کی تھی اور سپاہیوں کی تنخواہیں دو مہینے کے بعد وقت معینہ پر برابر نقد دی جاتی تھیں۔ سواروں کو ہر رجمنٹ اور پیدلوں کی ہر پلٹن بالکل مکمل تھی۔ اس میں سفر مینا مورچہ بندی اور خندق کھودنے کے لئے انجینیر، باجا، خیمے، حکیم، جراح، ملا، محاسب اور محکمۂ کمسریٹ وغیرہ سب

موجود تھے۔ افغانی فوج کے پاس جدید ترین وضع کی بریچ لوڈنگ، نورڈنفلٹ، ہوچکس اور کرپ طرز کی نیز انگریزی کوہی باتری خچر باتری میکسیم، گارڈنز اور گیٹلنگ توپیں تھیں۔ امیر موصوف اپنے فوجی انتظامات پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اپنی تزک میں لکھتے ہیں۔

" اگر ضرورت ہو تو تین لاکھ سپاہیوں کے لئے،

مع گولوں کارتوسوں کے تیار ہے۔ سامان . ،

ہیں اور چشم زدن میں کام میں لائے جاسکتے ہیں . . . .

کر رہا ہوں کہ دس لاکھ فوج اعلیٰ قسم کے جدید ترین ساز و سامان سے مسلح مع رسد وغیرہ اور

دو سال کی تنخواہ کے تیار رکھوں جو کہ جنگ دو سال کے لئے کافی ہو۔ یہ اتنی بڑی تعداد آدمیوں

کی افغانستان میں پندرہ دن کے عرصے میں بہم ہو سکتی ہے لیکن ہر شخص جو ذرا بھی جنگی معاملات

سے واقف ہو سمجھ سکتا ہے کہ اتنی بڑی فوج کے لئے سامان بار برداری و رسد تنخواہ و دیگر ضروریات

کا مہیا کرنا کس قدر دشوار کام ہے مگر ایک امر میرے لئے بہت موافق ہے وہ یہ کہ ملک اسلحہ

جنگ سے پر ہے ہر مرد و زن کے پاس ایک بندوق و تلوار ضرور ہے اور بعض افغانی

قبائل میں تو دس نو کو جہیز میں ہتھیار دئے جاتے ہیں بار برداری کے لئے اونٹ ہاتھی ،

گھوڑے، ٹٹو، خچر اور گدھوں کی کافی تعداد ملک میں ہے اور ملک اس قدر زرخیز ہے کہ

ہے کہ بلا کسی خارجی امداد کے رسد کا سامان مہیا ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر کسی چیز کی کمی ہے تو

روپے کی ہے جس کے جمع کرنے میں شب و روز کوشاں ہوں "

ملکی محکمے | عبدالرحمن خاں نے تمام دفاتر اور محکمے کابل کے قلعے میں رکھے تھے اس قلعہ کو لوگ "ارک" کہتے ہیں۔ ان تمام دفاتر کی چاروں طرف ایک وسیع باغ تھا جس کو عبدالرحمن خاں نے اپنے عہد میں تیار کرایا تھا۔

محکمہ خزانہ | جس میں تمام ملک کی آمدنی جمع ہوتی، خزانے کی پھر دو شاخیں تھیں خزانہ خاص اور خزانہ عامرہ۔ خزانہ خاص امیر کی ذاتی ملکیت تھی اور خزانہ عامرہ بیت المال تھا جس سے ملک کے تمام

اخراجات چلتے تھے اور یہ تمام خزانہ محاسب اعلیٰ کے ماتحت تھا۔ عبدالرحمٰن خاں یا ولیعہد کی مہر کے بغیر روپیہ نہیں نکل سکتا تھا۔ اس خزانے کی شاخیں تمام ملک میں تھیں۔ جہاں کے اخراجات منہا ہونے کے بعد باقی رقم سال میں ایک مرتبہ صدر خزانے میں جمع کی جاتی تھی۔

محکمۂ عدالت | اس محکمے کا کام یہ تھا کہ تمام مقدمات تحقیق و تفتیش کے بعد فیصل ہوں۔ عبدالرحمٰن خاں سے پیشتر اس محکمے کا نام تک نہ تھا۔ عجیب و غریب طریقے پر امیر افغانستان مقدمات کے فیصلے کرتا تھا۔ مثلاً شیر علی خاں کے زمانے میں یہ قانون تھا کہ جو شخص تین روپئے سرکاری خزانے میں جمع کر دیتا وہ جس کو چاہتا قتل کر سکتا تھا۔ لیکن عبدالرحمٰن خاں نے فوراً اس قانون کو منسوخ کر دیا۔ اور تمام مقدمات شرع اسلامی کی رو سے فیصل ہونے لگے۔ مدعا علیہ کو اپنی صفائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اپیل بھی ہو سکتی تھی جس پر بعد غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتا تھا۔ محکمۂ عدالت کا پورا انتظام ایک قاضی القضاۃ کے ماتحت تھا جو عدالت العالیہ کا قاضی ہوتا تھا۔ تمام صوبوں کے قاضی اس کے ماتحت تھے۔

محکمۂ تعمیرات | تمام ملک میں سرکاری عمارات اور راستوں کی تعمیر اسی محکمے کے سپرد تھی۔ عبدالرحمٰن خاں سے پیشتر امیران کابل نے کوئی قابل ذکر عمارت نہیں تعمیر کرائی۔ عبدالرحمٰن خاں نے اس محکمہ کو نہایت اعلیٰ پیمانے پر قائم کیا تھا اور تمام ملک میں سرکاری عمارتوں کی تعمیر اسی محکمے کے ذمے تھی۔ اس محکمے نے تمام بڑے بڑے شہروں کو سڑکوں کے ذریعے سے ملا دیا تھا۔

محکمۂ حفظان صحت | عبدالرحمانی عہد سے پیشتر حفظان صحت کا انتظام بالکل نہ تھا۔ بقول عبدالرحمٰن خاں "تمام ملک نیم حکیم خطرۂ جان کے پنجوں میں پھنسا ہوا تھا۔" طبابت کا کام زیادہ تر معمولی پنساری کرتے تھے۔ لیکن عبدالرحمٰن خاں نے اس محکمے کو باقاعدہ قائم کیا۔ اس محکمے کی دو شاخیں تھیں ایک شاخ یونانی تھی اور دوسری ڈاکٹری۔ عبدالرحمٰن خاں نے اپنی خود نوشتہ سوانح حیات میں ہندوستانی مسلمان ڈاکٹروں کی بڑی تعریف کی ہے جن میں ڈاکٹر محمد دائم اور ڈاکٹر عبدالرحیم خاں کا نام خاص طور پر مذکور ہے جنہوں نے افغانستان کے طبی محکمے کو اپنی پیہم محنتوں سے اعلیٰ درجے پر پہنچایا تھا۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں اور چھاؤنیوں میں شفا خانے کھولے گئے تھے۔

محکمۂ معدنیات | افغانستان میں اس قدر کانیں ہیں کہ اگر ان کو کھودا جائے تو یہ ملک دنیا میں سب سے زیادہ متمول ملک ہو سکتا ہے لیکن بقول عبدالرحمٰن جو شخص جوہری نہ ہو اس کے نزدیک ہیرا بلور دونوں یکساں ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل افغانستان یا ان کے فرمانروا ان بیش بہا معادن سے فائدہ نہ اٹھا سکے لیکن عبدالرحمٰن خاں نے معدنیات کا کام ایک محکمے کے ماتحت جاری کرایا تھا جس کا افسر [illegible] معدنیات یوربین تھا جس نے نہایت جانفشانی سے جلال آباد [illegible] کا کام شروع کرایا تھا جو نہایت کامیاب رہا۔

محکمۂ صنعت و حرفت | جس زمانے میں عبدالرحمٰن خاں [illegible] آئے تھے وہاں ایک دخانی انجن کو دیکھ کر امیر کو شوق ہوا [illegible] دیں۔ چنانچہ عبدالرحمٰن خاں نے ایک یوربین مسٹر سالٹر پائن نامی انجنیر کو اس مقصد کے لئے ملازم رکھا جس نے [illegible]ء میں ایک ورکشاپ قائم کیا۔ اس کارخانے نے دن بدن ترقی کی چنانچہ چند ہی سال بعد اس کارخانے میں بندوقیں اور توپیں ڈھلنے لگیں۔ عبدالرحمٰن خاں کی آخری عمر میں اس کارخانے میں سات ہزار آدمی کام کرتے تھے۔ جس میں روزانہ دس ہزار مارٹینی کارتوس اور دس ہزار سائیڈر کا بو[illegible] تیار ہوتے تھے۔ مزید براں یہاں سکے بھی مضروب ہوتے تھے۔ یومیہ ایک لاکھ بیس ہزار سکے مسکوک ہو کر نکلتے تھے۔ علاوہ ازیں چمڑے، دیاسلائی، صابون سازی اور گلٹ سازی وغیرہ کا کام ہوتا تھا۔ یہ کارخانہ نصف میل لمبا تھا۔

الغرض عبدالرحمٰن خاں نے اپنی قوم کے عشق میں وہ وہ کارنامے کئے کہ افغانستان کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمٰن خاں نے اپنی قوم کے لئے وہ کام کئے تھے جو پیٹر اعظم نے روس کے لئے کیا تھا۔

محکمۂ تعلیم | عبدالرحمٰن خاں نے ابتدائی تعلیم کے لئے بہت زبردست کوشش کی تھی چنانچہ محکمۂ تعلیم کے ماتحت انھوں نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ابتدائی مدارس کا جال بچھا دیا تھا جس میں امراء روسا اور فوجیوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے اس کے علاوہ خود باشندگان ملک کی طرف سے بھی

مذہبی مدارس کا انتظام تھا۔ عبدالرحمن خاں کے زمانے میں حکومت کے عہدے کے لئے ایک خاص امتحان پاس کرنا پڑتا تھا۔ مولویوں کے لئے ایک امتحان تھا جس کے پاس کرنے کے بعد ان کو ملازمت ملتی تھی۔

محکمۂ رسل و رسائل | عبدالرحمن خاں سے پیشتر یہ محکمہ برائے نام تھا پشاور سے کابل تک ڈاک جاتی تھی لیکن اس کا بھی کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ عبدالرحمن خاں نے اس محکمہ کو از سر نو قائم کیا اور اس کا جال تمام ملک میں پھیلا دیا۔ ہر بڑے شہر میں ایک ڈاکخانہ بنایا گیا ہندوستان، چین، روس، ایران، جاپان، یورپ اور امریکہ سے خطوط آنے جانے لگے۔ افغانی خطوط پر دولت افغانیہ کے اسٹامپ لگائے جاتے تھے۔ اس طریقہ پر اس محکمے کا خرچ اس کی آمد سے ہوتا تھا۔

محکمۂ کمسریٹ | عبدالرحمن خاں نے گھوڑوں کی پرورش کے لئے ایک باقاعدہ محکمہ قائم کیا تھا۔ جس میں چوبیس ہزار گھوڑے تھے جن کی پرورش احتیاط اور جدید طریقے پر ہوتی تھی۔ عبدالرحمن خاں نے ان گھوڑوں کو عرب، ایران، ٹرکی، اسٹریلیا اور انگلستان سے منگایا تھا۔ اس محکمہ کا افسر اعلیٰ بھی ایک انگریز تھا جس کے ماتحت افغانی اور ہندوستانی نوجوان کام کرتے تھے۔

مدبرانہ مشاغل | عبدالرحمن خاں کی زندگی اپنے ہمعصر ایشیائی فرمارواؤں میں ممتاز نظر آتی ہے۔ عبدالرحمن کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے جسم اور دماغ کو بیکار رکھے اور ان سے کوئی مفید کام نہ لے۔ عبدالرحمن کی زندگی میں ایک سپاہیانہ زندگی نظر آتی ہے وہ خود اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں تحریر کرتے ہیں۔

"میں اپنی تمام زندگی میں پیدا سپاہی ہی نہیں بلکہ ایک مزدور اور کام کرنے والے سے بھی زیادہ محنتی اور جفاکش رہا ہوں۔ میری پوشاک اور بود و باش ہمیشہ سادہ اور سپاہیانہ رہی ہے مجھے ہمیشہ یہ پسند رہا ہے کہ شب و روز کسی نہ کسی کام میں مشغول رہوں اور محنت کرتا رہوں اور صرف چند گھنٹے آرام کروں۔ چونکہ عادت طبیعت ثانی ہے اس لئے میری عادت ہو گئی ہے کہ باوجود علالت کے بھی اپنا کام پورا کئے بغیر

دم نہیں لیتا ہوں۔ میرے ڈاکٹر اور حکیم کہتے ہیں کہ ہر وقت محنت میرے لئے تمام امراض کا باعث ہے۔ چونکہ ضرورت سے زیادہ جانفشانی کرتا ہوں اور کھانا وقت پر نہیں کھاتا میرا جواب یہ ہے کہ عشق و منطق میں کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

عشق چوں در سینہ آمد عقل سا اول بود

چونکہ مجھے اپنی قوم کی بہبودی کا عشق ہے مجھے اپنی
اپنی رعایا کی مصیبتوں اور عیوب سے جو مجھ سے
کبھی گرفتار نہیں ہوتے ہیں وہ ہرگز نہیں سمجھ سکتے
دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔

افغانستان کی فلاح و بہبودی کی جس قدر علامتیں کامیابی و ترقی کی دیکھتا ہوں اسی قدر اور زیادہ عرق ریزی کرتا ہوں جیسے کہ کوئی عاشق اپنے دلبر کا نقش پا دیکھ کر اس کی طرف جاتا اور وہ نقش اُسے راہ سے اِدھر اُدھر نہیں جانے دیتا۔ میری حالت بھی بالکل اسی وارفتہ عاشق کی سی ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا مجھے حکومت کے فرائض ادا کرنے کی توفیق دے جس کے لئے اس نے اتنے لوگوں میں سے مجھے منتخب کیا ہے"

آگے چل کر عبدالرحمٰن خاں اپنی تزک میں اپنے روزانہ مشاغل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"شب و روز چوبیس گھنٹے جو میں کام کرتا ہوں اس کے لئے کوئی وقت مقررہ یا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ بس صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ایک معمولی مزدور کی طرح محنت کرتا رہتا ہوں جب بھوک معلوم ہوتی ہے تو کھانا کھاتا ہوں اور بعض دن تو یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں مجھے اس کا خیال نہیں رہتا اور کام سے سر اٹھا کر یک بارگی اپنے درباریوں سے دریافت کرتا ہوں کہ آج میں نے کھانا کھایا ہے یا نہیں۔ اسی طرح جب میں تھک جاتا ہوں اور نیند غلبہ کرتی ہے تو اسی پلنگ پر سو جاتا ہوں جس پر کہ بیٹھ کر کام کرتا ہوں۔ مجھے کسی علٰحدہ کمرے

یا سونے کے کمرے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ کسی خلوت گاہ یا بڑے دربار کا کمرا درکار ہو۔ میرے محلوں میں اس قسم کے کمرے بہت ہیں لیکن مجھے اتنی فرصت کہاں کہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں بھی جا سکوں۔"

عبدالرحمٰن خاں کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے کہ "عبدالرحمٰن خاں اپنے ہمعصر مشرقی حکمرانوں میں سب سے زیادہ کام کرنے والا تھا۔ عبدالرحمٰن خاں عام طور پر صبح نو بجے اٹھتا تھا غسل اور ناشتے کے بعد دربار میں کام شروع کرتا تھا۔ دو بجے کا کھانا دربار ہی میں تناول کرتا تھا۔ شام کو دربار سے اٹھ کر پرائیویٹ مکان میں چارپائی پر بیٹھ جاتا تھا اور تمام احکامات وہاں سے صادر کرتا۔ غرض کہ ایک بجے رات تک امیر کا یہ معمول تھا اور اگر کام نہ ہوتا تو امیر گانا سنتا تھا۔ اور اسی طرح اپنے دماغ کی تھکان دور کرتا تھا۔ عبدالرحمٰن خاں کے منشی ایرانی اور ہندوستانی تھے۔

عبدالرحمٰن خاں نے تمام دفاتر حکومت کو ایک مکان میں مرتب کرایا تھا اور خود ان سب دفاتر کا منتظم اور سپرنٹنڈنٹ تھا۔ صرف ایک ایک پرزہ کاغذ کا حال جانتا تھا بلکہ ایک ایک پائی خرچ حکومت کا اس کی منظوری کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ مزید براں امیر کے خاص کاموں کے لئے خاص دن مقرر تھے چنانچہ دوشنبہ کا دن قندھار اور ہرات کے معاملات کے لئے مقرر تھا۔ سہ شنبہ کا دن فوجی دربار کے لئے مخصوص تھا اور تمام فوجی افسروں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ چہار شنبہ کا دن دربار عام کے لئے معین تھا جس میں ہر امیر و غریب اپنی فریاد یا عرض و معروض کر سکتا تھا۔ پنجشنبہ کے دن حکومت برطانیہ کے ساتھ خط و کتابت کرتا تھا۔ شنبہ کا دن اپنے خانگی معاملات کے لئے وقف تھا اور جمعہ کا دن عبدالرحمٰن خاں کے آرام کا دن تھا۔

وفات اور اس کا جانشین | اکیس سال تک افغانستان پر کامیاب حکومت کرکے تمام افغانستان کو متحد کرکے ۱۹۰۱ء میں اس دنیا سے رحلت کی۔ حد سے زیادہ محنت و مشقت کرنے کی وجہ سے نقرس کا عارضہ ہو گیا تھا۔ آخر الامر یہی عارضہ عبدالرحمٰن خاں کی وفات کا سبب بنا۔

سردار حبیب اللہ خاں جو عبدالرحمٰن خاں کا بڑا بیٹا تھا۔ جس کو عبدالرحمٰن خاں نے اپنی

زندگی میں آہستہ آہستہ تمام حکومت کے شعبوں کا نگراں بنایا تھا باتفاق سرداران قبائل امیر افغانستان مقرر ہوا۔ لیکن حبیب اللہ خاں اپنے عہد حکومت میں اپنے آپ کو ویسا ثابت نہ کر سکا جیسا کہ عبدالرحمٰن خاں کے تربیت یافتہ شہزادہ کو ہونا چاہیئے تھا۔

اولاد | عبدالرحمٰن خاں نے اپنی جلاوطنی سے پیشتر پہلی شادی کی تھی اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا تھا جس کا نام عبداللہ خاں تھا جلاوطنی کے زمانے میں شیر علی خاں نے اس کو مع اسکی والدہ کے قندھار میں قید کر دیا تھا اور یہ غریب شہزادہ انیس برس کی عمر میں اسی قید و مشقت میں مر گیا۔ دوسری شادی

عبدالرحمٰن خاں نے سمرقند میں جلاوطنی کے زمانے میں

تھی۔ اس خانم سے عبدالرحمٰن خاں کے کوئی اولاد نہ ہو

تھی جس سے عبدالرحمٰن خاں کے دو بیٹے ہوئے۔ جن

تیسری شادی تخت نشینی کے بعد کی جس سے ایک بیٹا پیدا ہو

خاں کے مزاج پر اس آخری بیگم کو سب سے زیادہ قابو تھا۔ معاملہ فہمی۔ دانائی اور سنا میں یہ خاتون مشہور تھی۔ افغانستان میں سلطانہ کے نام سے مشہور تھی۔

جانشینوں کے لئے چند وصیتیں | عبدالرحمٰن خاں نے اپنی تزک دو حصوں میں تحریر کی ہے جس کے حصہ اول میں اس نے وہ واقعات تحریر کئے ہیں جو زندگی میں پیش آئے تھے اُن واقعات سے نتائج نکال کر اپنے جانشینوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ اچھی چیزوں کو اختیار کریں اور بری چیزوں سے بچیں اور دوسرا حصہ خاص طور پر ان وصیتوں اور تدابیر پر مشتمل ہے کہ افغانستان کو ملک کی ترقی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ بیرونی اور اندرونی پالیسی امیر کابل کی کیا ہونی چاہئے ان دونوں چیزوں کو عبدالرحمٰن خاں نے نہایت شرح و بسط سے تحریر کیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند وصیتیں

۱۔ سب سے مقدم اور مفید ترین صلاح جو اپنے جانشینوں اور قوم کو افغانستان کو عظیم الشان سلطنت بنانے کے لئے دے سکتا ہوں وہ اتفاق ہے۔ ہر افغانی کا فرض ہے کہ اتفاق کے فوائد کو مد نظر رکھے۔ اتفاق اور صرف اتفاق ہی افغانستان کو ایک عظیم الشان قوت بنا سکتا ہے اپنے وطن کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ تمام خاندان شاہی، شرفاء اور عوام الناس یکجہتی

ویکسانی قائم ہو اور سب ہم رائے بھی ہوں۔ افغانوں کو اسلام کا یہ زرین اصول مدنظر رکھنا چاہئے "انما المومنون اخوۃ"۔

۲۔ "میرے جانشین کو یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے کہ وہ قوم کو ثابت کر دکھائے کہ وہ مستقل مزاج، مضبوط طبیعت والا۔ اپنی ذات پر خود بھروسہ کرنے والا، جفاکش، ہمدرد اور وطن دوست حکمراں ہے اگر ان صفات میں سے ایک بھی کھو بیٹھے تو نہ صرف حکومت ہی کھو بیٹھے گا بلکہ خطروں میں مبتلا ہو جائے گا"

۳۔ "میرے جانشینوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ اپنی فرصت کے وقت تاریخ، جغرافیہ اور سیاسی کتب کا مطالعہ کرے کیونکہ یہ چیزیں ہر ایک حکمراں کے لئے ضروری اور لابدی ہیں۔ مزید برآں ان تمام اخبارات اور تصانیف کا مطالعہ کرے جن میں وقتاً فوقتاً مملکت افغانستان کے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں"

۴۔ "میرے جانشینوں کو چاہئے کہ میں نے جس باضابطہ حکومت کا بنیادی پتھر رکھا ہے گو ابھی تک اس نے جمہوری حکومت کی شکل نہیں اختیار کی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ میرے جانشین اگر مختلف ممالک کی حکومتوں کا طرز حکومت دیکھ کر اپنے لئے کوئی مفید طرز حکومت اختیار کریں گے تو انشاءاللہ تعالیٰ افغانستان دنیا کے متمدن ممالک کی صف میں کھڑا ہو سکے گا۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ بہترین اصول سلطنت وہی تھا جو کہ عرب کے اس عظیم الشان واضع قوانین یعنی ہمارے مقدس پیغمبر نے مقرر فرمایا تھا جس میں دو جماعتیں تھیں ایک مہاجرین اور دوسری انصار۔ ہر شخص اپنی رائے کا مجاز تھا۔ کثرت رائے پر عملدرآمد ہوتا تھا۔"

افغانستان کو جمہوری طرز پر چلانے کے لئے میں نے تین قسم کے وکلا دربار میں جمع کئے تھے۔ جو انتظامات حکومت کے متعلق مجھے مشورہ دیتے تھے مجھے امید ہے کہ میرے جانشین میری پیروی کریں گے۔ تدریجی طریقے سے ملک کو جمہوری نظام سے روشناس کریں گے اس کے بعد تمام ملک سے نمائندوں کا انتخاب کریں گے اور ایک مضبوط مجلس شوریٰ قائم کریں گے جو ملک کا تمام انتظام اپنے

مشورے سے کر سکے۔

۵۔ میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ جو اسلامی تحریک ملک میں جاری کرنا چاہیں وہ سوچ سمجھ کر جاری کریں ایسا نہ ہو کہ رعایا کے جذبات کو ٹھیس لگے۔ مغربی تعلیم کے وا[illegible]سلوم اور جمہوری طرز حکومت کے قوانین بتدریج اختیار کریں۔"

۶۔ میرے جانشینوں کے لئے ضروری ہے کہ ہو [illegible]

کی تعلیم و تربیت اور جدید اسلحہ جنگ کی بہم رسانی او [illegible]

کو اپنے سپاہی عارضی نہ دیں کیونکہ اس سے بڑے نتا [illegible]

خیال رکھنا چاہئے۔ ان کو مقررہ وقت پر تنخواہیں دی [illegible]

کی حفاظت کر سکیں۔ اسلحہ کے کارخانے جو میں نے قائم کئے ہیں ان کو ترقی دیں۔ معادن سے دھاتیں نکال کر جنگی سامان کی تیاری میں صرف کریں میرے جانشینوں کا یہ فرض ہے کہ ہر وقت تین لاکھ فوج مسلح تیار رکھیں تاکہ بوقت ضرورت ملک کی حفاظت ہو سکے۔"

عبدالرحمٰن خاں نے جو وصیتیں اپنے جانشینوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اپنی تزک میں تحریر کی ہیں ان سب کا اگر یہاں ذکر کیا جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا اس لئے مندرجہ بالا وصیتوں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

عبدالرحمٰن خاں اور اتحاد اسلامی | عبدالرحمٰن خاں روسی اور برطانوی سیاسی پیش قدمی کو دیکھ کر اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں تحریر کرتا ہے کہ ایران، ٹرکی اور افغانستان تینوں اسلامی سلطنتیں متحد ہو کر اس مغربی پیش قدمی کو روکیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر سہ اسلامی سلطنتیں بذریعہ تار اور ریل ملائی جائیں تاکہ تجارتی، معاشی اور معاشرتی فائدہ ہو۔ لیکن افسوس مسلمان مدبرین نے اس مفید تجویز کی ناقدری کی جس کا نتیجہ بالآخر ظاہر ہو کر رہا۔

ایک دوسری جگہ عبدالرحمٰن خاں اپنی تزک میں مسلمانوں کی نا اتفاقی اور انتشار پر افسوس کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"اسلامی تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اسلامی سلطنتوں کا زوال صرف باہمی عناد و نااتفاقی اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے ہوا ہے اہل اسلام کو کامل عروج صرف اس مبارک و پاک قول پر عمل درآمد کرنے سے ہوا ہے جس کی اس عالیشان ترکیب وہندہ و اصلاح کنندۂ عرب علیہ السلام نے تلقین فرمائی ہے اور وہ قول یہ ہے" انما المومنون اخوۃ " یعنی مسلمان سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور باہمی اور باہمی نفاق اور تفرقہ اور اس عمدہ اصول اور اتفاق کی پابندی نہ کرنے کے سبب سے اہل اسلام تباہ و برباد ہو گئے اور یکے بعد دیگرے ان کی عظیم الشان مملکتیں ان کے ہاتھوں سے جاتی رہیں۔

علمی قابلیت گو عبدالرحمن خاں کی تعلیم معمولی تھی لیکن انقلابات زمانہ اور تجربات نے اس کے اندر وہ قابلیت پیدا کر دی تھی کہ بڑے بڑے تعلیمیافتہ انسان بھی اس قابلیت سے محروم تھے عبدالرحمن خاں کی تصانیف میں سے مشہور تر تصنیف " تزک عبدالرحمانی " ہے جس میں عبدالرحمن خاں نے وہ تمام واقعات درج کئے ہیں جو اس کو اپنی زندگی میں پیش آتے تھے۔ یہ کتاب نہایت شستہ فارسی میں اس نے تحریر کی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ عبدالرحمن خاں کا طرز تحریر نہایت اعلیٰ اور دلفریب ہے۔ عبدالرحمن خاں کی نثر بالکل موتیوں کی لڑیوں کی طرح مسلسل ہے۔

عبدالرحمن خاں اپنے زمانہ کا نہایت اعلیٰ درجہ کا خطیب تھا ایک مشرقی اخبار نویس عبدالرحمن خاں کو قوت خطیبانہ پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"عبدالرحمن خاں اپنے زمانہ کا ایک زبردست خطیب ہے اس کی عام تقریریں سننے میں ایک دلچسپی پائی جاتی ہے یہ تقریریں فی الواقع فصیح و بلیغ علم منطق کی چاشنی سے پر ہوتی ہے تقریر کے وقت سامعین پیکر دیوار کی طرح اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں عبدالرحمن خاں اپنی تقریر میں گزشتہ تاریخی واقعات کا حوالہ دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تاریخ کا مطالعہ بہت ہی عمیق نظر سے کیا ہے۔"

عبدالرحمٰن خاں کی شخصیت | عبدالرحمٰن خاں کا میر منشی سلطان محمد خاں بارایٹ لا مترجم تزک عبدالرحمانی اپنی کتاب کے دیباچہ میں عبدالرحمٰن خاں کی زندگی پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"عبدالرحمٰن خاں اپنے زمانے کا بزرگ و لائق ترین شخص تھا ان تمام مدبروں نے جو اس
سے ملے ہیں یہی رائے قائم کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ عجب و غریب ... ...
جو انھیں ایک ایسے ملک کو جوان کے زا... ...
سے آباد تھا ایک مضبوط اور متحد اسلامی سلطنت
حال کی نئی حملوات کا مرکز بنانے میں ہو
قدرتی فہم و ذکا کے لئے کافی شہادت ہو"

عبدالرحمٰن خاں کا وہی میر منشی عبدالرحمٰن خاں کی زندگی کی نیرنگیاں گناتے ہوئے اپنی کتاب کے دیباچہ میں آگے ایک دوسری جگہ یہ تحریر کرتا ہے۔

"عبدالرحمٰن خاں ایک وقت ہم کو قید و بند نظر آتا ہے تو دوسرے وقت اپنا کھانا آپ پکاتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ کبھی وائسرائے ہند کے پاس پناہ مانگتا ہے اور کبھی بحیثیت امیر کابل کے اس سے ملاقات کرتا ہے کسی وقت خود جنرل ہے اور دوسرے وقت کسی جنرل کے ماتحت کام کرتے ہوئے نظر آتا ہے کبھی کسی انجنیر اور آہنگر کی شکل میں ہے تو دوسرے وقت فرمانروائی کے لباس میں دکھائی دیتا ہے ایک جگہ وہ باغبانی کرتے ہوئے تو دوسری جگہ روسی اور برطانوی عالیشان درباروں میں ممتاز جگہ پر جلوہ افروز نظر آتا ہے کبھی بادشاہ ہے اور کبھی خشک ٹکڑے کے لئے محتاج ہے۔ غرض کہ یہ خوبیاں اور نیرنگیاں کسی اور ایشیائی فرمانروا میں بہت کم پائی جاتی ہیں"

سر لیپل گریفن جس نے افغانی سرداروں اور افغانی معاملات کا بہت عمیق مطالعہ کیا تھا

وہ عبدالرحمٰن خاں کی لیاقت و تدبر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"میری رائے میں وہ تمام بارکزئی سرداروں میں جو آج تک مجھے ملے ہیں لیاقت میں سب سے بڑھ کر تھا۔ اس کی گفتگو سے دانائی و فہم و فراست ظاہر ہوتی تھی گفتگو میں وہ امر بحث طلب پر نہایت قابلیت سے نکتہ چینی کرتا تھا۔ اس کی رائے لیاقت و ذہانت سے پر تھی۔"

ایک امریکی سیاح جو عبدالرحمٰن خاں سے ۱۸۷۳ء میں سمرقند میں ملا تھا وہ عبدالرحمٰن خاں کی شخصیت پر رائے زنی کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے۔

"وہ ایک جوان رعنا اور بارعب مضبوط آدمی ہے۔ وہ نہایت رعب و داب سے چلتا ہے اور اس کی حرکات و سکنات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بات کا پکا اور حکمرانی کا عادی ہے۔"

(۱)

منگولیا ایک لق و دق، ہولناک صحرا ہے، اس

کی میتری تک ڈنک مارنے کا موقعہ تاکتی رہتی ہے

منگولیا والے کے دل کا حال کوئی نہیں جانتا

روسیوں سے بہت دور، نارکاتے صحرا کے پاس پہنچ کر

اور سات ساحلوں کے کنارے گمنام ہرے بھرے ملکوں میں پھیل جائے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بہت سے کرغیوں نے جو روسی لڑائی کے زمانے میں اپنا مال اسباب گاڑیوں پر لاد کر ارتیش سے منگولیا پہنچے تھے اپنے ڈیرے روسیوں کے قریب ڈال لیے تھے، اُن کے دل کا حال سب پر روشن ہے۔ پھرتے پھراتے وہ وہاں پہنچے اور اپنے جانوروں، بال بچوں اور بیماروں تک ساتھ لیتے گئے۔

روسی بے دردی سے اس طرف دھکیلے جا رہے تھے، مگر وہ ہٹے کٹے کسان تھے۔ اپنے ننگے ضعیفوں کو وہ پہاڑوں کے پتھروں پر چھوڑ آئے: ایک آدمی یہاں مرا، دوسرا وہاں مار مار کے ہلاک کر دیا گیا، بال بچے اور اوزار اور مویشی گوروں کے رحم پر چھوڑ دئے گئے۔ بہار کے زمانے میں کسان بھیڑیوں کی طرح کینہ ور ہو جاتے تھے اپنے خیموں میں لیٹے لیٹے اسٹیپی کا ارتیش کا خیال کرتے رہتے تھے۔ ۔ ۔

وہ پچاس کے قریب تھے۔ سرجائی سلی دانوف اُن کا سردار تھا۔ اُن کی پلٹن کا نام "رفیق سیلی دانوف کی سرخ فوج کا دستہ" تھا۔

اُن کے دل اچاٹ تھے۔

جب وہ پہاڑوں پر سے دھکیلے جا رہے تھے تو کالی پتھریلی زمین جس پر سے انھیں گزرنا پڑتا تھا

کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ وہ اسٹیپی میں پہنچے۔ وہاں اُنکا دل نہ لگا کیونکہ یہ کھلے میدان اُن کے ادتیش بالا میدانوں سے کٹے ہوئے تھے، بھری ریت، سخت گھاس، لوہے کی طرح تپتا ہوا آسمان، سب باتیں انوکھی اور پرائی تھیں اور زمین

عورتوں کے بغیر زندگی دوبھر تھی۔

رات کے وقت وہ حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے تھے اور عورتوں کی بات سپاہیانہ زبان میں کہتے تھے اور جب حالت برداشت سے باہر ہو جاتی تو گھوڑوں پر زین کس کے اسٹیپی میں کرغی عورتوں کو پکڑتے تھے۔ کرغی عورتیں اپنے تئیں ان کے قبضے میں دے دیتی تھیں

ان کے ساتھ ہم بستر ہونے سے گھن آتی تھی، کیونکہ وہ بے حس ہو کر لیٹ جاتی تھیں اور آنکھیں زور سے بھینچ لیتی تھیں۔ یہ ایسا ہوا جیسے گھر کے مویشیوں کے ساتھ گناہ کیا۔

کرغی کسانوں سے ڈرتے تھے اور اسٹیپی کے قلب میں گھس جاتے تھے۔ کسی روسی کو دیکھتے تو اُسے بندوق یا کمان سے ڈراتے، کڑک کر للکارتے، مگر نہ تیر چلاتے نہ بندوق۔ شاید چلا نہیں سکتے تھے؛

(۲)

دستے کا خزانچی افاناسی پیترووچ دودھ پیتے بچے کی طرح بسورتا رہتا تھا۔ اُس کا چہرا بھی شیر خوار بچوں کا سا تھا، چھوٹا، صاف، سرخ و سفید۔ مگر اس کی ٹانگیں اونٹ کی طرح لمبی اور مضبوط تھیں۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کے تن جاتا تھا۔ اس کا چہرا چھپا ہوا معلوم ہوتا تھا مگر شکل سے عتاب اور جلال ٹپکتا تھا۔

تثلیث کے دن تین آدمیوں کو حکم دیا گیا کہ اسٹیپی میں جا کر اچھی چراگاہیں تلاش کریں۔ یہ تین سلی وانوف خود، خزانچی افاناسی پیترووچ اور معتمد دریوزینن تھے۔

ریت دھوپ میں دھوئیں کے بادل کی طرح اٹھتا تھا۔

اوپر سے ہوا چل رہی تھی، زمین میں سے تھرتھراتے ہوئے آسمان کی طرف بخارات اٹھتے تھے

آدمیوں اور جانوروں کے جسم پتھر کی طرح سخت اور بھاری تھے۔ ہر چیز سے دہشت برستی تھی۔

سیلی وانوف نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا:

"نہ معلوم اُس طرف چراگاہوں کی کیا حالت ہوگی؟"

اُس کے ساتھی سمجھ گئے۔ اُس کی مراد ازمش سے تھی گر [illegible]

تھا گویا سورج نے اُن کے بال جلا دئے، جیسے وہ [illegible]

چھوٹی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ تھیں، جیسے پگھلی [illegible]

کی گرمی تھی۔

آخر کار افاناسی تیہ ورچنے [illegible] لہجے میں کہا۔

"کہیں اس طرف بھی سب کچھ نہ سوکھ گیا ہو؟"

اُس کی ہمین آواز نم ناک تھی، مگر آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ البتہ اُس کی ران کے نیچے تھکے ہوئے اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کی بڑی لمبی آنکھوں میں قطرے جھلک رہے تھے۔

اس طرح ایک کے پیچھے ایک جنگلی بکریوں کے بنائے ہوئے ڈگر پر دستے والے اسٹیپی کے رُخ چلے جا رہے تھے۔۔۔

ریت آگ کی طرح تپ رہا تھا، جہاں تک نظر کام کرتی تھی پھیلا ہوا تھا۔ ایسی ہوا تھی جس سے دم گھٹتا تھا۔ پسینہ جسم کے اندر ابل رہا تھا، مگر خشک جلد کے باہر نہیں پھوٹتا تھا۔۔۔

شام کے قریب جب وہ ایک وادی میں سے نکل رہے تھے، سیلی وانوف نے مغرب کی طرف اشارہ کرکے کہا:

"وہ دیکھو! اُس طرف سوار نظر آتے ہیں۔"

اس کا خیال ٹھیک تھا، حدِ نظر پر ریت کے گلابی بادل دکھائی دیتے تھے۔

"مکرنی ہوں گے۔"

آپس میں بحث ہوئی۔ دریونیہ ہین نے کہا کہ کرنی سیلی وانوف کے کیمپ سے دور دور رہتے

ہیں، اُن میں اتنی ہمت نہیں کہ پاس آئیں۔ افاناسی تیپرووچ نے کہا، نہیں ، کرغی ہی ہیں۔ ایسی بھاری گرد عموناً وہی اڑاتے ہیں۔

مگر جب وہ غبار کے قریب پہنچے تو سب کی رائے ہوئی :

'باہر والے . . . خبر نہیں کون . . .'

اپنے سواروں کی آواز سے گھوڑے سمجھ گئے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ انھوں نے کان کھڑے کئے اور اشارے سے بہت پہلے ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ خاکی اور زرد رنگ کے گھوڑے، لاشوں کی طرح، گڑھوں میں دبک گئے، اُن کی بانس کی سی لمبی لمبی ٹانگوں سے بے بسی ظاہر ہو رہی تھی۔ انھیں دیکھ کر ہنسی آتی تھی، کیا یہ شرم کا اثر تھا کہ انھوں نے اپنی بڑی بڑی سہمی ہوئی آنکھیں بند کر لیں اور ہانپنے لگے؟

سیلی وانوف اور خرانچی افاناسی تیپرووچ اپنے گھوڑوں کے برابر لیٹے ہوئے تھے۔ خرانچی ناک چڑھا کر سو رہا تھا۔ اس کی ڈھارس بندھانے کے لئے سیلی وانوف اُسے ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا اس بچوں کے سے سونے سے اس بھاری ڈیل ڈول کے کسان کے دل کو ٹھنڈک پہنچی اور اسے شرارت سوجھی۔

پگڈنڈی غبار میں چھپ گئی تھی۔ پہیوں کی آواز آتی تھی گھوڑوں کی لمبی لمبی کالی ایال گرد میں لہراتی ہوئی نظر آتی تھی۔

سیلی وانوف نے یقین کے لہجے میں کہا :

'روسی . . . افسر . . .'

نئی بنی ہوئی گاڑی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اُن کی ٹوپیوں کے گرد لال پٹیاں تھیں۔ گرد سے اُن کے چہرے چھپ گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لال لال پٹیاں پیلے بادلوں میں جھلک رہی ہیں ایک ہاتھ جس میں چابک تھا جب گرد کے اوپر اٹھتا تھا تو اُس کے ساتھ ایک بندوق کی نال بھی اٹھتی تھی۔

دریویز مینن نے کچھ سوچ کر کہا :

'افسر کسی کام سے جا رہے ہیں۔ چڑھائی کی تیاری ہے . . . صاف معلوم ہوتا ہے'

پھر بے ادبی سے آنکھ مار کر بولا :

"سیلی وانچک، ہم ان کا قصہ پاک کر دیں گے نا ؟

گاڑی اپنے مسافروں سمیت آگے بڑھ رہی ہے، اُن کے پاس بچے گھوڑے ہیں۔ وہ خوش خوش چلے جا رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے گاڑی کے جو نشان بنتے ہیں، وہ ننگ لیا گیا، وغبار سے اس طرح مٹتے جا رہے ہیں جیسے کسی نے لومڑی کی دم سے اُن ۔۔

افاناسی پیرودیچ نے اپنی رقت آمیز آواز سے کہا

'بھائیو اس کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ بہتر ہے

'اپنے سر کی خیر مناؤ ۔ ۔ ۔ مار کھانے کو جی چاہتا ہے

سیلی وانوف لال پیلا ہو گیا۔ جھڑک کر کہنے لگا :

'خزانچی یہاں رونے کی ضرورت نہیں ہے !'

سب سے زیادہ انھیں اس بات کا غصہ تھا کہ افسروں نے گارد کے بغیر اکیلے آنے کی ہمت کی گویا یہ خیال کیا کہ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، گویا کسانوں کو موت کا گھاٹ اتارنا معمولی بات ہے اسی وقت ایک افسر گاڑی میں سروقد کھڑا ہو کر اسٹیپی کے چاروں طرف نظر دوڑانے لگا۔ کیا خاک نظر آتا ؟ گرد تھی، جلی ہوئی سرخ گھاس پر شام کی ہوا تھی۔ دو گڑھوں کے پاس جو گھوڑوں کی لاشیں معلوم ہوتی تھیں، وہ پتھر تھے ۔ ۔ ۔ کس قسم کے پتھر تھے ؟ کیا لاشیں تھیں ؟ ۔ ۔ ۔

گاڑی، پہیے، سواریاں، اُن کے خیالات ۔ ۔ ۔ وہ تپتے ہوئے ریت پر بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

کمیں گاہ کے آدمیوں نے گولیاں چلائیں للکارا۔ پھر گولی چلائی

ایک ساتھ وہ دونوں ٹوپیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کے گاڑی میں گریں۔

باگیں دفعتہً ڈھیلی پڑ گئیں ۔ ۔ ۔

گھوڑے طرارہ بھر کے سرپٹ بھاگے ۔ ۔ ۔ گرے ۔ ایال پر سفید کف تھا۔ ۔ ۔ ۔ رگ رگ پھڑک

بھی تھی، گھوڑے سے جھکا کر اٹھے۔

افاناسی پتیرو وچ بولا:

ٹھنڈے ہو گئے . . .،

کسان اس طرف گئے۔ اندر جھانک کے دیکھا۔

سرخ پٹی کی ٹوپیوں والے دونوں مسافر مر چکے تھے۔ دونوں کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے سر پیچھے کی طرف کو جھکے ہوئے تھے۔ مُردوں میں سے ایک عورت تھی۔ اُس کے بال بکھر گئے تھے، فوجی وردی میں سے عورت کی اونچی چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

درویز مینن نے کہا، عجب بات ہے۔ قصور اسی کا ہے۔ اسے یہ ٹوپی پہننے کا کوئی حق نہیں تھا۔

عورت کو کون مارنا چاہتا ہے؟ . . عورتوں کی سماج کو ضرورت ہے۔

افاناسی پتیرو وچ نے ٹھوکا۔

تم بھی نرے بن مانس اور بورژوا[1] ہو . . . تمہاری کھوپری میں کچھ نہیں ہے . . کوڑا ہی کوڑا ہے . . . . .،

سیلی وانوف نے انہیں روکا۔ اتنی زبان مت چلاؤ، ہم لٹیرے نہیں ہیں، سامان کی فہرست بنانی چاہئے۔ یہ اب قوم کی ملکیت ہے۔ کاغذ لاؤ،

قومی ملکیت کی چیزوں میں سب سے پہلے ان کی نظر ایک ہلکے رنگ کی آنکھوں اور بھورے بالوں والے بچے پر پڑی جو ایک بنی ہوئی چینی ٹوکری میں لیٹا تھا۔ اپنے چھوٹے سے ہاتھ میں وہ خاکی کمبل کا کنارا بھینچ کر پکڑے ہوئے تھا، شیر خوار تھا، ننھا منا تھا، اور مہین آواز سے روں روں کر رہا تھا۔

افاناسی پتیرو وچ نے رقت سے کہا:

دیکھا . . . اس کی بھی سنو یہ کیا کہتا ہے . . .،

---

(۱) متوسط طبقے کے شریف آدمی کو کہتے ہیں۔ اشتراکیوں کے نزدیک گویا یہ گالی ہے۔

عورت پر انھوں نے رحم کھایا اور اس کے کپڑے نہیں اتارے۔ مرد کو ننگا ریت میں گاڑ دیا۔

(۳)

افاناسی بھیر روح پکڑی ہوئی گاڑی میں واپس روانہ ہوا۔ بچے کو گود میں لے لیا اور اُسے ہلا ہلا کر دھیمی آواز سے گانے لگا:

بلبل درد بھرا گیت گاتی ہے . . . مینا بھی
اُسے اپنا گاؤں لیبیا جانی، سونشیوں سنگ
وہ دبی ہوئی آواز سے رونے لگا۔

بچہ بھی رویا۔

تپتا ہوا، بھربھرا، خشک ریت بھی، جب گاڑی اس پر سے گزرتی ہے، دبی آواز سے روتا نظر آتا تھا۔

دستے والے اپنے پستہ قد، مضبوط کھال کے منگولی گھوڑوں پر سوار تھے۔ اُن کے چہرے تپ رہے تھے، اُن کی رگیں تپ رہی تھیں۔

پگڈنڈیوں کے قریب دھوپ سے جھلسے ہوئے خنظل کے قطعے تھے جن کے کانٹے ریت کی طرح نوک دار تھے۔

ریت خنظل ہے، باریک اور چبھتا ہوا۔

آہ، پگڈنڈیاں، بکریوں کی پگڈنڈیاں! آہ، ریت، چبھتا ہوا ریت! منگولیا ایک لق ودق، ہولناک صحرا ہے! . . . .

× × × × × ×

انھوں نے افسر کے سامان کا جائزہ لیا، کتابیں تھیں، ایک ڈبے میں تمباکو، اور فولاد کے چمکتے ہوئے آلات تھے۔ ان میں سے ایک پیتل کا چوکور ڈبہ تھا جو تین لمبی ٹانگوں پر کھڑا تھا، اس کے کئی حصے تھے۔

دستے والوں نے مختلف چیزوں کو تولا، انھیں ہاتھ سے چھوا، بار بار اُٹھا کر دیکھا کہ ان میں کتنا بوجھ ہے۔

کانوں میں سے بیشتر کی چربی کی بوآتی تھی کچھ اور کرنے کو نہ تھا وہ بہت سا کھا گئے۔ چکنائی ان کے کپڑوں پر گر گئی۔ بڑی بڑی گال کی ہڈیاں ، پتلے پتلے ہونٹ، وہ ڈان کے کنارے تھقاز کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے ، لمبے لمبے کالے بال، سنولائے ہوئے چہرے ۔ وہ چونے کی کانوں میں کام کر چکے تھے۔

ان سب کی ٹانگیں ہنڈی تھیں۔ ان کی آوازیں اسٹیپی والوں کی طرح حلق سے نکلتی تھیں

افاناسی پتیر وویچ نے پیلی اسے کو ٹانگ سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنی آنکھوں سکیڑ لیں:

'یہ ذرہ بین ہے ... ابھی دربین ہے ، ہاتھوں میں آ ئی ہوگی۔ یارو انھیں اس میں چاند دکھائی دیا ... چاند میں ریت ... اسے دھونے کی ضرورت نہیں ... آٹے کی طرح گرتا ہے خالص سونا ہے ، بس بوری میں بھرنے کی دیر ہے ... '

ان میں سے ایک جو شہر میں رہ چکا تھا قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

' زیٹ '

افاناسی پتیر وویچ کو تاؤ آگیا۔

' پلید مُردار ، یہ زیٹ ہے ؟ ... ذرا ٹھہر جا ، کس کے لئے ٹھہروں ؟ '

افاناسی پتیر وویچ نے پستول سنبھالی۔

سیلی وانوف نے اُن کا غصہ دھیما کیا۔

تبا کو انھوں نے آپس میں بانٹ لیا اور آلات خزانچی کے حوالے کر دئے ، وہ موقع پاکر کسی چیز کے بدلے میں کرغیزوں کو دے دے گا۔

اُس نے آلات بچے کے آگے رکھ دئے۔

ان سے کھیل . . .،

بچے نے اس نذرانے پر توجہ نہیں کی، روئے گیا۔ افاناسی پتیر دویچ نے اُسے بہلانے کی بہت کوشش کی، پسینے پسینے ہوگیا مگر بچہ نہ بہلا۔ برابر روتا رہا۔

باورچی کھانا لائے مکھن، دلئے اور شوربے کی بھبک۔ [illegible]

بڑے بڑے چمچے نکالے گئے۔ خیمے والوں نے گھاس پا دُر ــ

پکار کر کہا:

جلدی کرو! . . . بھوک لگ رہی ہے . . . یہاں

کھانا کھا چکے تو خیال آیا: بچے کے کھانے کا کیا ہوگا؟ اس سے [illegible]

افاناسی پتیر دویچ نے روٹی کا نوالا چبایا۔ گیلی روٹی کا ٹکڑا بچے کے ننھے سے کھلے ہوئے منہ میں رکھ کر چمکار کر کہا:

ننھے . . . اسے حلق سے اتارلے، ننھے . . . مزے کا ہے۔

مگر بچے نے منہ پھیر لیا اور ہونٹ بند کرلئے، ناک ہی ناک میں بلکتا رہا، اس کی دبی ہوئی چیخوں سے دل ہلا جاتا تھا۔

کسان آئے اور اُس کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے، ایک کے پیچھے ایک کھڑا ہوکر بچے کو دیکھنے لگا۔ سب چپ تھے۔

شدت کی گرمی تھی۔ اُن کے گلے اور ہونٹ گوشت سے چکنے ہوگئے تھے۔ کرتوں کے گلے کھلے تھے، پاؤں ننگے اور منگولیا کی زمین کی طرح زرد تھے۔

ایک کسان نے تجویز پیش کی:

'شوربہ پلا کے دیکھو۔'

انھوں نے شوربہ ٹھنڈا کیا۔ افاناسی پتیر دویچ نے اس میں انگلی ڈبو کر بچے کے منہ میں ٹھونس دی۔ چکنا گاڑھا شوربہ ہونٹوں پر سے بہتا ہوا اس کے چھوٹے گلابی کرتے اور موٹی بانات کے کمبل پر گرگیا۔

اس نے نہیں پلٹ دیا۔

"کتے کا پلا زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے ... تمہاری انگلی چبا جاتا ..."

"ایک کتا ہے، دوسرا انسان ...."

"سوچنے سے کام نہیں چلے گا!"

کیمپ میں گائے کا دودھ نہیں تھا۔ انھوں نے سوچا کہ گھوڑی کا دودھ پلائیں۔ پھر خیال آیا کہ کہیں بچہ مر نہ جائے۔

کسان اپنی گاڑیوں کے پاس چلے گئے، حیران پریشان ٹکریوں میں بٹ کر سوچنے لگے۔ افانا سی پتیرووچ ایک بیٹا بنیان کندھے پر ڈالے کبھی اس گاڑی کے پاس جاتا تھا کبھی اس کے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی میچی پڑ تی تھیں۔ اس کی بہن آواز بچے کی طرح مضطرب تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بچہ بسورتا ہوا ادھر سے ادھر پھر رہا ہے

اب کیا ہوگا؟ ... کسانو کیا کیا جائے؟ ... کوئی تدبیر تو ہو گی، کیوں؟ ... کتے کے بچو، تمہارے بھیجے میں کچھ نہیں آتا؟ ...،

چوڑے چکلے شانوں والے، قوی ہیکل جوان بے بس کھڑے تھے۔

"یہ عورت کا کام ہے ..."

"کہتے تو ٹھیک ہو ..."

"عورت کے ہاتھ سے پوری بھیڑ کھا جاتا ...."

"یہی بات ہے ..."

"ویلی وانوف نے لوگوں کو جمع کر کے کہا:

یہ نہیں ہو سکتا کہ اس عیسائی بچے کو جانوروں کی موت مرنے دیا جائے مانا کہ اس کا باپ بورژوا تھا۔ مگر بچے کی بات کیا کہتے ہو؟ وہ خود بے قصور ہے۔"

کسانوں نے اتفاق کیا۔

دیویز مینن نے ایک قہقہہ مارا۔

بچے کو بڑا ہونے دو! یہ ہمارے ساتھ رہے گا۔ اور سنہری ریت جمع کرنے چاند تک اڑ کر پہنچے گا ....''

کسانوں کو ہنسی نہیں آئی۔ افاناسی پتیرووچ نے گھونسا تان کر زور سے کہا:

تم جاہل ہو۔ یہ ہے تمہاری کرپا! ایک تمہیں نہ!

اس نے زمین پر پاؤں مارا، اپنے شانے ہلائے

'گائے ... اس کے لئے گائے چاہئے!'

سب نے ایک زبان ہو کر کہا:

''گائے کے بغیر نہیں جی سکتا ....''

'گائے ہونی چاہئے ...'

'گائے کے بغیر مر جائے گا!''

افاناسی پتیرووچ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا:

یارو گائے میں جا کر لاؤں گا ...

دریویز مینن نے بدتمیزی سے بات کاٹ کر کہا:

'کیا ارتیش یا لیبیا جا رہے ہو؟'

'کمبخت موذی، ارتیش جا کر کیا لوں گا! کرغیوں کے پاس جا رہا ہوں

دوربین کے بدلے گائے لانے کا خیال ہے! جائیے سرکار!'

افاناسی پتیرووچ آگ بگولا ہو گیا:

مُردار! میرے گھونسے کا مزا چکھے گا؟'

پنچایت کے چودھری سیلی وانوف نے کہا:

'بس اب چپ رہو!'

رائے لی گئی۔ فیصلہ ہوا کہ دریوز مینن، افاناسی پتیروچ اور تین اور گھوڑوں پر سوار ہو کر سیڑھی میں کرغیزوں کے کسی گاؤں میں جائیں اور ایک گائے کو گھیر کر اپنے ساتھ لیتے آئیں، سو قہوہ چلاؤ ممکن ہے دو یا پانچ گائیں ہاتھ لگ جائیں۔ باورچی کہہ رہے تھے کہ گوشت کا ذخیرہ ختم ہونے والا ہے۔ انھوں نے بندوقیں زین سے باندھیں اور لومڑی کی کھال کی ٹوپیاں پہنیں تاکہ دور سے کرغیز معلوم ہوں۔

بچے کو کمبل میں لپیٹ کر گاڑی میں لٹا دیا۔ ایک جوان کسان اس کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا اور بچے کا دل بہلانے کے لئے تھوڑے وقفے سے خنظل کی جھاڑیوں میں گولیاں چلاتا رہا۔

(۴)

آہ منگولیا کا سنسان ریت! آہ کمبخت نیلے پتھر!

روسی ریت پر چلے جا رہے ہیں۔ رات ہے۔
ریت میں سے گرم گرم بھبکے، خنظل کی بو اٹھتی ہے۔
کرغیزوں کے گاؤں کے کتے بھیڑئیے پر، اندھیرے پر بھونکتے ہیں،
بھیڑئیے اندھیرے میں بھوک پر، موت پر دہاڑتے ہیں۔
کرغیز جان بچا کر بھاگے۔
کیا مویشیوں کے گلّے صحیح سلامت رہ جائیں گے؟

کرغیزوں کے گاؤں میں سے کھٹے دودھ کی بو آتی تھی، دبلے بھوکے بچے الاؤ کے ارد گرد بیٹھے تھے ان کے پاس کتی تیز دانت والے کتے تھے جن کی ہڈیاں نکلی ہوئی تھیں جیسے جھاڑ پونس کے توشے معلوم ہوتے تھے۔ خیموں کے پار ایک جھیل اور سرکنڈوں کی جھاڑیاں تھیں۔ دفعتہً جھاڑیوں میں سے گولیوں کی آواز آئی جو الاؤ پر چلائی گئی تھیں۔ بھگدڑ مچ گئی۔
کرغیز گھبرا کر اپنی ٹاٹ کی جھونپڑیوں میں سے نکل نکل کر بھاگے، دہشت کے مارے چیخنے لگے

ہیک ہیک کر گھوڑوں پر چڑھ گئے۔ گھوڑے دن رات زین کسے کسائے کھڑے رہتے تھے۔ اپنے خیموں کو روند ڈالا، اسٹیپی کو روند ڈالا، سرکنڈوں میں سے چیخیا نہ صدائیں آ رہی تھیں۔

"خبردار، خبردار، لال فوج، گوری فوج۔ روسی۔ خبردار، خبردار . . ."

ایک سفید داڑھی والا آدمی گھوڑے پر سے گرا۔ اس کا سر ایک ٹیڑھی ہوئی دیگ سے ٹکرایا۔ دیگ الٹ گئی۔ وہ جل گیا اور دبی ہوئی آوازیں کرنے لگا۔ ایک [illegible] پہنچا، احتیاط سے چلتے ہوئے دودھ میں منہ ڈالا۔

گھوڑیاں زور سے ہنہنانے لگیں گلے میں بھیڑ پر بھیڑیں آگریں۔ گائیں ہانپنے لگیں۔

کرغی عورتوں نے روسیوں کو دیکھ کر بے بسی اور عاجزی سے ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیے۔

دریویزمینن ہوس ناک انداز سے ہنسا۔

"تو گویا ہم ساتھ ہوتے۔ کیوں! ہم سے ہمیشہ یہ نہیں ہوگا . . ."

اپنی چپٹی بوتل دودھ سے بھر کر، چابک کھینچتا ہوا، گائیں اور بچھڑے گھیر کر وہ ایک خیمے کی طرف لے گیا۔

بچھڑے رسی سے چھوٹ کر تھنوں کی طرف جھپٹے اور ہمک کر تھن اپنے بڑے بڑے نرم ہونٹوں میں لے لئے۔

"بہت بھوکے معلوم ہوتے ہیں . . ."

دریویزمینن نے بچھڑوں پر بندوق چلائی۔

اتفاقاً سی پتیرووچ گاؤں کا چکر لگا کر دریویزمینن کے ساتھ اپنے گھوڑے پر چڑھ رہا تھا کہ اسے خیال آیا:

"مارے کمبخت دودھ پلانے کی بوتل لینی ہے، بھول ہی گیا تھا!"

بوتل کی تلاش میں کبھی خیموں کے اندر جاتا تھا، کبھی باہر نکلتا تھا خیموں کی آگ بجھنے کو تھی۔

افاناسی پتیر ووچ نے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اٹھائی اور بوتل ڈھونڈھنے لگا۔ لکڑی کو اس طرح اٹھایا کہ اس میں سے چنگاریاں اڑنے لگیں اور وہ دھوئیں سے کھانسنے لگا۔ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لکڑی چٹخ رہی تھی دوسرے ہاتھ میں بندوق تھی، بوتل نہیں ملی۔ مسکین کرغی عورتیں اپنے بچھونوں پر پھیلی ہوئی لیٹی تھیں بچے چلا رہے تھے۔

افاناسی پتیر ووچ کو جلال آگیا۔ ایک خیمے میں اس نے ایک کرغی عورت کو ڈانٹ کر کہا:

" نابکار! بوتل چاہئے، بوتل! "

کرغی عورت رو رو کر اپنا ریشمی خفتان کھولنے لگی . . . اس کے پہلو میں ایک بچہ گدڑی میں رو رہا تھا۔

افاناسی پتیر ووچ نے جھپٹ کر اس کی چھاتیاں ہاتھ میں لیں اور انھیں دبایا۔ اس نے سیٹی بجائی اور خوشی سے بے قابو ہو کر چیخنے لگا۔

واہ وا، دودھ پلانے کی بوتل! خوب ملی! . . . آنا غل کیوں مچاتی؟ بہت اچھی بوتل ہے! اندھیرے میں اس عورت کو زین پر بٹھایا اور بار بار اس کی چھاتی پر ہاتھ ڈالتا رہا، یہاں تک کہ اسے پلی وانوف کے کیمپ میں لے آیا۔

خوشی کے جوش میں کہنے لگا، جو چیز چاہتا تھا وہ مل گئی۔ جب میں کہتا ہوں کہ فلاں چیز کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ لاؤں گا تو ڈھونڈھ لاتا ہوں، خواہ اس کے لئے زمین ہی کیوں نہ کھودنی پڑے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

(۶)

کیمپ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کرغی عورت اندھیرے میں اپنے بچے کو بھی ساتھ لے آئی ہے۔ کسانوں نے کہا خیر دودھ دونوں کے لئے کافی ہو جائے گا۔ گائیں ہیں اور عورت بھی خوب تیار ہے۔

کرغی عورت گم صم تھی، اس کے چہرے پر سختی تھی جب کوئی آس پاس نہ ہوتا تو بچوں کو دودھ

پاتی تھی۔ دونوں نیچے میں ٹاٹ کے بچھونے پر لیٹ جاتے۔ ایک بالکل سفید، دوسرا زرد، اور دونوں ایک سی آواز میں روتے تھے۔

ہفتہ بھر بعد پنچایت میں افاناسی پتیروویچ نے شکایت کی:

"رفیقو، مجھے یہ آنکھ مچولی پسند نہیں۔ کرغی عورت ہمیں دھوکا دے رہی ہے، سارا دودھ اپنے بچے کو پلا دیتی ہے۔ کبھی کبھار ایک آدھ بوند ہمارے بچے کو پلا دیتی ہے۔ بھائیو، میں اپنی آنکھ سے جھانک کر دیکھ چکا ہوں۔ تم خود بھی چل کر دیکھ لو . . . "

کسان گئے اور انھوں نے دیکھا بچے، بچوں کی طرح تھے۔

خربوزے کی طرح زرد۔ صاف نظر آتا تھا کہ کرغی کے مقابلے میں

افاناسی پتیروویچ نے ادھر اُدھر ہاتھ پھینک کر کہا۔

میں نے اس کا نام سوچ لیا ہے واسکا . . . مگر ذرا اس کو ———

نہیں تو کیا ہے!"

دریوزمینن بولا مگر اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ رہا کرتی اس کا کہیں پتہ نہ تھا:۔

"ارے میرے واسکا تو تو معلوم ہوا ہے کہ اب چلا"

انھوں نے ایک لکڑی لی اور گاڑی کے بم پر اس طرح رکھی کہ ایک رخ دوسرے سے زیادہ نہ جھکنے پائے، یہ دیکھنے کو کون زیادہ بھاری ہے، ایک بچے کو اس طرف اور دوسرے کو اس طرف بٹھا دیا۔ پھٹی پرانی گدڑی میں لپٹے ہوئے بچے رونے لگے، ان میں سے بچوں کی ہلکی ہلکی بو آتی تھی۔ کرغی عورت گاڑی کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

کسان چپ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔

سیلی وانوف نے کہا "اب چھوڑ دو! دیکھیں ترازو کیا کہتی ہے!"

افاناسی پتیروویچ نے لکڑی پر سے ہاتھ اٹھا لئے۔ روسی بچہ فوراً اوپر اٹھ گیا۔

افاناسی نے جھنجلا کر کہا "خدا سمجھے تجھ سے کمبخت زرد منہ والی"

اس نے ایک بھیڑ کی کھوپڑی جو زمین پر پڑی تھی اٹھائی اور روسی بچے کی طرف رکھ دی۔ دونوں کا وزن برابر ہو گیا۔

اس نے اپنے بچے کو بھیڑ کے برابر زیادہ دودھ پلا دیا تھا۔

کسانوں میں غوغا مچ گیا۔

’کسی نے دیکھ بھال نہیں کی ؟‘

’دیکھ بھال کے سوا اور بھی کام ہیں !‘

چند زیادہ ثقہ کسانوں نے اس رائے کی تائید کی:

’دیکھ بھال کوئی کیسے کر سکتا ہے ؟‘

’اس کے علاوہ وہ دوسرے بچے کی ماں ہے۔‘

افاناسی تیرووچ نے زمین پر پاؤں پٹخا اور پکار کر کہا:

’تو تم سمجھتے ہو کہ اپنے روس کے ایک جیتے جاگتے بچے کو اس بدیسی کیڑے پر قربان کر دیں؟ واسکا کو ایڑیاں رگڑ کے مر جانے دیں،‘

سیلی وانوف نے افاناسی تیرووچ سے کہا:

’اس کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیتے۔ میرا مطلب ہے اس دوسرے کا، مر جانے دو کرغی لونڈے کو۔ ایسے بہت سوں کو پار اتار چکے ہیں، ایک کم یا ایک زیادہ سے کیا فرق پڑتا ہے؟‘

کسانوں نے واسکا پر نظر ڈالی اور چپ چاپ وہاں سے چلے گئے۔

افاناسی تیرووچ نے کرغی بچے کو ایک پھٹی ہوئی بوری میں بند کر دیا۔

ماں رونے لگی۔ افاناسی تیرووچ نے اس کے کلّے پر ہلکا سا تھپڑ مارا اور بچے کو لے کر اسٹیپ پہنچا۔

(۶)

دو دن بعد کسان خیمے کے قریب پنجوں کے بل کھڑے ایک دوسرے کے شانے پر سے اندر جھانک رہے تھے۔ ٹاٹ کے بچھونے پر کرغی عورت گورے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔

عورت کا چہرا مسکین تھا، اس کی آنکھیں جنی کے بچوں کی طرح چمکتی تھیں۔
بچے کا منہ اس کی چھاتی سے لگا ہوا تھا اور وہ خفتان پر ہاتھ رکھے کلیلیں کر رہا تھا، اپنی ٹانگیں
اس بے ڈھنگے پن سے ادھر ادھر پھینک رہا تھا کہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی
کسان ہنسی کے مارے لوٹے جاتے تھے۔

مگر سب سے زیادہ رقت افاناسی پر تھی: اک نگاہ ڈال کر اس نے مسکین انداز سے کہا:

کیسا پیارا بچہ ہے!
ٹاٹ کے خیمے کے پار، کوئی نہیں کہہ سکتا کہاں
کوئی نہیں جانتا کہ لق و دق، ہولناک منگولیا

عرضِ امانت

"انا عرضنا الامانۃ" کی تفسیر ایک شاعر کی زبان سے

(۱)

ابھی کہ قدرت کی نکہتوں سے تمام دنیا مہک رہی تھی
ابھی کہ فطرت کے ساغروں سے شرابِ عرفاں چھلک رہی تھی

شعاعِ حسنِ ازل کا پرتو ہر ایک شے سے جھلک رہا تھا
ضیائے انوارِ سرمدی سے سوادِ عالم چمک رہا تھا

چہار سو تار ہائے سازِ ہوا میں نغمے مچل رہے تھے
فضا تھی مخمور جوش میں مستیوں کے چشمے ابل رہے تھے

نظامِ عالم کے ذرے ذرے پر ایک مستی سی چھا رہی تھی
کہ جیسے روحِ آفرینش کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی

اٹھی ہوئی تھی عروسِ رنگیں ادا کے رخ سے نقاب گویا
وفور تھا کیفِ بیخودی کا برس رہا تھا شباب گویا

حسین تاروں میں رقص کرتی تھی لرزشِ مستیِ ترنم
لبوں پہ غنچوں کے کھیلتی تھی لطافتِ نزہتِ تبسم

گلوں کی دوشیزہ نکہتوں میں تھی ایک روحِ حیات ساری
نمو کی رعنائیوں سے یعنی جوان تھی کائنات ساری

شفق کی رنگین بارشوں سے نکھر رہا تھا جمالِ دنیا
غرضکہ تھا کمسنی کا عالم حسین تھی پیر زالِ دنیا

(۲)

کہ دفعۃً شاہدِ ازل کو "خبر نہیں"، کیا خیال آیا
خفیف جنبش ہوئی لبوں میں ادائے رنگیں سے مسکرایا

اٹھیں یکایک جھکی نگاہیں، شکن لگی کھیلنے جبیں پر
رگوں میں اک موجِ خون دوڑی نکھر آئی سرخیِ رخِ حسیں پر

اٹھا اک انگڑائی لیکے اور مستیوں سے عطرِ حیات کھینچا
لطیف و پاکیزہ دستِ قدرت سے جوہرِ کائنات کھینچا

بیاضِ تخلیق کے ورق پر پھر ایک نقشِ حسیں بنایا
ربابِ ہستی کے پردہ ہائے لطیف پر ایک راگ گایا

فضائے تقدیس میں جو گونجا تھا نغمۂ سازِ آفرینش
وہ دستِ قدرت میں بن گیا آ کے اک گلِ نازِ آفرینش

حریمِ عصمت سے جلوہ آرا ہوئی عروسِ بہارِ فطرت
وہ حورِ دنیا، وہ روحِ امکاں، نشاطِ دوراں نگارِ فطرت

شباب کا شعلۂ مجسم، وہ حسن و ناز و ادا کی دیوی
وہ پیکرِ مستیِ ترنم، حجابِ شرم و حیا کی دیوی

جمیل چہرے پہ نور ایماں، شریر آنکھوں میں کفر عریاں ۔۔۔ لبوں میں آبِ حیات پنہاں، فسونِ رفتار حشر ساماں
صدا میں زورِ صدائے ایمن، جمال سے شمع طور روشن ۔۔۔ کنارِ رنگیں میں جانِ گلشن، سرورِ صد میکدہ بداماں

(۳)

ادا سے اُس نے فلک کی جانب جو مسکرا کر نگاہ ڈالی ۔۔۔ حسین تارے لرز گئے اور مسکرا کر نظر چرا لی
کرشمۂ حسن اس کو کہئے کہ زور تھا قوتِ نظر کا ۔۔۔ سفید منہ پڑ گیا فلک پر لطافتِ تربتِ سحر کا
حریفِ رنگینیِ گلستاں جو چرخ پر غازۂ شفق تھا ۔۔۔ نظارہ [illegible] و تقشیں کے اثر سے اس کا بھی رنگ فق تھا
لائیں خورشید نے نگاہیں مگر بڑھی خیرگی نظر کی
یہاں سے مایوس ہو کے اُس نے شگفتہ باغوں کی سمت دیکھا
نکھار سبزہ کا منفعل تھا، ابھار پھولوں کا مضمحل تھا
وہ زلفِ مشکیں کی مست نکہت خرام کی شوخیاں قیامت ۔۔۔ ہوئی پریشاں [illegible]
حرارتِ گرمیِ تبسم، حلاوتِ خوبیِ تکلم ۔۔۔ چھپا رہا کیف موجِ مے میں، نہاں ہوا ساز میں ترنم
غرض زر آسودگی کے قابل مقام کا انتخاب ٹھہرا ۔۔۔ اس امتحان میں غریب فہمی کا دل فقط کامیاب ٹھہرا

(۴)

ابھی وہ شاعر کے دل کے اندر ربابِ فطرت بجا رہی ہے ۔۔۔ خیال کے ہر عمق میں بیٹھی ہوئی وہی راگ گا رہی ہے
فضائے عالم پہ چھا رہا ہے وہی ترنم سحاب بن کر ۔۔۔ برس رہے ہیں تمام دنیا پہ مست نغمے شراب بن کر
انھیں کی رنگین بارشوں سے حسین ہے کائنات ساری ۔۔۔ شگفتگی ہے انھیں کے دم سے جوان ہیں حیات ساری

تنقید و تبصرہ

کتب :-

عطیۂ پیغمبر - تقطیع چھوٹی - تعداد صفحات ۱۱۶ - لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی - قیمت درج نہیں
ملنے کا پتہ - حضرت کامل جوناگڈھی - دفتر اخبار محمدی - اجمیری دروازہ - دہلی -

اس چھوٹی سی کتاب میں حضرت کامل جوناگڈھی نے آنحضرتؐ کی چند اخلاقی احادیث کو اردو کی رباعیوں میں ترجمہ کیا ہے - ایک صفحہ پر رباعی ہے اور اس کے مقابل کے دوسرے صفحہ پر اصل حدیث مع اردو ترجمہ نثر کے کر دی ہے - ترجمہ نثر کا بھی صاف ہو اور رباعیاں بھی خاصی ہیں - ان کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لئے مفید اور دلچسپ ہوگا -

---

پیغام رسول - یہ کتاب مذکورۂ بالا کا دوسرا حصہ ہے جو ۱۳۱ صفحات پر تمام ہوا ہے اس میں بھی مختصر اور تعلیمی احادیث کے ترجمے اردو نثر اور رباعیوں میں کئے گئے ہیں -

مظہر علم و دین - یہ ۳۶ صفحوں کا رسالہ بھی حضرت کامل کی تصنیف ہے - اس میں علم کی فضیلت اور جہالت کی مذمت پر ایک مثنوی ہے - پہلے احادیث مع ترجمہ کے لکھی گئی ہیں اس کے بعد ۱۶ صفحوں میں مثنوی ہے جو مولوی روم کی مثنوی کے وزن پر ہے -
حضرت کامل کی ان تینوں کتابوں کو مذہبی حیثیت سے اگر بچوں کو پڑھایا جائے تو مفید ہوگا -

---

زہر عشق - چھوٹی تقطیع حجم مع مقدمات ۱۶۴ صفحے - چھپائی لکھائی اور کاغذ عمدہ -
مجلد قیمت عہ - ملنے کا پتہ - ایوان اشاعت گورکھپور (یو - پی)

اردو زبان کی بدنام مگر مشہور مثنوی زہرِ عشق جو لکھنؤ کے عہدِ عیش یعنی واجد علی شاہی دور کی ایک یادگار رہے اس کو حضرت مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک مقدمے کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ مقدمہ کے ذیل میں ایک بیان احسن صاحب کا ہے جو مثنوی مذکورہ کے مصنف نواب مرزا صاحب شوق کے نواسے ہیں۔ یہ بیان اس مثنوی کی اصلی حیثیت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے۔ حضرت نیاز فتحپوری کا بھی ایک تبصرہ شامل مقدمہ ہے جس میں انھوں نے اپنے ادیبانہ انداز میں نواب مرزا کی شاعرانہ مجنوں اور نیاز کے ساتھ اس جنس ادب سے سرائی کرنے والے صوفی صاحب دریابادی بھی ہیں مداح ہے ان کو اس مثنوی سے خاص الفت معلوم ہوتی ہے۔ لکھا ہوا بھی شامل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس کی خوبیاں دکھلائی ہیں۔ مگر آخر اخلاقی قدروں کی بھی کچھ قیمت ہے یا نہیں خاص کر وہ قدریں جو جملہ اقوام عالم میں مسلم ہوں۔ پھر ان کو پامال کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ بلا اس بحث کے چھیڑے ہوئے بھی اس مثنوی کی اشاعت ہو سکتی تھی اور بجائے ۱۱۶ صفحات کے غیر ضروری مقدمات کے صرف احسن صاحب کا بیان اس کی شانِ نزول کے متعلق کافی تھا۔ خود مثنوی اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس کی معنوی خوبیوں کو دکھلانے کے لئے کسی تبصرہ کی مطلق ضرورت نہیں۔ اس کے ساتھ اگر نواب مرزا کی دوسری مثنوی بہارِ عشق جو ادبی لحاظ سے زہرِ عشق سے فائق تر ہے شامل کر دی گئی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ قیمت بھی زیادہ رکھی گئی ہے۔

دولتِ غزنویہ۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۴۰۰ صفحات۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۶؍
ملنے کا پتہ: منیجر صاحب کتب خانہ دار الادب۔ لاہور

اس کتاب میں مولانا محمود الرحمٰن صاحب ندوی نے سلطان محمود غزنوی اور اس

کے جانشینوں کے کارنامے اور مشرقی و مغربی مورخین کی تصانیف سے ان کے حالات جمع کئے ہیں۔ سلطان محمود پر معاندین نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کے معقول جوابات لکھے ہیں اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے۔ سلیقۂ تحریر اور طرز بیان پسندیدہ ہے۔

اصلاح تعلیم ابتدائی۔ قاضی سید مظہر علی صاحب ایف۔ اے (علیگ) ساکن نصیر آباد ضلع شرقی خاندیس نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کی اصلاح کے متعلق تقریباً دو جز کا یہ مضمون لکھ کر شائع کیا ہے جس میں مفید مشورے دئے ہیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ انھوں نے مسلمان طلبہ کے لئے سب سے بہتر قرار دیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر جو مفکرین غور کر رہے ہیں ان کی نظر میں ہمارا نصاب مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے پونہ ڈویژن میں جامعہ کے نصاب تعلیم کو منظور کرانے کی تجویز بھی پیش کی ہے۔ اور بصورت دیگر یہ مشورہ دیا ہے کہ جو کمیٹی نصاب تیار کرے اس میں جامعہ کے اساتذہ میں سے بھی دو اُستاد ضرور شریک کئے جائیں۔

دلچسپ نظمیں۔ چھوٹے بچوں کے لئے آسان اور مختصر ۲۸ نظموں کا مجموعہ۔ مصنفہ حضرت ناظم انصاری۔ قیمت فی نسخہ ۲ر ملنے کا پتہ۔ مصنف سے انٹرنیشنل پریس۔ پرارتھنا سماج۔ بمبئی نمبر۴

انقلاب افغانستان (جلد اول)۔ مصنفہ محمد حسین خاں بی۔ اے (علیگ) حجم ۲۰۸ صفحات چھپائی لکھائی کاغذ اچھا۔ مع متعدد عکسی تصاویر قیمت فی نسخہ اعلیٰ عہ اوسط ۶ر افغانستان کے واقعات حاضرہ کے متعلق یہ کتاب نہایت مفصل اور صداقت کے ساتھ لکھی گئی ہے جس سے امان اللہ خاں سابق شاہ افغانستان کے خیبت و خسران اور محمد نادر خاں

موجودہ بادشاہ کی فتوحات اور کامیابیوں کے اسباب وعلل واضح ہو جاتے ہیں

اس کے مصنف ایک مدت تک افغانستان کے صدر تعلیمات رہ چکے ہیں اور وہاں کے سرد و گرم کو چکھ چکے ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اپنے ۱۱ سالہ قیام افغانستان کے ذاتی معا... و مشاہدات کی بنا پر لکھا ہے۔ ہم ذاتی طور پر بھی مصنف کی حق گوئی و نیک دلی سے واقف ہیں۔ اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بیانات صحیح اور ... انھوں نے ... کو لکھا ہے وہ اپنی حقیقت کی شہادت خود دے...

اس پوری سرگزشت پر روشنی پڑتی ہے جو ان...

جو لوگ افغانستان کے معاملے میں دلچسپی...

یوں تاریخی حیثیت سے بھی یہ ہر شخص کے لئے دلچسپ ہے ... مصنف ... افغانستان میں رہنے سے بہت کچھ پشتو کے زیر اثر آگئی ہے لیکن مطلب سمجھانے سے قاصر نہیں ہے۔ دفتر پیام اسلام۔ جالندھر شہر (پنجاب) سے مل سکتی ہے۔

رسائل :-

الہلال - اس نام سے بڑی تقطیع پر واضح لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ۱۶ صفحوں کا ... اردو اخبار ہماری جامعہ کے تعلیم یافتوں نے نکالنا شروع کیا ہے جس کے متواتر پانچ ... اب تک موصول ہو چکے ہیں۔

اس کے مقاصد اور اس کی پالیسی وہی ہے جو اہل جامعہ کی ہے یعنی آزادی کا ... دین کا علمبردار اور ادب کا خادم۔ اب تک جس قدر نمبر اس کے نکلے ہیں ان کو دیکھ کر دل ... کی وقعت اور خوشی پیدا ہوتی ہے۔

برہما میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد بہت ہے۔ مگر وہاں صحیح مسلک کا کوئی اخبار اس زبان میں نہ تھا۔ الہلال نے یہ کمی پوری کی ہے ہم کو امید ہے کہ برہما میں یہ ادب، دین اور ...

آزادی کی خدمت کرے گا۔ اور وہاں کے اُردو خواں طبقہ کو صحیح مسلک پر چلائے گا۔

اخبار نکالنا بالخصوص ایسے خطہ میں جہاں کے باشندے دوسری زبان بولتے ہوں بڑا مشکل کام ہے لیکن اس اخبار کے مدیر مولوی خلیل احمد وعلی احمد خاں واسرائیل احمد خاں نے جن کے قلم کی روانی اور جولانی سے اچھے اچھے اہل قلم لطف اندوز ہوتے ہیں عزم بالجزم کرلیا ہے کہ اس کو جاری رکھیں گے۔ انھوں نے الہلال پریس بھی قائم کرلیا ہے جو ایک مدت تک اس کے بقا کی ضمانت ہے۔ ہم دل سے متمنی ہیں کہ یہ اخبار اپنی روشنی پھیلائے اور حسب منشا ترقی کرے قیمت سالانہ آٹھ روپیہ۔

ایوان - ایوان اشاعت گورکھپور سے حضرت مجنوں کی ادارت میں یہ ماہوار رسالہ چار جزکا نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کا سالانہ چندہ للعہ ہے اور چھپائی لکھائی اور کاغذ عمدہ ہے۔ اب تک دو نمبر نکلے ہیں۔ دونوں ادبی اور معنوی لحاظ سے دلکش ہیں۔ جس محنت سے یہ رسالہ تیار کیا جاتا ہے وہ قابل داد ہے اور وہ یہی ہوسکتی ہے کہ اہل نظر اس کو خریدیں تاکہ یہ اپنے معیار کو ترقی دے سکے۔

ہندوستان کے طول و عرض میں اس وقت رسالوں کی کمی نہیں۔ لیکن ایسے رسائل جو علمی اور ادبی کہے جانے کے مستحق ہوں کم ہیں۔ ایوان اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے اور ہم کو امید ہے کہ بجلد مقبولیت اور ترقی حاصل کرے گا۔

آتالیق - یہ ماہوار رسالہ نوعمر طلبہ کی علمی ترقی اور اخلاقی نشو و نما میں مدد دینے کے لئے مولوی محمد عبدالرب صاحب کوکب مولوی فاضل حیدرآباد دکن سے نکالتے ہیں۔ اس کا حجم دو جز ہے اور مضامین خاصے ہیں۔ چھپائی لکھائی بھی اچھی ہے۔ قیمت کہیں درج نہیں۔

شذرات

سیاسیات حاضرہ نے مسلمانوں کو صاف صاف دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک تغیر
اور نئے تجربات چاہتا ہے، مخلوط حلقۂ انتخاب اس کے سامنے [illegible]
جدت سے ڈرتا اور احتیاط کو پسند کرتا ہے۔ جداگ[illegible]
امتیاز ہے۔ ان کے اختلاف بالکل قدرتی ہیں [illegible]
ایسی ہی جماعتیں رکھتی ہے۔ مخلوط اور جداگانہ [illegible]
جو ریڈیکل اور کنزرویٹو دوسرے ملکوں میں۔ ایک مستقبل کا زائندہ ہے، دوسرا ماضی کا۔ ایک
کے پیش نظر تخیلات ہیں دوسرے کے تجربات۔ ایک ترقی چاہتا ہے، دوسرا حفاظت۔ ایک دل کو
مشعل راہ بناتا ہے دوسرا عقل کو۔ پس ہمیں ان کے اختلافات سے اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں
ہے دونوں ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والے ہیں نہ کہ ضد، مشیت الٰہی دونوں سے اپنا
کام لینا چاہتی ہے۔ جہاں مسائل پر جمہور کی رائے لی جائے ایسے ناگزیر اختلافات کا نہ صرف
گوارا کرنا مناسب ہے بلکہ ان کا ابھارنا اور منظر عام پر لانا ہی عین جمہوریت ہے۔ مگر جہاں پبلک
کا یہ فرض ہے کہ وہ جماعتوں کے اختلافات کو اچھی طرح ظاہر ہونے کا موقع دے وہاں ہر جماعت
کا یہ فرض ہے کہ اپنے مسلک کی نشر و اشاعت کا صحیح طریقہ اختیار کرے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے
جبکہ تعرض اصول سے رکھا جائے نہ کہ اشخاص سے اور کام دلائل سے لیا جائے نہ کہ تشدد
سے۔ اختلاف کی آزادی روا اس لئے رکھی جاتی ہے کہ ہر اصول کو حسب استعداد مقبولیت
حاصل کرنے کا موقع ملے اور بالآخر وہ اختیار کیا جائے جس پر زیادہ سے زیادہ لوگ متفق ہو سکیں
لیکن اگر بحث اصول کی جگہ اشخاص کے حسن و قبح سے ہونے لگے اور زد و کوب و دشنام
طرازی کا بازار گرم ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ اصل مقصد فوت ہو جائے گا بلکہ ہر فریق بہت جلد

حضوں نے دیسے گے گا کہ پبلک کی نگاہوں سے اس کا اعتبار اٹھ گیا جب سبھی جھوٹ سچ بدنام ہو جائیں تو کوئی کے بھروسے کے قابل رہے ؟

ہم مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں نے افسوس کہ یہی غلط طریقہ اختیار کیا ہے۔ مسائل کی اہمیت متقضی تھی کہ ہر ایک سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے اپنے دلائل پیش کرتا۔ مخلوط حلقۂ انتخاب کے حامی چشم تحمل سے کام لے کر آئندہ سیاست پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتے۔ ملک میں سیاسی قوتوں کا توازن کیا ہوگا، کونسی نئی قوتیں پیدا ہو جائیں گی، اختلافات کی بنائیں کیا ہوں گی کونسے نئے مسائل ملک کی توجہ اپنی طرف جذب کرلیں گے، اور ان تمام باتوں کا اثر فرقہ وارانہ کشیدگی کو کس حد تک کم کرنے والا ثابت ہوگا۔ قدامت پسندوں کا خوف کہاں تک حق بجانب ثابت ہوگا۔ جو مسلمان اقلیت میں پڑکر فی الواقع خطرے میں ہونگے ان کی کم سے کم امداد کیا ہوگی ان کی حفاظت کے ذرائع جو سوچے گئے ہیں کیونکر کافی ہونگے۔ اسی طرح جداگانہ حلقۂ انتخاب کے حامی نظام اساسی کے مجوزہ تغیرات سے بے اطمینانی کے وجوہ ایک ایک کر کے صاف اور سلجھے طریقہ سے پیش کرتے۔ فرقہ وارانہ تعلقات کی موجودہ حالت نے انھیں بالکل ہی مایوس کیوں بنا دیا ہے متحدہ قومیت اور رواداری کی جدید تحریک پر انھیں اعتماد کس لئے نہیں ہے۔ جداگانہ حلقہ انتخاب کو مذہب اور تمدن کی حفاظت کا قطعی ضامن کیونکر مان لیا جائے اور اسے فرقہ وارانہ تعلقات کے بد سے بدتر ہو جانے کا سبب کس واسطے نہ سمجھا جائے مگر ایسے امور سے بحث کر کے پبلک کی تسکین کی جگہ تخویف سے کام لینا۔ اکابر ملت کو جن کے آگے کل تک سب کی آنکھیں فرش راہ ہوتی تھیں۔ محض اختلاف خیال کے جرم میں ذلیل و رسوا کرنا۔ ایک دوسرے کے خلاف اشتعال انگیز باتیں کہنا گالیاں دینا۔ مذاق اڑانا یہ ہے وہ طریقہ جو ہم اکثر اپنے لئے پسند کرتے ہیں ہمارے ہی پہلو بہ پہلو ایک دوسرا مذہبی فرقہ بھی ہے جس کے اندرونی اختلافات ہم

سے کم اہم نہیں ہیں مگر اس کی جماعتوں میں شائستگی، رواداری، اخلاق اور تعاون کی قابلِ تقلید مثال نظر ہے۔ افسوس صد افسوس کہ "وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ" کی پیروی کا ادعا کرنے والے آج اپنے مذہب سے اس قدر ہٹ گئے ہیں کہ نرمی اور رواداری کا دوسروں کو سبق دینے کی جگہ ان سے سبق لینے کے بھی قابل نہیں رہے! معلوم ہوتا ہے ہمیں اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ابھی بڑی ٹھوکریں کھانی ہیں کہ صحیح راہ عمل سے کہیں زیادہ افراد کے تعلقات کی عمدگی جماعت کو نقصان سے بچاتی ہے۔

مجموعہ # دورِ جدید کی نئی کتابیں اردو

عصرِ حاضر کی سب سے عظیم الشان جدید دینی تحریک بہائی روح کی طرح عالم کی رگ و پے میں کام کر رہی ہے۔ ہندوستان میں انگریزی اخبار دی بہائی ویکلی لاہور زیرِ ادارت پروفیسر پریتم سنگھ ایم اے جاری ہے۔ اردو میں اہلِ بہا کا مشہور و مقبولِ عام رسالہ کوکب ہند قرولباغ دہلی سے نکلتا ہے۔ نمونہ کے لئے ایک آنہ کے ٹکٹ آنا چاہئے۔ دفتر کوکب ہند سے اردو میں اب تک بہترین بہائی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں۔

دورِ بہائی۔ حضرت بہاءاللہ حضرت عبدالبہاء۔ حضرت شوقی ربانی کے حالات۔ تحریک بہاء کی تاریخ۔ بہائی تعلیمات اور چند الواح مبارکہ عربی و فارسی مع اردو ترجمہ درج ہیں۔ ہر ایک محقق کے لئے یہ کتاب بہترین رفیق ہے۔ قیمت صرف عہ ر

لوحِ ابنِ ذئب۔ حضرت بہاءاللہ کی کتب مقدسہ میں سے ایک مشہور کتاب ہے کتب آسمانی کے اسرار تمام دنیا کے موعود کی جلوہ گری۔ نوعِ بشر کے لئے حیاتِ جدید کا پیغام۔ قیمت عہ

عکہ کی روشنی دس دن۔ امریکن جولیا ایم گرانڈی نے حضرت عبدالبہاء کے بیانات درج کئے ہیں جنہیں پڑھکر روحِ انسانی کیف و سرور سے سرشار ہو جاتی ہے۔

کلام اللہ۔ حضرت بہاءاللہ کی الواح مبارکہ عربی و فارسی میں سے چند الواح کا مجموعہ مع اردو ترجمہ۔ جو لوگ تازہ کلام الٰہی کے شائق ہیں ان کے لئے یہ تحفہ نہایت بیش بہا ہے کیونکہ کلام الٰہی خواہ ایک کلمہ ہو تمام دنیا کی کتابیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں قیمت عہ

ہفت وادی۔ عارفوں کے روحانی سفر کی سات منزلوں کا پُرکیف بیان۔ اسرارِ حقیقت کا جوہر گویا کوزہ میں دریا سما گیا ہے۔ قیمت صرف ۳ ر

صحیفۂ زرتشت۔ ایران کے مشہور پیغمبر زرتشت کی الہامی کتاب کا ترجمہ اور رسالہ "دساتیر و قرآن" جس میں پارسی مذہب اور اسلام کی مطابقت دکھائی ہے۔ قیمت صرف چار آنے۔

سب کتابیں "منیجر کوکب ہند قرولباغ۔ دہلی" سے منگائیے

دفعتاً ایک عورت اندر آگئی جو ملوک اندلس کی خاندان سے تھی اور زیاد بن نابغہ تمیمی نے اس سے نکاح کرلیا تھا۔ اس عورت نے عبدالعزیز کو تاج لگائے ہوئے دیکھا تو واپس آکر زیاد سے فرمائش کی کہ میں تمہارے لئے تاج بنواؤں تم بھی لگاؤ، زیاد نے جواب دیا کہ اس کا استعمال ہمارے مذہب میں جائز نہیں ہے اس نے دین مسیح کی قسم کھا کر کہا میں نے تمہارے امام کو تاج لگائے ہوئے دیکھا ہے تم اس کے نابانہ بتاتے ہو اس طرح

یہ واقعہ زیاد بن نابغہ کو معلوم ہوا اور انھوں نے حبیب بن ...

اور سرداران و بزرگان لشکر کو علم ہوا مجبوراً عام لشکر یہ ...

اور زیاد نے اپنی آنکھوں سے عبدالعزیز کو سر پر تاج ...

اور مسلمانوں نے کہا کہ عبدالعزیز نصرانی ہوگیا، چنانچہ ... ان ...

آخر ۹۰ھ کا ہے اس وقت تک سلیمان بن عبدالملک خلیفہ تھے،

ایوب ابن حبیب کی امارت

عبدالعزیز ابن موسیٰ کی عہد امارت میں بہت سے شہر فتح ہوئے، ان کے بعد اہل اندلس بہت دن تک بلا امیر کے رہے اور کسی والی کو منتخب کرسکے کئی سال کے بعد (ایوب) ابن حبیب پر اتفاق کیا، ابن حبیب ایک مرد صالح تھے اور نماز میں اہل اندلس کی امامت کرتے تھے جب اہل اندلس کو بغیر کسی امیر کے ایک مدت ہوگئی تو انھوں نے اوائل ۹۹ھ میں ابن حبیب کو اپنا والی منتخب کیا اور بجائے اشبیلیہ کے قرطبہ کو دار الامارت قرار دیا۔

اس انتخاب کے بعد ایوب ابن حبیب قرطبہ آئے اور اس قصر میں مقیم ہوئے جس کو مغیث نے اپنے لئے مخصوص کرلیا تھا، ابن حبیب کے اس قصر میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب موسیٰ ابن نصیر ولید کے ایلچی کے ساتھ شام کی طرف جانے لگے، تو طارق کے مفتوحہ علاقہ در استہ

بلاط مغیث

سے گذرے تاکہ اندلس کے بقیہ حصے بھی دیکھتے جائیں۔ اس لئے قرطبہ ہوتے گئے اور مغیث سے کہا یہ قصر تمہارے لئے مناسب نہیں ہے۔ یہ صرف والئ قرطبہ کے لئے ہی موزوں ہے، مغیث نے بجائے اس کے ایک دوسری عمارت پسند کرلی جو باب الجزیرہ پر واقع ہے، باب الجزیرہ وہی باب القنطرہ ہے (پل کا دروازہ) جو اسی ٹوٹی ہوئی فصیل کے مقابل میں ہے، جس سے فتح قرطبہ کے وقت مغیث اور اس کے ساتھی

داخل ہوئے تھے۔ یہ مکان نہایت عمدہ بارونق اور پر فضا تھا۔ اس میں زیتون اور ثمردار درخت کثرت سے تھے اس کا نام رصافہ تھا اور یہی عمارت بھی والیٔ قرطبہ کے قبضہ میں تھی۔ جسے مغیث نے تعمیر کیا تھا اسی میں ایک [illegible] تھی۔ جس کو اب اندلس میں بلاط مغیث کہتے ہیں۔

قتل عبدالعزیز کی تحقیقات

عبدالعزیز ابن موسیٰ کے قتل کی خبر خلیفہ سلیمان کو بہت گراں گزری اور انہوں نے افریقیہ پر عبیداللہ ابن یزید قریشی کو والی مقرر کیا۔ اس زمانے میں اندلس قرطبہ اور تمام ماورائی افریقیہ کا نظم و نسق والی افریقیہ سے متعلق ہوتا تھا۔ اس لئے خلیفہ نے عبیداللہ ابن یزید کو حکم دیا کہ عبدالعزیز ابن موسیٰ کے معاملۂ قتل میں سختی سے تحقیقات کریں اور حبیب ابن ابی عبیدہ اور زیاد ابن نابغہ کا جرم ثابت ہو جائے تو ان دونوں کو ان کے ساتھ جن لوگوں نے عبدالعزیز کے قتل میں شرکت کی تھی ان سب کو قید کر کے دارالخلافت دمشق روانہ کریں۔ کچھ مدت کے بعد سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ عبیداللہ ابن یزید والی افریقیہ نے اندلس پر الحر ابن عبدالرحمٰن ثقفی کو حاکم بنا کر بھیجا۔ اور قتل عبدالعزیز کی تحقیقات بھی انہیں کے ذمہ کی۔ حر اندلس میں پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ آگیا۔ ان کے عہد میں عبیداللہ ابن یزید افریقیہ سے معزول ہو گئے ان کے بجائے اسماعیل ابن عبداللہ مولائے بنی مخزوم افریقیہ والی افریقیہ مقرر ہوئے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز

اموال بیت المال کے متعلق احتیاطی کارروائی

اسماعیل ابن عبداللہ کے ولایت کا واقعہ یہ ہے کہ خلفاء کا دستور تھا کہ جب ان کے پاس مختلف ممالک و امصار سے خراج وغیرہ کی آمدنی آتی تھی تو ہر رقم کے ساتھ ثقہ لوگوں میں سے دس آدمی آکر ایک وفد کی صورت میں خلیفہ کے سامنے حلف سے بیان کرتے تھے کہ ان اموال میں سے کوئی درہم و دینار ناحق نہیں لیا گیا۔ اور اس میں سے مجاہدین اور اہل بلد وغیرہ کے جس کے جو حقوق تھے دے دئے گئے ہیں۔ یہ ان سب سے بچا ہوا خالص بیت المال کا حصہ ہے۔

اسماعیل ابن عبداللہ اور سمح ابن مالک کے ولایت کی وجہ

جب تک حلف کے ذریعہ سے ان معاملات کا اطمینان نہ ہو جاتا بیت المال میں ایک حبہ داخل نہ کیا جاتا۔ اس وقت تک افریقیہ کے حدود باقاعدہ مکمل اور منضبط نہیں ہوئی تھیں۔ اس لئے لشکر اور عملہ وغیرہ کی تنخواہیں ادا کرنے کے بعد آمدنی میں سے جو کچھ بچتا تھا

خلیفہ کے پاس بھیجا جاتا جب سلیمان کے زمانے میں لوگ افریقہ کا خراج لے کر پہنچتے تو حسب دستور وفد کو حکم دیا گیا
کہ حلف سے بیان دیں، وفد افریقہ کے دس آدمیوں میں سے آٹھ نے حلف کیا، حضرت اسماعیل بن عبداللہ مولائے
بنی مخزوم نے اور ان کے ساتھ سمح بن مالک خولانی نے حلفیہ بیان دینے سے انکار کر دیا حضرت عمر ابن عبدالعزیز
اس موقع پر موجود تھے ان کو ان دونوں کی یہ بات بہت پسند آئی اور انھیں اپنے پاس رکھ لیا -

ان کی مصاحبت میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو ان کے تقویٰ اور […] کا کافی اندازہ […] ان دونوں کی بڑی […]
قدر کرنے لگے جب آپ خلیفہ ہوئے تو اسماعیل کو افریقہ کا […]
کہ اندلس کی آمدنی سے خمس نکالیں ان زمینوں […]
[…] سے حاصل کی گئی ہیں اور مجاہدین کو مقبوضہ گاؤں […]
کر دیا جائے" اور سمح کو ہدایت کی کہ اندلس اور اس کے […]

اندلس کے مسلمانوں کے متعلق حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا ارادہ | حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی نیت یہ تھی کہ اندلس کے مسلمانوں کو وہاں سے
منتقل کریں کیونکہ انھیں مسلمانوں کا کسی ایسے ملک میں رہنا پسند نہ تھا جو ممالک
اسلامیہ کے ایک طرف واقع ہو اور ان کے اور اس ملک کے درمیان کوئی سمندر واقع ہو جیسا کہ اندلس میں تھا -
علاوہ ازیں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس طرح علیحدہ رہنے سے مسلمانوں کے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر خدا انہیں
کچھ روز اور زندہ رکھتا تو وہ ایسا ہی کرتے"

سنہ ۱۰۰ھ میں سمح اندلس پر پہنچے تو انھوں نے اس کی تفتیش شروع کی کہ کون سے اقطاع جنگ کے
بعد قبضہ میں آئے ہیں تاکہ جو اقطاع صلح کے ذریعہ سے فتح ہوئے ہیں ان کی تمیز ہو سکے، پھر غزوات کے لئے لشکر بھی
اور قرطبہ کا پل بنایا۔

قرطبہ کا پل | اس پل کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ پہلی سمح نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو لکھا کہ شہر قرطبہ کا غربی حصہ منہدم
ہو گیا ہے اور اسی جانب جو دریا تھا، اس کا پل بھی ٹوٹ چکا ہے جاڑے کے موسم میں لوگوں کی آمد و رفت میں
سخت دشواری ہوتی ہے دریا عبور کرنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو میں شہر کی فصیلیں تیار
کرا دوں کیونکہ لشکر کے مصارف اور نفقات جہاد نکال دینے کے بعد بھی میرے پاس خراج کا روپیہ

مناسب سمجھے کہ میں یہ انتظام کرسکتا ہوں اور اگر آپ کی رائے ہو تو میں اس فصیل کے پتھروں سے قرطبہ کا پل بھی بنوا دوں حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے سنگین پل بنوانے کا حکم دیدیا اور فصیل کی نسبت کہا ہوا اگر پتھر نہ ملیں تو اینٹ سے بنوائی جائے چنانچہ اس سلسلہ میں ١٠١ھ میں یہ پل تیار ہوگیا۔

یزید ابن عبدالملک کا عہد ابن صفوان کی گورنری اندلس کے عمال

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی وفات کے بعد یزید ابن عبدالملک نے حنظلہ ابن صفوان کے بھائی بشیر ابن صفوان کو افریقیہ کا والی بنایا، انھوں نے سمح ابن مالک کو اندلس سے معزول کرکے انکی جگہ عنبسہ ابن سحیم کلبی کو مقرر کیا عنبسہ کے بعد اندلس کے والی پے درپے کئی تبدیل و مقرر ہوئے۔ مثلاً عنبسہ کے بعد یحییٰ ابن سلمہ کلبی۔ ان کے بعد عثمان ابن ابی نسعہ خثعمی اور ان کے بعد حذیفہ ابن احوص قیسی پھر ہیثم ابن عبید کنانی پھر عبدالرحمن ابن عبداللہ غافقی والی ہوئے۔ انھیں عبدالرحمن کے زمانے میں اہل بلاط الشہداء کی شہادت ہوئی اور یہ خود بھی ان کے ساتھ شہید ہوئے پھر عبدالملک ابن قطن محاربی فہری یہاں کا والی ہوا عبدالملک ابن قطن کو اندلس کی ولایت دوبارہ تفویض ہوئی، لیکن اس مرتبہ ان کی حکومت ۹ ماہ سے زیادہ نہ رہی، ان والیوں کے جو اوصاف ہم کو معلوم ہوئے ان کا خلاصہ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ تقریباً یہ سب دشمنوں سے جہاد کرتے، اور ملک کی توسیع میں کوشش کرتے رہے۔ اور فتوحات کو ترقی دیتے ہوئے افرنجہ، فرانس تک پہونچ گئے۔ یہاں تک کہ سارا اندلس فتح ہوگیا۔

گورنر افریقیہ کا طرز حکومت

ان تمام والیوں پر بشیر ابن صفوان حکومت کرتے تھے بشیر ابن صفوان عمال کے تقرر کے سلسلہ میں خلیفہ سے کوئی حکم نہ لیتے تھے۔ جب اہل اندلس کسی والی سے ناراض ہوتے تو بشیر کو آگاہ کیا کرتے تھے۔ بشیر اس کو معزول کرکے اہل اندلس کا پسندیدہ والی مقرر کردیتے یہی صورت والیوں کی وفات پر بھی ہوتی۔

عبیداللہ ابن حجاب کی گورنری اور عقبہ ابن حجاج سے ملاقات

جب یزید ابن عبدالملک کا دور ختم ہوا تو ہشام ابن عبدالعزیز[1] نے اپنے زمانے میں عبیداللہ ابن حجاب ابن حارث کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ عبیداللہ ابن حجاب بنی سلول قیسی کے غلام تھے ان کو بھی مصر کی گورنری کے ساتھ ولایت اندلس کے اختیارات بھی تفویض ہوئے

---

[1] ہشام ابن عبدالعزیز غلط ہے، ہشام ابن عبدالملک ہونا چاہیئے۔

گورنر کی قابلِ تقلید رواداری

بشیر ابن صفوان کے زمانے میں عقبہ ابن حجاج اندلس کے والی مقرر ہو چکے تھے۔ جب عبید اللہ مصر کے گورنر ہوئے۔ تو عقبہ وفد کے ساتھ ان سے ملنے آئے عقبہ کے والد حجاج نے عبید اللہ کے دادا حارث کو اپنی غلامی سے آزاد کیا تھا۔ اس لئے عبید اللہ نے ان کو اپنی جگہ اپنے پاس بٹھایا عبید اللہ کے لڑکے اور حاضرین مجلس یہ منظر دیکھ کر بہت متعجب ہوئے اور سرگوشی کرنے لگے۔ عبید اللہ کے لڑکوں کو یہ بات خصوصیت سے ناگوار گذری۔ اور انھوں نے اپنے باپ سے ناگواری کے لہجے میں کہا کہ "آپ نے ایک اعرابی کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ سرداران قریش وغیرہ کا کچھ خیال نہ کیا جو آپ کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ بخدا آپکی اس با[ت سے]
ممکن ہے کہ اس بڑھاپے میں آپ کو کسی کی عداوت سے [...]
کے ساتھ ہی یہ خوف بھی کھٹکا ہوا ہے کہ اسکا علم امیر [...]
رخصت [...] ہو جائیگی کیونکہ آپ نے قریش کی تحقیر کی ہے" عبید اللہ نے جواب دیا [...] ہو، مجھے خیال نہ رہا اب ایسا نہ ہوگا دوسرے دن صبح ہوئی تو عبید اللہ نے سب لوگوں کو بلا کر بٹھایا اور عقبہ کو طلب کر کے صدر مجلس میں جگہ دی اور خود ان کے قدموں کے پاس بیٹھ گئے جب تمام مجلس بھر گئی تو اپنے بیٹوں کو بلوایا۔ انھوں نے یہ رنگ دیکھا تو اور متعجب ہوئے اور سمجھے کہ شاید بڑھاپے سے ہوش حواس جواب دینے والے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ سٹھیا جائے۔ لڑکے تو اسی تعجب میں رہے عبید اللہ نے [...] میں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور حمد و نعت کے بعد اپنے اولاد کی شکایت کرتے ان کی گفتگو نقل کی پھر کہا۔ "اے لوگو میں اللہ اور تم کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ عقبہ ابن حجاج ہے اور حجاج نے میرے دادا حارث کو آزاد کیا تھا۔ چونکہ میری اولاد کو شیطان نے دھوکے میں ڈالدیا ہے یہ لوگ خود بینی و غرور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں نے چاہا کہ اللہ کے ساتھ کفر سے پناہ مانگوں اور جو بات حق ہے۔ اس کو خدا کے لئے ظاہر کر دوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ میرے لڑکے حق بات سے منحرف ہو جائیں۔ اور ان پر اللہ اور دوسرے لعنت کرنے والوں کی لعنت پڑے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی ہے ملعون من ادعی الی غیر نسبہ ملعون من انکر نعمۃ المنعم علیہ جو شخص اپنے نسب کو دوسرے کی نسب سے منسوب کرے،

یا اپنے محسن کے احسان سے انکار کرے۔ وہ ملعون ہے۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے،
کفر باللہ تبرؤ من نسب و ان دق و کفر باللہ ادعاء الی نسب مجہول۔ اپنی نسب سے بیزار ہونا، اگرچہ کم رتبہ کا ہو اور اپنے نسب کو نسب مجہول کی طرف منسوب کرنا اللہ کے ساتھ کفر کرنا ہے، پھر اپنے بیٹوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کہ اے بیٹو ان جو دو سے مجھے خوف ہوا کہیں ہم اللہ کی لعنت و عذاب میں نہ مبتلا ہو جائیں یہ واضح رہے کہ میرا سخن زیادہ تر اپنی اور تمہاری طرف ہے۔ رہی یہ بات جو تم کہتے ہو کہ اس واقعہ کے علم سے امیر المومنین ناراض ہوں گے تو ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، اللہ ان کو سلامت رکھے وہ زیادہ حلیم ہیں اور اللہ کو زیادہ جاننے والے ہیں اور اللہ کے حقوق کو اس سے زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں جتنا تم گمان کرتے ہو بلکہ میری یہ بات ان کی رضامندی کا باعث ہو گی۔

ان کی اس فیاضانہ تقریر سے لوگوں پر بہت اثر ہوا۔ اور سب نے ان کا شکریہ ادا کر کے ان کے لئے دعا کی، اس صاف بیانی سے ان کے بیٹے بہت شرمندہ ہوئے۔ اور مجلس سے اٹھ کر چلے گئے پھر انھوں نے عقبہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا، اے میرے آقا آپ کا حق واجب ہے اللہ امیر المومنین کو اچھا رکھے ان کا ایما یہ ہے اور اسے آپ کی خوشی پر منحصر رکھا گیا ہے۔ کہ آپ اگر افریقیہ کی ولایت پسند کریں تو والی افریقیہ آپکی جگہ اندلس چلا جائے۔ ورنہ آپکو اندلس ہی کے عامل بنتے دوں۔ عقبہ نے اندلس ہی پسند کیا اور کہا کہ میں جہاد کو عزیز رکھتا ہوں اور اندلس میں جہاد کا میدان وسیع ہے۔ چنانچہ عبید اللہ سے ملنے کے بعد سنہ ۱۱۰ھ میں اندلس آئے اور کئی سال تک یہاں کے والی رہے۔ خوب جہاد پورا کیا اور فتوحات کرتے ہوئے اربونہ تک پہنچ گئے۔ جلیقیہ۔ البہ نبلونہ کو فتح کیا۔ جلیقیہ میں بجز صخرہ کے کوئی موضع ایسا باقی نہ رہا جو فتح نہ کر لیا ہو۔

صخرہ کی فتح نہ ہونے کا یہ سبب ہوا کہ اس میں وہاں کا بادشاہ پناہ گزیں تھا جس کو بلائی کہتے تھے یہ بادشاہ تین سو پیادوں کے ساتھ اس موضع میں داخل ہوا مسلمان بھی تعاقب میں لگے ہوئے تھے۔ محاصرہ کر کے وہیں پڑاؤ ڈالدیا۔ مگر ان کے مقابلے میں بہت دشواریاں پیش آئیں حریف نے ہمت نہ ہاری برابر ڈٹا رہا اس کے بہت سے ساتھی بھوک سے مر گئے اور ان میں سے ایک جماعت ہمت ہار کر مسلمانوں میں آملی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فوج میں کمی ہوتے ہوتے کل تیس مرد رہ گئے جنکے ساتھ دس عورتیں بھی تھیں اور رسد وغیرہ کی حالت اتنی تباہ ہو گئی کہ صرف شہد پر زندگی کا دارومدار رہ گیا شہد آسانی سے ملنے کی وجہ یہ تھی

کہ ان کے پاس شہد کی مکھیاں ہی تھیں اب لوگ پہاڑوں اور ان کے غاروں میں چھپ گئے اور آخر اپنی مستقل مزاجی سے مسلمان حملہ آوروں کو تھکا دیا۔ اور مسلمان پریشان ہو کر ان کو وہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور ان کو حقیر جانا اور کہنے لگے کہ تیس کافر ہمارا کیا بگاڑ لیں گے۔ لیکن انہی تیس آدمیوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی اس کی تفصیل حسب موقع بیان ہوگی۔

بربریوں کی شورش | غرض عقبہ ابن حجاج بربریوں کی شورشوں تک اندلس سے دور رہے ۔ ۱۲۱ھ میں بربریوں نے اباضیہ و صفریہ فرقوں پر انتقام لینے کے لئے چڑھائی کی اور طنجہ کا سردار محفوظ مغوی کر دیا ۔
عامل طنجہ عمر ابن عبد اللہ مرادی سے جنگ کی اور اس کو قتل
کشت و خون ہوا کہ بقول بعض اہل طنجہ کے دریا کے بیچ تک
ایسی سخت تھی۔ کہ اس میں قوم بربر کے آس پاس کے تمام
ہوئی۔ اور یہاں ان کو مار کر بھگا دیا گیا۔

عبدالملک ابن قطن کا عقبہ ابن حجاج پر حملہ | جس زمانہ میں بشیر بن صفوان اپنے ملک یعنی افریقیہ کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ اسی زمانے میں عبدالملک ابن قطن محاربی فہری نے عقبہ ابن حجاج پر چڑھائی کی اور ان کو معزول کر کے خود اندلس پر قابض ہو بیٹھا۔ اس کا حال نہ معلوم ہوا کہ عقبہ کو عبدالملک نے قتل کیا یا نکال دیا عبدالملک کا یہ زمانہ حکومت دو سال چند ماہ رہا یعنی آخر ۱۲۱ھ سے ۱۲۳ھ تک پھر بلج ابن بشیر قشیری اور ان کے بعد کعبی اہل شام کو لیکر اندلس میں داخل ہوئے کعبی کے آنے کے اسباب ہم نے آگے چل کر بیان کئے ہیں۔

دربار خلافت میں موسیٰ کی بربادی | اب پھر ہم موسیٰ ابن نصیر کا ذکر کرتے ہیں۔ موسیٰ ابن نصیر سلیمان کے عہد خلافت میں شام میں آئے ولید کا چھیالیس سال کی عمر میں ۹۶ھ میں انتقال ہو چکا تھا۔ ولید حضرت معاویہ رحمتہ اللہ علیہ کے خلافت میں پیدا ہوئے تھے۔ ولید کے بعد سلیمان تخت نشین ہوئے موسیٰ ابن نصیر کے حریف وطارق ومغیث۔ سلیمان تک پہونچنے میں سبقت کی اور موسیٰ کی سخت شکایت کی اور مائدہ کے بارے میں جو کچھ طارق کے سلوک ہوا تھا۔ اور والی قرطبہ کے بارے میں مغیث پر جو کچھ گذری تھی یہ سب واقعات نہایت تشریح کے ساتھ بیان کئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ اس مہم میں موسیٰ

کو ایک اتنا بڑا جوہر ملا ہے کہ خزانۂ فارس کے جوہر کے سوا کسی بادشاہ کے خزانہ میں نہ ہوگا۔ اس جوہر کو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا جب موسیٰ آئے تو خلیفہ نے ان کو اور ان کے بیٹے کو طلب کرکے طارق و مغیث کے شکایات کے سلسلہ میں جواب طلب کیا۔ موسیٰ نے بعض عذرات پیش کئے پھر خلیفہ نے مائدہ طلب کیا موسیٰ نے کہا "یہ حاضر ہے" خلیفہ نے اسے دیکھ کر کہا یہ ایسا ہی ناقص تھا۔ موسیٰ نے کہا جی ہاں ایسا ہی تھا۔ یہ سنتے ہی طارق نے اپنے قبا میں ہاتھ ڈالا اس کا پایہ نکالا اور خلیفہ کے سامنے رکھ دیا۔ اس بات سے خلیفہ سلیمان کو موسیٰ کے جھوٹ اور ان کے متعلق ہر شکایت میں طارق کی سچائی کا یقین ہو گیا۔ اور انہوں نے فوراً موسیٰ کے قید کئے جانے کا حکم صادر کر دیا اور ایک سخت تاوان عائد کیا جس کی ادائیگی سے وہ قاصر رہے۔ اور انہیں اہل عرب سے امداد لینی پڑی

کہا جاتا ہے کہ قبیلۂ لخم کو موسیٰ کے تاوان کے ستر ہزار اشرفیاں دینا پڑیں اور اس کا سبب یہ تھا کہ موسیٰ نے اس قبیلے کی ایک عورت سے عقد کیا تھا جس کے پہلے شوہر سے ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام طریف تھا۔ موسیٰ نے اس کی کفالت کی اور پرورش کرکے اس پر بہت سے احسانات کئے اس لئے بنی لخم ان کی ممنون تھے یہی کہتے ہیں کہ موسیٰ کو حبیب لخمی کی بہن بیاہی تھی۔ یہی سبب تھا کہ جب اہل اندلس نے عبدالعزیز کو قتل کیا ہے تو اس یورش میں حبیب لخمی کو گھیر لیا تھا۔ بنی لخم کے ساتھ محبت کا یہ سب سے اہم نتیجہ تھا۔ جو لوگوں کے علم میں ہے۔

افریقیہ کا کام کلثوم ابن عیاض کا تقرر	جب ہشام ابن عبدالملک خلیفہ ہوئے تو انہوں نے افریقیہ مہم کے لئے کلثوم ابن عیاض قشیری کو تیار کیا۔ لوگوں کو ان کے ساتھ جانے

پر توجہ دلائی اور اپنے اطمینان کے لئے اس کے بھتیجے ابن بشیر قشیری کو اس کا قائم مقام مقرر کر دیا اور یہ انتظام کر دیا کہ اگر بلج کام آ جائیں تو ثعلبہ بن سلمہ عاملی اس کے جانشین ہوں پھر ثعلبہ کو اہل شام کی لشکر پر پہنچ کر فوجیں اکٹھا لیں۔

شام کی افواج کی تقسیم حسب ذیل تھی [1]	شام کے ہر لشکر میں سے چھ ہزار نفر اور قنسرین کے عساکر میں سے تین ہزار جمع کی۔ اسی طرح شام سے ۲۷ ہزار فوج دے کر کلثوم ابن عیاض کو

[1] فلسطین۔ اردن۔ حمص۔ دمشق۔

(باقی)

فہرست مضامین

قیمت سالانہ پانچ روپیہ۔ ششماہی (عہ)

نفسیات عرب

جامعہ ملیہ کے پرانے طالب علم مولوی غلام سرور صاحب نے جو اس وقت مصر کے جامعہ ازہر میں علوم عربیہ کی تکمیل کر رہے ہیں کسی عربی اہل قلم کا یہ مضمون اردو میں ترجمہ کر کے رسالہ جامعہ کے لئے ارسال کیا ہے۔ مقالہ نگار نے اس میں عرب کی نفسیاتی کیفیت کو مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے دکھانے کے بعد ان پر تنقید کی ہے۔

یہ مضمون اس قدر سطحی ہے کہ میں کبھی اس کے اوپر کچھ لکھ کر اپنے قلم کو آلودہ نہ کرتا اگر بیچ میں میرے عزیز شاگرد کا قدم بحیثیت مترجم کے نہ ہوتا۔

اصلیت یہ ہے کہ کسی قوم کے اعمال و عواطف اور نفسیات و جذبات پر بحث کرنے کے لئے اس کی مجموعی تاریخ سامنے رکھنی چاہئے۔ جزئی واقعات سے کلی نتائج اخذ کرنا صحیح نہیں۔

عرب اولیٰ نے جو تاریخ دنیا میں چھوڑی ہے اس میں جو چیزیں ہر جگہ اور عموم کے ساتھ نمایاں ہیں وہ ان کی شجاعت و بسالت، مفتوح اقوام کے ساتھ رافت و رحمت، نظام امن و امان۔ بنی نوع انسان کی محبت۔ روا داری اور سلوک اور سب سے بڑھ کر اللہ کا تقویٰ اور خشیت ہے۔ وہ اپنے ان تمام کارناموں میں حق و انصاف کے وفادار خادم اور جاں نثار سپاہی نظر آتے ہیں۔ دنیا کی کسی دوسری قوم کی تاریخ میں یہ سب باتیں اس قدر اور اس ہم آہنگی کے ساتھ نہیں پائی جاتیں۔ عرب کے اس کارنامہ کو جو آفتاب نصف النہار کی طرح دنیا میں روشن ہے کون چھپا سکتا ہے۔ بے شک عرب نے اپنی جاہلی عصبیت کی بنا پر اللہ اور رسول کے فرمان کے خلاف اقوام عجم پر اپنی افضلیت کا دعویٰ کیا۔ اور افضلیت بھی تاریخی اور عملی نہیں بلکہ نسبی اور فطرتی۔ حالانکہ قرآن کریم نے جملہ بنی نوع

انسان کو صرف ایک ماں باپ بلکہ "نفس واحد" کی پیداوار قرار دیا ہے۔ اور انسانی وحدت کا
سبق سکھایا ہے۔ اصول نفسیات کے لحاظ سے اس کا ردعمل بھی سخت ہونا چاہئے تھا چنانچہ
شعوبیہ کی جماعت پیدا ہوئی جس نے نہ صرف انکی جاہلیت اور وحشت کے افسانے پھیلائے
بلکہ ان کے مکارم پر بھی خاک ڈالنی شروع کی۔ کوفہ۔ بصرہ اور قیروان کی ویرانی کو عرب کے
فقدان حسن انتخاب کا نتیجہ قرار دینا اسی جماعت کا کام ہے۔ ورنہ تاریخوں میں ان کی تباہی
کے مفصل و مشرح اسباب موجود ہیں۔

ابن خلدون ہر قسم کی رطب و یابس
فلسفۂ تاریخ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے
ساتھ صرف تین چار مہینوں میں لکھا گیا ہے۔ یہی وجہ
ترتیب بے ڈھنگی ہے۔ لایعنی تکرار کی کثرت ہے۔ اور حشو و زوائد بہت ہیں بعض بیانات
نامکمل اور بعض غیر صحیح ہیں۔ واقعات کے مقابل میں اس مقدمہ کی شہادت کوئی وزن
نہیں رکھتی۔

مولوی غلام سرور کو یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ میزان عمل ہے جس پر قومیں اور
شخصیتیں تولی جاتی ہیں۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

قومیں اپنے مخصوص مزاج اور نفسیات میں ایک دوسرے سے کافی [اَلم] اختلاف رکھتی ہیں۔ انگریزی
مزاج اور ہے اور فرانسیسی اور مصری ان ہر دو سے علحدہ ہے۔ مزاج اور طبائع کا یہ اختلاف اور ان میں
باہمی تباین نتیجہ ہے مخصوص ماحول اور سماجی اثرات کا جس میں ہر قوم اپنی زندگی گزارتی ہے یہی سبب
ہے کہ ایک وقت واحد میں مختلف قومیں ترقی و ارتقاء کے مختلف مدارج پر گامزن نظر آتی ہیں۔ قوموں کے
اس سلسلۂ ارتقاء کی ہر کڑی اپنے نفسی مظاہر کے اعتبار سے ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔
قوم کے تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تعلیم و تربیت کے اختلاف کے علاوہ ان کے طبعی

[illegible] کا پتہ دے سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں ایک [illegible] [illegible] ہر قوم کے افراد میں ہوتی ہے جو کسی اشتراک کی وجہ سے [illegible] مثال میں صاف [illegible] [illegible] ایک انگریز کو جرمن یا اطالوی سے تھوڑی سی مشق کے بعد فرانسیسی انگریز یا مصری میں تمیز کر سکتے ہیں جسمانی اور [illegible] یک رنگی کے علاوہ قوم کے مختلف افراد میں نفسی اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔

عربی قوم کے وہ کون سے نفسی خصائص ہیں جو وحدت مشترک کا درجہ رکھتے ہیں؟ دوسرے الفاظ میں اگر ہم ایک ایسے عربی فرد کا انتخاب کریں جو عرب قوم کے طبائع و نفسی کیفیات کا نمونہ ہو تو اس کے کیا اوصاف ہوں گے؟ اس موضوع کے متعلق اہل علم کی رائیں غیر معمولی اختلاف رکھتی ہیں۔ ان میں بعض یہ ہیں۔

۱۔ جماعت شعوبیہ کا ایک رکن اہل عرب کے متعلق لکھتا ہے ”عربوں کے علاوہ تمام عجمی اقوام میں خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں بھی آباد رہی ہوں بادشاہ ہوتے چلے آئے ہیں جو اس کی حفاظت کرتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شہر تھے۔ جو ان کے مراکز کا کام دیتے تھے۔ ان کے قوانین تھے جن کی اطاعت و فرمانبرداری ہوتی تھی۔ ان کے طفیل فلسفہ معرض وجود میں آیا۔ اور صنعت و حرفت میں اختراعات ہوئیں دیباج و شطرنج کی ایجاد ان کی مرہون منت ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس طرح اہل روم نے اصطرلاب، قانون اور تخلیق کے متعلق فلسفہ مرتب کیا لیکن عربوں کے اندر نہ تو کوئی بادشاہ ہوا جو ان کے افراد کو ایک مرکز پر لاتا اور مختلف اجزا کو متحد کرتا۔ غاصب و ظالم کا قلع قمع اور شہریوں کو فتنہ و فساد سے روکتا۔ صنعت و حرفت میں وہ بالکل صفر۔ فلسفہ ان کے ہاں تمام کو نہیں لے دے کے ایک شاعری ہے لیکن اس میں بھی عجم برابر کا ساجھی ہے۔ بلکہ اہل روم کے ہاں عجیب و غریب اشعار ہیں جو اوزان اور عروض پر پورے اترتے ہیں۔

۲۔ شعوبیہ کا رد اور عربوں اور غیر عربوں کا موازنہ کرتے ہوئے جاحظ لکھتا ہے ”اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل ہند کے یہاں علوم مدون اور مستقل کتب میں موجود ہیں اور یہ تصنیفات کسی خاص شخص یا عالم سے منسوب نہیں بلکہ ان کا سلسلہ نسلاً بہ نسلاً بطور وراثت چلا آتا ہے۔ اور اسی طرح یہ علوم منقو

[illegible] سے حرکت کر رہے ہیں۔ یونان کے پاس فلسفہ اور منطق ہے لیکن منطق کے باوجود فصاحت
[illegible] سے کورا اور تقریر و خطابت سے ماجنبے۔ اہل فارس کے ہاں خطیب و مقرر ہیں لیکن ان کا
تمام زور بیان اور ندرت معانی نتیجہ ہے عمیق فکر اور محنت و اجتہاد کا۔ اس کے مقابلے میں عرب کے
پاس جو کچھ ہے وہ آمادہ فی البدیہہ۔ اس کے ہاں نہ آورد ہے اور نہ محنت تفکر۔ نہ خیال آرائی اور احتیاج
غیر۔ اس کا یہ وصف الہام کا حکم رکھتا ہے۔ جہاں اس نے شعر گوئی کی طرف توجہ کی خیالات کا سلسلہ
بے روک ٹوک آ حاضر ہوا۔ اور الفاظ خود بخود آراستہ ہوتے چلے گئے۔
تا بلا لیکن تھے اہل طبع اور تکلف سے ناآشنا۔ اہل شعر [illegible]
عرب دوسروں کے علوم رٹنے والے اور اُن کی لکیر [illegible]
جو ان کے دل کو بھا گیا اور اُن کو راس آیا۔ اور اُن کی عقول
نے بجز حفظ و اخذ کرنے کے کبھی کوشش نہ کی۔

۴۔ ابن خلدون کی رائے . . . . . ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے شہرہ آفاق مقدمہ
میں مختلف مقامات پر عربوں کے متعلق بحث کی ہے ہم اس کی آرا کا ملخص پیش کیے دیتے ہیں۔ ابن
خلدون کے نزدیک عربوں کی اجتماعی حالت عین فطری ہے۔ اس دور میں سے نشو و ارتقا کے سلسلہ
کو طے کرتے وقت ہر قوم کو گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے الفاظ میں "عربی قوم اپنی تخلیق میں بالکل طبعی ہے
وہ اپنی وحشی طبیعت کے اعتبار سے ایسی ہے کہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کرنے والی ہے۔ آسانی اور
جان جوکھوں کے بغیر جو اس کے ہاتھ پڑ جائے اس سے دریغ نہیں کرتی گھاس اور پانی کی تلاش
میں صحرا پیماں مارتی ہے۔ غالب اور قوی قبائل بلند اور محفوظ مقامات میں رہنے کی وجہ سے اس
کے فتنہ و فساد سے مامون رہتے ہیں لیکن جہاں میدانی قبائل کی کمزوری اور عدم مدافعت نے اسے
موقع دیا۔ فوراً اُن پر چڑھ دوڑی اور لقمہ تر بنا لیا۔ اُن پر قتل و غارت کی یورشوں کا لامتناہی سلسلہ
جاری رکھتی ہے یہاں تک کہ وہ اس کے مطیع و محکوم ہو جائیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ تھوڑے سے سیاسی
ردو بدل اور سرکار کی تبدیلی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی عمرانی حیات کا خاتمہ

اہلِ عرب جس ملک پر قابض ہوئے وہ بسرعت ویرانی و بربادی کے کنارے آ لگا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ عرب وحشی قوم ہے۔ عمارتوں کو توڑ کر اُن کے پتھروں سے اپنی ہانڈیوں کے لئے چولہوں کا کام لیتے ہیں۔ مکانوں کی چھت اُتار کر اپنے خیمے آباد کرتے ہیں۔ اُن کی میخیں خیموں کے لئے تناؤ کا کام دیتی ہیں۔ لوگوں کا مال غصب کرنے میں اُن کے ہاں کوئی حد ہی نہیں جہاں وہ پہنچ کر رک جائیں۔ قوانین اور احکام کا خیال اور لوگوں کو فتنہ و فساد سے باز رکھنے کا جذبہ مفقود۔ اُن کے نزدیک سب سے اہم چیز لوٹ مار یا جرمانہ و تاوان سے مال غیر کو ہتھیانا ہے۔ جہاں وہ قابو میں آ گیا ملکی مصالح اور دوسرے امور کی اصلاح سے گردن پھیر لی۔ حکومت کے بلا کے حریص۔ شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کی سیادت تسلیم کرنے والے اگرچہ وہ بھائی، باپ یا قبیلہ کا رئیس ہی کیوں نہ ہو۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن کے ہاں اکثر طوائف الملوکی رہی۔ بیک وقت ایک حاکم کی بجائے متعدد حکام اور امرا ہوتے رہے۔ اس طرح حکمرانی اور تحصیل خراج کئی ہاتھوں میں بٹ گئی۔ اور زندگی تباہ اور تمدن پامال ہو گیا۔ ذرا ان مقبوضات کو دیکھو جو ابتدائے آفرینش سے اُن کے ہاتھ لگے۔ اُن کا تمدن معدوم اور آبادی چٹیل میدان بن گئی۔ مثال کے طور پر یمن کو لیجئے بالکل تباہ و برباد الا چند گنتی کے شہر اور قصبے۔ یہی حال عراق عرب کا ہوا یہاں اہل فارس اور شام میں اہل شام کا جو کچھ تہذیب و تمدن تھا اُن کی بھینٹ چڑھا۔

عرب اپنے اکھڑپن۔ تمرد، تند مزاجی۔ عالی ہمتی اور حرص سیادت کی وجہ سے ایک دوسرے کی سیادت تسلیم کرنے میں دنیا کی سب قوموں سے سخت ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے ہاں سلطنت دینی نفوذ کے بغیر قائم نہ ہو سکی۔ یہ دینی نفوذ خواہ نبوت ہو یا ولایت یا سلطنت پر مجموعی حیثیت سے دینی اثر غالب ہو۔

وہ آبادیاں جن کا نقشہ ان لوگوں کے ہاتھوں تیار ہوا جلد ویران ہو گئیں جس کا سبب محل وقوع انتخاب کرتے وقت۔ مناسب جگہ۔ آب و ہوا کی عمدگی پانی اور زراعت و چراگاہ کی اہمیت کی عدم رعایت ہے۔ اس کے علاوہ شہر کی عمدگی اور خرابی کا اس میں دخل ہے۔ عرب تو شہریت سے نابلد وحشی بسانے

[illegible] اپنے اونٹوں کی چراگاہوں کا خیال رکھتے تھے۔ انھیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ پانی اچھا ہے یا خراب، کم ہے یا زیادہ۔ نہ انھیں زراعت، آب و ہوا اور پیداوار کی جگہوں سے سروکار تھا۔ کوفہ۔ بصرہ اور قیروان کے بسانے میں ان کا زاویۂ نگاہ دیکھو۔ انھوں نے اس میں اپنے اونٹوں کی چراگاہوں اور صحرا کی قربت اور سفر و مسافت کے مواقع کے سوا دوسری کوئی رعایت نہیں رکھی۔ یہ صورت شہروں کی آبادی کی طبعی مناسبت کے اعتبار سے بیکار تھی۔ اُن کے ہاں ایسے جوہر کا فقدان تھا جو اُن کے تمدن کو اُن کے بعد مدد دیتا۔ اُن کی بستیاں اور مساکن بننے کے اعتبار سے غیر طبعی تھے۔ یہ آبادیاں دوسری قوموں کے دسترس سے دور تھیں کہ وہاں اور لوگ بھی آباد ہو سکتے۔ چنانچہ جونہی مکینوں کا شیرازہ بکھرا، اُن کی عصبیت جو مکانوں کے لئے باڑھ کا کام دیتی تھی، مفقود ہو گئیں۔

اہل عرب صنعت و حرفت میں دنیا کی سب قوموں

اور شہریت سے جو صنعت و حرفت کو وجود میں لانے کا سبب ہے، بعد ہے

اور وہ ممالک جو عہد اسلام میں اُن کے زیر نگیں ہونے سے بالجملہ صنعت و حرفت کی سرد بازاری میں مبتلا ہیں

یہاں تک کہ وہ ہمیشہ غیروں کے محتاج رہے۔

علوم و فنون میں بھی عرب دوسروں سے پیچھے رہے جس کی وجہ یہ ہے کہ علوم و فنون کے لئے تعلیم و ملکہ کی اشد ضرورت ہے۔ اسی وجہ سے علوم کا شمار صنائع میں ہوتا ہے اور تعلیم و ملکہ سے جیسا کہ پیشتر ہم لکھ چکے ہیں، عربوں کو بُعد المشرقین تھا۔ چنانچہ علوم اہل امصار تک محدود رہ گئے اور عرب اُن سے کورے ہی رہے۔ اُس عہد میں شہری آبادی عجم یا عربوں کے الفاظ میں موالیوں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ اسلامی دور میں مسلمان علماء و فضلا کی بیشتر تعداد غیر عرب تھی اور علوم کی تدوین و بقا کے لئے اٹھے بھی تو عجمی یعنی غیر عرب۔

ان سب باتوں کے علاوہ عرب میں حق و ہدایت کو بسرعت قبول کرنے کی استعداد سب قوموں سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ اہل عرب کی سلامت طبعی تھی۔ اُن میں درشتی جو اکھڑ پن سے ملتی ہوئی ہے ضرور تھی لیکن یہ چیز اچھی بات قبول کرنے کی استعداد رکھتی ہے۔

[illegible] اور رہا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ اُسے خود اپنی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ [illegible]
[illegible] نہیں ملتا اور وہ اپنے سوا دوسرے پر بھروسا کرتا ہے۔ وہ ہر وقت مسلح رہتا ہے۔ وہ
[illegible] پر کمربستہ رہتا ہے۔ عرب کے لئے شجاعت اور دلیری طبیعت بن گئی ہے۔ ہم [illegible]
ہیں کہ [illegible] بادیہ نشین عرب اپنے بھائی سے جو شہر کی ہوا کھا چکا ہے زیادہ دلیر اور شجاع ہے۔

— عرب اقوامِ عالم میں اپنی فصاحت و بلاغت، زورِ بیان اور خطابت میں ممتاز ہیں۔ ابتدائے
آفرینش سے زورِ بیان اُن کے لئے باعثِ امتیاز چلا آتا ہے۔

۴۔ روڈلیری اپنی کتاب د ... ایں عربوں کا ذکر
کرتے ہوئے کہتا ہے "عرب اپنے سامنے ہمیشہ مادی نصب العین رکھتا ہے۔ وہ تمام اشیا کو مادی نظر
سے دیکھنے کا عادی ہے۔ کوئی چیز اُس وقت تک اس کی نظر میں پوری نہیں اترتی جب تک وہ اُس
سے پیدا ہونے والے منافع کا اندازہ نہ لگا لے۔ طمع اس کے تمام شعور و جذبات پر حاوی ہے۔ ایمان
اور عواطف کے لئے اُس کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ مذہب کی طرف وہ زیادہ مائل نہیں۔ عرب ہر
چیز کی اُس کے محسوس نتیجہ یا حاصل کے لحاظ سے قدر کرتا ہے۔ عزتِ نفس کا جذبہ اس پر یہاں تک غالب
ہے کہ وہ کسی کی سیادت کو کسی رنگ میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس کے قبیلہ کے سردار یا قائدِ لشکر کو
اپنی ریاست کے روزِ اول ہی سے اُس کی طرف سے لڑائیوں میں حسد بغض یا خیانت کے ظہور کا اندیشہ
لگا رہتا ہے۔ جو شخص عرب پر احسان کرے اس کو اُس کے انتقام کے لئے تیار رہنا چاہئے کیونکہ محسن کا
احسان اُس کے دل میں خضوع اور ذلت کے احساس کو جوش زن کرتا ہے اور وہ اپنے آپ کو محسن
کے جوتے کے نیچے پاتا ہے۔ لامانس کا قول ہے کہ "عرب مساوات کا نمونہ ہے"۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب
اس جذبۂ مساوات میں حد سے بڑھ گیا ہے۔ ہر وہ سیادت جو اُس کی شخصی آزادی کے دائرہ کو محدود
کرنے کی کوشش کرے اور اگرچہ یہ تحدید اُس کی مصلحت کے لئے ہو عرب کو عداوت اور دشمنی کی دعوت
دیتی ہے۔ عرب کی فطرت کا یہی راز ہے جس سے اُن جرائم اور خیانتوں کے سلسلہ کا جو تاریخِ عرب کے
ایک بڑے حصہ پر حاوی ہے انکشاف ہوتا ہے۔ اس راز کی عدمِ واقفیت کی وجہ سے اہلِ یورپ

[illegible] فاحش غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور اس بے علمی کے طفیل مسلم عرب ہمیں نہیں بے وجہ
[illegible] بے شمار قربانیاں دینی پڑیں۔ اہل عرب کی سرزوری اور جذبہ سرکشی ہی ہے جو ان کے مغربی
[illegible] کے قبول کرنے اور اس پر عملدرآمد ہونے میں حائل ہو رہا ہے۔ ایک عرب کے لئے اپنا استقلال
اور آزادی نفس اتنی عزیز ہے کہ اگر آپ اس کے حلقہ کو محدود یا اس کے اطراف میں کچھ کمی کرنے کی
کوشش کریں تو وہ ایک مقید وحشی کی طرح غضب و غصہ میں [illegible]
کی سی کیفیت طاری ہو جائے گی اور وہ اپنی زنجیروں کو توڑ[illegible]
ترین جد و جہد کرے گا۔
اس کے ساتھ عرب مخلص اور اپنے قبیلہ کی روایا۔
مہمان نوازی اور جنگی عہد و پیمان میں پورا اترنے والا ہے۔
میرے خیال میں یہ اوصاف حسنہ کسی خاص قوم سے مخصوص نہیں ہیں سلسلہ نشو و ارتقا میں
ہر قوم کو اس دور میں سے گزرنا پڑتا ہے اور اس میں مذکورہ صفات لازمی طور پر پیدا ہو جاتی ہیں۔
اس لئے ہم یہ صفات عربوں کی مخصوص ملکیت نہیں گردانتے۔ چنانچہ جب عرب مستقل طور پر رہنے لگے اور
بادیہ پیمائی کے بجائے کھیتی باڑی کرنی شروع کی تو ان اوصاف میں بھی فرق آ گیا۔
۵۔ ان کے علاوہ عربی ادب کی کتابوں میں کثرت سے ایسے اقوال ملیں گے جن میں دنیا
کا کوئی فضل و کمال ایسا نہیں جو عربوں میں نہ پایا جاتا ہو اور کوئی برائی اور عیب نہیں جس سے ان کی
ذات منزہ قرار نہ دی گئی ہو۔ مثال کے طور پر الوسی کی بلوغ الادب، ملاحظہ فرمائیے۔ ایک طویل
بیان کے بعد مصنف مذکور لکھتا ہے "حاصل کلام یہ ہے کہ عرب عقل اور سمجھ میں سب سے اعلیٰ طاقت
انسانی ہیں سب سے بڑھے ہوئے اور فہم و ادراک میں سب سے چوٹی پر تھے۔ چنانچہ اس کا قدرتی
نتیجہ تھا کہ وہ ہر فضل و کمال کے حامل ہوئے اور بندگی اور عظمت نے ان کے ہاں جنم لیا" اسی طرح
ابن رشیق العمدہ میں عربوں کے فضائل کے ذکر میں کہتا ہے۔ "عرب سب قوموں سے افضل و اعلیٰ
ہیں ان کی حکمت سب حکمتوں کی سرتاج ہے"

تنقید یا انتقاد . . . .

ہم اہلِ عرب کے تقدس کے قائل نہیں اور نہ ہمارے نزدیک اُن اقوال کی جن میں عربوں کو ہر کمال و فضل سے متصف اور ہر نقص سے مبریٰ دکھایا گیا ہے کوئی اہمیت ہے۔ ہمارے خیال میں بیان کی گئی خامیاں بھی علمی نہیں کہلایا جا سکتا۔ ہمارے نزدیک عرب اور قوموں کی طرح ایک قوم ہیں۔ ان میں محاسن بھی ہیں اور عیوب بھی۔ اُن کی عقلیت اور ذہنیت اُن کی تاریخ اور ادب اسی طرح معرضِ بحث میں لائے جا سکتے ہیں جیسے کسی اور قوم کے۔ اس لحاظ سے پانچویں رائے ہماری بحث یا انتقاد سے مستثنیٰ ہے۔ اسی طرح جماعت شعوبیہ کی غلط روی بھی صاف طور پر ظاہر ہے۔ وہ عرب سے یونان کا فلسفہ، رومانی قانون اور صنعت و حرفت کی مہارت اور اصطرلاب وغیرہ اختراعات کا مطالبہ کرتے ہیں وہ ان قوموں کا عربوں سے مقابلہ کرتے تو ہیں لیکن غیر متمدن۔ بادیہ نشین عرب سے جو کسی صورت سے جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ صحیح مقابلہ تو اس وقت ہو سکتا ہے کہ مختلف قوموں کے ایک ہی دورِ تمدن کو لیا جائے۔ نہ یہ کہ ایک قوم ابھی بدویت کے مراحل طے کر رہی ہو اور اس کو ایک مہذب و متمدن قوم کے مقابل لا کھڑا کیا جائے۔ اس کی مثال تو ایسی ہوئی کہ ایک بچے کی عقل کا مقابلہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے کیا جائے۔ اہلِ فارس اور اہلِ روم میں سے ہر ایک قوم کو نشو و ارتقاء کے طبعی ادوار میں سے گزرنا پڑا ہے اور عہدِ بدویت میں اُن کے ہاں بھی فلسفہ یا اختراعات کا وجود نہ تھا۔ اگر مقابلہ منظور ہے تو متمدن اور مہذب عرب سے کیجئے جس کے پاس قانون بھی تھا اور علوم بھی اگرچہ اتنا زیادہ نہیں جس کی تفصیل آگے آئے گی۔
مذکورہ اقوال میں ابنِ خلدون اور رولیری کے بیانات ہماری خاص توجہ اور انتقاد کے مستحق ہیں۔

ابنِ خلدون کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ عرب وحشی اور لٹیرا ہے۔ کسی ملک پر اس کا تسلط اُس کی تباہی و ویرانی کا پیش خیمہ ہے۔ کسی رئیس کے سامنے مشکل سے سرِ تسلیم خم کرنے والا، صنعت سے نابلد اور علوم میں خام۔ ان ہر دو میں درجۂ کمال تک پہنچنے کی استعداد ندارد۔ سلیم الطبع، نیکی کے لئے مستعد، بہادر اور دلیر۔

اولیری کے نزدیک عرب مادہ پرست۔ تنگ خیال۔ جا مد العواطف۔ عزت نفس و ذاتی
آزادی میں حد سے زیادہ سخت۔ حکومت و سیادت کا باغی۔ سخی اور اپنے قبیلہ کی روایات کو
پورے اخلاص اور دیانت سے نبھانے والا۔

ابن خلدون اور اولیری دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ عرب مادہ پرست اور سرکش ہیں
عرب کی سرکشی اور سرزوری میں تو کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ اولیری کا یہ قول بھی حق
بجانب ہے کہ ان جرائم اور خیانتوں کو سمجھنے کے لئے بن ۔۔۔
کی اس فطرتی سرکشی اور سرزوری کا راز بڑی مدد دیتا ۔۔۔
ایک بڑا حصہ ابن خلدون اور اولیری کا ہمنوا ہے۔ پروف۔
لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں عربوں کے متعلق یہی رائے ۔۔۔
مادیت سے یہ مراد ہے کہ عرب مادہ۔ درہم اور دینار کے سوا دوسری چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔
معنویات کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ بادیہ نشین عربوں میں یہ وصف روز
روشن کی طرح سے نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن ایام جاہلیت کے عرب کو مجموعی طور پر اس وصف سے مختص
کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے ؟ اس عمومیت کو ہم بغیر شک و شبہ کے دیکھے نہیں رہ سکتے۔ اگر شرافت
اور کرم و وفا کی تمام حکایتیں اور روایات قبیلہ کی خاطر بخوشی جان پر کھیلنے کے واقعات جن سے ادبی
تصنیفات بھری پڑی ہیں صحیح ہے تو عرب پر مادہ پرستی اور مادیت کا الزام کیا۔ مادہ پرستی اور یہ
اوصاف تو ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہ تو ایک دوسرے کے منافی ہیں۔

ہمارے خیال میں ابن خلدون اور اولیری نے عربوں کے اوصاف بیان کرتے وقت ان
کی تقسیم مدنظر نہیں رکھی تھی۔ انھوں نے یہ بیان نہیں کیا کہ ان کا موضوع کلام کس عہد کا عرب ہے۔
ہمارے نزدیک جاہلی عرب بہت سی باتوں میں اسلامی عرب سے مختلف ہے۔ بلکہ جاہلی میں بھی شہری
اور بدوی دونوں الگ الگ ہیں۔ اور نیز زمانہ حال کا بادیہ نشین عرب وہ نہیں جو زمانہ قبل از اسلام نہیں
تھا۔ ابن خلدون نے باوجود وقت بحث کے اپنے موضوع گفتگو کو کسی خاص عہد کے عرب تک محدود

[illegible] بحث کا نتیجہ ہے کہ اس کے اقوال میں سقم صاف نمایاں ہے۔ اس کے بیان کے بعض [illegible] سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ عرب سے مراد جاہلی بادیہ نشین عرب لیتا ہے۔ مثلاً جہاں وہ لکھتا ہے کہ عرب محلات کو توڑ کر اس کے پتھروں سے چولھوں کا کام لیتے ہیں اور عمارتوں کی چھتوں سے اپنے خیمے آباد کرتے ہیں۔ مذکورہ اوصاف محض بادیہ نشین اور جاہلی عرب کے ہیں۔ اموی اور عباسی عہد کے متمدن عرب کو ان سے کیا واسطہ۔ لیکن آگے چل کر ابن خلدون عربوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اُن کے حسن انتخاب کی کمی کا ذکر کرتا ہے جو شہروں کے بساتے وقت اُن کے مناسب محل وقوع کے انتخاب کرنے میں اُن سے سرزد ہوئی۔ اس کی تائید میں وہ بصرہ۔ کوفہ اور قیروان کی بستیاں پیش کرتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ محلوں کو توڑنے والے بادیہ نشین عرب ان اعمال کے جوابدہ نہیں بلکہ اس سے صدر اسلام کا عرب مراد ہے جس کے ہاتھ پر روم اور فارس فتح ہوئے۔ شہروں کو بسانے والا عرب اور ہے اور عمارتوں کے پتھروں سے چولھوں کا کام لینے والا عرب اور۔ بعد ازاں ابن خلدون عربوں کا علوم و فنون سے بحسن و خوبی عہدہ برآ نہ ہونا بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میدان میں بھی اولیت کا سہرا غیر عرب یعنی موالی کے سر رہا۔ اس لئے اس کی مراد عہد عباسی یا عہد اموی کے آخری زمانہ کے عرب سے ہے۔ اس سے آگے چل کر ابن خلدون کے خود اپنے اقوال سے اس کا تناقص ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنے مقدمہ تاریخ میں ایک اور مقام پر لکھتا ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ عربوں میں تمدن اور تہذیب اخذ کرنے کی صلاحیت موجود تھی اور وہ دوسرے لوگوں کے اختلاط و معاشرت سے استفادہ کرنا جانتے تھے۔ اس خیال کی مزید توضیح کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتا ہے "عربوں کا یہ خاص وصف فتوحات اسلامیہ کے بعد ظاہر ہوا۔ انھوں نے فارس و روم پر قابض ہو کر وہاں کے باشندوں اور اہل ہنر سے خدمات لیں۔ اس سے قبل اہل عرب تمدن سے ناآشنا تھے چنانچہ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ

"کسریٰ کے خزانے میں جب انھیں کافور ہاتھ لگا تو وہ نمک سمجھ کر آٹے میں استعمال کرنے لگے اس قسم کی اور بہت سی روایتیں اُن کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ جب عربوں نے اُن قوموں کو مسخر

[illegible] سلطنتیں تھیں اور وہاں کے باشندوں کو ان کے پیشوں میں لگایا اور اُن سے اپنی خانگی ضروریات میں مدد لی اور اُن میں سے اہلِ کمال و ماہرین کی سرپرستی کی۔ اُن کی اس توجہ اور سلیقہ سے صنعت وحرفت کو چار چاند لگ گئے اور اس طرح سے عرب ترقی کے مدارج طے کر کے درجۂ کمال تک پہنچے۔ اہلِ عرب نے سامانِ اکل وشرب۔ لباس۔ فنِ تعمیر۔ اسلحہ۔ ظروف اور لوازمِ آرائش میں عمدہ اختراعات کیں۔"

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ ابن خلدون نے عرب پر ...
غلط ملط کر دیا ہے۔ اور مجموعی طور پر اُن پر تبصرہ کیا ہے۔ حالانکہ ...
کے ساتھ عرب بھی تبدیل ہوتے گئے۔

اس کے بعد اولیری کا بیان ملاحظہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ عرب میں ضعفِ تخیل کا خیال تو شاید اس لئے پیدا ہوا کہ عربی شاعری قصص اور تمثیل (ڈرامہ) شعر سے قطعاً خالی ہے۔ اور اس میں ہومر کے ایلیڈ اور فردوسی کے شاہنامہ کی طرح طویل رزمیہ نظمیں نہیں جن میں قومی مفاخر گائے گئے ہوں۔ اور نیز عربوں کے ہاں اُن کے دورِ جدید میں بھی روایات (ناول) وغیرہ کی قسم کا ادب جس میں تخیل کی فراوانی ہو نہیں ملتا۔

ادب کی اس خاص نوع میں اہلِ عرب کے عجز کا ہمیں اعتراف ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے خیال میں مظاہرِ تخیل کے حدود صرف ادب کی اسی نوع تک محدود نہیں اور تخیل کی تمام کائنات لے دے کے صرف اسی پر بس نہیں کرتی۔ فخر۔ حماسہ۔ غزل۔ وصف۔ تشبیہ اور مجاز وغیرہ تخیل ہی کے مظاہر ہیں۔ اور ان میں اہلِ عرب کی طبع آزمائیاں اس کثرت سے ہیں کہ جس سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس ضخیم ذخیرہ میں جدت و اختراع کی کمی ہے۔

اسی طرح عربی شاعری جو تغزل۔ محبوب کے آثار و منازل پر عاشق کی آہ وزاری گزرے ہوئے دنوں اور واقعات کی یاد۔ جذبات اور دلی کیفیات کے بیان اور شیفتگی اور سوز و گداز کی صورتوں پر مشتمل ہے۔ کسی طرح جامد جذبات کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

جاحظ بحیثیت شعوبیہ کے اس قول کو تو تسلیم کرتا ہے کہ عربوں کے ہاں نہ علم تھا اور نہ فلسفہ اور نہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ۔ لیکن اس کے عوض میں جاحظ کے نزدیک عربوں کو دو مایہ ناز خصوصیات میسر تھیں۔ ایک اُن کی طلاقت لسانی اور دوسری اُن کی حاضر دماغی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں کے یہ دو وصف نمایاں اور اظہر من الشمس ہیں۔ اُن کی زبان آوری اور بدیہہ گوئی کے ثبوت میں ادب و شعر میں اُن کے آثار پر ایک نظر کافی ہے۔

سطور بالا سے عربوں کے متعلق ہماری رائے آپ پر روشن ہو گئی ہوگی۔ یعنی یہ کہ عرب ایام جاہلیت اور اسلام میں اخلاقی و دماغی لحاظ سے ایک درجہ ترقی پر نہ تھے۔ ہم جاہلی عرب کے اوصاف مختصر طور پر عرض کرتے ہیں۔

عربی مزاج عصبی، سریع الغضب۔ معمولی سی بات پر مشتعل ہونے والا ہے۔ جب اس کی آتش غضب بھڑک اٹھے تو پھر حدود کی پابند نہیں رہتی اور خصوصاً اس وقت اس کا جوش غضب اشد ترین ہوتا ہے جب اس کی عزت و آبرو پر کوئی حملہ یا اس کے قبیلہ کی حرمت پر دست درازی ہو جہاں وہ مشتعل ہوا فوراً تلوار سونت لی۔ اور وہی اس کی حکم نتی ہے اسی کا نتیجہ تھا کہ خانہ جنگی نے ان کو خاک کے گھاٹ اتار دیا۔ اور جنگ اُن کے ہاں روزمرہ کی زندگی اور مانوس نظام ہو گیا۔

عصبی مزاج کا فطری نتیجہ ذکاوت ہے اور واقعہ ہے کہ عرب ذکی ہو اس کی ذکاوت زبان میں صاف طور پر عیاں ہو۔ بسا اوقات وہ صرف رمز و کنایہ اور بعید اشارہ پر ہی اعتماد کرتا ہو۔ اسی سے اس کی بدیہہ گوئی اور حاضر دماغی میں اس کی ذکاوت کا پتہ چلتا ہو۔ ناگہاں ایک سوال کے لئے فوراً موزوں جواب حاضر کرے گا۔ لیکن عربی ذکاوت مخترع و جدت تراش نہیں۔ وہ ایک مطلب کو متعدد صورتوں میں ادا کرے گا۔ اس کے اختراع معانی سے زیادہ اس کا ادائے معانی جاذب ہوتا ہے۔ مختصر لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ عرب کی زبان اس کے دماغ سے زیادہ چلتی ہے۔

عرب کا تخیل محدود اور غیر متنوع ہے۔ بہت کم اس کا تخیل اپنے سے بہتر احول یا موجودہ زندگی سے برتر زندگی کی خیالی تشکیل کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عرب کا تخیل واقفیت کی

ــــ سے بعض کم آگے پرواز کرتا ہے۔ چنانچہ بلند پروازی کے اسی فقدان کا نتیجہ ہے کہ وہ
شاعلی، کے تصور سے قاصر ہے۔ بات یہ ہے کہ نتیجہ ہے تخیل کی بلند پروازی کا۔ اسی وجہ
سے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اس نے کوئی خاص لفظ بھی وضع نہیں کیا اور جہاں تک ہمیں علم ہے
اس کے ادب میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں پایا جاتا شاذ و نادر ہی...
کی تلاش میں عالم جدید کی پرواز کرتا ہے۔ اور صرف ایک محدود...
جاتا ہے۔

طبائع کے اعتبار سے اس کا شوق حریت شاذ و نادر...
آزادی صرف اس کے اپنے نفس تک محدود ہے۔ اجتماعی حریت...
کی اطاعت کا وہ سرے سے قائل نہیں۔ ایام جاہلیت کیا اسلامی عہد میں بھی اس کی تاریخ آپس کی
خانہ جنگیوں کا ایک سلسلہ ہے۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کا عہد عربی تاریخ کا زرین زمانہ ہے۔ جس میں انہوں
نے عربوں کو بیرونی جنگوں میں لگا کر آپس کی خانہ جنگی سے مامون رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت
عمر رضی اللہ عنہ عربی فطرت کے بہترین نبض شناس تھے۔

عرب ساوات کا شیدا ہے۔ لیکن صرف قبیلہ کی حدود کے اندر مساوات کی شیفتگی کے ساتھ ساتھ
اپنے قبیلہ اور جنس پر بڑا ناز کرنے والا بھی ہے۔ اُسے اپنی برتری اور عالی نسبی پر دل و جان سے یقین ہے
اہل فارس و روم کے تہذیب و تمدن اور اپنی وحشت و بدویت۔ اُن کی آسودگی و ثروت اور اپنی
بے خانمانی اور فقر و فاقہ کے باوجود اُن کی عظمت و بزرگی کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ یہاں تک کہ جب
اُن کے ممالک کو فتح کیا تو وہاں کے باشندوں کو ہی حاکمانہ نظر سے دیکھا۔

(ترجمہ از عربی)

کیا اُردو شاعری محض نقالی ہے؟

(بسلسلۂ گزشتہ)

الفاظ کے بعد مضمون پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم اردو شاعری کے مضامین بھی محدود۔ رسمی اور تقلیدی ہیں۔ ان میں کچھ وسعت نہیں ہے۔ مضمون کی تلاش میں پرانے شعرا کی کشکولیں بار بار ٹٹولی جاتی ہیں اور مقررہ قواعد کے بموجب پھر انھیں باتوں کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ شاعرانہ مضامین کو محدود صرف اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ قدیم شعرا اپنی توجہ زیادہ تر داخلی شاعری پر صرف کرتے تھے۔ اور انھوں نے قدرتی مناظر و مرایا اور وصف نگاری سے بڑی حد تک بے اعتنائی کی ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کی حقیقت و ماہیت سے قدیم شعرا موجودہ معترضین کے بہ نسبت بہت زیادہ واقف تھے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول ہے کہ "شاعری حیات انسانی کی تفسیر ہے" آج تمام مغربی ممالک اسی خیال کی تائید کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم شعرا بھی اسی پر عامل تھے۔ شاعری میں نیچر بہ حیثیت نیچر کوئی اہمیت نہیں رکھتا دنیائے شاعری کا مرکز انسان ہے۔ نیچر کی کوئی چیز اسی حد تک شاعری کا موضوع بن سکتی ہے۔ جس حد تک اس کو روح انسانی سے تعلق ہے۔ نیچر کا سب سے بڑا پرستار ورڈس ورتھ تھا لیکن اس کا عقیدہ ہے کہ نیچر کی ہر شے میں ایک عالمگیر روح جاری و ساری ہے۔ اور اسی روح کے ذریعہ سے ساری کائنات ایک رشتۂ اتحاد میں مربوط ہے۔ اسی روح کو دریافت کرنا اور اس سے لوگوں کو روشناس کرانا شاعر کا کام ہے۔ جو لوگ ورڈس ورتھ کے عقیدہ کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا بھی خیال ہے کہ تمام اشیائے عالم میں ایک زندہ روح نہیں تو کم سے کم وحدت و ہم آہنگی ضرور پائی جاتی ہے۔ شیلی کے قول کے مطابق نیچر کے خوبصورت چہرہ کی نقاب کشائی شاعر کا فریضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہر بیں آنکھیں قدرتی اشیا کے صرف باہری اور نمایاں پہلو کو دیکھتی ہیں لیکن شاعر کی نظر ظاہری پردہ سے گزر کر اشیا کے درون و بطن تک پہنچتی ہے اور وہاں شاعر جو کچھ رموز و اسرار دیکھتا ہے انھیں اپنی نظم میں بیان کرتا

ہمارے شعرا کا یہی خیال ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ حسنِ ازل کا مظہر ہے۔ شاعر کو اشیاء کی ظاہری ہیئت و صورت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اسی حسنِ ازل کا پرستار ہے جس کے جلوے چشمِ حقیقت بیں کو ہر ذرہ میں نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی مصور اور شاعر میں یہی فرق ہے کہ اول الذکر کی نظر کسی شے کے ظاہری پہلو پر پڑتی ہے اور وہ اس کی عکسی تصویر اتار [illegible] لیکن شاعر کی نظر [illegible] سے گزر کر کسی شے کے بطن و ماہیت تک پہنچتی ہے اور وہ ا[illegible] پر روشنی ڈالتا ہے۔ بیانیہ شاعری میں کوئی واقعہ جس طرح وہ [illegible] نظر آتا ہے بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن ماہرینِ فن کے نزدیک [illegible] کے مرادف ہے۔ کسی منظوم واقعہ یا کسی منظر کی عکاسی پر شاعری کا اطلاق [illegible] رموز و اسرار اور حقائق و معارف کے حریم میں باریاب ہونا اور وہاں کی تجلیات سے اہلِ عالم کو آگاہ کرنا شاعری کا اعلیٰ منصب ہے۔ ہمارے قدیم شعرا کا یہی خیال تھا۔ ان کی علو ہمتی اور بلند نظری نے انہیں بیانیہ شاعری اور وصف نگاری کی طرف مائل ہونے نہیں دیا۔ بگولہ پر ایک بیانیہ شاعر جب نظم لکھنے بیٹھے گا تو اس کی مختلف ظاہر کیفیتوں کو تفصیل سے بیان کرے گا لیکن ایک حقیقت شناس شاعر اس کی حرکت و تراقص کو ایسے انداز سے بیان کر دے گا کہ عرصہ تک روح وجد کرتی رہے گی۔ چنانچہ حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہر چند بگولہ مضطر ہے اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے۔ اک رقص تو ہے بیتاب سہی برباد سہی

کیا کوئی بیانیہ شاعر اپنی سو سطروں کی نظم میں بھی وہ جوش وہ حرکت۔ وہ رقص۔ وہ اہتزاز وہ گرمی وہ تڑپ پیدا کر سکتا ہے جو اس ایک شعر میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے؟ ایک سطح آشنا شاعر سمندر کے کنارے جاتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ ساحل بہت دیر تک مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن سمندر کا تلاطم اور موجوں کی لگاتار ٹکر آخر دیوارِ ساحل کو توڑ دیتی ہے۔ اس شاعر کی نگاہیں جو کچھ دیکھتی ہیں وہ اسے تفصیل کے ساتھ نظم کر دیتا ہے۔ لیکن ایک حقیقی شاعر سمندر کے

[illegible] کی انسانی زندگی سے سب تعلق نہیں پاتا یہاں بھی اسے دنیائے حسن و عشق کے جلوے نظر آتے ہیں چنانچہ مرزا غالب فرماتے ہیں۔

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل

جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ پارسائی کا

بہرحال اگر کوئی شاعر کسی قدرتی منظر کی ہو بہو تصویر کھینچ دے اور یہ تصویر اسے مست و بیخود بھی بنادے تو ورڈس ورتھ کے نزدیک ایک شاعر کی حیثیت ایک بچہ سے بڑھ کر نہیں ہے جو کسی بسنتی پھول سے بیحد خوش ہو کر اچھلتا ہے کودتا ہے۔ اور ناچتا ہے۔ بچہ صرف پھول کی خوشنمائی پر جان دیتا ہے لیکن اس کے رموز و اسرار سے واقف نہیں۔ ہمارے باکمال شعرا بھی واقعہ گوئی۔ منظر نگاری اور وصف بیانی وغیرہ کو طفلانہ حرکت سمجھ کر ادھر کم رُخ کرتے تھے اور حیات انسانی کی تفسیر و تعبیر کو شاعری کا اعلیٰ مقصد خیال کرتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ انگریزی کی درسی کتابوں میں کتے۔ بلی۔ فاختہ۔ شاہ بلوط وغیرہ پر چھوٹی چھوٹی نظمیں دیکھ کر" دانایانِ فرنگ " سے مرعوب ذہنیتوں نے انھیں انگریزی شاعری کا اعلیٰ نمونہ سمجھ لیا۔ دراصل ان میں کوئی شاعرانہ خوبیاں ہوں یا نہوں لیکن وہ حاکم زبان کی شاعری سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور حاکم کی شاعری محکوم کی شاعری سے یقیناً بالا و برتر ہوگی۔ اس غلامانہ ذہنیت کے تحت یورپ زدوں کی ایک ٹولی نے اپنے اسلاف کے روشن کارناموں پر دُھول جھونکنا شروع کیا۔ انھیں پرانے لکیر کے فقیر قرار دے کر اس نئی ٹولی نے اپنے سمندِ سخن کی جولانی کے لئے ایک نیا میدان ڈھونڈ لیا۔ اس میدان کی ہر چھوٹی بڑی چیز پر چند موزوں و مقفیٰ سطریں لکھ دینے سے ایک نظم تیار ہو جاتی تھی۔ پھر کیا تھا یار لوگوں نے پہنچی پر۔ اسلم کی بلی پر۔ گھوڑے پر۔ کتے پر۔ ریل گاڑی پر۔ گائے پر۔ اونٹ پر۔ قادر ولیم پر۔ چھوٹی چیونٹی پر۔ بڑے ہاتھی پر۔ گدھے پر۔ شیر پر۔ ملکہ وکٹوریہ پر۔ خرگوش پر۔ بھیڑیئے پر۔ روباہ بیدم پر۔ کوے پر۔ مور پر۔ پیپل پر۔ برگد پر۔ شیخ جی کے حقہ پر یہاں تک کہ اندھرا دیس کی سندری پر نظمیں لکھی گئیں۔ اسے جدید شاعری کا لقب ملا۔ جب اینٹ۔ پتھر۔ جہاز۔ بندر۔ خاک۔ دھول سب کچھ موضوعِ شاعری بننے کے لئے تیار ہو تو اس نئی سرزمین کی لانہایت وسعتوں کے کیا کہنے۔ پرانے شاعروں کی نسبت

[illegible] نے اپنی بلند پروازیوں سے متاعِ سخن کو فرش سے اٹھا کر عرش پر رکھ دیا۔ لیکن جب شاعری [illegible] بے ہنگام سر میں گانا شروع کیا کہ سروشِ سخن نے کان میں روئی ڈال لی اور اس جنس کا سدا کو ایسا ٹھکرایا کہ وہ آسمان سے زمین پر نہیں گری بلکہ تحت الثریٰ تک پہنچ گئی۔

بہر حال یہ سب کچھ خارجی شاعری سے تعلق ہے جب ہم داخلی شاعری پر نظر کرتے ہیں جس کو عالمِ خارجی سے نہیں بلکہ قلبی دنیا سے تعلق ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ایک صنفِ غزل کی بے پایاں وسعت پہنائے دو عالم سے ہمدوش ہے۔ غزل کے اشعار میں حیاتِ انسانی کی پوری تفسیر موجود ہے۔ غزل اپنے لغوی معنی کے لحاظ سے صرف حسن و عشق کو معا[illegible]
لیکن ہمارے باکمال شعرا نے اس کو محض عشقیہ مضامین تک [illegible]
حکیمانہ۔ اخلاقی۔ صوفیانہ۔ عارفانہ اور نعتیہ کلام کا حامل بنا کر [illegible]
شاعری پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ صرف عشق و محبت کی گرویدہ ہے [illegible]
ہے کہ دوسرے مضامین کی وہاں کھپت ہی نہیں۔ نہ معلوم عشقیہ مضامین کی اہمیت کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جب سے انسان کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر آیا اس وقت سے آج تک دنیا میں عشق و محبت کی گرم بازاری رہی ہے۔ اور جب تک روئے زمین پر ایک متنفس بھی باقی رہیگا محبت کی گرمیِ محفل کبھی کم نہ ہوگی۔ رسم و رواج۔ معیارِ اخلاق خیالات و افکار۔ سیاسی و معاشری تحریکات یہاں تک کہ مذہبی ایقان و اعتقاد بھی تبدیل ہو سکتا ہے لیکن جذبۂ عشق کو بقائے دوام حاصل ہے۔ جس شاعری کی بنیاد عشق و محبت پر ہو وہ ہر زمانہ میں قلوبِ انسانی کو گرماتی رہے گی۔ دوسری تحریکات سے تعلق رکھنے والی شاعری اسی وقت تک لطف بخش ہوتی ہے جب تک وہ تحریکیں زندہ ہیں۔ ان کے مردہ ہونے پر ان سے متعلقہ شاعری کا بازار بھی سرد پڑ جاتا ہے۔ علاوہ بریں عشق و محبت کی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ ہر قدم پر ایک نیا عالم اور بیشمار جلوے نظر آتے ہیں۔ حسن کے ناز و انداز اور عشق کے راز و نیاز لامتناہی ہیں۔ اگر غزل میں صرف حسن و عشق ہی کے معاملات کی ترجمانی ہوتی رہے تو وہ کبھی ختم ہونے والے نہیں۔ پھر عشقیہ مضامین پر تنگی و محدودیت کا الزام تنگ نظری کی دلیل ہے۔ غزل کے دوسرے

[illegible] سیات۔ اخلاقی، عارفانہ اور نعتیہ مضامین بحث میں شامل کرنے جائیں تو ان کا [illegible] ہو جاتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کا بھی کوئی ایسا معاملہ نہیں جس پر غزل گو شعرا نے نظر نہ ڈالی ہو۔ چونکہ ان کی زبان عاشقانہ ہوتی ہے اس لئے روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے اشعار کو بھی عام لوگ عشقیہ کلام سمجھ لیتے ہیں، لیکن تمثیل و کنایہ کی گفتگو سمجھنے والوں کو ہر شعر میں معاملاتِ حیات کی تشریح ملتی ہے۔ غزل میں انسانی زندگی کی پوری تفسیر موجود ہے۔ اس کا بین ثبوت اس امر سے ظاہر ہے کہ ہم اپنی تحریروں، تقریروں میں۔ مضمون نویسی میں، خط و کتابت میں، گفتگو میں اکثر غزل کے اشعار نقل کرتے ہیں جن کی چول ایسی ٹھیک بیٹھتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع کے لئے وہ کہے گئے تھے۔ مثلاً ایک شعر ہے کہ

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند　　　دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

بظاہر یہ ایک عاشقانہ شعر ہے جو معشوق بام پر ہے۔ عاشق رات کو چوری چھپے کمند ڈال کر چڑھتا ہے۔ جب وہ چار ہاتھ لب بام باقی رہ جاتا ہے تو بدقسمتی سے کمند ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن یہ شعر زندگی کے ہر شعبے میں استعمال ہو سکتا ہے۔ کسی دینی یا دنیوی مقصد کے لئے جب انسان کوشش کرتا ہے۔ اور تمام مراحل کامیابی کے ساتھ طے کر لیتا ہے لیکن اگر آخری منزل میں ایسی ناکامی ہو کہ تمام کوششیں رائگاں ہو جائیں تو اس وقت اس پر یہ شعر صادق آئے گا۔ زیادہ مثالوں کی یہاں نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ غزل کے اشعار کثیر المعنی ہوتے ہیں۔ ہر شخص ان کی اس خصوصیت سے واقف ہے اور اپنی زندگی کے مختلف موقعوں پر مختلف اشعار استعمال کرتا ہے۔ فارسی اور اردو غزل کے اشعار کی سی لچک اور ہمہ گیری دنیا کی کسی زبان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی جس شاعری کے مضامین زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں پر حاوی ہوں۔ جو حیاتِ انسانی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے کی ترجمانی کرتے ہوں اس کو تنگ اور محدود کہنا ڈھٹائی نہیں تو اور کیا ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں اسی طرح اردو شاعری اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ [illegible] کہ ہمارے قدیم شعرا کا خیال تھا کہ

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں　　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

[illegible] اور ہر جملہ کی تشریح تشبیہ و کنایہ میں کرتے تھے تاکہ کلام کی لطافت و رنگینی قائم
رہے۔ لیکن [illegible] تشبیہ و کنایہ کی گفتگو سمجھنے سے عاری ہیں ان کو ہر شعر گل و بلبل کی داستان ہی معلوم ہوتا
ہے۔ [illegible] طرز بیان سے دھوکا کھا کر وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مضامین شاعری میں وسعت اور تنوع نہیں ہے۔
یہ کہنا بھی سراسر غلط ہے کہ تمام شعرا آنکھ بند کر کے ایک ہی ڈگر پر چلتے تھے۔ ایک ہی مضمون کو بار بار
دہراتے تھے۔ سب کا رنگ ایک ہی ہے۔ کہیں جدت اور تنوع کا نام نہیں۔ جس طرح ہر قوم کے خصائص
و شعائر جداگانہ ہوتے ہیں اسی طرح ہر زمانے کی سیاسی و معاشرتی خصوصیت [illegible]
کی بنا پر ہم ایک قوم یا ایک زمانے کے لٹریچر کو دوسری قوم یا د[illegible]
کیونکہ لٹریچر قومی شعائر و معاشری خصائص کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر [illegible]
سا حال ہے تو عربی لٹریچر عرب قوم کی ذہنی و روحانی کیفیتوں کا آئینہ د[illegible]
کی تہذیب و معاشرت کی تصویریں نظر آتی ہیں تو وکٹوریائی لٹریچر عہد وکٹوریہ کے نتائج افکار کا سرمایہ دار
ہے۔ جب ہم "یونانی لٹریچر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ تمام یونانی مصنفین ایک
نہج پر سوچتے تھے۔ ایک ہی مضمون پر لکھتے تھے۔ ایک ہی طرز تحریر کی پیروی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے
کہ شعرائے اساطین کے کلام کیا بہ لحاظ مضمون اور کیا بہ لحاظ اسلوب بیان ایک دوسرے سے متبائن
تھے۔ لیکن انفرادی اختلافات دور کرنے پر بھی ان میں بہت سے مشترکہ اوصاف پائے جاتے تھے
جو یونانی قوم سے مختص تھے اور جو ان کے کلام کو دوسری قوموں کی شاعری سے ممتاز کرتے تھے۔
یہی حال ایک ہی قوم کے مختلف عہود و ادوار کے لٹریچر کا ہے۔ ایک عہد کا لٹریچر باوجود مصنفین کے
انفرادی فروق کے چند مشترکہ امتیازی خصوصیات کے لحاظ سے دوسرے عہد کے لٹریچر سے جداگانہ
ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اجنبی ملک میں جائے تو وہاں کے تمام باشندے اس کو ایک ہی وضع قطع کے
معلوم ہوں گے۔ ان کو وہ دوسری قوموں سے بہ آسانی تمیز کرے گا لیکن وہاں کی مختلف جماعتوں۔
مختلف گروہوں یا مختلف افراد کے عادات و خصائل میں امتیاز کرنے کے لئے اسے وہاں کچھ مدت
تک قیام کر کے غور کے ساتھ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اسی طرح کسی قوم یا کسی

[illegible] خصوصیات بآسانی معلوم ہو سکتی ہیں لیکن مختلف شعرا کے کلام کو ایک دوسرے سے ممیز کرنے کے لیے استیعاب مطالعے کی ضرورت ہے۔ اس تمہید کے پیش نظر اگر ہم قدیم اردو شاعری پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ ہمارے شعرا اپنے زمانے کے معاشرہ کے خیالات و جذبات۔ ذہنی رجحانات، معانی بلند پروازیوں اور عام تہذیب و تمدن کے ترجمان تھے۔ کوتہ اندیش معترضین جب اردو کے کلام کو دیگر زبانوں کی نظموں کے مقابل میں رکھتے ہیں تو ان کو قدیم شاعری کا سارا سرمایہ یکساں معلوم ہوتا ہے اور انفرادی اختلافات کا پتہ نہیں چلتا لیکن جو اہل نظر ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ میر کی شاعری میں 'آہ' ہے تو مرزا سودا 'واہ' کے دلدادہ ہیں۔ حاتم کو ایہام گوئی میں مزہ ملتا ہے تو آبرو کو رعایت لفظی مرغوب ہے۔ درد کا کلام نکات تصوف سے لبریز ہے تو انشا کو بذلہ گوئی میں لطف آتا ہے۔ جرأت معاملہ بندی میں مہارت رکھتے ہیں تو ذوق محاورہ بندی کے بادشاہ ہیں۔ غالب فلسفہ کے شیدائی ہیں تو مومن رنگ تغزل کے دلدادہ ہیں۔ ظفر کا کلام صفائی زبان کے لیے مشہور ہے تو آتش کا سوز و گداز اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ امیر کی طبیعت میں اگر متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے تو داغ کا کلام شوخی اور تیکھاپن میں بے نظیر ہے۔ میر حسن زبان کی سادگی و روانی پر جان دیتے ہیں تو نسیم صناعی و مرصع کاری پر مرتے ہیں۔ اگر دبستان دہلی کو جذبات نگاری پر ناز تھا تو دبستان لکھنؤ کو تخیلی چوٹی کا مضمون زیادہ مرغوب تھا۔ الغرض کیا بہ لحاظ مضمون اور کیا بہ لحاظ اسلوب بیان شعرا کی انفرادی خصوصیتیں جداگانہ تھیں تاہم تہذیب و تمدن کی یکسانی اور اجتماعی پسند و مذاق کی ہم رنگی کی وجہ سے ان میں بہت سے مشترکہ و متحدہ اوصاف بھی پیدا ہو گئے تھے جن کی بنا پر ان کی شاعری نے ایک قائم ہیئت و شکل اختیار کر لی تھی۔ قدیم شاعری کو بہ حیثیت مجموعی ایک چمنستان قرار دیا جا سکتا ہے جس میں رنگ برنگ کے پھول اپنی بہار دکھا رہے ہوں۔ اگر کسی کو یہ تمام گلہائے بوقلموں ایک ہی رنگ کے نظر آئیں تو یہ اس کے نقص بصری کا قصور۔ قدیم تذکروں اور تنقیدوں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ جوہریان سخن کے نزدیک مضمون کی طرفگی اور تازگی اور طرز ادا کی جدت و ندرت کی بڑی قدر تھی۔ شعرا نہ صرف نئی نئی بندشوں اور ترکیبوں کی تلاش میں رہتے تھے بلکہ اچھوتے مضمون پیدا کرنے کی بھی انھیں

[illegible] تھی۔ اس وقت کی سب سے بڑی علمی مجلسیں مشاعرے تھے جہاں شاعروں کو مضمون
آفرینیوں کی دل کھول کر داد ملتی تھی۔ البتہ ان کے نئے اور اچھوتے مضامین بھی ہیئت اجتماعیہ کے مذاق
و پسند کے مطابق ہوتے تھے اور شاعری کا اقتضا بھی یہی ہے۔ ورنہ اگر کوئی شاعر بالکل اجنبی و نامانوس
مضمون باندھے تو نہ کسی کو اس سے لطف حاصل ہوگا اور نہ کہیں سے اس کی داد ملے گی معترضین
کی مادہ پرستی نے صرف قدرتی مناظر و مرایا یا عالم خارجی کی اشیائے مادی کو نیا مضمون سمجھ لیا ہے۔
اور ان کی حقیقت نا آشنا نگاہ میں عالم باطنی کے لاتعداد نقاب [illegible]
ہمارے قدیم شعرا کا خاص موضوع سخن تھیں سب ایک ہی [illegible]
چونکہ فارسی اور اردو شاعری کے مضامین ایک [illegible]
ثانی الذکر کو اول الذکر کی نقالی کا نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن [illegible]
تہذیب و تمدن کی یکسانی کا نتیجہ ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری کی جو معاصر [illegible]
اردو شاعری نے بھی نشو و نما پائی اس لئے ایک ہی فضا و ماحول کا دونوں قسم کی شاعریوں پر یکساں اثر پڑنا
لازمی امر تھا۔ کسی عہد کا لٹریچر مختلف شعرا کے کلام اور متفرق ادیبوں کی تصنیفات کا بے ربط مجموعہ نہیں
ہوتا۔ ورنہ اس کی حیثیت ایک عجائب خانہ کی سی ہوگی جس میں مختلف نباتی و معدنی پیداواریں یا مردہ
حیوانات کے کالبد یا صنعت و حرفت کے نمونے قرینہ کے ساتھ الماریوں میں یا میزوں پر سجائے گئے ہوں
بلکہ ادب و شاعری ایک زندہ نامیات ہے جس کے اعضا و جوارح ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے
ہیں۔ قدیم اردو شاعری بھی ایک چھتنار درخت تھی۔ مختلف شعرا کے کلام بمنزلہ اس کی شاخ کے تھے۔
جو مادری تنہ سے مربوط تھے اور اسی سے اپنی غذا حاصل کرتے تھے۔ زندگی کا عالمگیر قانون سب پر حاوی
تھا۔ جدت اور آزادی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی شاخ اپنے مادری تنہ سے علحدہ ہو جائے۔ ایسی
آزادی خودکشی کے مرادف ہوگی۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی۔ ان
کے حربی استیلا، سیاسی برتری اور حاکمانہ اقتدار نے ایک خاص تہذیب و تمدن کی بنا ڈالی تھی جو انگریزی
کے بعد تک قائم رہا۔ اسی تہذیب و تمدن نے اہل ہند کو فارسی ادب و شاعری کا گرویدہ بنا یا تھا ہم

چونکہ [illegible] معاشرتی فضا میں فارسی کو عام مقبولیت حاصل ہوئی تھی اسی فضا میں اردو شاعری نے [illegible] اور نشوونما پائی۔ لوگوں کے خیالات و جذبات، تصورات و تخیلات، مقاصد و عزائم، [illegible] رسم و رواج، طرز بود و ماند، آداب و مراسم، روایات و معتقدات اور توہمات و مزعومات شروع سے اخیر تک ایک ہی نہج پر قائم رہے۔ اگر ان میں تبدیلی واقع ہوئی تو اس وقت جبکہ انگریزی تسلط نے مغربی و مشرقی تہذیب کو باہمی تصادم کا موقع دیا۔ شاعری میں انہیں معاشرتی حالات و کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ چونکہ معاشرتی حالات و کیفیات اور لوگوں کے خیالات و افکار اور پسند و مذاق ایک ہی تھے اور اردو و فارسی شاعری ان کے اظہار کے صرف دو ذریعے تھے اس لئے دونوں کے مضامین کا یکساں ہونا ایک لازمی امر تھا۔ نقالی تو ہمیشہ اجنبی چیز کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہندی شاعر کسی چینی شاعر کی تقلید کرے اور اپنی شاعری میں چینی خیالات و جذبات کی تصویر کھینچے تو اس کے ہموطنوں کو ایسی شاعری سے بوجہ اجنبیت و بیگانگی کوئی لطف حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اردو شعرا جن مضامین پر طبع آزمائی کرتے تھے وہ یہاں کے لوگوں کے پسند و مذاق کے مطابق بلکہ انہیں کے خیالات و جذبات کا آئینہ ہوتے تھے اس لئے وہ صد درجہ محظوظ ہوتے تھے اور شعرا کو باج تحسین ادا کرتے تھے۔ الغرض اردو شاعری پر کسی صورت سے نقالی کا الزام عاید نہیں ہو سکتا۔

مضمون سے قطع نظر اسلوب بیان بھی رسمیت، محدودیت اور نقالی کا الزام عائد کرنے کا دستور ہو گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ قدیم اردو شاعری میں روایتی و رسمی تشبیہات و استعارات کی جو عربی و فارسی کی خوشہ چینی سے حاصل ہوئے ہیں سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے اور طرح طرح کی صناعیاں استعمال کی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اردو شاعری کا دامن بیجا و بیکار تصنعات و تکلفات سے گرانبار ہو گیا۔ ان تمام باتوں سے حقیقی جذبات و خیالات کے اظہار میں رکاوٹ پیش ہوتی ہے۔ اگر شاعری کی زبان سادہ، فطری اور رسمی تکلفات و تصنعات سے پاک ہو ہر قسم کے خیال و جذبہ کی ترجمانی میں سہولت واقع ہوگی۔ یہ اعتراض بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی عیسوی میں انگریزی نقاد کلاسیت کی مخالفت میں جن خیالات کا اظہار کر رہے تھے انہیں کی یہ صدائے بازگشت ہے۔ یوں تو انگلستان میں ولیم بلیک ہی کے وقت سے کلاسیت (Classicism) کی مخالفت شروع ہو گئی تھی لیکن [illegible] میں

ورڈزورتھ نے اپنا مشہور و معروف دیباچہ شائع کیا جس میں اس نے قدیم "پوئٹک ڈکشن" (شاعرانہ زبان و اسلوب بیان) کے خلاف علی الاعلان علم بغاوت بلند کیا۔ اور نہایت سادہ اور معمولی بول چال کی زبان میں شاعری شروع کی۔ مضمون کے لحاظ سے بھی اس نے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی سیدھی سادی زندگی کے حالات و واقعات انتخاب کئے لیکن آگے چل کر وہ خود ہی اس کی خلاف ورزی کرنے لگا۔ چنانچہ ورڈزورتھ کے بلند پایہ سانٹ (Sonnets) ہر قسم کی صنائیوں اور صنائع کاریوں سے لبریز

ہیں۔ بڑے بڑے نقاد مثلاً میتھیو آرنلڈ۔ والٹر پیٹر۔ لفکا ڈیو ہرن

ورتھ کا وہی کلام پرجوش موثر اور زندہ رہنے کے قابل ہے جس

بلاغت کے اصول کی پابندی کی ہے ورنہ اس کے کثیر التعداد

بول چال کی زبان اختیار کی ہے بالکل مبتذل۔ بے کیف سے بے لطف اور

طبقہ کے شاعروں کو جو ادب العالیہ کی کمان زہ کرنے سے قاصر تھے ایک اچھا موقع ہاتھ آیا۔ چونکہ فصاحت و بلاغت کے اصول کی پیروی زحمت طلب تھی اس لئے انھوں نے ورڈزورتھ کی بتائی ہوئی آسان ڈگر پر آنکھ بند کر کے چلنا شروع کیا۔ مقررہ اصول و ضوابط کی خلاف ورزی کا نام جدت رکھا گیا بہت سے اہل نظر بھی اس آسان نئی راہ پر صرف اس وجہ سے گامزن ہو گئے کہ کہیں جدت پسند طبقہ ان پر دقیانوسیت کا الزام نہ عائد کر دے۔ رفتہ رفتہ ساری ادبی لطافت خاک میں مل گئی۔ بالآخر ماہرین فن نے محسوس کیا کہ قدیم روش کی خلاف ورزی اور بے آئینی نے ادبی دنیا میں تزلزل اور انتشار پیدا کر دیا ہے شاعری کا بازار جنس کاسد سے بھرا جاتا ہے۔ سر والٹر ریلے کا بیان ہے کہ کلاسیت کے مخالفین کا سارا کارنامہ محض تخریبی ہے۔ مسٹر الفرڈ نائیس کا خیال ہے کہ شاعری آگے بڑھنے کے بجائے الٹے پاؤں دور توحش کی طرف رجعت کر رہی ہے۔ وہ اپنے مقالہ "موجودہ ادبیات کی چند خصوصیات" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "حامیان جدید شاعری کسی باکمال اور عظیم المرتبت شاعر کے کلام کی تعریف کرنے کے وقت بھی اس سے تصنع و تکلف کا انتساب ضرور کرتے ہیں اور اس طرح مدح میں ذم کا پہلو پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنے سے زیادہ زبردست اور وسیع الخیال شاعروں کے کلام میں جب انھیں کوئی دوسرا عیب نظر نہیں آتا

تو تصنع کا ہر جا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ یہی صناعی ہر زمانے میں بلند پایہ شاعری کا جزو لاینفک رہا کی ہے۔ یونان کے عظیم المرتبت شعرا بشمول ہومر صناعی کے دلدادہ تھے وہ شاعری کے نحوی اسقام کو جتنا اہم سمجھتے تھے اتنا ہی فصاحت و بلاغت کے اصول کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ رومی ادبیات بھی اپنی فصاحت و فن کاری ہی کی وجہ سے آجتک زندہ ہے۔ ملٹن کی کتاب "فردوس گم شدہ" میں بھی اعلیٰ درجہ کی صناعیاں موجود ہیں۔ شکسپیر کے کلام میں بھی تصنعات و تکلفات کی کمی نہیں۔ "ہنری پنجم" اور "جولیس سیزر" کے ڈراموں میں کہیں کہیں اس قدر صناعی و مرصع کاری صرف کی گئی ہے کہ حامیان جدید شاعری اسے دیکھ کر ہرن کے بچے کی طرح چونک پڑتے ہیں اور ان کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ شکسپیر اور خود ورڈس ورتھ کے بہترین سانٹ نہایت مرصع و مسجع ہیں۔ شیلی کے کلام میں تو روح شاعری اور صناعی ناقابل انفکاک ہیں۔ اس کی نظم "مغربی ہوا" میں صنائع و بدائع کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان پر کوئی شدید جذبہ طاری ہوتا ہے اور اس کے دل میں جوش اور گرمی پیدا ہوتی ہے تو اس کی زبان سے فصاحت و بلاغت کا دریا بہنے لگتا ہے۔ مگر طوطوں کو حقیقت و واقعیت سے کیا غرض۔ ان کو صرف ایک لفظ "تصنع" کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ اسی سے وہ جارحانہ اور مدافعانہ اوزار کا کام لیتے ہیں۔ اسی سے وہ اپنی کمزوریوں کو چھپاتے ہیں اسی سے وہ اپنے سے زیادہ قابل شاعروں پر حملہ کرتے ہیں۔ اسی سے وہ سادہ لوح پبلک کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ لوگ زبان کی تیز دھار کو کند بنا دیتے ہیں۔ کلام کی ساری لطافت و رنگینی کا خون کرتے ہیں قدیم شعرا کی معنی آفرینیوں اور نازک خیالیوں کا مضحکہ اڑاتے ہیں قدما کی جنس بیش ارز پر تصنع و تکلف کا عیب لگاتے ہیں۔ اپنی جنس کم ارز کو سادگی و آزادی کا نمونہ قرار دے کر اس کی قیمت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کو اپنی موروثی دولت کی کوئی قدر نہیں۔ وہ اپنے نامور اسلاف کی توہین کرتے ہیں۔"

ہندوستان کی حالت اس سے بھی خراب ہے۔ جب یہاں کی ایک چھوٹی سی جماعت اول اول انگریزی لٹریچر سے تھوڑی بہت آگاہ ہوئی تو اس وقت کے انگریز نقادوں کی طرح وہ بھی اپنے آبا و اجداد کی پر عظمت شاعری پر ریمیت۔ قدامت اور نقالی کا الزام عائد کرنے لگی جب ادنیٰ درجے کے

شاعر قدیم اساتذہ سخن کی طلسم کاریوں۔ نازک خیالیوں۔ مضمون آفرینیوں اور رنگین بیانیوں کے مقابلہ
کی تاب نہ لا سکے تو ان پر تصنع و تکلف کا الزام عاید کرنے لگے اور مقررہ اصول و ضوابط کی پیروی کو اظہار
خیال کی راہ کا روڑا سمجھنے لگے۔ حالانکہ اظہار خیال میں رکاوٹ کا عذر بذات خود ان کے شاعرانہ ضعف
و عجز کی دلیل ہے۔ ورنہ باوجود تمام نحوی و عروضی قید و بند کے قدما کے ضیغم اندیشہ کو بیشہ سخن کے کسی حصہ
میں صید معانی کے شکار سے کوئی امر مانع نہ تھا۔ بہرکیف حامیان جدید شاعری کے عجز حوصلہ اور بے بضاعتی
نے جس قسم کی سادگی زبان اختیار کی اس نے ان کے کلام کو بالکل روکھا پھیکا۔ بے مزہ و بے نمک
بنا دیا۔ اور اس پر "دندان تو ہمہ در دہان اند، چشمان تو زیر ابروان اند" کی مثال صادق آنے لگی
چنانچہ تصنعات و تکلفات سے پاک اور بالکل سادہ زبان میں جدید شاعری کا [illegible] ملاحظہ
ہو۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو	اٹھو اہل وطن
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ	ورنہ کھاؤ پیو [illegible]
جبکہ تم زندگی کا لطف اٹھاؤ	دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار	زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
نوکروں کی تمہارے ہے جو غذا	ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی	جن پہ بپتا ہے کیسی آن پڑی

جدید شاعری کے ایک اور زبردست نقیب فرماتے ہیں۔

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال	دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں	ساری آفات سے بری تھی میں
تھا ہرا کھیت میرا گہوارہ	وہ وطن تھا مجھے بہت پیارا
پانی پی پی کے تھی میں لہراتی	دھوپ لیتی کبھی ہوا کھاتی
مینہ برستا تھا جھونکے آتے تھے	گودیوں میں مجھے کھلاتے تھے

یہی سورج زمین تھے ماں باوا | مجھ سے کرتے تھے نیک برتاوا
جب کیا مجھ کو پال پوس بڑا | آہ ظالم کسان آن پڑا
گئی تقدیر یک بیک جو پلٹ | کھیت کا کھیت کر دیا تلپٹ

اگر سادہ۔ فطری۔ آزاد اور تصنعات سے پاک شاعری اسی کا نام ہے تو وائے برحال شاعری۔ اس سے تو نثر ہی ہزار درجہ بہتر ہے۔"[1] بالآخر جدید شاعری کے باکمال و بلاغت شناس شعرا نے محسوس کیا کہ اپنی زبان کی ساخت۔ بساط و امتیازی خصوصیات کو نظر انداز کر کے محض انگریزی شاعروں کی کورانہ تقلید میں اپنے کلام کو تمام زیب و زینت کے سامان سے محروم کر دینا اور عروس سخن کو عریاں بنا دینا شاعری کی ترقی نہیں ہے بلکہ اس کو حضیض و پستی میں ڈھکیلنا ہے۔ اس لئے انھوں نے نئی شراب کو بھی قدیم ابریق و مینا میں ڈھالا۔ اور جدید شاہد سخن کو اسی لطیف و رنگین لباس میں جلوہ گر کیا جس سے قدیم شعرا اپنی عروس سخن کو زینت بخشتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال مغربی و مشرقی دونوں خمکدوں کے بادہ نوش ہیں۔ ان سے بڑھ کر مغربی شاعری کا رمز شناس کون ہوگا؛ لیکن انھوں نے انگریزی اسلوب بیان کی تقلید نہیں کی بلکہ اپنے کلام میں گرمی۔ جوش۔ تڑپ۔ اثر۔ زور اور رنگ پیدا کرنے کے لئے قدما ہی کی لطافت۔ نزاکت۔ باریک خیالی اور رنگین بیانی اختیار کی۔ وہ فلسفیانہ شاعری کے دلدادہ ہیں۔ قومی ترانے بھی گاتے ہیں۔ وصف نگاری بھی کرتے ہیں۔ درس بھی دیتے ہیں۔ سیاسی مسائل پر بھی رائے زنی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے عروج و زوال کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں لیکن ہر جگہ وہی عشق مجازی کی اصطلاحیں۔ وہی صناعیاں۔ وہی رنگین بیانیاں۔ وہی فسوں کاریاں۔ وہی لطیف تشبیہیں وہی پاکیزہ استعارے۔ وہی تلمیحیں۔ وہی راگ۔ وہی مرکبات استعمال کرتے ہیں جو قدیم شاعری کا طرہ امتیاز ہیں۔ مثال کے طور پر حسب ذیل قطعہ ملاحظہ ہو۔ وہ

---

(۱) یہاں مضمون نگار صاحب نے اپنے ذاتی مذاق کو معیار کلی قرار دے کر ایک جنبش قلم میں سب بے تکلف اور بے تصنع شاعری کو مردود قرار دے دیا ہے۔ سچ ہے جسے شراب کا چسکا لگ جائے وہ آب زلال کا لطف نہیں اٹھا سکتا ہے۔

مسلمانوں کو مغربی تہذیب کے زہریلے اثرات سے بچنے اور حیات بخش شعائر اسلامی اختیار کرنے کی ہدایت دیتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط — اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق — سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آ [illegible]
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر — قطرۂ شبنم [illegible]
رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو [illegible]
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو [illegible]
بادۂ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز — جگر شیشہ و پیمانہ و مینا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ — چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں — خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

ہرچہ در دل گذرد وقف زبان دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع

ڈاکٹر اقبال کی طرح مولانا سلیم مرحوم بھی جدید شاعری کے ایک زبردست علم بردار تھے۔ انکا کلام بھی محض عشقیہ مضامین تک محدود نہیں ہے بلکہ اخلاق۔ تصوف۔ حب انسانی۔ درس عمل۔ فطرت نگاری رجائیت وتفاؤل اور فلسفہ جدید وغیرہ پر مشتمل ہے لیکن کسی قسم کے خیالات کی ترجمانی میں ان کو نحوی و عروضی اصول کی پابندی اور علم معنی و بیان کی پیروی کوئی رکاوٹ پیش نہیں کرتی۔ انھوں نے بھی اپنے کلام میں زور و اثر پیدا کرنے کے لئے قدا ہی کی رنگین بیانی اختیار کی ہے۔ نمونۃً چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

سورج کی زد میں گرچہ فنا کا یقین ہے — شبنم کو پھر بھی سینہ سپر دیکھتا ہوں

دیکھوں میں تیرا جلوہ بے رنگ کس طرح | نیرنگیوں کا دل پہ اثر دیکھتا ہوں میں
کن کن بتوں کو سجدہ کیا تیرے سامنے | پیشانی اپنی شرم سے تر دیکھتا ہوں میں
دل سے کس آفتاب کے اٹھنے کا وقت ہو | رگ رگ میں اپنے نور سحر دیکھتا ہوں میں
بخشی ہیں میرے ذرہ کو تو نے وہ رفعتیں | سجدہ میں آفتاب کا سر دیکھتا ہوں میں
دولت کدے کی بستیوں سے ہو بستی تری بعید | اجڑے دلوں میں تیرا گزر دیکھتا ہوں میں

حقیقت الامر یہ ہے کہ قدما اپنے ذوق جمالیات وسلامت طبع کی رہبری میں حسن کے ناز و انداز اور عشق کے راز و نیاز کے اظہار کے لئے نہ صرف رنگین و جادو اثر الفاظ ہی کے بلکہ لطیف تشبیہوں اور پاکیزہ استعاروں کے بھی وافر ذخیرے تیار کر گئے ہیں جو اب اُردو ادبیات کے جزو بدن بن گئے ہیں۔ ان کو جدا کرنا گویا زبان کی ہیئت وصورت کو بگاڑنا ہے۔ مانا کہ یہ تمام ذخیرے عربی و فارسی کے ادب العالیہ سے ماخوذ ہیں لیکن یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے کیونکہ اخلاف کو اپنے برگزیدہ اسلاف کے روشن کارناموں سے استفادہ کا جائز حق حاصل ہے۔ موجودہ یورپ کا سارا علمی و ادبی خزانہ بھی زیادہ تر یونانی و لاطینی خرمن سے خوشہ چینی کا نتیجہ ہے۔ ملل سابقہ اپنے ذہنی تجربات و نتائج افکار کی جو بیش بہا دولت چھوڑ گئے ہیں وہ آنے والی نسلوں کی جائز میراث ہے۔ اگر انسان اپنے آبا و اجداد کے منتقل کردہ علمی و ادبی خزانوں سے کام نہ لے اور ان کی ایجادوں اور دریافتوں سے فائدہ نہ اٹھائے تو تہذیب و تمدن میں جمود و سکون واقع ہو جائے۔ موجودہ تہذیب و تمدن کی سر بفلک عمارت اسلاف ہی کی ڈالی ہوئی بنیاد پر قائم ہے۔ ورنہ اگر ہر نسل انسانی صرف اپنے ہی تجربات و مشاہدات اور دریافت و ایجادات کے اندر اپنی تنگ و دو محدود رکھے۔ اور موروثی دولت سے متمتع نہ ہو تو دنیا کبھی دور توحش سے آگے قدم نہ بڑھا سکے گی۔ اگرچہ اُردو بولی مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں کے اختلاط و امتزاج سے پیدا ہوئی تھی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو شاعری خاص فارسی شاعری کی منظور نظر دختر ہے۔ اگر لڑکی نے اپنی ماں سے طرز گفتگو و انداز بیان سیکھا یا زیب و زینت کے سامان یعنی تشبیہات و استعارات حاصل کئے تو یہ فطری امر تھا۔ اس پر تقلید و خوشہ چینی کا الزام عاید کرنا حماقت ہے۔ نادر بندشوں۔ دل آویز

ترکیبوں . لطیف استعاروں اور رنگین تشبیہوں کو غیر ضروری روئے سخن کا صرف غازہ نہیں ہیں بلکہ شاعری کی جان ہیں . ممکن ہے کہ نثر میں وہ صرف زیب و زینت کے لئے استعمال ہوتی ہوں لیکن شاعری اور خصوصاً غزل میں ان کی حیثیت روح رواں کی ہے - ان کے بغیر کلام کی حقیقت جسد بیجان کی سی ہوتی ہے . تشبیہ و استعارہ کو اظہار خیال کے لئے سدراہ سمجھنا تو بالکل جہالت کی نشانی ہے کیونکہ اکثر اوق وپیچیدہ خیالات جو سیدھے سادے الفاظ میں [illegible] تشبیہ و مناسب استعارہ کی مدد سے آئینہ کی طرح صاف [illegible] کے علاوہ کلام کی شوخی . گرمی . رنگینی اور تاثیر بھی بڑی [illegible] ہے . قدیم شعرا کی بلاغت شناسی اور جدت طرازی جس [illegible] کی نئی لہریں دوڑاتی تھی وہ زبان اُردو کی ساخت و بناوٹ کے عین مطابق [illegible] اُردو شاعری میں انگریزی یا بھاشا کی سی تشبیہیں ڈھونڈھتے ہیں حالانکہ یہ تشبیہیں اردو زبان کی ساخت و ترکیب اور فطرت و روایت کے منافی ہونے کی وجہ سے بالکل ان مل اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں . لیکن جب معترضین کو قدیم شاعری میں اجنبی و بیگانہ عناصر نہیں ملتے تو وہ رسمیت و محدودیت کا الزام عاید کرنے لگتے ہیں . قدیم شاعری کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اساتذۂ سخن نہ صرف ان تشبیہات و استعارات سے کام لیتے تھے جو انہیں اسلاف سے وراثۃً منتقل ہوئے تھے بلکہ جدید تشبیہیں بھی ایجاد کرتے تھے البتہ اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ جدید تشبیہیں اجنبی . بیگانہ . نامانوس اور زبان اُردو کی فطرت و طبیعت کے خلاف نہ ہوں بلکہ قدیم تشبیہوں کے ہم رنگ ہوں . فصاحت و بلاغت کا تقاضا بھی یہی ہے . چنانچہ ڈاکٹر بجنوری نے مرزا غالب کے ایجاد کردہ الفاظ اور ان کے خود آفریدہ تشبیہات و استعارات کی طویل فہرستیں پیش کی ہیں . مرزا کی ایجادیں قدیم الفاظ و تشبیہات سے اس قدر ملتی جلتی ہیں اور ایسے بے تکلف انداز سے استعمال ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہماری زبان میں موجود تھیں اور ہزاروں بار کی سنی ہوئی ہیں . مثلاً دام شنیدن . خمار رسوم . آتش خاموش . جوہر اندیشہ . گلبانگ تسلی . پہلو اندیشہ . زنجیر رسوائی . موج نگاہ . نبض خس وغیرہ الفاظ کی ترکیبی جدت آشکار اور نمایاں

ظاہر ہیں۔ اسی طرح موئے آتش دیدہ کی زنجیر ہے۔ دانہائے تسبیح کی صدول عشاق سے خانۂ مجنوں کی گردبے دروازہ سے بہار کی حنائے پائے خزاں سے۔ جوہر آئینہ کی طوطی بسمل سے۔ دام موج کی حلقہ صد کام نہنگ سے۔ تار اشک یاس کی رشتۂ چشم سوزن سے ہر قطرۂ خون تن کی نگیں نام مخشتی سے تشبیہیں جدت وندرت کا اعلی نمونہ ہیں۔ لیکن یہ امر ذہن نشین رہے کہ ٹکسال الفاظ کی طرح نئی نئی تشبیہیں ایجاد کرنا جو لطافت و پاکیزگی میں پرانی تشبیہوں کی ٹکر کے ہوں ہر کس وناکس کا کام نہیں ہے بلکہ صرف شکسپیر، ملٹن، ٹینی سن، غالب، میر انیس اور اقبال جیسے خدایان سخن کا خلاق دماغ ہی اس مہم کو سر کر سکتا ہے۔ مسٹر گرننگ ٹیمپوین کا رونا ہے کہ شکسپیر کی دیکھا دیکھی ادنی درجے کے شاعروں نے بھی تصرف شعری و آزادہ روی اختیار کرکے انگریزی ادبیات کو ایسی پست سطح پر ڈال دیا جہاں وہ ابتدائے تاریخ سے آج تک کبھی نہ گری تھی۔ اردو شاعری میں بھی آج کل نا اہلوں کی کج روی جسے وہ بزعم خود جدت طرازی سے تعبیر کرتے ہیں۔ متاع سخن کو قعر مذلت میں گرا رہی ہے بعض متشاعروں کے شوق الفاظ تراشی نے ان کے کلام کو صرف بے معنی لفظوں کا گورکھ دھندا بنا دیا ہے جسے دیکھ کر نقاد کو کہنا پڑتا ہے کہ "یہ ہے وہ شعر جو شرمندۂ معنی نہ ہوا"۔ اسی طرح ان کی نو آفریدہ تشبیہوں پر "ایجاد بندہ گرچہ گندہ" کی مثل صادق آتی ہے۔

اردو شاعری پر فارسی کی نقالی کا الزام عاید کرنے کے ضمن میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اردو شاعری کا بڑا سرمایہ صرف غزلیات پر مشتمل ہے۔ شعرا کے ضخیم دواوین میں اگرچہ دوسرے اصناف سخن مثلاً قصیدے مثنویاں۔ ترکیب بند۔ مسدس۔ رباعیاں وغیرہ بھی نظر آتی ہیں لیکن ان کی مقدار اس قدر کم ہے کہ انہیں کالعدم ہی متصور کرنا مناسب ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ دور آخر میں فارسی کی ساری پونجی غزل ہی تھی اس لئے اردو شعرا نے محض تقلیداً صرف غزل گوئی پر اپنا پورا زور قلم صرف کر دیا لیکن حقیقت الامر یہ ہے کہ فارسی شاعری کے دور آخر میں جو اسباب غزل گوئی کے محرک تھے انہیں اسباب نے اردو شعرا کو بھی غزل سرائی پر مائل کیا۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ زبان میں بھی قدرۃً لطافت۔ رنگینی۔ نرمی۔ گھلاوٹ۔ صفائی اور شیرینی پیدا ہوتی جاتی ہے۔

فارسی کے شعرائے متاخرین کا خاص جولانگاہ میدان تغزل تھا کیونکہ دیرینہ تہذیب و تمدن کی ترقی نے زبان میں جو نزاکت ۔ پاکیزگی ۔ صفائی اور روانی پیدا کر دی تھی وہ بحیثیت مجموعی غزل ہی کی متقاضی تھی ۔ غرض کہ ایک فطری لسانی اصول کے تحت فارسی شعرا غزل سرائی کرنے لگے تھے ۔ پھر انھیں شاعروں نے جب تفنن طبع کے لئے ریختہ کی جانب توجہ کی تو یہ لازمی امر تھا کہ وہ اس میں بھی غزل ہی کہتے ۔ اس کے علاوہ تمدنی و معاشرتی فضا بھی غزل گوئی ہی کے لئے موزوں تھی [illegible]

وجود پذیر ہوئی وہ عیش و عشرت کا دور تھا ۔ حربی جذبات [illegible] تھی ۔ جو مصافی فضا پہلے اسلحہ کی جھنکار سے گونج رہی تھی [illegible] تھے ۔ ہر طرف رقص و سرود کی گرم بازاری تھی مغلیہ اقبال [illegible] کی خارا شگاف تلواریں نیام میں دھری دھری زنگ آلود ہو گئی تھیں [illegible] تھی جس کے متعلق پُر جوش رزمیہ مثنوی لکھی جاتی ۔ کوئی فاتحانہ و شجاعانہ کارنامہ بھی نہ تھا جو شاعروں کو قصیدہ خوانی پر مائل کرتا ۔ امرا کی دیکھا دیکھی عوام بھی رنگ رلیوں میں مصروف تھے ۔ ایسے تعیش پسند ماحول میں اگر کوئی صنف سخن تاب شنیدن کی منت کش ہو سکتی تھی تو وہ صرف ترنم آمیز غزل تھی ۔ اگر کوئی شاعر طویل مثنویاں یا قصیدے لکھتا بھی تو ان کے سننے کی زحمت کون گوارا کرتا ۔ غزل گوئی کی ترقی و عام مقبولیت کی ایک اور وجہ تھی ۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کسی قوم کا مطلع اقبال زوال و ادبار کے سیاہ بادل سے مکدر ہو جاتا ہے جب دولت و عظمت کی لکشمی منہ موڑ لیتی ہے ۔ جب دنیا کی بے ثباتی و بے اعتباری کا نقش دلوں پر بیٹھ جاتا ہے تو ملک کے گوشہ گوشہ میں توکل و قناعت کے صوفیانہ ادارے قائم ہو جاتے ہیں بے شمار خانقاہیں تعمیر ہوتی ہیں جن کی سکون پرور فضا میں قلب مضطر کو ایک گونہ اطمینان و قرار حاصل ہوتا ہے ۔ ان کے سماع خانوں کے دلپذیر نغمے روح پر وجدانی کیفیت طاری کرتے ہیں ۔ لیکن ان تمام صوفیانہ اثر خیزیوں اور اہتزاز آفرینیوں کا دارومدار غزل ہی پر ہے ۔ الغرض یہ زمانہ ہر لحاظ سے غزل کے لئے موزوں تھا ۔ تاریخی واقعات ۔ سیاسی تحریکات ۔ معاشرتی حالات ۔ تمدنی کیفیات ۔ سماجی رجحانات ۔ ذہنی و اخلاقی میلانات ۔ صوفیانہ ادارات سب کے سب متحد طور پر غزل

ہی کے متقاضی تھے۔ ایسی حالت میں اگر اردو شعرا کے دواوین غزلوں سے گرانبار ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہو؟ الغرض اردو شاعری میں غزلیات کی فراوانی اقتضائے زمانہ کا نتیجہ تھی نہ کہ فارسی کی نقالی کا۔ آج کل بھی یہ عہد لبتا۔ معاشری معاملات کی پیچیدگی۔ زندگی کے جھمیلے بنیق معاش وغیرہ کی وجہ سے اطمینان وسکون مفقود ہو گیا ہے۔ اب کسی کو نہ نثر میں لمبی چوڑی داستانوں سے اور نہ نظم میں طویل قصیدوں اور مثنویوں سے حظ اندوز ہونے کا موقع حاصل ہے۔ اس عدیم الفرصتی کے زمانے میں چھوٹے چھوٹے افسانوں یا مختصر نظموں یا غزل ہی کو قبول عام کی سند حاصل ہو سکتی ہے۔

خاتمہ سخن پر یہ عرض کر دینا مناسب ہو کہ ادب وشاعری کوئی جامد وساکن چیز نہیں ہے بلکہ زندہ نامیات (Living Organisms) کی طرح ترقی پذیر ہے جس طرح زندگی کے اور شعبوں میں انسان اپنے اسلاف کے تجربات ومشاہدات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنی ایجادات واکتشافات کا ان میں اضافہ کرتا ہو اسی طرح ہمیں چاہئے کہ ادب وشاعری میں بھی ہم قدما کی جادو نگاریوں اور رنگین بیانیوں سے مستفید ہوں اور بوقت ضرورت نئے الفاظ وتشبیہات سے زبان کا دامن وسیع کریں لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اضافے ہمارے موروثی ذخائر ادبیہ سے میل کھاتے ہوں۔ انھیں کی طرح خوشگوار، شگفتہ اور فصیح ہوں۔ ان میں اجنبیت۔ ثقالت اور غرابت نہ پائی جائے۔ سیاسی ومعاشری اداروں کی طرح زبان بھی قواعد و ضوابط کی محتاج ہے۔ ہمارے اسلاف اس حقیقت سے بیخبر تھے۔ انھوں نے اپنے مذاق شعری وضروریات ادبی کے مطابق معنی وبیان کے اصول اور فن انشا ونظم کے قواعد مدون کئے۔ اب عہد حاضر میں اگر خیالات میں زیادہ وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ نصب العین اور نقطۂ نگاہ میں فرق آگیا ہے۔ کلام وانشا کی غرض وغایت بھی بدل گئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پرانا ضابطہ بالکل بیکار اور بیخ کنی کے لائق ہو گیا۔ دانائی کا تقاضا ہے کہ پرانے ضوابط میں حسب ضرورت اصلاح وترمیم کی جائے۔ جو شخص محض آئین شکنی کو بہت بڑا اجتہادی کارنامہ خیال کرتا ہے۔ وہ فی الحقیقت ادب وشاعری کا سخت دشمن ہے۔ ایک قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ آرائش وزیبائش کی خواہش انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ دور توحش کا انسان بھی جس کھو یا غار میں رہتا تھا اس کو پھول پتیوں سے یا شکار کئے ہوئے جانوروں کے خوبصورت سینگوں سے

یا طائروں کے رنگین پروں سے آراستہ کرتا تھا۔ آج بھی صفحۂ عالم پر ایسی جنگلی قومیں آباد ہیں جن کی عورتوں کو اپنے جھونپڑوں سے بالکل برہنہ نکلنے میں عار نہیں ہوتا لیکن وہی عورتیں اپنے جسم کو بغیر رنگے ہوئے یا بغیر گودنے یا سیپی کی مالا پہنے ہوئے منظر عام پر آنے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ الغرض انسان ضروریات سے زیادہ تعیشات کا دلدادہ ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تعیشات [illegible] یات زندگی میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ ایک نیم مہذب قوم جن اشیا کو تعیشات [illegible] قوم کی ضروریات زندگی سمجھی جاتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کی ترقی [illegible] پر منحصر ہے۔ اگر کوئی شائستہ قوم تمام آرائشی و زیبائشی سامان [illegible] اور سادہ غذا۔ موٹا لباس اور ٹوٹی جھونپڑی پر قناعت کرنے لگے تو [illegible] الی التوحش تصور کیا جائے گا۔ ادب و شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ یہاں بھی [illegible] و افادت [illegible] حاصل ہے۔ اگر انسان اپنا مافی الضمیر سیدھے سادے الفاظ میں ظاہر کر دے تو یہ محض بول چال کی زبان ہوگی لیکن اسی بات کو وہ ایسے دلکش پیرایہ میں بیان کرے کہ سننے والے کو حظ و انبساط حاصل ہو تو یہ ادبی زبان کہلائے گی۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ بناوٹ اور سجاوٹ کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی زبان بالکل مبتذل اور سوقیانہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اور انسان کا نفس ناطقہ محض افادت کی طرف سے بےحس ہو جاتا ہے۔ ادب و شاعری میں شائستگی شائستگی مذاق کی علامت ہے۔ کبھی تو محض شائستگی زمین شعر کو آسمان بنا دیتی ہے۔ ناسخ کا یہ روشن مطلع شائستگی کی سحرکاری کی بہترین مثال ہے ؎

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا طلوع صبح محشر چاک ہے میرے گریباں کا

علم معنی و بیان کی تدوین اور صنائع و بدائع کی ایجاد انسان کے فطری شوق آرائش و شائستگی کی رہین منت ہے۔ شائستگی کے تمام لوازمات کو جو زینت کلام کے موجب ہیں محض تصنع و تکلف قرار دے کر ان سے یکسر دست بردار ہو جانا اور شاعری میں معمولی بول چال کی زبان اختیار کرنا گویا عروس سخن کو بالکل ننگا اور عریاں بنا دینا ہے۔ یہ شاعری کی تعمیر نہیں بلکہ تخریب ہے۔ باکمال شعرا افادت اور شائستگی

دونوں کا مناسب لحاظ رکھتے ہیں ۔ اُردو شاعروں نے زیادہ تر وہی صنعتیں استعمال کی ہیں جن سے کلام کی حقیقی زینت ہوتی ہے اور منقوط و غیر منقوط یا رقطا و خیفا یا ذو قافیتیں و ذو بحریں وغیرہ کی صنعتوں سے پرہیز کیا ہے کیونکہ ان سے معنی کا خون ہو جایا کرتا ہے ۔ یہ بھی ثبوت اس امر کا ہے کہ اُردو شعرا فارسی شعرا کی اندھی تقلید نہیں کرتے تھے ۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ادب و شاعری میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں نہیں بنتیں بلکہ وہ ایک عظیم الشان عمارت ہے ۔ ہر نسل اس میں کم و بیش اضافہ کرتی ہے مختلف تحریکیں اور مختلف ورنگا ہیں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہوتیں بلکہ اسی ایک عمارت کے اجزا ہیں جدید شاعری بھی کوئی علحدہ شے نہیں ہے بلکہ قدیم شاعری ہی کی بنیادوں پر قائم ہے ضروریات زمانہ کے لحاظ سے نئی نئی منزلیں تعمیر ہونی چاہئیں لیکن ان کی ساخت و ہیئت ایسی ہونی چاہئے کہ وہ ایک ہی عمارت کا جزو کہلا سکیں ۔ قدما کا کارنامہ قابل احترام ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا اور دو ہی صدیوں میں لے ایسی بلندی پر پہنچا دیا جہاں تک صعود کرنے میں دوسری زبانوں کو آٹھ آٹھ دس دس صدیاں لگی ہیں ۔ اس محیر العقول کارنامہ کی جتنی بھی تعریف کیجائے کم ہے ۔ موجودہ شعرا کا کام ہے قدمانے ادب و شاعری کو جس منزل تک پہنچایا ہے اس سے وہ آگے قدم بڑھائیں اور ایسی راہ اختیار کریں جو انھیں کعبۂ مقصود کی طرف رہبری کرے ۔ ورنہ آئین شکنی و بے راہ روی کا نتیجہ وہی ہوگا جس کے متعلق سعدی علیہ الرحمۃ فرما گئے ہیں کہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی ‌ ‌ ‌ کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

قلعہ داران سدہوٹ نے اُردو کی کیا خدمت کی؟

دکن کی اسلامی سلطنتوں نے اُردو زبان کی ترقی میں جو کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں وہ تاریخ سے پوشیدہ نہیں۔ بہمنیہ۔ عادل شاہیہ۔ قطب شاہیہ۔ آصفیہ سلطنتوں سے قطع نظر حیدر علی و ٹیپو سلطان رؤسا ارکاٹ اور قلعہ داران سدہوٹ نے بھی اُردو زبان کی خدمت کی [illegible] نے سفینہ (مدراس) میں روشنی ڈالی ہے۔ یہاں قلعہ داران [illegible] ہیں۔ مگر اس کی صراحت سے پیشتر ان کا تعارف ضروری [illegible] کی تاریخ پیش کی جاتی ہے۔

بہلول خاں سادنوری عادل شاہی امیر تھا اس کی اولاد [illegible] میانہ آخری شخص ہے جو بیجاپور میں صاحب عزت و مرتبہ امیر تھا۔ علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۸ھ تا ۱۰۸۳ھ) کے زمانے میں اس کے تین لڑکے اعظم خاں۔ رحیم خاں اور کریم خاں (جو عبدالرحیم خاں اور عبدالکریم خاں سے موسوم تھے) دربار بیجاپور سے کنارہ کشی کرکے اورنگ زیب کے ساتھ مل گئے اور خان جہاں کی وساطت سے دربار عالمگیر میں باریاب ہوکر منصب اور جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

اعظم خاں اپنے حسن تدبیر اور حسن کارگزاری سے اعلیٰ منصب پر فائز ہوا اور اپنے بھائی کریم خاں کو اپنا میر سامان مقرر کیا۔ مگر رحیم خاں نے کم مایہ گی سے برداشتہ خاطر ہوکر قطب شاہی سلطنت کی راہ لی۔ میر جملہ کے توسط سے سلطان عبداللہ کے دربار میں باریاب ہوکر منصب سہ ہزار سے سرفراز ہوا۔ بعض معرکوں میں داد شجاعت دے کر نام آوری حاصل کی۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

اس کی جگہ اس کا فرزند نیک نام خاں مامور ہوا۔ بالاگھاٹ کے معرکے میں میر جملہ کے ساتھ شریک رہا۔ واپسی میں قلعہ سدہوٹ کا محاصرہ ہوا مگر وہ نائد پالیگار نے صلح کرلی۔ میر جملہ پایان گھاٹ کی تسخیر کے لئے روانہ ہوا۔ نیک نام خاں کو اس کے عمدہ خدمات کے صلہ میں نہ صرف پرگنہ چھتو ر جاگیر میں ملا بلکہ

علم۔ نوبت اور نقارہ سے بھی سرفراز کیا گیا۔

میر جملہ کی روانگی کے بعد نیک نام خاں نے قرب وجوار کے دیگر مقامات مثلاً کنچی کوٹہ۔ بدویل جل مرنگ وغیرہ فتح کئے اور آخر میں قلعہ سدہوٹ بھی تسخیر کرلیا۔ اس کامیابی کے صلہ میں دربار مغلیہ شاہی سے مزید پچاس لاکھ سالانہ محاصل کی جاگیر تعلقہ کنچی کوٹہ۔ چنور وغیرہ مل گئی۔

نیک نام خاں نے قلعہ سدہوٹ کو اپنا مستقر بنایا اور اس کے باہر جہاں ایام محاصرہ میں میر جملہ کا کیمپ تھا ایک نیا شہر آباد کر کے اپنے نام پر نیک نام آباد سے موسوم کیا۔ اس عرصہ میں بیجاپور اور گولکنڈہ سلطنت دہلی میں شامل ہو چکے تھے اور خان نبی فرزند خضر خاں ہی عالمگیر کی جانب سے ذوالفقار خاں کی نیابت میں کرناٹک کا صوبہ دار مقرر ہوا۔

جب یہ نیک نام آباد پہنچا تو چندے یہاں قیام کیا کیونکہ نیک نام خاں بیمار تھا آخرش اس کا انتقال ہوگیا اور خان نے اس کے جا بھتیجے لعل خاں کو اس کا جانشین نامزد کیا۔

جب عالمگیر کے بعد محمد معظم اور محمد اعظم کی خانہ جنگیاں ہوئیں تو اس زمانے میں اعظم خاں اور کریم خاں نے (جن کا قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے) خاصی ترقی کی۔ محمد معظم بہادر شاہ کی جانب سے مردانہ وار لڑے اور دونوں مارے گئے۔ چونکہ اعظم خاں کی کوئی اولاد نہ تھی اس لئے عبدالنبی ابن کریم خاں دربار مغلیہ کی جانب سے سرفراز کیا گیا۔ اس کی اولاد کے چھ شخصوں نے تقریباً خود مختارانہ سنہ ۱۹۱ھ تک سدہوٹ میں حکمرانی کی۔

بہلول خاں (۱)
|
نبی خاں
|
اعظم خاں — رحیم خاں — کریم خاں

رحیم خاں: دختر زوجہ عبدالنبی خاں — نیک نام خاں
نیک نام خاں: عزیز خاں

کریم خاں: لعل خاں — عبدالنبی خاں
عبدالنبی خاں: عبدالمحمد خاں — عبدالمجید خاں — محمود خاں — حسینی میاں
عبدالمجید خاں: عبدالمجید خاں
عبدالمجید خاں: عبدالحلیم خاں

(۱) نوٹ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ
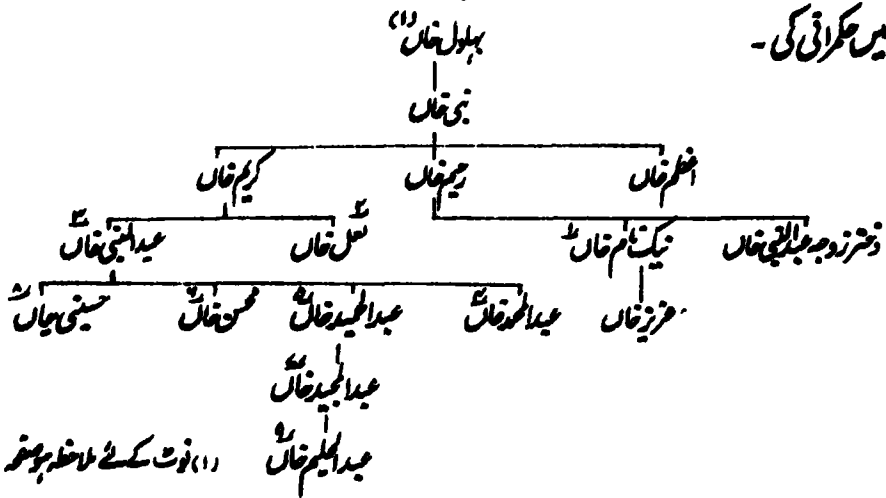
عبدالنبی خاں | عبدالنبی خاں ابن عبدالکریم خاں جو عبدالرحیم خاں کا داماد بھی تھا مغلیہ سلطنت کی جانب سے سدہوٹ کا قلعہ دار بنایا گیا۔ اس کی دلاوری اور کامیابی کے متعلق ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس وقت عبدالنبی خاں کو دربار سلطانی میں طلب کیا گیا اس وقت عزیز خاں (جو نیک نام خاں کا خواص زادہ تھا) نے جانشینی کا دعویٰ کیا۔ دونوں دعوے داروں کے سامنے ایک شیر چھوڑا گیا۔ عزیز خاں تو شیر کا لقمہ بن گیا مگر عبدالنبی خاں نے اس کو ہلاک کر دیا۔

غرضکہ عبدالنبی خاں قلعہ دار بن گیا۔ اپنے لواحقین اور ماتحتین کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا نیز ازاں قرب و جوار پر (جو پالیگار سے موسوم تھے) فوج کشی کر کے اپنے علاقے کو وسیع کر لیا۔ نو آباد شہر کو بجائے جدید نام نیک نام آباد کے اس کے قدیم نام "کڑپہ" سے موسوم کیا۔ دلکشا باغ لگائے۔ علم و ہنر کی ترویج کی۔ محمد بن رضا اسی کے دربار کا شاعر تھا جس نے ... نظم میں ترجمہ کیا۔ سنہ ۱۱۱۱ھ میں عبدالنبی خاں کا انتقال ہوا چار لڑکے عبدالمحمد خاں، عبدالحمید خاں۔ محسن خاں عرف موچا میاں اور حسینی میاں۔

عبدالمحمد خاں (از ۱۱۱۱ھ تا ۱۱۳۲ھ) | اگرچہ نابینا تھا مگر باپ کے بعد جانشین ہوا۔ بھائیوں نے اطاعت کی فہم و فراست عقل و دانش میں کامل تھا۔ خویش و بیگانہ کو تالیف قلوب سے گرویدہ کر لیا۔

اسی زمانے میں جب داؤد خاں برہان پور میں قتل ہو گیا تو خان جہان خاں نے سید عرب خاں کو کرناٹک کی طرف انتظام کے لئے روانہ کیا۔ عبدالمحمد خاں نے اول تو دوستی ظاہر کی مگر جب کڑپہ کے قریب پہنچ گیا تو اپنے بھائی عبدالحمید خاں کے تحت ایک لشکر لڑائی کے لئے روانہ کیا۔ جب اس کو کامیابی نہیں ہوئی تو خود ایک ہزار آہن پوش سواروں کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا عرب خاں پر فتح

(نوٹ صفحہ گذشتہ)

(۱) بہلول خاں کی دوسری اولاد بھی جنوبی ہند میں "سرکار بنکاپور" پر حکمران ہوئی۔ عبدالرؤف خاں پسر بہلول خاں کے بعد عبدالکریم خاں اس کے بعد اس کا فرزند عبدالغفار خاں پھر اس کا فرزند عبدالمجید خاں اور اس کے بعد اس کا فرزند عبدالحکیم خاں یہاں حکمران ہوئے ان کا کچھ حصہ ملک تو مرہٹوں نے لے لیا اور باقی حصہ پر حیدر علی نے قبضہ کر لیا۔

پائی اس کو قتل کر دیا اس طرح گویا مغلیہ فوج پر فتح یاب ہو کر کامیاب ہوا۔ اس کے بعد چیل مدک کے زمینداروں پر فوج کشی کر کے کامیاب ہوا۔

اب نواب قمرالدین خاں آصف جاہ اول صوبہ دار دکن ہو کر اورنگ آباد آئے ان کے طلب پہ عبدالمحمد خاں دربار آصفی میں حاضر ہوا۔ شکر کھیڑہ کی لڑائی میں آپ کا ساتھ دیا بہادری دکھائی جس کے باعث مورد عنایت آصفجاہ ہوا آپ کے حیدرآباد کی جانب متوجہ ہونے پر اجازت لے کر اپنے مستقر کو روانہ ہوا اس کے چند روز بعد مرہٹوں کی جنگ میں سرخ رو ہوا۔ انیس سال کی حکمرانی کے بعد ۱۱۳۶ھ میں انتقال کیا۔

عبدالحمید خاں (از ۱۱۳۶ھ تا ۱۱۵۹ھ) بھائی کی جگہ مسند قلعہ داری پر متمکن ہوا۔ آصفجاہ کی اطاعت اختیار کی چند روز تک شریک رزم بزم ہوا۔ جس وقت آصفجاہ اور ناصر جنگ (باپ بیٹے) میں جنگ ہوئی تو اس نے بیٹے کا ساتھ دیا۔ جنگ ختم ہونے پر آصفجاہ نے چشم پوشی کی بلکہ ۱۱۵۵ھ میں جب پائیں گھاٹ کے بندوبست کے لئے روانہ ہوئے تو اس کو مرحمتوں سے سرفراز فرمایا۔ نہتر نگر (ارکاٹ) کی واپسی پر عبدالحمید خاں نے رخصت چاہی۔ اپنے مستقر کو واپس ہوا۔ اور چند روز کے بعد ۱۱۵۹ھ میں انتقال کیا۔

عبدالحمید خاں کے عہد میں شہر سدہوٹ کو خاصی ترقی ہوئی۔ نئی نئی عمارتیں باغات لگائے گئے۔ علم وفن کی سرپرستی کی گئی۔ شعروشاعری کا چرچا تھا۔ قلعہ دار کے سوا امرا۔ دربار کو بھی اس کا شوق تھا۔ محمد حیدر ابن جعفر اسی عہد کا مشہور شاعر ہے جس نے ابن نشاطی کے پھول بن کا اضافہ کیا۔

محسن خاں بھائی کی جگہ مسندنشین ہوا۔ فرانسیسیوں سے (جو اس زمانے میں پلچری میں تھے) مدد لے کر زمینداران چرپلہ وغیرہ پر فوج کشی کی اس کے بعد گگن پلی کے قلعہ دار میر غلام علی خاں عرف کلو پر چڑھائی کی مگر شکست پائی دوبارہ اپنے بھائی عبدالحمید خاں کی سرکردگی میں پیش قدمی کی۔ فرنچ فوج بھی ہمراہ تھی گگن پلی فتح ہوا قلعہ دار نے پیش کش اور نذرانہ قبول کیا۔

[illegible] میں جب آصفجاہ اول کا انتقال ہوا اور ناصر جنگ جانشین ہوئے۔ ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ اور ناصر جنگ کی لڑائی ہوئی۔ چندا صاحب اور فرانسیسوں نے مظفر جنگ کا ساتھ دیا۔ اس [illegible] محسن خاں اول تو ناطرف دار رہا مگر اس کے بعد ناصر جنگ کی حمایت کے لئے روانہ ہوا تھا۔ راہ میں [illegible] ناصر جنگ شہید ہوگئے۔ مظفر جنگ فرانسیسوں کی مدد سے دکن کے حکمران ہو کر حیدر آباد کی جانب روانہ ہوئے۔ رائچوٹی کے مقام پر فرانسیسوں اور افغانوں میں تکرار ہو کر خانہ جنگی برپا ہوئی مظفر جنگ مارے گئے۔ محسن خاں اونٹ پر سوار ہو کر سدہوٹ کو فرار ہوگیا اور وہاں اپنے ملک کے انتظام مالی و ملکی میں مصروف رہا۔ مظفر جنگ کے مارے جانے کے بعد نواب صلابت جنگ جو آصفجاہ اول کے تیسرے فرزند تھے۔ دکن کے حکمراں ہوئے اور فرانسیسوں ک

آباد روانہ ہوئے۔

عبدالمجید خاں | چونکہ محسن خاں نے ملازمین کی تنخواہیں کم کر،
اس کو مقید کر دیا اور عبدالمجید خاں ابن عبدالحمید خاں کو حکمران بنایا۔

حکمرانی کے بعد عبدالمجید خاں نے اول تو قلمرو آصفی پر تاخت کا ارادہ کیا مگر چرپالیگاران بالاگھاٹ کی جانب متوجہ ہوا۔ کہٹ کیز۔ نیکنور۔ مدن پلی وغیرہ مقامات فتح کئے۔ اس کے بعد بلونت راؤ مرہٹہ نے سدہوٹ پر فوج کشی کی۔ ایک مرتبہ مرہٹوں نے عبدالمجید خاں کی ہمشیرہ کے بدرقہ پر چھاپا مارا۔ اس واقعہ کی اطلاع پاکر عبدالمجید خاں کا نائرہ غضب برافروختہ ہوا مرنے مارنے پر آمادہ ہو کر قلعہ سے نکلا اس امر کی منادی کر دی جو شخص مرنے کے لئے تیار ہے وہ ساتھ چلے اور جس کو جان و مال کی تمنا ہے وہ ساتھ نہ ہو۔ ایک ہزار افغان ہمراہ ہوئے قلعہ کی حفاظت کے لئے فرانسیسی فوج چھوڑی گئی مرہٹوں کی تعداد کئی ہزار تھی۔ اس کے مقابل افغان صرف ایک ہزار تھے۔ بریں ہم بڑے سرکے کا رن پڑا۔ صدہا آدمی قتل ہوئے بڑی جوانمردی اور جانبازی کے بعد خود عبدالمجید خاں قتل ہوا لاش سدہوٹ لائی گئی اور باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔

اس کے زمانے میں بھی دکھنی شعر و شاعری کا رواج تھا۔ ولی ویلوری اسی کے دربار کا شاعر تھا۔

[illegible] میں اپنی مشہور مثنوی رتن و پدم کی تصنیف کی۔

[illegible] عبدالمجید خاں کے مارے جانے پر محسن خاں دوبارہ حکمراں ہوا۔ اس عرصہ میں پالیگاران [illegible] و کنٹور [illegible] ممالک پر قابض ہو گئے اور فرانسیسیوں کی تنخواہ کئی ماہ سے ادا نہیں ہوئی تھی جس کے باعث وہ بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ سرور خاں تبیلی لڑکے نے ان کا ساتھ دیا مگر جنگ کی نوبت نہیں آئی تنخواہ ادا کر دی گئی فتنہ فرو ہوا۔ کچھ عرصہ بعد پالیگاران سے وصولی پیش کش کے لئے روانہ ہوا۔ اثنائے راہ میں [illegible] ہو گیا لاش کرپہ میں لا کر دفن کی گئی۔

عبدالحلیم خاں۔ محسن خاں کی کوئی اولاد نہیں تھی عبدالمجید خاں کا لڑکا عبدالحلیم خاں جانشین ہوا۔ سرور خاں فوج فراہم کر کے مقابلے کے لئے آیا مگر کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد پالیگاران سے مقابلے ہوئے پھر حیدر علی والی میسور نے حملے شروع کر دئے آخر کار سنہ ۱۱۹۱ھ میں سدہوٹ بھی فتح ہو گیا عبدالحلیم خاں کو [illegible] گرفتار کر کے گنجام کے قلعہ میں مقید کیا گیا اور حیدر علی کی جانب سے علی رضا خاں سدہوٹ کا قلعہ دار بنایا گیا۔

عبدالحلیم خاں کے والد سید محمد نے فوج فراہم کی اور انگریزوں سے جو مچھلی بندر میں تھے مدد لیکر سنہ [illegible] میں اپنے آبائی ملک کی واپسی کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ حیدرآباد فرار ہو کر آیا یہاں چند روز کے بعد انتقال کیا۔

اس طرح سدہوٹ سنہ ۱۱۹۱ھ میں میسور میں شامل ہو گیا اس کے بعد سنہ ۱۲۱۳ھ میں نظام الملک آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں نے اس کو فتح کر لیا اور سنہ ۱۲۱۵ھ میں انگریزی فوج کی تنخواہ کے لئے سرکار کمپنی کو دیا گیا جو آج تک گورنمنٹ مدراس کے تحت میں ہے[1]۔

---

(۱) حالات بالا حسب ذیل تاریخوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

۱۔ تذکرۃ البلاد والحکام مصنفہ حسن علی کرمانی مرتبہ سنہ ۱۲۳۱ھ (مخطوطہ)

۲۔ نشان حیدری مصنفہ حسن علی کرمانی مرتبہ سنہ ۱۲۱۷ھ (مخطوطہ)

(باقی آئندہ صفحہ پر)

بن تفصیل سے واضح ہو سکتا ہے کہ ان قلعہ داروں کی پوری عمر جدال و قتال میں بسر ہوئی
اور ان کو مشکل سے میدان جنگ سے فرصت نہیں ملی۔ ان کو اتنا موقع نہیں ملا کہ اطمینان اور دلجمعی سے
سے کسی علمی کام میں مصروف ہوسکتے اور علم و ہنر کی ترویج کی جانب متوجہ ہوتے۔ باوجود ان تمام امور
کے جب ہم اس عہد ادبیات میں ان کارہائے نمایاں کو دیکھتے ہیں تو ہم کو ان کی علمی قدر دانی اور علمی
سرپرستی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجود اپنی جنگی مصروفیت کے انھوں نے بہت کچھ کیا۔
اُردو کی ترقی میں انھوں نے جو حصہ لیا اس کی پوری تفصیل اس لئے ناممکن ہے کہ زمانے کی دستبرد
سے تصنیفات معدوم ہو چکی ہیں۔ شعرا اور مصنفین کے نام پوشیدہ ہو چکے
گمنامی میں پنہاں ہیں۔ مگر جو کچھ بھی ہے وہ اس امر کے لئے کافی۔
زندہ رہے اور تاریخ اُردو میں ان کو مناسب جگہ دی جائے۔
ذیل میں ان مخطوطات کا ذکر کیا جاتا ہے جو ان کے زمانے
باقی ہیں :-

(۱) ترجمہ قصیدہ بردہ۔ عبد النبی خاں کے زمانے میں محمد بن رضا نے اس کو دکھنی نظم میں منظوم
کیا ہے اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں نمبر ۲۳ پر موجود ہے۔
ابتدا میں ۹ صفحات میں حمد و نعت منقبت اور بادشاہ کی مدح کی گئی ہے۔ اور یہ بھی ظاہر کیا گیا
ہے اس کو ملا جامی کے فارسی ترجمے سے دکھنی میں منظوم کیا گیا ہے۔

حمد حق کا کر اول تو صفحہ دل پر رقم	نام پاک اس پاک کا ہے زینت لوح و قلم
ہے سورج ہور چاند اُس کے صنع عالی گولہ	مہر گویا ہے ستارے صنع محشر بو کہم
شکر اُس کا کب ہوئے گا ہم سوں جب کیا	مصطفےٰ النبی مہربان کوں ہم او پر رہبر عجم

۲۔ سوانح دکن مصنفہ منعم خاں اورنگ آبادی (مخطوطہ)

۴۔ حدیقۃ العالم مصنفہ میر عالم (مطبوعہ)

آج ولی دو جہان کے گنج کا گنجہ وار — واقف راز نہاں ہور مشفق صاحب حرم
در ولایت سیادت شاہ عبداللہ ہے — پاشاہ ملک دل کا جان اسکو ہے وحم
خاک راہ اس شاہ کے درگاہ عالیجاہ کا — ہور بقین دل سوں اُسکا ہے غلام بیدرم
خادم آل محمد یو محمد بن رضا — رحمت باری تعالیٰ اُس پہ ہوے دمبدم

جس کے تصنیف روشن دل محمد موعلی — قدوہ اہل عرب مشہور در ملک عجم
شرح اس کیتن کیو ہیں فارسی میں خوش کلام — مولوی جامی کہ جس کا دل رہتا جیوں جام جم
لیک آسکے کہنے کوں پاتے نہ عاجز ہی تمام — کیوں کہ کوزہ میں رکھی ہیں لیا آذیت یم
اس بدل یو خوشہ چیں خرمن اہل کلام — شرح رکھتی سوں کیا صفحہ اوپر شرح رقم

اگرچہ شعر نمبرہ سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ عبدالنبی کے عہد کی تصنیف نہیں ہے مگر خاتمے کی عبارت اور اشعار سے بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے کہ یہ عبدالنبی خاں کے عہد میں تصنیف ہوئی ہے چنانچہ

"تمام شد شرح قصیدہ بردہ بموجب امر واجب الاذعان لازم الاتفاق خورشید اوج

سخا مہتاب برج صفا . . . . . . "

کریم ابن الکریم ابن الکریم است — گل باغ نواب عبدالرحیم است
در بحر نواب عبدالنبی خاں — سخی باکرم ہم جود و احسان

امیر امرائے اعظم الشان یعنی نواب عبدالحمید خاں سلمہ الرحمن . . . . "

اس کے علاوہ اسی جلد میں چند اور رسالے مثلاً شعب الایمان وغیرہ بھی شامل ہیں جو سب کے سب صاحبزادہ نواب عبدالحمید خاں کے لئے لکھے جانے کی صراحت موجود ہے۔

نفس مضمون کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

لے محب کر دیا دتوں ہمسایہ شہر سلم — جگ کے انجان سوں ملاجاری کیا ابو دہم

یا چلی ہے باد خوش بو کاظمہ کے شہر تے　　یا چمک بجلی کی دکھارات از کوہ اضم
کیا ہوا تجھ چشم کون جو بس کہے تو روین زیاد　　کیا ہوا تجھ دل کون جو کیں ہوش یا تو ہو سے ندم
چاہے عاشق کر چھپاوے عشق تو چھپتا نہیں　　دل سے جب آگ سوں ہو یک چھپی غم سوں نم
عشق نین تو اشک نین پرتے نشان یار دیکھ　　یاد کر کوہ و شجر کیوں چشم ہوئیں بے خواب جم

خاتمہ ملاحظہ ہو:-

ہو توں راضی اے خدا ابوبکر ہور فاروق سوں　　ہور عثماں ہور علی جو اتھا صاحب کرم
آل ہور اصحاب ہور سب تابعین سوں جو اچھے　　صاحب تقیٰ
شاخ جہاران کے ہلاوے جب تلک باد صبا　　خوش کرے
بخش یارب توں گنہ قاری کے ہور
بخش سامع ہور کاتب کیتن توں لے عباد...

---

(۲) تکمیلہ پھول بن۔ ابن نشاطی کی پھول بن مشہور مثنوی ہے جو سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں ۱۰۶۶ھ میں لکھی گئی ہے۔

اس عہد کے مشہور شاعر محمد حیدر نے (جو خود کو ابن جعفر سے مخاطب کرتا ہے) تقریباً تین سو شعر کہہ کر اس مثنوی کا گویا تکملہ کیا ہے۔

محمد حیدر ابن جعفر عبدالحمید خاں کے دربار کا شاعر تھا عبدالکریم خاں کی فرمائش پر اس نے یہ شعر لکھے ہیں۔ وہ بیان کرتا ہے کریم خاں کو قصے سننے کا شوق تھا جب اس نے پھول بن کے قصہ کو سنا اور اس میں آخر پر ہمایوں فال اور سمنبر کی شادی کے حالات نہ پائے تو بہت افسوس کیا اور اس امر کی خواہش کی کہ اس کی تکمیل کی جائے ابن جعفر کو حکم دیا اس کو مرتب کرے۔

ان اضافہ شدہ اشعار میں تفصیل کے ساتھ شادی کے حالات، رسومات کی وضاحت کی گئی

ہے جو اس وقت کے مسلمانوں میں مروج تھے۔ ان سے رسم و رواج کی پوری صورت منکشف ہوتی ہے۔ شاہی کی رسم ملاقات کے بعد ابن جعفر نے ضیافت کا حال بھی نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ اس وقت کے رسم و رواج کی پوری وضاحت ہوتی ہے۔ بہرحال ابن جعفر کا یہ تکملہ خاص حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ابن جعفر کا اضافہ ابن نشاطی کے ذیل کے شعر کے بعد ہوا ہے ؎

عدالت کار کر اپنی سیس پر تاج ۔۔۔ فراغت سوں سدا کرتا رہا راج

ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں :۔

محمد حمید جعفر زبان کھول ۔۔۔ نکل دریا سوں دل کی در بے مول
سنبر ہور ہمایوں شاہزادہ ۔۔۔ سکونت جب کئے اس ملک میں آ
دنو آئے سو خوش خبری سنیا جب ۔۔۔ وک شاہ عجم شاداں ہوا تب
رواں کریوں محبت ساتھ خامہ ۔۔۔ لکھیا تب یوں دنوکوں شاہ نامہ

قلعہ داران سدہوٹ کی تعریف اور اپنے اشعار کہنے کی صراحت بھی خاتمہ پر درج ہے ملاحظہ ہو:۔

صفت ان بزرگان کی بیشتر ہیں ۔۔۔ ولیکن یاں کیا ہوں مختصر میں
مردان کا امیر نامور ہے ۔۔۔ شجاعت اور سخاوت میں نشر ہے
بہوت آئے ہیں اس شہری شہر کے ۔۔۔ سما جاتے نہیں ہے یکی مال ندے
تمسکل آفاق میں دویوں سے مشہور ۔۔۔ ہے جیوں مشہور جنکے اوج سور
رہے قانون پر وہ بزرگاں کے ۔۔۔ سے ظاہر سب امیراں میں جہاں کے
نواب عبدالنبی خاں کا ہے فرزند ۔۔۔ نواب عبدالرحیم کا وہ ہے دلبند
کرم کے بحر کا رخشاں گہر ہے ۔۔۔ نواب بہلول خاں کا وہ جگر ہے
نواب عبدالحمید ہے نام اس کا ۔۔۔ عدل انصاف ہے جم کام اس کا
ہوا غالب سب ملکی ملک میں ۔۔۔ رکھیا حق اس کنیں امن و اماں سین

قلعہ [illegible] کیران کون مکان ہے — مکان اس کے نمن جگ میں کہاں ہو
قلعہ بھی کوئی نہیں ثانی ہے اسکا — ندی لائی ہے سر اس کی چرن سوں

قلعہ کے بعد شہر کی اس کے بعد محل شاہی کی تعریف اس کے آرام و آسائش کے ذکر کے بعد اپنی تصنیف کے متعلق صراحت کرتا ہے :-

یو ہیں استاد کا حق جان و دل سات — انو کے فرزندان کا [illegible]
کریم صاحب اہے اس نیک کا نام — اہے جیو [illegible]
کریم ان کون دیا ہے نام بھی نیک — دیا ہے ا [illegible]
اچھے قصیاں ستے ان کو اوک ذوق — کھانیاں ـ
قصے کون پھول بن کے وہ سنے جب — بچارے یوں [illegible]
حکایت ہے سنبر کی بہوت خوب — سگل اس کا بیان ہے بہوت محبوب
وسے نہیں بہاؤ کا مذکور ہے کچ — نہ ہلدی تیل کا دستور ہے کچ
کچ یک شمہ سخن کا مجھ ستے پائے — سو یوں اس بہاؤ کا مج حکم فرمائے
کرو کچ ذکر اس کے بہاؤ کا اب — کھا دیں یو قصا تصویر سوں سب
کرے جب حکم سوں یوں سرفراز — حکم پر میں کیا گنج سخن باز

ابن جعفر کے اضافہ شدہ اشعار کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

شاہ عجم نے اپنے وزیر کے ہاتھ ہمایوں فال کے پاس اپنا نامہ روانہ کیا وزیر قطع منازل کرتا ہوا ہمایوں فال کے پاس پہنچا اور نامہ پیش کیا۔ اس کے بعد سنبر اور ہمایوں فال ملک عجم کو روانہ ہوئے۔ بادشاہ ملک عجم نے نہایت تپاک کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور دونوں کی شادی کا اہتمام کیا اور کاریگروں کے ہاتھ قصر تیار ہوئے جو روم اور شام کے نمونہ پر تھے اس کے بعد بادشاہوں اور امیروں کو دعوت

[illegible] کے بعد پھر شادی شروع۔ ہلدی۔ مہندی۔ شب گشت کے بعد محفل عقد منعقد ہوئی۔ عقد کے بعد ضیافت شروع ہوئی اور محفل رقص و طرب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بازگشت ہوئی اور دلہن کے جہیز کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ شادی کے بعد کچھ عرصہ تک تو دولہا دلہن ملک عجم میں رہے اس کے بعد ہمایوں فال اپنے وطن کو روانہ ہوا باپ سے ملاقات ہوئی۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے شادی کے رسوم۔ ضیافت میں کھانوں کی تفصیل پھر جہیز کے سامان اور زیورات کی صراحت میں بڑی تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

بطور نمونہ کسی قدر کلام پیش کیا جاتا ہے۔

وزیر کون بہوت لشکر دے کر سنگات | روانہ تب کیا نامہ بھی دے ہات
وزیر اس شاہ کن تب و وداع ہو | چلیا ہے جلد شہزادے طرف وو
ہر یک منزل مراحل قطع کرتا | ہر یک جنگل و بستی سون گذرتا
کتے دن راہ چل کر اس وضع سون | وو شہزادے کے آ پونچیا شہر کون
سو شہزادے کو نامہ شاہ دیتا | زبانی بھی سگل اظہار کیتا

شب گشت آئی جلوہ گر ہو | نہ تھی شب بلکہ رشک روز تھی وو
فلک پر آکر شاہ روم تا شام | کیا جاری سگل اطراف احکام۔
گیا مغرب میں پھر کرنے کو شاہی | چڑیا تخت فلک بر بد لا ہے
ہوا روپوش جب وو شاہ گل رنگ | بھریا سب جگ میں آ لشکر زنگ

مٹھائی بہوت خوش بادام کے کر | جلیبے میاں ہور سموسے بھی رکھی بھر
مٹھائی میں تھے موصوف بہوت خوب | اتھا بادام کا حلوہ بھی مجوب
ترنجے ہور نارنجے [illegible] مربا | رکھے پیٹھے کا ہور بھی آم کا لیا

اتھے انگور انجیر وانار ان　　　　جنس ہور آم خربوزی بھی تھورال
اتھے تربوز اور شہ توت مرغوب　　　　ہر یک میوہ اتھا ئیک سوں یک خوب

جدان فارغ ہوئے سب کون صلاۃ　　　　عطر وانیاں بھی یا اسے یان خوش بات
گلاب و عطر گل سب کون دئے پان　　　　اوک صدیاں کیتین سب سون دئے اسا
تدان خلعت کیتین لائے ہیں نادر　　　　اتھے خلعت [illegible]
دئے ہر یک کون اس کا مرتبا دیکھ　　　　نہیں [illegible]

رسم سب تیل کو بھی کر کر تیار　　　　پچھے عار [illegible]
نقارے نوبتاں ہور دبدبی سات　　　　لجا پونچاے نوشہ کے طرف ان جوں ھا
بہت دن یوں پنچ تھے شادی دو طرفا　　　　وہاں کھاتے تھے کھانا لوگ سب آ
اتھے مجلس محلین یوں پنچ دن رات　　　　کھلے گلشن منی جیوں گل خوشی سات
رسم ہلدی بری ہور جہیز کے جب　　　　بجا لائے اوک ترتیب سوں سب

نمونہ بالا سے محمد حیدر کے کلام کا طرز انداز اور قوت بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے اس میں شک نہیں یہ اپنے وقت کا ایک اچھا شاعر تھا۔

(۳)، مثنوی رتن و پدم۔ یہ ولی ویلوری کی تصنیف ہے جو نواب عبدالمجید کے دربار کا شاعر تھا۔

ولی کا نام میر ولی فیاض ہے ویلور علاقہ مدراس کا رہنے والا تھا۔ اولاً فوجی خدمت کے سلسلے میں قلعہ دار سات گڈھ کا ملازم تھا اس کے بعد سدہوٹ آکر قلعہ دار سدہوٹ کی ملازمت اختیار کی اور یہیں انتقال کیا۔

اس کی پہلی تصنیف "روضۃ الشہداء"[1] ہے جو ۱۱۴۱ھ میں لکھی گئی۔

مثنوی رتن و پدم میں چتور کے راجہ رتن سین اور سرندیپ کی مہارانی پدماوت[2] کی عشقیہ داستان مذکور ہے۔ یہ نایاب مثنوی ہے اس کا ایک نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانہ میں تھا جس کی صراحت اسپرنگر نے اپنی کیٹلاگ میں کی ہے۔ اس کی صراحت سے پایا جاتا ہے یہ ضخیم مثنوی ہے جس کے چار ہزار شعر ہیں۔

مؤلف اردوئے قدیم نے اسپرنگر کی وضاحت کو اپنی تالیف میں اردو کا لباس پہنایا ہے۔ جو اشعار پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

حراست خاں امیر ایک نامور تھا ۔۔۔ سکونت گاہ اُس کوں سات گڑھ تھا
اتھا او اہل درد و نیک اعمال ۔۔۔ رفاقت میں اتھا میں اس کے خوشحال
قضا را واں سوں ہو قسمت ز برخاست ۔۔۔ سو آیا میں طرف کریہ کے دھر خواست
نواب عبدالمجید ابن عبدالحمید ایک ۔۔۔ اتھا واں نامور صوبہ سعید ایک
سو او بحر شجاع پروانہ لکھ کر ۔۔۔ بسلک نوکران میں منسلک کر
تعین کر مجکوں سدہوٹ کو روانہ ۔۔۔ گیا وہ صاحب شیر تن زمانہ
سو حسب الحکم میں سدہوٹ کو آیا ۔۔۔ زنگار رنگ واں تماشے منے پایا

اس مثنوی کی ابتدا حسب ذیل شعر سے ہے۔

خدایا تو ہے پاک پروردگار ۔۔۔ زنکار و آثار و آچھی اثار

(صفحہ ۸۹ و ۹۰)

---

(۱) روضۃ الشہداء کے متعلق ہم نے ایک علحدہ مضمون لکھا ہے جو ساقی دہلی کے جنوری ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا ہے۔

(۲) پدماوت کے متعلق مختلف قصے لکھے گئے ہیں جن پر ہم نے ایک مضمون لکھا ہے جو نیرنگ خیال جولائی ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا ہے۔

چونکہ یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گزری اسی لئے اس کے متعلق مزید وضاحت نہیں کی جا سکتی۔
یہ صراحت ان چند مخطوطات کی ہے جو آج ہمیں معلوم بھی نہیں۔ نہ معلوم اور کون کون تصنیفات
ان قلعہ داران سد ہوٹ کے زمانے کی ہوں اور کون کون نامور شاعروں نے ملک سخن سر واد لی۔
اس میں کوئی شک نہیں قلعہ دان سد ہوٹ نے اُردو کی سرپرستی کی دوران کے دربار سے
شعرا کی فیاضانہ مدد کی گئی جس کا بدیہی ثبوت آج بھی موجود ہے۔
خوش قسمتی سے انڈیا آفس کا نسخہ "پھول بن" وہی ہے جو قلعہ داروں کے لئے مرتب ہوا تھا
اس کا خوشخط بہترین کاغذ، مطلانقش ونگار، عمدہ تصاویر اس امر کے۔۔
کو علم و ادب سے کس قدر الفت تھی اور کس طرح وہ اردو کی سرپرستی
بہر حال ملک دکن کا چپہ چپہ زبان اُردو کی سرپرستی کیا کرتا
اُردو کے نامور شعرا عالم وجود میں آئے ہیں جو آسمان شہرت پر آفتاب بن۔۔
کم ان کے کارناموں سے واقف ہیں۔

چینی قومیت وجمہوریت

ڈاکٹر سن یت سین کے تین اصول

۳۔ معیشت

معیشت کی تعریف :۔

معیشت کیا ہے ؟ یہ وہی لفظ ہے جو برابر ہماری زبان پر آتا ہے ، ہاں شاید ہم اس لفظ کو بے سوچے سمجھے اپنے منہ سے نکالا کرتے ہیں اور اس کو معنی خیز نہیں سمجھتے لیکن آج کل کا زمانہ اور ہے ، جدید علوم اور سائنس نے دنیا کا رنگ بدل دیا ہے ۔ جدید علوم کے حدود میں اس لفظ کو اجتماعی معاش پر استعمال کرنے سے اتنے معانی نکالے جا سکتے ہیں کہ ہم حیرت میں رہ جاتے ہیں ۔ اس وقت ہم اس کی تعریف کرنے کو بیٹھے ہیں ، مگر کیسی ؟ مکمل تعریف کرنا تو بہت مشکل ہے ۔ بہر حال جہاں تک ہماری سمجھ میں آتا ہے کسی نہ کسی طریقہ سے اس کا مفہوم محدود کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم اس دائرے کے اندر کچھ بحث کر سکیں ۔ اس کے متعلق مختصراً ہم یہ کہتے ہیں کہ معیشت ایک سوال ہے انسان کی زندگی کا ۔ اجتماعیت کی بقا کا ۔ قوم کے ذرائع زندگی کا اور عوام کے وسائل معاش کا ۔ اب ہم اس معیشت کے نام سے اسی اہم اور عالمگیر سوال پر بحث کریں گے ۔ جو کہ موجودہ صدی میں ممالک مغرب کے اندر رونما ہوا ۔ یہ انسانی اجتماعیت کا سوال ہے ۔ اجتماعی زندگی کا سوال ۔ لین دین کا سوال ہے ۔ کھانے پینے کا سوال ہے ۔ رہنے سہنے کا سوال ہے اور تعلقات در رشتے قائم رکھنے کا سوال ہے جس کو ہم اپنی اصطلاح میں معیشت کہتے ہیں ، اس کا دوسرا نام عام اقتصادی یا عمرانی زندگی ہے ۔

معیشت اور مسئلہ اجتماعیہ

معیشت کا سوال درحقیقت اسی زمانے میں پیدا ہوا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج کل سارے

عالم میں مادی ترقی کا دور ہے۔ صنعت و حرفت تیزی کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کی قوت اختراع میں بے حد اضافہ ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر مشین کی ایجاد ہونے کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ مشین کی ایجاد کے بعد قوت صنعت میں انقلاب عظیم ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ بہت سے لوگ کاموں سے محروم رہ گئے قوت بازو استعمال کرنے کی کہیں جگہ نہیں رہی جس کی وجہ سے بہت لوگ روٹی کمانے سے محروم ہو گئے اس صنعتی انقلاب کی وجہ سے مزدوری پیشہ طبقے سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے ان مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے اجتماعیت کا سوال پیدا ہوا۔ یہی اجتماعیت کا سوال [illegible]

بحث ہے۔

علم اجتماعی کے حدود حالات اجتماعیہ۔ اجتماعیت کے ارتقا نشو و نما پر مشتمل ہیں۔ اجتماعیت کا دائرہ، اجتماعی معاشیات اور انسانی [illegible] دیگر۔ یہ عوام کے معاشی حالات دریافت کرتا ہے، بجائے لفظ اجتماعیت [illegible] نے استعمال کیا کہ یہ مسئلہ کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے اس لفظ سے لوگ فوراً اس کی حقیقت اور ماہیت کو سمجھ سکتے ہیں جنگ عظیم سے پہلے، یورپ میں اشتراکی اور غیر اشتراکی دو جماعتیں پیدا ہو چکی تھیں، ان میں باہمی لڑائی ہوتی تھی۔ یا یوں کہو کہ سرمایہ دار طبقے اشتراکیوں کے خلاف آلات حرب اٹھاتے تھے۔ یہ جنگ ایک عرصہ تک جاری رہی جنگ عظیم کے بعد۔ یہ معلوم ہوا کہ سرمایہ دار مغلوب ہو گئے اب اشتراکیوں کو موقع ملا کہ وہ مسئلہ اجتماعیت کو حل کر دیں اس وقت جو اشتراکیت کے حامی تھے ان کو کوئی اچھی ترکیب نہ مل سکی جس سے وہ اس مسئلہ کو حل کر سکتے۔ اس واسطے اس کے حل کرنے میں ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی۔ اشتراکی اور غیر اشتراکی کی نزاع سے کہیں زیادہ خوفناک نظر آئی، دن بدن اس کے حل کرنے میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہونے لگیں کہ اس کا حل ہونا مشکل ہو گیا جب سرمایہ دار اور اشتراکیوں کے مابین مخالفت ہوتی تھی تو سارے عالم میں جتنے اشتراکیت کے حامی تھے خواہ وہ ہم وطن ہوں یا نہ ہوں، ایک دوسرے کے معین اور حامی بن جاتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں جماعت اشتراکی کی کیفیت اور ہو گئی جرمن اشتراکی روس کے اشتراکیوں کو اپنا دشمن اور روس کے اشتراکی انگریز اشتراکیوں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور ایک دوسرے پر بدگمانی اور طعنہ زنی کرتے ہیں۔ ان کا

خیال کچھ اور ان کا خیال کچھ اور۔ اس افتراق کی وجہ سے بین الاقوامی تعلقات جیسے ہونے چاہئیں تھے نہیں ہو سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم وطن اور ایک ہی ملک کے اہل اشتراکیت میں بھی طرح طرح کی عداوت و رقابت ظہور پذیر ہوئی۔ ان وجوہ سے مسئلہ اجتماعیت پر جتنی بحثیں کی جاتی ہیں، اتنی ہی مشکلات نظر آتی ہیں اور اب تک اس کے حل کرنے کی کوئی معقول ترکیب نہیں ملتی ہے۔

نظریہ مارکس پر ایک نظر۔

اشتراکیت کے اندر جو اہم سوال درپیش ہے وہ معاش کا یعنی عوام کی زندگی کا سوال ہے۔ صنعتی انقلاب کے بعد سے اشتراکیت کا مطالعہ کرنے والے دن بدن زیادہ ہوتے جاتے ہیں اُن کی تعداد شمار سے باہر ہے اُن میں سے جس نے اس مسئلے پر گہرائی اور محنت سے غور کیا ہے اس کا نام سب پر روشن ہے یعنی مارکس

مارکس کا نظریہ وجود میں آنے سے پہلے دنیا میں جو اشتراکیت کے علما تھے، اُن کا تخیل ناقابل عمل اور حقیقت سے بہت بعید تھا۔ مارکس نے تاریخی واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ معاشی تغیر و تبدل کے جو وجوہ و اسباب تھے۔ ان کو جمع کیا۔ اور بغور مطالعہ کرنے کے بعد اصول معیشت کی بنا پر اپنا نظریہ قائم کیا اس نے متقدمین پر اعتراض کیا۔ اور ان کے تخیل پر یہ رائے ظاہر کی کہ محض ان کے انفرادی اخلاق کا ظہور اور اجتماعی ہمدردی کا اظہار تھا اور کوئی چیز ان کے ذہن میں موجود نہ تھی، مارکس کی رائے میں مسئلہ معیشت انفرادی اخلاق اور اجتماعی ہمدردی سے کہیں زیادہ عمیق ہے اور محض اخلاق کے اظہار یا ہمدردی کی نمود سے اس کا حل ہونا بہت مشکل ہے۔ اس کے حل کرنے کے لئے در اصل سوشل زندگی اور اجتماعیت کے ارتقا پر نہایت عمیق مطالعہ اور مسلسل غور کی ضرورت ہے۔ . . . یہ مسئلہ صرف تاریخی شاہدات اور واقعات کے مطالعے اور اُن کے اسباب و نتائج کی تحقیق سے حل ہو سکتا ہے نہ کہ تخیل سے

اس میں شک نہیں کہ مارکس نے اجتماعی زندگی کا مطالعہ سائنٹفک اصول سے کیا ہے۔ اس نے جو ترکیب مسئلہ معیشت کے حل کرنے کے لئے نکالی ہے وہ سائنٹفک ترکیب ہے۔ اپنے عمیق مطالعہ

سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا میں ہر انسان کی نقل و حرکت جنبش و سکونت اگر یادداشت میں نوٹ کرلی جائیں تو وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہیں۔ تاریخ کے متعلق اس نے جو خاص بات بتائی وہ یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ کا مبدأ او منبع مادیات ہیں اور چونکہ مادیات میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اس لئے دنیا میں انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے حرکات مادیاتی کیف پر منحصر ہیں۔ اسی واسطے دنیا کی تہذیب، تمدن، مادیات کی تبدیلی سے بدل جاتے ہیں۔ ... مارکس نے جو مادی تغیر کی بات ہیں بتایا۔ شاید یہی تاریخ کا منبع ہو۔

حقیقت میں کیا مادیات ہی تاریخ کا منبع ہے؟ جنگ عظیم۔

کیا ہے کہ یہ بات غلط ہے ۔ ۔ ۔ ۔ امریکہ میں ولیم ام مارکس کا ایک

نے جو مادیات کو تاریخ کا مرکز اور منبع ثابت کیا ہے وہ غلط ہے ۔

منبع نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخ کا مرکز اجتماعی زندگی کا سوال ہے۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہو ...

اجتماعی زندگی نہ صرف تاریخ کا منبع ہے۔ بلکہ بقا کا مرکز بھی ہے۔ یہی معقول بات ہو۔

اس بنا پر ہماری معیشت بقائے انسان کا سوال ہے۔ وہ اصول کے لحاظ سے ارتقاء اجتماعیت کا مرکز ہے اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے تاریخ کا منبع ہے اتنا کہنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تاریخ کا مرکز و منبع معیشت ہو نہ کہ مادیات ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے ہم معیشت کے اصول پر غور کرتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں اور تحقیق کرتے ہیں کہ اسی لفظ معیشت میں مسئلہ اجتماعیت مضمر ہے۔ یہ لفظ اجتماعیت یا اشتراکیت سے کہیں زیادہ صاف اور واضح ہے ۔ اسی وجہ سے ہم نے معیشت کو اپنی اصطلاح کے لئے منتخب کیا ہو۔

ولیم یہ کہتا ہے کہ ہر عہد میں خواہ قدیم زمانہ ہو۔ خواہ جدید، انسان کی یہ کوشش رہی ہے کہ زندگی اور بقا کا سوال حل ہو جائے۔ انسان کا اپنی زندگی اور بقا کے لئے کوشش کرنا، ارتقاء اجتماعیت کا قانون اور تاریخ کا منبع ہے۔ مارکس کا نظریہ مادیات، ارتقاء و اجتماعیت کا قانون نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہوگا اور نہ وہ تاریخ کا منبع ہے اور نہ ہوگا ۔

مارکس نے اپنے مشاہدات سے یہ ثابت کیا کہ درجات وطبقات کے نزاعات صنعتی انقلاب کے بعد کی نئی چیزیں نہیں ہیں بلکہ جتنے زمانے گزرے ہیں ہر ایک میں درجات کی نزاع پائی جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں آقا غلام سے لڑتا تھا۔ زمیندار اور کسان کے درمیان نزاع ہوتی تھی۔ شریف ورذیل کے مابین دشمنی ہوتی تھی۔ مختصراً یہ کہ ہر دبانے والے اور ہر دبے ہوئے کے درمیان جنگ ہوتی تھی۔ جب تک سوشیل نظام میں خرابی رہے گی۔ تب تک یہ نزاع جاری رہے گی جبتک سوشیل نظام میں انقلاب ہوگا تب تک طبقات کا تنازع کبھی نہ مٹ سکے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ طبقات کا تنازع اجتماعی زندگی کی کشمکش سے ہوا اور اسی اجتماعی زندگی کی کشمکش سے دنیا کو ترقی ملی چونکہ اب تک یہ کشمکش باقی ہے۔ لہذا دنیا بھی حسب دستور ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے

ارتقاء اجتماعیت کے معاملے میں مختلف پہلو موجود ہیں اگر ہم صرف معیشت کا پہلو لیں اور اسی کی روشنی میں سرسری طور پر ممالک مغرب کے معاشی حالات پر نظر ڈالیں تو اس میں سے کم سے کم ہمیں چار چیزیں نظر آئیں گی۔ (۱) سوسائٹی اور صنعت کی اصلاح۔ (۲) ذرائع نقل وحمل پر عوام کی ملکیت۔ (۳) محصول بلاواسطہ۔ (۴) عناصر اجتماعیت کا تناسب اور ہم آہنگی ...... اگر مارکس کے نظریہ کے مطابق ہم ان چار چیزوں پر حکم لگائیں تو ضرور ہم یہ کہیں گے کہ یہ درجات کے تنازع سے رونما ہوئیں۔ سرمایہ دار اور مزدور کے فائدہ و نفع کے ایک دوسرے کے منافی ہونے کی وجہ سے تصادم برابر جاری رہتا ہے۔ اس تصادم میں طرفین میں سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے نزاعات پیدا ہوتی ہیں۔ ہیں نزاعاتی کشمکش سے اجتماعی زندگی کو ترقی ملتی ہے لیکن اگر ممالک مغرب کے موجودہ اجتماعی حالات کی تحقیق کریں تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ ان دونوں کا نفع وفائدہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسرے کا معاون ہے۔ اس اعتبار سے جس چیز سے اجتماعیت کو ارتقاء و ترقی ملی ہے اور ملتی ہے وہ اجتماعی زندگی کی ہم آہنگی ہے۔ وہ ہم آہنگی جس میں سرمایہ دار مزدور دونوں کا فائدہ یکساں ہے۔ نہ کہ وہ تصادم جس سے طرفین ایک دوسرے کے متضاد ہوجاتے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنا معیشت کی رو سے ایک دوسرے کو نفع وفائدہ پہنچانا ہے،

اور سب کو یکساں نفع وفائدہ ملنے سے اجتماعی زندگی میں ترقی ہوتی ہے اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا
ہونا ناممکن ہے جبکہ بنی نوع انسان کو مسئلہ معیشت کا کوئی حل نہ ملے۔ آدم سے لے کر آج تک لوگ جد وجہد کرتے
رہے ہیں، کرتے ہیں اور کریں گے، وہ اس لئے ہے کہ ان کی زندگی قائم رہے۔ انسان کا اپنی بقا کے
لئے کوشش کرنا، اجتماعی زندگی کی ترقی کا سبب ہو۔ درجاتی نزاع اس کا سبب نہیں ہے درجاتی
نزاع کی حیثیت اجتماعی زندگی کی راہ میں صرف اتنی ہے کہ وہ انسانی زندگی کا ایک مرض ہے جو بقائے
حیات قائم کرنے میں معقول ترکیب نہ ملنے سے پیدا ہوا۔ زندگی کو قائم کرنے میں مشکلات پیش آنے سے
آخر درجاتی مرض لاحق ہوا۔ مارکس نے جو مسئلہ اجتماعیت پر غور ومطالعہ کیا تو ا
کا مرض نظر آیا جس کو اس نے ترقی کا سبب سمجھ لیا حالانکہ درحقیقت
مارکس کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے صرف اجتماعی
کیا، نہ کہ ترقی کا سبب۔

مارکس دنیا کے تمام پیداوار کے کارنامے مزدوری پیشہ طبقہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس
سوسائٹی کی انفرادی محنت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ سوسائٹی کا ہر فرد چاہے بالواسطہ ہو یا
بالواسطہ، مال کی پیداوار اور نکاسی میں ضرور کچھ نہ کچھ سوسائٹی کی خدمت کرتا ہے ..... مانا کہ سرمایہ دار
اور مزدور کے مفاد میں ہم آہنگی نہیں ہے جس سے نزاعات پیدا ہوتی ہیں۔ پھر بھی جن سرمایہ داروں سے وہ جنگ
کرتے ہیں وہ سوسائٹی کے بااثر اور قابل لوگ ہیں۔ مزدوری پیشہ طبقے کیسے ان کے خلاف جنگ کر سکتے
ہیں، وہی لوگ اُن سے جنگ کرتے ہیں جو سرمایہ داروں کے شاکی ہیں اور جنہوں نے مزدوروں پر
اثر اور رعب جما رکھا ہے ...... الغرض تمام انسانوں کو اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے معاشی
نزاع دور کرنا ہے۔ اس لئے اُن کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اجتماعی مفاد مدنظر رکھتے ہوئے درجات
طبقات کے حدود مٹانے کی کوشش کریں اور اُن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے کام کریں، جب
اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو گئی تو پھر اس کی ترقی کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی۔ اس
وقت تمام انسان بے خوف وخطر رہ سکتے ہیں۔ معیشت کا اصول اسی مسئلہ کو حل کرتا ہے۔ ان وجوہ سے

ہم یہ کہتے ہیں کہ معیشت ہی اجتماعی زندگی کی ترقی کا منبع اور اس کی اصلی قوت ہے۔

ان کے علاوہ اور بہت سی باتیں ہیں جن کو مارکس نے اپنے خیال کے مطابق ہمیں بتایا۔ لیکن وہ اسی زمانے میں خلاف واقع ثابت ہوئیں۔ اُن میں سے صرف ایک بات کا ذکر کرنا اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ اس نے اپنے نظریہ کو کس غلط بنیاد پر رکھا ہے۔ مارکس کا یہ خیال تھا کہ عالم میں اگر سرمایہ دار لوگ زیادہ ہوگئے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو کھا جائیں گے، اور خود بخود مٹ جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ ہم کو یہ بتا رہا ہے کہ سرمایہ داروں کے بجائے مٹنے کے توقع سے زیادہ ترقی ہوتی جاتی ہے۔ مارکس کی رائے ہے کہ تین شرائط پر عمل کرنے سے سرمایہ داروں کو خالص نفع مل سکتا ہے۔ (۱) مزدوری میں کمی کرنا۔ (۲) کام کا وقت بڑھانا۔ (۳) پیداوار کو غیر معمولی قیمت پر فروخت کرنا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب ہم کارخانہ فورڈ کے صنعتی اصول کا مارکس کے اس نظریہ سے مقابلہ کریں تو پورا پورا برعکس ثابت ہوتا ہے یعنی باوجودیکہ مزدوری میں اضافہ کیا، کام کا وقت گھٹایا، اور سستے دام فروخت کیا پھر بھی مالک کارخانہ کو نفع ہی نفع ملتا ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ جو کچھ روپیہ پیسہ سرمایہ داروں کو ملتا ہے وہ مزدوروں کے نفع میں سے ہے ۔ ۔ ۔ ۔ پیداوار کی نکاسی لین دین، خرید و فروخت کا معاملہ تاجروں سے ہوتا ہے۔ مگر پیداوار تو بیچارے مزدوروں کی محنت سے ہوتی ہے۔ مالک کارخانہ اور تاجر دونوں مل کے بیچ میں فائدہ اٹھاتے ہیں اور بیچارے مزدوروں کو محروم کر دیتے ہیں، اس سے اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دار مزدوروں کے لئے نقصان دہ اور دنیا کے لئے مضر ہیں اس لئے ان کو مٹانا ضروری ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے خیال کے مطابق سرمایہ دار کو پہلے مٹانا پڑے گا اس کے بعد تاجر کو ۔ ۔ ۔ مگر آج اتحادی جمعیت کا نظام قائم کیا جا رہا ہے جس کے ذریعہ سے سب سے پہلے تاجر مٹ جائے گا۔ بعد میں سرمایہ دار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی مارکس کی رائے کے خلاف ظاہر ہوا۔

اس کے نظریہ کے مطابق، دنیا کی صنعتی ترقی کثرت پیداوار پر موقوف ہے اور پیداوار کی کثرت، کافی سرمایہ پر ہے۔ جب سرمایہ کافی ہو تب پیداوار میں اضافہ ہو سکتا ہے اور صنعت کو ترقی مل سکتی ہے اور مالک کو نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر لوہے کے کارخانہ (ہان کیو ہیین) کے پاس کافی سرمایہ ہے۔

اور پیداوار بھی کثرت سے ہوتی ہے۔ چاہئے تھا کہ نفع ملتا اور ترقی ہوتی مگر خسارہ ہوتا ہے۔ یہ کیوں ؟
...... اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ صنعت کی ترقی کا پیداوار اور سرمایہ کے اوپر دارومدار
نہیں ہے صنعتی ترقی کا دارومدار صرف اس پر ہے کہ سوسائٹی کتنا سامان قبول کر سکتی ہے اور کتنے
کی ضرورت ہوتی ہے۔ پیداوار اگر زیادہ ہو اور نکاسی کم تو کیسے نفع مل سکتا ہے۔ اسی واسطے آج کل
دنیا میں جتنے بڑے بڑے کارخانے ہیں ان میں جتنا مال وسامان تیار کیا جاتا ہے۔ وہ سوسائٹی
کی ضرورت کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں بعض [illegible]
مدد کرتے ہیں، [illegible] نکاسی کی وجہ سے اجتماعی زندگی کا سوال پیدا [illegible]
صنعتی ترقی نہ پیداوار پر موقوف ہے اور نہ سرمایہ پر بلکہ عوام کے [illegible]
گویا سیاسی تحریک کا مرکز ہے۔ نزاعات طبقات کا باعث اور [illegible]
تمام دشواریوں کو دور کرنے میں ہم کو ہرگز یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ [illegible]

مسئلہ معیشت حل کرنے کی ترکیب :-

ہر ملک کے حالات مختلف ہوتے ہیں اور سرمایہ کی حیثیت کے اختلاف کی وجہ سے مسئلہ معیشت کے
حل کرنے میں مختلف ملک مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں..... ممالک مغرب نے مسئلہ معیشت کو
حل کرنے کے لئے اب تک کوئی خاص اور معقول ترکیب نہیں نکالی ہے، بہرحال اس کے متعلق دو جماعتیں
موجود ہیں جو کہ اس مسئلہ پر غور کرتی ہیں۔ ایک وہ جماعت ہے جو مارکس کے خیال کے مطابق مسئلہ معیشت
میں مکمل تبدیلی یعنی انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔ یہ سرعت پسند جماعت ہے جس کی رائے میں سیاسی معیشت
کا حل صرف انقلاب سے ہو سکتا ہے۔ دوسری جماعت وہ ہے جو کہ ایک پرامن طریقہ اختیار کرنا
چاہتی ہے اور اس پرامن طریقے کے ماتحت سیاسی مفاوضات اور سمجھوتے سے طرفین کو باہم ملا کر اس
مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہ سوشلسٹ ہیں (غیر اہل اشتراکیت)، ان کے خیال میں یہی
بہتر طریقہ ہے جس سے مسئلہ معیشت کے حل ہونے کی امید ہے۔ ممالک مغرب میں ان دونوں جماعتوں
کی کشمکش بڑی شدید ہے، ہر ایک نے غیر معمولی روش اختیار کر رکھی ہے۔ ان میں تصادم پیدا ہوتا ہے

اور ہر ایک اپنے ہی راستے پر چلتا ہے۔

انقلاب سے مسئلہ معیشت کا حل کرنا مشکل ہے؛

انقلاب کے ذریعہ سے مسئلہ معیشت کو حل کرنے کی ترکیب روس نے اختیار کی تمار کو تخت سے اتارے ہوئے ایک مدت ہو چکی ہے۔ مگر روس میں صرف سیاسی معاملے کا حل ہوا ہے۔ جہاں تک معیشت کا تعلق ہے۔ انقلاب روس کے بعد ہی ابتک کوئی اس کا معقول حل نظر نہیں آیا۔ آج کل روس نے اگرچہ معاشیات کے متعلق ایک نئی اسکیم تیار کی ہے مگر وہ بھی زیر تجربہ ہے فوراً اس پر کاربند ہو جانا ناممکن ہے اس سے معلوم ہوا کہ معیشت کا سوال انقلاب سے حل کرنا مشکل ہے بلکہ ایک معقول ترکیب درکار ہے یہی وجہ ہے کہ ممالک مغرب کے اہل معاش اور ماہرین معیشت، روسی علماء کے ہمخیال نہیں ہیں اور ان کی رایوں کو ناقابل قبول سمجھتے ہیں۔ علماء مغرب کا خیال ہے کہ مسئلہ معیشت، سیاسی تحریک اور مفاوضات سرمایہ دار اور مزدور کے سمجھوتے سے حل ہو سکتا ہے۔ طرفین کو سیاسی تحریک سے ملا دینا ایک دن کا کام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے عرصہ دراز کی ضرورت ہے۔ جلد بازی نہایت تلخ پھل لاتی ہے۔ یہ لوگ امن پسند اور اتحاد پسند ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا کے جتنے سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک ہیں ان کو مارکس کی ترکیب سے کچھ نہ ملے گا کیونکہ اس سے معیشت کا حل نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک صرف امن کے طریقے، صلح کے طریقہ سے اور اتحاد کے طریقہ سے اس کا حل ہو سکے گا۔ اس کی ترکیب کیا ہے؟ اس کی ترکیب ہم ذکر کر چکے ہیں، یعنی (۱) سوسائٹی اور صنعت کی اصلاح (۲) ذرائع نقل وحمل پر عوام کی ملکیت۔ (۳) محصول بلاواسطہ (۴) عناصر اجتماعی کا تناسب اور ہم آہنگی ۔ ۔ ۔ ۔ اتحادی جمعیت یہ چار باتیں مارکس کی رائے کے خلاف ہیں۔

ممالک مغرب کی آئندہ اجتماعی زندگی:

حقیقت میں ممالک اپنی اجتماعی زندگی اور مسئلہ معیشت کے حل کرنے کے لئے کیا عمل اختیار کریں گے اور ان کا طرز کیا ہوگا، اس وقت ہم قطعًا کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امن اور اتحاد پسند لوگوں کے خلاف اہل سرمایہ نے ناراضگی ظاہر کی۔ اس بنا پر بہت ممکن ہے کہ لوگوں کو جلد بازی کرنی

پتے یعنی انقلاب کے ذریعہ سے موجودہ معیشت کا نظام الٹ دیں اور قوت سے اس کا حل نکالیں اب سرمایہ داروں کا حال یہ ہو کہ وہ اس طریقہ سے اپنے مفاد و منافع کی حفاظت کرنے کو تیار ہیں جس طریقہ سے اہل شہنشاہیت تخت شاہی کی حفاظت کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لوگ شخصیت اور استبداد کے سوشیلسٹ کے خلاف اُٹھیں گے اور ان کو قوت سے دبائیں گے۔ ان وجوہ سے ممکن ہے کہ مغرب کے معیشت کے مصلح حالات کی مجبوری سے مارکس کے عقیدہ پر عمل کرنے کو آمادہ ہو جائیں۔

اشتراکیت :

اشتراکیت کا نظام اُس زمانے سے قائم ہوا ہوگا جس زمانے سے ... بعد یہ نظام پھر ٹوٹ گیا ہوگا۔ مگر کون سے زمانے میں یہ نظام ٹوٹا؟ یہ نظام اس زمانے میں ٹوٹا جس زمانے میں ضرب نقود کی ابتدا ہوئی سکا نظام اس طریقہ سے الٹ گیا ہوگا جس طریقہ سے شین کی اختراع ... ہوگیا ۔ ۔ ۔ ۔ اس زمانے میں عالم کے اکثر سمجھدار اور طاقتور لوگوں نے دنیا کے تمام ذرائع معاش پر اپنے ذاتی منافع اور مفاد کے لئے قبضہ کر لیا ہوگا اور ناتوان کو اپنا غلام بنانے کی کوشش کی ہوگی تاکہ وہ ان کی بجائے کام کریں جس کی وجہ سے انسان انسان کے درمیان نہایت دردانگیز اور المناک واقعات پیش آئے ہوں گے۔ خونریزی تو کیا مقتولوں کے پہاڑ لگادئے گئے ہوں گے، خون کے دریا بہادئے گئے ہوں گے۔ مگر یہ نزاعات کب ختم ہوں گی؟ یہ نزاعات اشتراکیت کے دوبارہ پیدا ہونے کے بعد موقوف ہوں گی، اشتراکیت کے زمانے میں تمام عوام کو روٹی مل سکتی ہے جس سے انسان کا انسان کے ساتھ جنگ وجدال دور ہو سکتا ہے۔

معیشت اور اشتراکیت :

اشتراکیت جو دنیا میں رونما ہوئی اس کی اصلی غایت اجتماعی زندگی کو درست کرنا اور مسئلہ زندگی کو حل کرنا ہے۔ ہماری جماعت کی معیشت کا اصول، نہ صرف ایک اعلیٰ خیال ہے جس پر عمل کرنے سے اجتماعی زندگی کا سوال حل ہوجاتا ہے بلکہ یہی اجتماعیت کا سرچشمہ و مرکز ہے اور تاریخی واقعات کا محرک اور منبع اجتماعی زندگی کا حل ہونا معیشت کے حل ہونے پر موقوف ہے۔ انسان کو اس وقت راحت و آرام ملیگا جب

اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے۔ اس موقع پر ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ بتائیں کہ معیشت اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت ہماری معیشت کا خواب ہے اور معیشت اس کی تعبیر ہے۔ حقیقت میں ان دونوں کے درمیان کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ صرف طرز عمل کا اختلاف ہے۔

چین کی اجتماعی حالت:

ہم اس وقت تک معیشت کے متعلق کوئی اطمینان بخش اسکیم نہیں تیار کر سکیں گے، جب تک ہم تاریخ اور واقعات سے مواد نہ اخذ کریں۔ صرف منطقی بحث سے ہم کو کیا ملے گا! . . . . چین کے صحیح حالات اور واقعات کیا ہیں؟ یہ تو سب جانتے ہیں کہ غربت ہے، افلاس ہے۔ یہاں غم خوردہ، دل شکستہ اور مصیبت زدہ رہتے ہیں، کہنے کو تو یوں ہے کہ چین نگارخانہ ہے۔ مگر حقیقت میں چالیس کروڑ خدا کی مخلوق باشقت اپنی زندگی اس سرزمین میں کاٹتی ہے۔ اہل چین دولتمندی کے دولتمند نہیں بلکہ مفلسی کے دولتمند ہیں۔ یعنی یہاں بڑے سے بڑے مفلس اور غریب کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مگر چھوٹے سے چھوٹا دولتمند شاذ و نادر۔ نواب اور اجارہ دار کا تو کیا ذکر۔ اہل چین کے قول "دولت و غربت میں توازن نہیں" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دولتمند کا سر آسمان پر ہے، اور غریب کا سر زمین کے نیچے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن میں کوئی چھوٹا غریب ہے اور کوئی بڑا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل سرزمین چین میں ایک بھی ایسا زمیندار نہیں ہے جو حقیقۃً زمیندار کہلانے کا مستحق ہو۔ بلکہ غریب اور مفلس نما زمیندار ہیں . . . . . اس زمانے میں جب کہ یورپ کا معاشی طوفان چین کی طرف بہتا آرہا ہے اور ہر قسم کے نظام میں کچھ نہ کچھ تبدیلی نظر آتی ہے تو سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمین کس کی ملکیت میں رہنا چاہئے۔ کوئی کہتا ہے کہ زمیندار کے ہاتھ میں رہنا چاہئے وہی اس کا تنہا مالک ہے کوئی کہتا ہے زمین زمینداروں سے چھین کر حکومت کے ہاتھ میں آنا چاہئے۔ یہ بالکل وہی سوال ہے جو مغربی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان پیدا ہوا۔ مزدوری طبقے یہ سمجھتے ہیں کہ مال کے منافع و مفاد ہمیں ملنے چاہئیں، سرمایہ دار یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہی منافع و مفاد کے مستحق ہیں۔

زمین کا سوال :

اس میں شک نہیں کہ زمین کی قیمت کا بڑھنا اور گھٹنا عوام کی محنت اور کوشش سے ہوا د
زمیندار کو مطلقاً اس میں دخل نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عوام اپنی محنت ومشقت سے جس زمین کو اصلاح کر کے
اچھی بنا لیتے ہیں اُس زمین کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور یہ لازمی بات ہو کہ جب کسی زمین کی قیمت بڑھتی
ہے تو اس کے ارد گرد جو ضروریات اور لوازمات ہیں ان کی قیمت بھی بڑھنے لگتی ہے مطلب یہ ہے
کہ زمین سے جو کچھ اور جس قدر منافع پیدا ہوتے ہیں وہ عوام کے پیدا کردہ ہیں۔ مگر حقیقتہً مالکان زمین
سارے منافع پر قبضہ کر کے اپنا ہی بنا لیتے ہیں۔ اس ناانصافی اور ظلم کو دور کرنے کے لئے ... اور
نے کوئی ترکیب ہمیں نہیں بتاتی ہے ۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اس و...
کرنی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت اس کا حل کرنا ہمارے لئے بہ نسبت اور...
اگر صنعت وحرفت کی ترقی کے بعد ہم اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کریں
لئے نہایت دشواری ہوگی ۔

معیشت اور اہل انقلاب چین :

ہاں ہم نے ذکر کیا تھا کہ زمین کس کی ملکیت میں رہنا چاہئے ، زمینداروں کے ہاتھ میں یا حکومت
کے ؟ اور اس کے متعلق اہل انقلاب کے پاس کیا ترکیب ہو ؟ ہمیں اس کی کوئی پروا نہیں کہ زمین کی
ملکیت زمینداروں کے ہاتھ میں رہے یا حکومت کے۔ سوال صرف یہ ہو کہ ہمارے پاس کیا طریقہ ہے جس
سے ہم مسئلہ زمین کو حل کر سکیں اور جس سے کسان، زمیندار اور حکومت تینوں مطمئن ہو جائیں اور کوئی
کسی کا شاکی نہ ہو۔ اس کے متعلق ہمارے پاس ایک ترکیب ہو کہ ملکیت میں تناسب اور مساوات قائم
ہے۔ معیشت کی غرض وغایت یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے متعلق جتنے ذرائع معاش ہیں۔ اُن کی ملکیت
میں توازن اور مساوات قائم کی جائے جس سے نہ زمینداروں کو نقصان ہو اور نہ حکومت کو نفع ۔ نہ
حکومت کو نقصان ہو اور نہ مالکان سرمایہ کو نفع ۔ اُن کی ملکیت یکساں رہے اور نفع دونوں کو برابر ملے۔
اس وقت ہمارا سب سے اہم کام ملکیت کا سوال حل کرنا ہے اس کے متعلق ہمارے پاس ایک

ترکیب ہو کہ ملکیت میں تناسب اور مساوات قائم رہے۔ معیشت کی غرض وغایت یہ ہو کہ اجتماعی زندگی کے متعلق جتنے ذرائع معاش ہیں، اُن کی ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کی جائے جس سے نہ زمینداروں کو نقصان ہو اور نہ حکومت کو نفع نہ حکومت کو نقصان ہو اور نہ مالکان سرمایہ کو نفع۔ اُن کی ملکیت یکساں رہے اور نفع دونوں کو برابر ملے۔ اس وقت ہمارا سب سے اہم کام ملکیت کا سوال حل کرنا ہے۔ اس کے حل کئے بغیر ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کرنا ناممکن ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس بات کو سن کر غالباً مالکان اور زمینداران کے دلوں میں وہم اور خوف پیدا ہوا ہوگا کہ ہم اُن کے حقوق اور ملکیت چھیننے کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ حقیقت میں یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ہماری جماعت کی ترکیب سے زمین کے متعلق جو فیصلہ کیا جاتا ہے اس سے زمینداروں کو بالکل مطمئن اور بے ڈر رہنا چاہیئے ۔ ۔ ۔ یہ ترکیب کیا ہے؟ وہ یہ کہ حکومت زمین پر قیمت کے مطابق محصول لگائے گی یا قیمت کے مطابق زمینداروں سے خریدے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تک میرا خیال ہے قیمت کے متعلق زمیندار کو فیصلہ کرنا چاہئے یعنی وہ خود زمین کی قیمت مقرر کر کے حکومت کو اطلاع دیدیں تاکہ حکومت اُن کے مطلع شدہ قیمت کے مطابق زمین پر محصول لگائے یا اُن سے خریدے۔ محصول تو عموماً ایک فیصدی $\frac{1}{100}$ کے حساب سے لگائیں گے۔ زمینداروں کو اختیار رہے زمین کی قیمت جتنی لگانا چاہیں لگا سکتے ہیں قانوناً ان کا اطلاع نامہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ مگر حکومت کو یہ اختیار رہے کہ چاہے مطلع شدہ زمین پر محصول لگائے اور چاہے اسی قیمت پر زمینداروں سے خریدے۔ یہ دو اختیار دینے سے طرفین کی تعدی رک جاتی ہے۔ نہ حکومت زمینداروں پر ظلم کر سکتی ہے کہ وہ مفت اُن کی ملکیت چھین لے اور نہ زمینداروں کو حکومت سے زیادہ وصول کرنے کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ اگر زمینداروں نے واجبی قیمت سے زیادہ حکومت کو اطلاع دی تو ممکن ہے کہ حکومت قیمت کے مطابق زمین پر محصول لگائے اور اُن سے خریدے نہ۔ اگر انھوں نے کم دام کو بتائے تو یہ بھی احتمال ہے کہ حکومت اُن سے بجائے محصول کے قیمتہً خرید لے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان وجوہ سے زمیندار یقیناً ٹھیک ٹھیک دام بتا دیں گے نہ زیادہ اور نہ کم۔ قیمت تعین کرنے کے بعد ہم زمین پر ایک قانون نافذ کر دیں گے وہ یہ کہ اُس سال سے جس زمین کی قیمت کا تعین

ہوا ہے ۔ زمین کی قیمت جتنی بڑھے یا بڑھائی جائے وہ اصلی قیمت کے علاوہ سب کی سب حکومت کی ملکیت ہوگی نہ کہ کسی فرد کی . . . . یہ سب ہماری ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کرنے کی ترکیب ۔ اسی سے ہم کو معیشت کا سوال حل کرنا ہے یہ گویا ایک قسم کی اشتراکیت ہے ۔ مگر حقیقت میں اشتراکیت سے بالکل الگ ہے ۔ یعنی ہماری اشتراکیت مستقبل میں ہوگی نہ کہ حال میں ۔ اور یہ مستقبل کی اشتراکیت بالکل انصاف اور عدل پر قائم ہوگی ۔ اس وقت جس کے پاس زمین ہے اگر وہ ہماری ترکیب کے مطابق عمل کرے تو اس کو نقصان نہ ہوگا ۔ اور نہ حکومت کو یہ ترکیب اہل یورپ کی ترکیبوں سے بالکل علیحدہ ہے اہل یورپ کی رائے میں عوام کی جتنی ملکیت اور جائداد ہے بلا معاوضہ یا خفیف معاوضہ دے کر حکومت کو ان پر قبضہ کرلینا چاہئے ۔ یہ مالکان اور زمینداران کے لئے ایک نہایت سنگین . . . سوائے تباہی کے اور کچھ نہ ہوگا ۔

معیشت کا سوال حل کرنے میں یہ بات ضروری ہے کہ ہم سے بڑا سرمایہ دار ہے ۔ وہ زمیندار ہے ۔ یہ زمیندار اگرچہ بین الاقوامی سرمایہ دار غریب کے برابر ہے مگر اپنی قوم کے اندر اس کو سرمایہ دار خیال کرنا پڑتا ہے کیونکہ چین میں جو کچھ روپیہ پیسہ ہے اکثر اسی کے پاس ہے ۔ زمیندار کے علاوہ اور کوئی ایسے بڑے کارخانہ کا مالک نہیں ہے جس کے پاس بے شمار دولت ہو ۔ زمین کی ملکیت میں توازن اور مساوات قائم کرنا ایک طرف سے سرمایہ کو محدود کرنا ہے اور دوسری طرف سے مسئلہ معیشت کے حل کرنے میں آسانی بہم پہنچاتا ہے چین کو اپنے معیشت کے سوال کو حل کرنے کے لئے محض سرمایہ کا محدود کرنا کافی نہیں ہے کیونکہ غیر ممالک دولتمند ہیں اور چین غریب ۔ غیر ممالک کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے اور چین کی پیداوار ضرورت سے کم ۔ اس وقت چین کو نہ صرف ذاتی ملکیت اور سرمایہ کا محدود کرنا ہے ۔ بلکہ ملکی ملکیت اور قومی سرمایہ کو بڑھانا اور ترقی دینا ہے ۔ قومی سرمایہ کے ذریعے دستکاری کو ترقی دے کر معیشت کا سوال حل ہونے کی امید ہے ۔ صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے بہت سے طریقے ہیں ۔ مثلاً ذرائع آمدورفت ، حمل و نقل اعلیٰ پیمانے پر تیار کرنا ۔ ریلوے کی تعمیر کرنا ۔ دریا کھودنا ۔ جہاز کی کمپنی قائم کرنا ۔

شاہراہ بنانا۔ موٹر کے لیے سڑکیں تیار کرنا۔ یہ صنعت کو ترقی دینے کا پہلا زینہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ معدنیات نکالیں خواہ وہ لوہا ہو یا کوئلہ یا اور کوئی چیز۔ چین میں معدنیات بہت ہیں۔ مگر اب تک زمین کے اندر دفن ہیں نہ لوگوں نے ان کو نکالا ہے اور نہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ سبب پوچھئے تو کہتے ہیں سرمایہ کہاں! روپیہ کہاں! اس میں شک نہیں کہ ذاتی سرمایہ اس کام کو انجام نہیں دے سکتا اور نہ کسی شخص کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ تنہا ایک کان کھودے۔ اب قومی سرمایہ سے مدفون ذخیرہ کو نکالنا پڑے گا جس سے سب کو نفع و فائدہ ہوگا۔ تیسرا یہ ہے کہ دستکاری کو سائنٹفک اصول سے ترقی دے اور جدید آلات سے مال کی پیداوار میں کام لے۔ چین میں اگرچہ مزدور بہت ہیں اور کام کرنے والوں کی کمی نہیں مگر مشین نہ ہونے کی وجہ سے چین کی صنعت غیر ممالک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا چین کو جن چیزوں کی ضرورت ہے غیر ممالک سے ان کی درآمد کا محتاج ہے۔ اس وجہ سے سالانہ چین کو بیحد روپیہ غیر ممالک کی طرف بھیجنا پڑتا ہے۔ جب ہم درآمد کا سدباب کرنا اپنا روپیہ اپنے ہاتھ میں رکھنا اور اپنے جائز حق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ضرورت اس کی ہے کہ ہم جلد از جلد دستکاری کو ترقی دیں، جدید آلات سے کام لیں تمام مزدوروں کو کاموں میں لگائیں۔ کوئی فرد بیکار نہ رہے اور سب کو روٹی مل سکے۔ جب ہماری دستکاری ترقی کرے گی تب ہماری آمدنی میں اضافہ ہوگا اور چینی باشندے بھوکے نہ مریں گے۔

اجتماعی زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کا اصلی مقصد:

چین کی اجتماعی زندگی کی مشکلات کو دور کرنے سے ہمارا اصلی مقصد غیر ممالک سے کسی قدر مشابہ ہے یعنی یہ کہ تمام باشندے خوشحالی اور فارغ البالی کی زندگی بسر کریں اور ہر قسم کی مصیبت و تکلیف جائداد کے عدم تناسب ملکیت کی عدم مساوات اور طبقات کی جنگ سے آزاد ہو جائیں یعنی ایک مشترک زندگی جس میں نہ امیر و غریب کا امتیاز ہو نہ رنگ و لہو کا فرق ہو۔ اور نہ من و تو کا احساس ہو۔ ہمارے تین اصول ہیں یعنی جمہوری ملکیت، جمہوری نظام، جمہوری منافع . . . . حکومت عوام کی ملکیت ہوگی معاملے عوام کے انتظامات سے ہوں گے۔ منافع و مفاد میں عوام حق دار ہوں گے . . . . . عوام نہ صرف جائداد و ملکیت میں شریک ہوں گے بلکہ ہر چیز میں۔ یہی معیشت کی اصلی غایت ہے اور اسی

کوسمانفوش کے الفاظ میں عالمگیر حکومت کہتے ہیں۔

روٹی کا سوال:

معیشت میں جو سب سے اہم سوال ہے وہ روٹی کا ہے۔
... روٹی کے سوال پر ایک نظر . . . . . جن ملکوں میں کافی روٹی مل سکتی ہے ان میں اول
نمبر امریکہ ہے۔ وہ نہ صرف اپنے ملک کے باشندے کو پیٹ بھر کے کھلا سکتا ہے۔ بلکہ اہل یورپ اس سے
بہت کافی مدد لیتے ہیں۔ دوسرا نمبر روس ہے وہ ایک نہایت وسیع اور زرخیز ملک ہے۔ وہاں کے
باشندے بہ نسبت اور ملک کے بہت کم ہیں۔ پیداوار اس کی بہت
مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، کناڈا، جنوبی امریکہ اور ا
کثرت سے غلے پیدا ہوتے ہیں خود استعمال کرنے کے بعد کافی مقدا
غیر ممالک کی کمی پوری ہوتی ہے۔ جنگ عظیم کے زمانے میں جل
کے لیے طاقتوں نے قبضہ میں کر لیا جس سے غلہ کی آمد و رفت کا راستہ بند ہو گیا۔ اور یورپ
تھا کہ آثار نمودار ہوئے۔ اس وقت اہل یورپ روٹی کے لئے بہت پریشان ہوئے اور قریب
تھا کہ غلہ کی کمی کی وجہ سے اہل یورپ بھوکے مر جائیں۔ اس اثنا میں چین کے اندر اس لئے روٹی کا
سوال نہیں پیدا ہوا کہ نہ سیلاب تھا جس سے کھیتی باڑی برباد ہو جائے، نہ بارش کی کمی تھی جس سے
غلہ کی فصل کم ہوا اور نہ اور کسی قسم کی آسمانی آفت تھی جس سے قحط کا اندیشہ ہو۔ کسان خوشحال تھے۔
غلے کثرت سے پیدا ہوئے تھے گویا اہل چین پر خدا کی برکت تھی جس سے اس مضطرب زمانے میں
چین کو روٹی کا سوال پیش نہ آیا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ دنیا کے کن کن ملکوں کو روٹی کی کمی ہے۔
یورپ کے مغرب میں ایک ملک جو تین جزیرے تا سے بنا ہے اور جس کو برطانیہ عظمیٰ کہتے ہیں، اس
میں سال بھر میں جو غلے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف تین مہینے کے لیے کافی ہوتے ہیں اور نو مہینے
کی روٹی باہر سے منگنی پڑتی ہے۔ جنگ عظیم کے موقع پر جب جرمنی نے سمندر کا سد باب کر دیا اور
جہازوں کو روک دیا تو قریب تھا کہ روٹی نہ ملنے کی وجہ سے سارے انگریز مر جائیں۔ ایشیا کے مشرق

میں ایک ملک ہو وہ بھی تین جزیرے نما سے بنا ہے اور جس کا نام جاپان ہے۔ اس کی سالانہ غلہ کی پیداوار جو ہے وہ اس کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔ تاہم جاپان کو روٹی کی فکر اتنی نہیں ہے جتنی کہ بمقابلہ کو کیونکہ اس کو صرف ایک مہینے کے لئے روٹی کی کمی پڑتی ہے اور اپنے ملک کی پیداوار سے گیارہ مہینے تک کام چلا سکتا ہے جرمنی کا غلہ صرف دس مہینے کام دیتا ہے۔ دو مہینے کی روٹی کے لئے غیر ممالک کا محتاج ہو۔ اُن کے علاوہ اور بہت سے ممالک ہیں جن کو روٹی کی فکر رہتی ہے۔ امن والے زمانے میں بھی جرمنی کو کافی روٹی نہیں ملتی۔ جنگ عظیم کے موقع پر اس کو اور زیادہ روٹی کی فکر ہوئی کیونکہ اکثر نوجوان کسان فوج میں بھرتی کئے گئے۔ زمین بیکار پڑی رہی جس کی وجہ سے پیداوار اور کم ہو گئی۔ اس لئے بالآخر جرمنی کو شکست کھانی پڑی۔ ان باتوں سے مطلب یہ ہے کہ روٹی کا سوال نہایت اہم ہے۔

۲۔ چین میں روٹی کا سوال . . . . چین کی زمین وسعت کے لحاظ سے امریکہ سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ آبادی کے اعتبار سے اس سے تین گنی زیادہ ہے۔ اگر ہم مقابلۃً چین اور امریکہ کے روٹی کے سوال پر غور کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ چین ہرگز امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر ہم فرانس کے ساتھ مقابلہ کریں تو چینی باشندے فرانس سے نوگنے زیادہ ہیں اور اگر زمین کی وسعت میں مقابلہ کریں تو فرانس کی زمین چین کی صرف ۱/۱۸ کے برابر ہے۔ مگر اہل فرانس نے جن کی تعداد صرف چار کروڑ ہے۔ جدید آلات اور سائنٹفک اصول سے اپنی کاشتکاری کی اصلاح کر لی ہے اور اگرچہ ان کو چین کی صرف ۱/۱۸ زمین ملی ہے مگر ان کو روٹی کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ چین کے پاس اگرچہ وسیع زمین موجود ہے۔ مگر زراعت کی اصلاح نہ ہونے کی وجہ سے پیداوار کم ہوتی ہے جس سے کافی روٹی نہیں مل سکتی۔ آخر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قحط اور بھوک سے جو مرتے ہیں ان کی تعداد لاکھوں ہوتی ہے۔ اگر ساتھ ہی ساتھ کوئی آفت بھی ان پر آجاتی ہے تو لاکھوں کی تعداد کیا بلکہ لاکھوں کے لاکھوں مرجاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صرف دس سال کے اندر نو کروڑ نفوس قحط اور بھوک سے ہلاک ہو گئے۔ یہ کس قدر درد انگیز اور اندوہناک امر ہے! . . . . . یہ روٹی کی کمی کا نتیجہ ہے۔ روٹی کی کمی کاشتکاری اور زراعت کی پستی کی

وجہ سے ہو۔ غیر ممالک کے معاشی دباؤ سے ہے۔ معاشی دباؤ کی وجہ سے چینی غیر ممالک کو روپیہ پیسہ نہیں دے سکتے۔ بجائے روپیہ پیسہ کے، اپنے غلے غیر قوموں کے ہاتھ میں سپرد کر دیتے ہیں۔ اس لئے خود بھوک اور فاقہ پر مجبور ہوتے ہیں۔

۴۔ جنس انسان کے لئے چار ضروری غذائیں ۔ ۔ ۔ ۔ انسان کو کن چیزوں کے کھانے کی ضرورت ہو اور کن چیزوں کے کھانے سے وہ زندہ رہ سکتے ہیں؟ ہم روزانہ اپنی جان بچانے کے لئے جو چیزیں کھاتے ہیں وہ درحقیقت چار اہم جزوں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ پہلی چیز ہوا ہے۔ جب ہم ہوا خور کہتے ہیں تو اس پر اکثر لوگ ہنسنے لگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو ۔ ۔ ۔ بعض نے اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا کہ ہوا کا کھانا کھانا، کھانے ۔ ۔ ۔ دوسری کھانے کی چیز پانی ہے۔ اردو میں پانی پینا کہتے ہیں۔ فارسی میں کوئی فرق نہیں۔ چینی زبان میں پانی پینے کو این، کہتے ہیں جس ۔ ۔ ۔ کبھی پانی پینے کو "چینی" کہتے ہیں جس کے معنی اردو میں کھانے کے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر سن یت سن نے یہاں "چینی" کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے اصلی لفظ اور نیز اس موقع کے آگے پیچھے جملوں کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے یہاں پانی پینے کے لئے کھانے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اگرچہ اردو محاورہ کے خلاف ہے مگر اس جگہ پر کھانے کا لفظ استعمال کرنا ہی مناسب ہے۔ اگر قارئین کے نزدیک یہ عیب ہے تو امید ہے کہ اس عیب سے درگزر فرمائیں۔ بدرالدین) ۔ تیسری چیز حیوانات ہے یعنی گوشت کھانا۔ چوتھی چیز نباتات ہے۔ یعنی غلے، میوے، سبزی وغیرہ ۔ یہ ہوا، پانی، حیوانات اور نباتات جنس انسان کے لئے چار اہم غذائیں ہیں۔ اب تفصیل کے ساتھ ان پر بحث کرتا ہوں۔

(الف) ہوا خور ۔ ۔ ۔ ۔ اگر آپ کو یقین نہیں ہے کہ ہوا کھانے کی ضرورت ہے تو آزمائش کے طور پر آپ یہ کیجئے کہ آپ اپنی ناک بند کر لیں ۔ صرف ایک منٹ تک بند رکھئے۔ تب دیکھئے کہ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ ایک منٹ تک کیا آپ صبر کر سکتے ہیں کہ ہوا نہ کھائیں؟ کیا ایک منٹ تک آپ ہوا نہ کھانے سے تکلیف نہیں محسوس کرتے ہیں؟ ضرور محسوس کرتے ہوں گے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک

منٹ میں آپ کو کتنی دفعہ ہوا کھانے کی ضرورت ہو؟ ایک منٹ میں سولہ مرتبہ۔ ہم روزانہ زیادہ سے زیادہ تین مرتبہ کھانا کھاتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ہیں کھانا کم ملے تو بھی گزر کر سکتے ہیں۔ ایک دو روز تک بھوک برداشت کر سکتے ہیں۔ ہم کو روزانہ ۲۳۰۴۰ مرتبہ ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر اس سے کم ہو، تو ہماری طبیعت ناساز معلوم ہوتی ہے۔ اگر چند منٹ تک ہوا نہ کھائیں تو مرنا یقینی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہوا انسان کی پرورش کے لئے ایک اہم غذا ہے۔ (ب) آب غور . . . . اگر ہم صرف کھانا کھائیں گے اور پانی نہ پئیں گے تو زندگی مشکل ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس کھانا نہیں ہے تو چھ سات دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اگر کسی کے پاس پانی نہیں ہے تو تین چار دن تک ہی جینا محال ہے (ج) حیوانات۔ (د) نباتات۔

ہر جگہ قدرت نے ہوا مہیا کر رکھی ہے دنیا میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ہوا نہ ہو اور ہوا کھانے کے لئے بغیر دام و معاوضہ مل سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اس سے کوئی معاشی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے پانی کی کثرت اور ہر فرد کو بغیر محنت کے مل جانے کی وجہ سے اس سے بھی کوئی معاشی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ الا شاذ و نادر یعنی جہاں پانی کی کمی ہے وہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربستان میں قبائل پانی کے لئے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ حیوانات کا انسان زیادہ محتاج نہیں ہے۔ ان کو کھانے سے اگرچہ فائدہ ہے مگر نہ کھانے سے ضرر نہیں ہے۔ اور نہ ہماری جان مفقود ہونے کا ڈر ہے۔ اسی واسطے ان سے بھی کوئی معاشی سوال نہیں پیدا ہوتا ہے مگر نباتات جو ہیں، ہر شخص ان کا محتاج ہے۔ ان کے نہ ملنے سے انسان کی زندگی کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور ان کی پیداوار انسان کی محنت پر موقوف ہے۔ محنت کی کمی، پیداوار کی کمی کا باعث ہے۔ دنیا میں جس چیز کی کمی یا ناکافی ہونے سے معاشی سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ نباتات ہیں۔ خاص کر اہل چین کے غذا کا دارومدار نباتات ہی پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنے کھانے اور روٹی کا سوال حل کرنے میں سب سے پہلے پیداوار کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

چین کے کسان :

زمانہ قدیم سے لے کر آج تک چین زراعتی ملک رہا ہے۔ اس واسطے زراعت یہاں کی پیداوار کا ایک بڑا چشمہ ہے۔ غلہ کی پیداوار کا تعلق کسان سے ہے۔ کسان جب بے فکری سے اپنی کھیتی باڑی میں جی لگاتے ہیں تو پیداوار میں زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ پریشانی کی حالت میں رہے اور کھیتی باڑی بھی کرے تو اس سے یہ توقع کرنا بالکل حماقت ہے کہ وہ پیداوار میں اضافہ کر سکے گا۔ ضرورت اس کی ہے کہ قانون کے ذریعہ سے کسانوں کو اتنے حقوق دیئے جائیں جن سے وہ اپنی آپ حفاظت کر سکیں۔ چینی باشندوں میں تقریباً نوے فیصدی کسان ہیں۔ مگر وہ اپنی محنت، بڑی جفاکشی اور مسلسل محنت سے جو کچھ کماتے ہیں اور جس قدر غلہ حاصل کر زمینداروں کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں اور جو کچھ ان کے لئے بچتا ہے کافی نہیں ہوتا . . . . پیداوار میں اس وقت اضافہ ہو سکتا ہے کوئی دوسرا طریقہ ہو۔ اور ان کے منافع و مفاد کی حفاظت کی کوئی ترکیب ہو تا کہ وہ پیداوار میں اضافہ کر سکیں۔ یہ سوال زمین کی ملکیت میں تناسب اور مساوات کا ہے۔ آئندہ زمانے میں معیشت کا مقصد پورا ہو سکتا ہے یا نہیں اور کسانوں کے معاملے طے ہو سکتے ہیں یا نہیں یہ صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ آیا کسان خود زمین کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں اگر کسان خود مالک بن جائے گا تو یہ سوال سوال ہی نہ رہے گا اور خود بخود حل ہو جائے گا . . . . چین میں اگرچہ کوئی بڑا زمیندار نہیں ہے مگر اکثر کسان زمین کے مالک بھی نہیں . . . . حال کی تحقیقات سے ہم نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ کسان سالانہ جتنے غلے پیدا کرتے ہیں ان کا نصف سے زیادہ زمینداروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے اور خود ان کو جو ملتا ہے وہ بچا ہے ان وجوہ سے کسانوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ وہ کھیتی باڑی کریں اور زمین جوتیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر زمینیں بیکار پڑی ہوئی ہیں۔

زمین کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے طریقے :

۱۔ جدید آلات . . . . مشین سے زمین جوتنا۔ اس سے پیداوار میں دوگنا اضافہ

ہوگا اور فیج میں دس گنی یا اس سے زیادہ کی تخفیف ہو گی۔

۲۔ کھاد . . . . . کیمیاوی ترکیب سے کھاد بنانا۔ زراعت میں بجلی سے کام لینا، پانی سے بجلی پیدا کرنا وغیرہ۔

۳۔ بیج کی تبدیلی . . . . . بیج تبدیل ہونے سے زمین کی تجدید ہوتی ہے۔ اس کی قوت پیدائش بڑھتی ہے اور عمدہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔

۴۔ مضر چیزوں کا انسداد . . . . . (الف) مضرات نباتات کا جدید طریقے سے استعمال کرنا (ب) نقصان رساں کیڑوں کو دیسی ترکیبوں سے مارنا۔

۵۔ تحفظ . . . . (الف) دیسی ترکیب سے (۱) سوکھا رکھنے سے (۲) نمکین بنا کر (ب) بدیسی ترکیب سے کھانے کی چیزوں کو ابال کر یا پکا کر ٹین میں محفوظ کرنا۔

۶۔ تعمیر ذرائع نقل وحمل . . . . ذرائع نقل وحمل کی کمی کی وجہ سے چین کو خواہ مخواہ آمدنی میں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہ ایک نامعلوم نقصان ہے اور اکثر لوگ اس سے بے خبر ہیں جہاں جہاں غلے ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں وہاں فاضل غلے کو کام میں نہیں لا سکتے۔ مجبوراً وہ سڑ جاتے ہیں یا ان کو جلانا پڑتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کسان تو غریب ہی لوگ ہیں۔ ان کے پاس اتنی قوت نہیں کہ ذاتی اخراجات سے فاضل غلے کو ان مقامات پر پہنچا سکیں جہاں غلے کی کمی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک طرف تو ارزانی رہتی ہے اور دوسری طرف قحط سے لوگ مرتے ہیں۔ اگر ذرائع نقل وحمل کافی ہوں تو ایسی حالت ہرگز پیش نہ آئے۔ ان وجوہ سے ذرائع نقل وحمل کی تعمیر میں ایک لمحے کے لئے تاخیر نہ ہونی چاہئے۔ ذرائع نقل وحمل کی تعمیر کرنے میں ان چند باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

(۱) دریائی راستے . . . [۱] تعمیر جدید چین کے تعمیری پروگرام کے مطابق جو دریا موجود ہیں

---

(۱) ایک کتاب کا نام ہے جو ڈاکٹر سن یٹ سین کی لکھی ہوئی ہے اور جس میں جدید چین کے تعمیری کاموں کی ایک بڑی اسکیم درج ہے۔

ان کو درست کیا جائے اور گہرائی کھودی جائے۔ جہاں جہاں نہریں کھودی جانے کا امکان ہے کھودی جائیں۔ سمندر میں جو ذرائع نقل و حمل ہیں وہ جہاز ہیں۔ اس کی ضرورت یہ ہو کہ جہاز کی کمپنی اعلیٰ پیمانہ پر قائم کی جائے۔

(۲) خشکی کے راستے . . . . (الف) ریلوے۔ ایک ضلع دوسرے ضلع کے ساتھ ملا دیا جائے جس سے غلہ اور پیداوار کا لانا اور لیجانا آسان ہو۔ (ب) موٹر کی سڑک جن دیہات میں جہاں ریل کا جانا مشکل ہے وہاں موٹر کی سڑک تعمیر کی جائے جو ریل کی کمی کی تلافی کر سکے۔ (ج) تعلی۔ بارکش مزدور اگرچہ مزید خرچ کا سبب ہے مگر جہاں موٹر نہ جا سکتی ہو لینا پڑتا ہے۔

۷۔ آفتوں کا انسداد . . . . (الف) دریائی راستوں پر دیواریں تعمیر کرنا تاکہ سیلاب سے محفوظ رہے (ب) خشک زمین

(۱) فوری ترکیب: مشین سے آب پاشی کرنا خصوصاً بلند علاقوں میں اس کی سخت ضرورت ہے۔

(۲) دائمی ترکیب۔ کثرت سے درخت لگانا جنگل کی درستی کرنا جس میں عناصر آب کے اجتماع کی کافی گنجائش ہو۔

روٹی میں تناسب کی ضرورت :-

مکمل طور پر معیشت کا سوال حل کرنے میں ہم کو نہ صرف پیداوار کا سوال حل کرنا ہے، بلکہ مسئلہ تناسب کی طرف بھی توجہ کرنی ہوگی۔ منصفانہ تناسب کا نظام ذاتی سرمایہ کے ماتحت قائم کرنا مشکل ہے۔ . . . . . غلے کی پیداوار سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ روپیہ کمایا جائے . . . . جب تک افراد میں روپیہ کمانے کی خواہش باقی ہے تب تک ملک میں قحط اور روٹی کی کمی لازمی ہے۔ سرمایہ دار لوگ تو خوب اپنا پیٹ سیر کرتے ہیں مگر ان کو غریبوں اور مصیبت زدوں سے کیا واسطہ۔ تناسب کی طرف توجہ کرنے سے ہمارا یہ مطلب ہو کہ سب کو یکساں کھانا مل جائے اور ملک میں جو غلہ اور دوسری قسم کی پیداوار ہوتی ہیں سب کی سب جمع کر کے مشترک طور پر خرچ کی جائیں۔ اس منزل مقصود

پر پہنچنے کے لئے ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ ہر سال کا جو فاضل غلہ اور پیداوار ہے اس کو جمع کرکے جمہوری خزانے میں محفوظ رکھیں اور ایک دانہ غیر ممالک نہ جانے دیں . . . . اس طریقہ سے جب تک مینی باشندے کو کافی روٹی نہ مل جائے، اُس وقت تک غیر ممالک میں غلہ لیجانے کی اجازت نہ دی جائے کہ اس سے قوم کی تباہی ہوتی ہے۔

اصول معیشت اور سرمایہ داری کا اختلاف:

اصولی طور پر معیشت اور سرمایہ داری میں جو اختلاف ہے وہ یہ کہ سرمایہ داری کا مقصد ذات کے لئے روپیہ جمع کرنا ہے۔ اور معیشت کا مقصد عوام کے لئے کھانا فراہم کرنا ہے یہ ایک نیک مقصد ہے جس پر ہماری معیشت مبنی ہے۔ پرانا سرمایہ داری کا نظام ٹوٹ سکتا ہے لیکن اس وقت ہم کو نئے اصول سے روٹی کا سوال کرنا ہے اگر سرمایہ داری کے نظام کو توڑے بغیر ہم اپنے سوال کو حل کرسکتے ہیں تو ہم اس کو کیوں نہ باقی رکھیں۔ اس میں کچھ ترمیم و اصلاح کرکے اپنے کام چلائیں۔ کیونکہ اکبارگی اس کو توڑ دینا نہایت مشکل ہو۔

معیشت کے لوازمات:

ہمارے مطالعہ کے مطابق معیشت کے لوازمات میں چار چیزیں شامل ہیں۔ یعنی کھانا۔ رہنا پہنا اور چلنا۔ ہم کو اصول ثلثہ سے جدید چین تعمیر کرنا ہے۔ اس کی غایت یہ ہوگی کہ عوام کو ان چار چیزوں کی فکر نہ ہوگی۔ اس کے تمام فرائض اور ذمہ داریاں سب کی سب حکومت کی گردن پر ہوں گی۔ اگر حکومت نے حسب منشا عوام کے لئے ان چار چیزوں کو فراہم نہ کیا تو عوام اس سے مطالبہ کرسکتے ہیں۔

مسئلہ پوشاک:

انسانی زندگی کے نشوونما کی کیفیت —— انسانی زندگی کی کیفیت تہذیب و تمدن کے لحاظ سے تین درجے میں تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا یہ کہ انسان کی زندگی کے لئے ضروریات مہیا ہوں ورنہ اس کا زندہ رہنا محال ہے اور اگر اس کو ضروریات ناکافی ملیں تو اس کی زندگی غیر مطمئن

زندگی ہوگی۔ یعنی نہ زندہ انسان کی طرح رہ سکتا ہے اور نہ مردہ انسان کی طرح آرام لے سکتا ہے۔ اسی واسطے انسان اپنی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جب حضرت انسان کو ضروریات مل گئیں تو وہ دوسرے درجہ پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں یعنی ان کو آرام و راحت کی خواہش ہوتی ہے۔ اس وقت اگرچہ وہ اپنے کھانے اور پینے سے بے فکر رہتے ہیں مگر ان کو آسائش کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ آرام و راحت مل جانے کے بعد ان کو ایک اور خیال پیدا ہوتا ہے یعنی یہ کہ نہایت شان و شوکت اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ اس وقت ان کو قیمتی و [illegible]

بلکہ نفیس اور قیمتی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کو ایک باثروت آ[illegible]

پوشاک کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا کے شروع زمانہ میں [illegible]

میں ان کو ٹھنڈے کپڑے اور سردی میں گرم کپڑے مل جائیں۔ جب

میں گرم کپڑے ان کو میسر ہو گئے تو وہ پھر کپڑوں کی باریکی، نرمی، نفاست اور خوشنمائی [illegible]

ہیں۔ جب ان کی یہ خواہش بھی پوری ہو گئی تو گرمی میں کیسے کیسے پائدار ریشم [illegible] صنع کے

سن کے کپڑے جو نزاکت و لطافت کے لحاظ سے فن دستکاری اور صنعت کے انتہائی کمال کا نمونہ ہیں، منتخب کرنے لگتے ہیں اور جاڑے میں کیا کیا باریک اون کے کپڑے اور کیسی کیسی نفیس کھال جو قیمت کے لحاظ سے نہایت گراں اور وزن کے لحاظ سے بہت ہلکی ہیں، پسند کرنے لگتے ہیں، یہ ہیں پوشاک کے متعلق حضرت انسان کے کارنامے!

کھانے کے متعلق بھی وہی کیفیت ہے جو پوشاک کے متعلق انسان نے پیدا کر رکھی ہے۔ شروع میں لوگ صرف دال روٹی کے طالب تھے۔ جب دال روٹی سے سیر ہو گئے تو گوشت مچھلی، انڈے مرغی وغیرہ کھانے میں داخل کرنے لگے اور جب یہ سب مہیا ہو گئے تو مٹھائی، ٹین کے میوے، مربے، اچار اور بہت سے لوازمات شامل کرنے کی ضرورت ہوئی۔ بلکہ مختلف چیزوں کی چکھنے اور چیزوں سے لطف اٹھانے اور قیمتی چیزوں کے کھانے کے شائق ہو گئے۔ اس کا لازمی نتیجہ سوائے فضول خرچی، عیاشی اور بربادی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہم کو اس وقت معیشت کا سوال حل کرنا

نہ اس لئے ہے کہ لوگوں کو فضول خرچی اور عیاشی کی زندگی بسر کرنے دیں اور نہ اس لئے ہے کہ آرام اور عیش کی زندگی لوگوں کو بہم پہنچائیں۔ بلکہ اس لئے ہے کہ ضرورت کی زندگی لوگوں کے لئے فراہم کر دیا جائے ملک ہمارے چالیس کروڑ باشندوں کو اپنی زندگی کی ضروریات مل سکیں اور ان کے لوازمات پورے ہو سکیں۔

پوشاک کے اصلی سامان:

پوشاک کے مسئلے پر غور کرنے میں اس بات کا ذکر کرنا نہایت ضروری ہے کہ وہ کن چیزوں سے بنائی جاتی ہے۔ اور ان چیزوں کے اجزا کیا ہیں؟ پوشاک کے اصلی اور اہم سامان حیوانات اور نباتات سے فراہم کئے جاتے ہیں حیوانات اور نباتات سے پوشاک کے سامان جو فراہم کئے جاتے ہیں، وہ چار قسم کے ہیں۔ دو قسم کے سامان حیوانات سے اخذ کئے جاتے ہیں اور دو قسم کے نباتات سے۔ حیوانات سے۔ اون اور سمور حاصل ہوتا ہے۔ ریشم ایک قسم کے کیڑے سے حاصل ہوتا ہے۔ سن اور روئی نباتات سے۔ اون و سمور۔ ریشم۔ سن اور روئی یہ چار چیزیں پوشاک کے اصلی متاع اور سامان ہیں۔

چین کا ریشم:

چینی ریشم کو بین الاقوامی بازار میں غیر ملک کے ریشم سے شکست ہوتی ہے۔ اس کی صنعت اتنی اچھی نہیں جتنی کہ غیر ممالک کی قیمت بھی اتنی بلند نہیں جتنی کہ اوروں کی اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر باشندگان چین غیر ممالک کے بنائے کپڑے اور سوٹ پسند کرتے ہیں اور ان کو لے کر اپنی ضروریات کو پوری کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہم اپنی صنعت کی طرف سے غافل ہوتے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس وقت ہم نہ صرف ریشم کی صنعت کو ترقی نہیں دے سکتے۔ بلکہ دیسی ریشم کے استعمال کرنے سے بھی نفرت ظاہر کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ اپنی دیسی دستکاری کو ترقی دیتے اور اس کی اشاعت کرتے، بدیسی صنعت کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی ترقی و اشاعت کرنے میں ہم خود اپنے آپ کو رضاکاروں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں . . . . چینی ریشم کی صنعت کی ترقی میں دوسری جو رکاوٹ ہے وہ یہ ہے کہ تیاری کے طریقے اچھے نہیں۔ ریشم کے کیڑوں کو جس طریقے سے پالتے ہیں وہ اچھے طریقے نہیں ہیں۔

کیڑے اکثر بیمار رہوتے ہیں۔ ان بیمار کیڑوں سے جو مواد اخذ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ کمزور اور بے رونق ہوگا۔ نیز کپڑے کی بناوٹ بھی نہایت خراب ہوتی ہے۔ تار اکثر ٹوٹ جاتے ہیں جس سے کپڑوں میں جا بجا عیب نظر آتے ہیں جدید آلات سے ہم کام نہیں لیتے ...... دیہاتی لوگ قدیم روایات کے پابند ہیں۔ جدید طریقہ سے ان کو کیا واسطہ۔ اور خصوصاً اس زمانے میں جب کہ ابھی تک ریشمی کیڑوں کی تربیت کے لئے کوئی خاص تربیت گاہ بھی نہیں کھولی گئی ہو جس سے ہم ریشم کے کیڑوں کو عمدہ طور پر تربیت کر سکیں اور ریشم کے مواد کی اصلاح کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے ترقی کے ریشم کی صنعت روز بروز تنزل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ چینی باشندوں کی اپنی دستکاری کو نہ استعمال کرنے اور بین الاقوامی بازار میں مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے۔ نہ صرف مالگذاری کی کمی ہے بلکہ ان چیزوں کے عوض میں جن میں ہم بالفعل غیر ممالک کے محتاج ہیں بیچ سکتے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چین یا تو غیروں کا مقروض بن جائے یا ...

پوشاک کا سوال حل کرنے میں ہم کو نہ صرف اصلی صنعت کو ترقی دینا، عمدہ بنانا اور ... کرنا ہے۔ بلکہ ریشم کے کیڑے کی تربیت، ریشم نکالنے کی ترکیب اور بناوٹ کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کرنا ہے اور جدید اصول پر مشین سے ریشم کے کپڑے تیار کرنا ہے۔ مشین سے جو کپڑے تیار ہوں گے وہ ہاتھ کے تیار کئے ہوئے کپڑوں سے زیادہ مضبوط اور خوشنما ہوں گے۔ جس کی وجہ سے ہم بھی ان کو پسند کریں گے اور غیر بھی اس کے شائق ہوں گے۔ جب دیسی ریشم ملکی ضروریات کو پورا کرے گا تو درآمد سامان میں ضرور تخفیف ہوگی۔ مالگذاری کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور ان چیزوں کے عوض میں جن میں ہم غیر ممالک کے محتاج ہیں، ریشم دیا جا سکے گا۔

سن کی اصلاح:

سن کی صنعت میں ہمیں اصولاً کھیتی کی طرف توجہ کرنا پڑیگی۔ کس طرح سن لگانا چاہئے، کس طرح کھاد سن کے لئے مفید ہے۔ اور کس طرح سن کا تاگا اور سوت بنانا چاہئے۔ ان سب چیزوں کی پوری تحقیق کے بعد ایک خاص سکیم تیار ہو سکے گی۔ اس اسکیم کے ماتحت عمل کرنے سے ہماری سن

کی صنعت کی ترقی ہوگی۔ نئی سکیم کے مطابق جو چیزیں تیار ہوں گی وہ زیادہ جاذب نظر اور فائدہ مند ہونگی۔ ہاتھ سے سن کے سوت بنانا اور تاگا نکالنا نہ صرف تضیع اوقات ہے بلکہ تضیع سرمایہ بھی ہے ہاتھ سے جو چیزیں تیار ہوں گی وہ ادنٰی ہی ہوں گی اور لوگ اس کو پسند نہ کریں گے۔ راس المال بھی زیادہ لگے گا۔ داموں میں کم ہونگی۔ اس واسطے سن کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے ایک پوری سکیم کی ضرورت ہے۔ اس سکیم میں وہ تمام باتیں جو کہ سن کی کاشت سے لے کر کپڑے تیار کرنے تک ہوں۔ شامل کرنی چاہئیں۔ اس کے متعلق ہر ایک قدم پر جدید اصول سے کام لینا ہوگا ہر ایک بات میں تخفیف کرنی ہوگی اس طریقہ سے ہم سن کی صنعت کو ترقی دے سکتے ہیں۔ اور اس سے ملک اور عوام کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

روئی کی دستکاری:

بدیسی کپڑے۔ بناوٹ کے لحاظ سے چین کے دیسی کپڑوں سے اچھے ہیں۔ قیمت بھی معقول یہی وجہ ہے کہ اہل چین خود بدیسی کپڑوں کو پسند کرتے ہیں اور دیسی کپڑوں کو چھوڑنے پر آمادہ ہیں جس سے دیسی کپڑوں کے بازار پر بدیسی کپڑوں نے آکر قبضہ کر لیا ہے . . . . چین میں کپڑوں کی جتنی ملیں ہیں۔ ان میں معمولی سے معمولی کارخانے بھی کپڑوں کے تیار کرنے میں بدیسی سوت کو ترجیح دیتے ہیں اور دیسی سوت ان کو پسند نہیں آتا۔ وجہ یہ ہے کہ چین میں روئی کی دستکاری اصلاً غیر ممالک کے ہاتھ میں ہے چین میں جتنی روئی پیدا ہوتی ہے اور ان سے جتنا کچھ سامان تیار کیا جا سکتا ہے۔ اہل چین خود اُن سے کام نہیں لیتے اور ان کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ غیر ممالک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہاں کپڑے یا سوت تیار کرنے کے بعد پھر بے وقوف چینی ان کو بڑی گراں قیمت پر واپس خرید لیتے ہیں . . . . چین کا روپیہ پانی کی طرح غیر ممالک کی طرف بہتا جاتا ہے جس سے اہل چین کی معاشی زندگی تلخ اور برباد ہوگئی ہے . . . . آج کل اہل چین کی یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے نالائق وارث ہیں، عزت فروش ہیں اور ذلت و رسوائی کے سزاوار ہیں وہ نہ صرف اپنے ملک، اپنے آباؤ اجداد اور اپنی قوم و وطن سے دغا کرتے

ہیں، بلکہ انھوں نے اپنے شعور، اپنے ضمیر، اپنے ایمان، اور اپنے اصول کو دھوکا دیا ہے۔ وہ فطرت اور انسانیت کے اخلاقی مجرم ہیں۔ وہ نہ تو خود اپنے کھانے پینے کے لئے کچھ کماتے ہیں جس سے ان کی زندگی درست ہو اور نہ اپنے آبا و اجداد کے متروکہ کی حفاظت کرتے ہیں جس سے ان کی زندگی قائم رہے۔ ایسی قوم اور ایسے انسانوں کو دنیا میں رہنے کا کیا حق ہے؟ جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس کھانے کو نہیں ہے اور نہ پینے کو ہے تو اپنے آبا و اجداد کے زیورات و جواہرات معمولی داموں پر غیروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں اور

سمجھتے ہیں کہ وہ آرام کی زندگی بسر کریں گے! چین پر جو معاشی دباؤ ہے وہ کس قدر گراں ہے! منجملہ اور دباؤوں کے روئی کی دستکاری کی پستی بدیسی کپڑے کا کثرت سے درآمد ہونا بھی بذات خود ایک بڑا دباؤ ہے۔

برآمد کے مقابلے میں تیس کروڑ ٹل (پچاس کروڑ روپیہ کے قریب) زیادہ ہوتا ہے۔ درآمد کا اہم جز وہ بدیسی کپڑا ہے۔ اس واسطے درآمد سے جو نقصان چین کو پہنچتا ہے وہ روئی کی دستکاری کی پستی کی وجہ سے ہے ...... مطلب یہ ہے کہ سالانہ ہر ایک چینی کو غیر ممالک کو ایک روپیہ چار آنے کپڑے کا محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔

سوال پوشاک کا حل:

اگر ہم معاشی حیثیت سے پوشاک کا سوال حل کریں تو بہت مشکل ہے۔ اسی مسئلہ کے متعلق ہمیں سیاست کی طرف توجہ کرنی ہوگی۔ غیر مساوی معاہدوں کو منسوخ کرنا ہوگا۔ کسٹم ہاؤس کا انتظام غیروں کے ہاتھ سے واپس لینا ہوگا۔ امتیازی حقوق کو مٹانا ہوگا جب ہم بین الاقوامی سیاست میں اس درجہ پر پہنچ جائیں کہ ہم خود اپنے گھر کے معاملے میں جو جی چاہے طے کر سکیں۔ تو ہم کو خیال ہے کہ کسٹم ڈیوٹی میں اضافہ کریں جس سے ہم بدیسی مال کی حفاظت اور بدیسی مال کا سد باب کر سکیں یہ ایک اصلی ترکیب ہے۔ دیسی دستکاری کو ترقی دینے کی ..... پوشاک کا سوال حل کرنے میں ہمیں دیسی کپڑا پہننا ہوگا۔ اور بدیسی مال چھوڑنا پڑے گا۔ اس مقصد

میں کامیابی کی شرط یہ ہے کہ ہماری پشت پر سیاسی قوت ہو۔ اس وقت ہمیں یہ کرنا ہوگا کہ تمام باشندوں کی اجتماعی قوت سے ایک ایسا نظام قائم کریں جس سے ہمارے سیاسی حقوق سب کے سب واپس مل جائیں۔ حکومت کے سرمایہ سے روئی، ریشم، زراعت اور دستکاری کے کارخانے قائم کریں اور کسٹم اوس واپس لے لیں۔ اس سے ہماری صنعت و دستکاری کا تحفظ اور اس کی ترقی ہوگی۔ ان کے علاوہ برآمد کے سامان خام پا درآمد کے تیار شدہ سامان پر بھاری محصول[1] عائد کریں۔ اس طریقہ سے ہم دیسی دستکاری کو ترقی دیں۔ اس کی ترقی میں مسئلہ پوشاک کا حل ہے۔

پوشاک اور معیشت:

اصول معیشت پر کاربند ہونے کے لئے یہ ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ پوشاک سے انسان کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ اس کے تین فائدے ہیں ۱۔ حفاظت جسم۔ ۲۔ تزئین۔ ۳۔ آرام۔ تزئین اور آرام کو نظر رکھتے ہوئے ہمیں ملک کے ہر گوشے میں درزی خانے قائم کرنے ہوں گے۔ باشندوں کی حالت اور موسم کی کیفیت کی بنا پر قومی درزی خانوں میں ضروری لباس تیار کئے جائیں گے اور ان کو لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح کہ لوگوں کو یہ شکایت نہ ہونے پائے گی کہ کسی کو کم ملا اور کسی کو زیادہ . . . . . .

ہم کو مجبوراً اس مضمون کو نامکمل چھوڑنا پڑا۔ اس لئے کہ ڈاکٹر سن یٹ سین قبل اس کے کہ وہ معیشت کے لکچروں کا سلسلہ ختم کریں جو کہ چھ لکچروں پر مشتمل ہے (قومیت اور جمہوریت، ہر ایک کے متعلق چھ چھ لکچر ہیں) چوتھے لکچر کے بعد بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں ان کو اس دار فانی سے رخصت ہونا پڑا۔ اس کے بعد نہ ان کے جانشین نے ان کو پورا کیا اور نہ کسی اور عالم نے۔ لہٰذا ہم کو بھی وہیں اپنے قلم کو روکنا پڑا جہاں پر انھوں نے چھوڑا تھا۔

---

(۱) رویٹر کی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ یکم جنوری ۱۹۳۱ء سے حکومت نانکنگ نے نئے محصول کا ایک اعلان کیا ہے۔ جس سے درآمد مال پر مزید ڈیوٹی قائم کی گئی ہے۔

یہ مضامین جو کہ رسالہ جامعہ میں شائع کئے گئے ہیں، ڈاکٹر سن یت سین کے اصول ثلثہ سے کچھ اقتباسات ہیں۔ اگر ناظرین ان کے متعلق اور مزید حالات معلوم کرنا چاہتے ہوں، تو انشاءاللہ کچھ عرصہ کے بعد ہم ان تین اصولوں کو جو کہ چینی زبان میں مفصل ہیں پورے کے پورے پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اُن سے چین کے اندرونی اور بیرونی معاملات پر مزید روشنی پڑے گی اور یہ بھی اہل ہند پر بالکل صاف اور واضح ہو جائے گا کہ چین میں خانہ جنگی کیوں ہوتی ہے اور بین الاقوامی سیاست میں چین کیوں پیچھے ہے۔ نیز یہ بھی کہ چین کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے کیا واقعی ان اصول ثلثہ پر عمل کرنا کافی ہے؟

غزل

از حضرت ثاقب لکھنوی

سچ ہے کہ خواب دیکھتا ہوں قید خانے میں
سنتا ہوں میرے دل کی طرح ہے زمانے میں

دم گھٹ رہا ہے آپ سے آپ آشیانے میں
اچھی نہیں چمن کی ہوا اس زمانے میں

خونباریوں کا مجھ کو صلہ مل گیا کہ آج
کچھ رنگ بڑھ گیا مرے دل کے فسانے میں

پہلے تو آہ سرد سے آتا تھا دل کو چین
اب کیا کروں کہ آگ لگی ہے زمانے میں

دیکھی سوائے شام غلامی نہ صبح عیش
آزادیاں تمام ہوئیں قید خانے میں

کام آئیں دل کے بھی یہ تلوّن مزاجیاں
میرے بھی دن پھریں کبھی تیرے زمانے میں

گلچین و باغباں کی نظر ہے اُسی طرف
کچھ میرے بعد بھی ہے مرے آشیانے میں

کیوں میرے داغ دل کی ہے دشمن ہوائے دہر
ایسے چراغ بجھ نہیں سکتے زمانے میں

جس میں بھرا ہوا ہے مری زندگی کا حال
دنیا کو نیند آتی ہے اب اُس فسانے میں

مدت ہوئی کہ موت نے آکر چھڑا دیا — اب کون ڈھونڈتا تھا مجھے قید خانے میں

برسوں نہ سوئے بعد مرے ساکنان دہر — آواز نالہ گونج رہی تھی زمانے میں

جب میں نہیں تو باغ میں اُسکا مقام کیوں — اچھا ہوا کہ لگ گئی آگ آشیانے میں

اے قصہ گوئی بزم مری داستان چھیڑ — نیند آچلی ہے اُن کو کسی فسانے میں

ہجراں کشیدہ ہوں مجھے کیا کام مہر سے — سچ تو یہ ہے کہ دن نہیں ہوتا زمانے میں

صد چاک دل رہا نہ ہوا دام زلف سے — زلفیں نکل نکل گئیں آ آ کے شانے میں

کیا پڑھ رہے ہیں دور سے اصحاب اعتبار — میری جبیں یہ ہے کہ ترے آستانے میں

بس اے شب فراق نہ دے ذکر غم کو طول — کیا اور کوئی رات نہ ہوگی زمانے میں

مسکت ہر ایک حرف تھا دلکش ہر اک بیاں — کیوں بولتا کوئی مرا قصہ سنانے میں

جو کھو چکا ہوں عالم ہستی میں آکے میں — جھک جھک کے ڈھونڈتا ہوں اسی کو زمانے میں

چپ شب کے پاسباں بھی ہیں اسرار رات بھی — کوئی نہ کوئی محو ہے میری فسانے میں

رنگ ملال و عیش ہو ثاقب کہ شام و صبح
وہ سب ہی میرے دل میں جو کچھ ہے زمانے میں

شذرات

موسم گرما کی تعطیلات کے سلسلہ میں ۱۵ رمئی سے جامعہ دو ماہ کے لئے بند کر دی گئی ہے تمام طلبہ اور اساتذہ اپنے وطن یا سیر و سیاحت کی غرض سے مختلف مقامات کو چلے گئے ہیں۔

شکر ہے کہ جامعہ کا یہ سال باوجود چند در چند مشکلات اور آزمائشوں کے (جن کا تذکرہ ایک سے زائد بار انھیں صفحات میں کیا جا چکا ہے) ہر حیثیت سے کامیاب ر[illegible]

آئندہ کے لئے چھٹیاں شروع ہونے سے قبل ہی تعلیم و تربیت [illegible]
مفید تجویزوں اور نئی نئی اسکیموں پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کارکن[illegible]
اور جوش عمل میں سرگرمی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جامعہ کے مقاصد کے لئے فال نیک [illegible]
شامل حال رہی اور ان مفید تجاویز اور جدید اسکیموں پر صحیح طور پر عمل کیا گیا (جس کا ہمیں یقین ہے) تو انشاء اللہ ترقی کی طرف یہ ایک نیا اور شاندار قدم ہوگا۔

اس کے علاوہ تمام ماتحت شعبوں میں خواہ ان کا تعلق تعلیم سے ہو یا تجارت سے ضروری اور مفید اصلاحات کی گئی ہیں اور جہاں تک جامعہ پریس کا تعلق ہے ان اصلاحات پر نہ صرف عمل شروع کر دیا گیا ہے بلکہ اس کے خوشگوار نتائج بھی ظہور میں آنے لگے ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ اطلاع بھی ضروری ہے کہ جامعہ کی تعلیم کو ارزاں تر بنانے کے لئے تعلیم اور بورڈنگ کی فیس میں معقول تخفیف کر دی گئی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

فیس تعلیم و دار الاقامہ سال گزشتہ		تخفیف شدہ فیس	
مکتب تا ابتدائی سوم	[illegible]	ابتدائی	[illegible]
ابتدائی چہارم تا ہشتم	[illegible]	ثانوی اول تا سوم	[illegible]
ثانوی اول تا سوم	[illegible]	ثانوی چہارم تا سندی	[illegible]
ثانوی چہارم تا سندی	[illegible]		

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں ہو کہ دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں جامعہ یہاں کے اخراجات پہلے ہی بہت کم تھے اب اس موجودہ تخفیف کا مقصد یہ ہے کہ وہ طلبہ بھی جو مالی دقتوں کے باعث ہمارے یہاں تعلیم حاصل کرنے سے مجبور و معذور ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔

جامعہ کے اکثر اساتذہ و طلبہ نے طے کیا ہے کہ اس مرتبہ دو مہینے کی چھٹیاں مفید طریقہ پر گزاری جائیں اور سب سے مفید طریقہ اس موقع پر مختلف مقامات کی سیر و سیاحت ہو جس سے تندرستی و صحت میں ترقی اور اضافہ معلومات کے علاوہ دوسرے گوناگوں فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ چنانچہ طلبہ کی ایک جماعت جناب حامد علی خاں صاحب بی اے (جامعہ) کی نگرانی میں سائکلوں پر کشمیر کے سفر کے لیے روانہ ہو چکی ہے اور تقریباً نصف منزل طے کر چکی ہے۔ یہ لوگ پوری چھٹیاں اسی سفر میں گزاریں گے۔

اساتذہ اور طلبہ کی ایک اور جماعت مولانا شفیق الرحمن صاحب بی اے (جامعہ) کی سرکردگی میں کشمیر کی سیاحت کے لئے روانہ ہو گئی ہے۔ یہ حضرات جموں تک ریل میں اور وہاں سے پیدل سفر کریں گے۔ انھوں نے سیر و سیاحت کے علاوہ یہ اہم مقصد بھی اپنے پیش نظر رکھا ہے کہ وہاں کے باشندوں کی زبوں حالی کا بغور مطالعہ کریں اور ان کی ترقی کے عملی وسائل پر غور و فکر کریں۔

طلبہ کی ایک دوسری جماعت افغانستان کے دور دراز سفر کے لئے روانہ ہوئی ہے یہ بھی پوری چھٹیاں اسی سفر میں گزارے گی۔

مدرسہ تحتانیہ کے بعض اساتذہ تعلیم و تربیت سے متعلق مفید معلومات حاصل کرنے کے لئے پنجاب اور دوسرے صوبوں کے مدارس کا دورہ کریں گے۔

جامعہ کی طرف سے ان تمام جماعتوں کو بیش از بیش سہولتیں اور آسانیاں فراہم کی گئی ہیں توقع ہے کہ یہ تمام حضرات خیریت اور کامیابی کے ساتھ جامعہ واپس آئیں گے۔

زیرادارت

مولنا اسلم جیراجپوری　　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

جلد ۱۶ | بابتہ ماہ جون ۱۹۳۱ء

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے دفتر رسالہ جامعہ قرول باغ سے شائع کیا۔

مسلمانان چین

"کاش مسلمانان ہند کو خدا یہ توفیق دے کہ وہ چین کے مسلمانوں کے صحیح صحیح حالات بہم پہنچائیں اور روابط قائم کرنے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کریں اور اپنی عالمگیر اخوت کا عملی ثبوت دیں۔"

یہ مولانا عثمان صاحب فارقلیط دہلوی کے اس مضمون کے آخری الفاظ ہیں جو انھوں نے اخبار الجمعیۃ دہلی ۱۳؍ نومبر ۱۹۳۰ء میں "چین کے مسلمان۔ دنیائے اسلام کی ایک عظیم ترین اور فراموش شدہ برادری" کے عنوان سے لکھا ہے۔

میں مولانا موصوف کا ممنون ہوں کہ انھوں نے انگریزی اور عربی کتب سے جو مواد مل سکے ان کو جمع کر کے چینی مسلمانوں کے کچھ حالات اہل ہند کے لئے بہم پہنچائے۔ مجھے اس سے مطلب نہیں کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ اس سے بھی مطلب نہیں کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ یا چار کروڑ یا ڈھائی کروڑ ہے، اس سے بھی مطلب نہیں کہ فلاں مقام میں مسلمانوں کی اسقدر آبادی ہے اور فلاں صوبے میں اتنی مسجدیں بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ چینی مسلمانوں کی حالت آغاز عہد سے لے کر آج تک عالم اسلامی کے لئے ایک راز ہے جس کے انکشاف کے لئے اہل ہند بیتاب ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانان چین کے حالات جو لکھے جاتے ہیں جاسوسی کے قصوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں پڑھنے والے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ قصہ کے آخر میں کیا ہے۔ لوگ تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور حیرت کی نظر سے پڑھتے ہیں۔ اور تجسس کے ارادے سے جلد جلد اس کے ورق الٹتے ہیں تاکہ آخر میں جا کر بھید ظاہر ہو جائے۔ مولانا عثمان کے ان آخری مذکورہ بالا الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ہند مسلمانان چین کی حالت دریافت کرنے کے لئے بے تاب ہیں اور ان کی دلی تمنا یہ ہے

کہ کوئی معلوم یا نا معلوم - صحیح یا غیر صحیح طریقے سے چینی مسلمانوں کے حالات کی اطلاع ان کو مل جائے تاکہ ان کی تمنا پوری ہو جائے - اور وہ اپنے بھائی چینی مسلمانوں کی کیفیت معلوم کر کے لطف اندوز ہوں - اصلیت یہ ہے کہ مسلمانان چین کی حالت ایک ایسا معمہ ہے جس کا حل مشکل ہے کیونکہ چینی مسلمانوں کے تعلقات عالم اسلامی سے ہمیشہ سے منقطع رہے ہیں - اور دیگر ممالک کے مسلمان چینی نہ جاننے کی وجہ سے ان کے حالات سے باخبر نہ ہو سکے - اس لئے یہ راز اور زیادہ مخفی رہا -

انگریز مصنفین اور بالخصوص مشنریز ان کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اپنے انداز اور خاص زاویۂ نگاہ سے لکھتے ہیں - یہی حال فرنچ اور جرمن مصنفوں اور خود ان کے بیانات چینی مسلمانوں کے متعلق اس قدر باہم مختلف ہیں کہ اندازہ لگانے سے قاصر ہیں کہ کس کا بیان صحیح ہے اور کس کا غلط - بے تابی اور بھی بڑھ گئی ہے کہ کسی معتبر اور صحیح ذریعہ سے چینی مسلمانوں کے ... معلوم ہوں -

میں کچھ تو مدیر صاحب رسالہ جامعہ کی فرمائش اور کچھ مسلمانان ہند کی اس تشنگی کو رفع کرنے کے لئے چینی مسلمانوں کے حالات کے متعلق یہ مختصر مضمون لکھتا ہوں - میں خود اگرچہ چین کا باشندہ ہوں لیکن کمسنی میں وطن کو چھوڑ کر تحصیل علم کے لئے ہندوستان آ گیا - اس لئے مجھے یہ موقع نہ مل سکا کہ تفصیل کے ساتھ مسلمانان چین کے حالات اپنے ساتھ لے چلوں تاکہ اس کو اہل ہند کے سامنے پیش کر سکوں اور یہاں بالفعل میرے پاس وہ کتابیں موجود نہیں ہیں جو چینی مورخین نے چینی مسلمانوں کے متعلق اپنی زبان میں لکھی ہیں - ان وجوہ سے حالات لکھنے میں بہت بڑی مشکل ہے - لہٰذا اس وقت ان اخباروں اور رسالوں سے جو چین سے میرے پاس آتے ہیں کچھ حالات اخذ کر کے لکھتا ہوں - اس میں جو باتیں صحیح ہیں یا غلط ہیں ناظرین کو خود ان کا فیصلہ کرنا ہوگا -

کیونکہ میں نے محقق کی حیثیت سے ان بیانات کو قلمبند نہیں کیا ہے بلکہ یہ کوشش کی ہے کہ چین میں تاریخ حافظہ سے آج تک کے مختصر حالات مسلمانوں کے لکھ دوں۔ ان سے اگرچہ چینی مسلمانوں کی حقیقی اور مفصل کیفیت نہیں معلوم ہو سکتی ہے لیکن تاہم ایک دھندلی سی تصویر ان کی اس میں نظر آجائے گی جس سے کچھ انکی حالت کا اندازہ ہو سکے گا۔

بدرالدین

چینی زبان میں مسلمانوں کی تاریخ:

اب تک چینی زبان میں بھی مسلمانان چین کی کوئی جامع تاریخ مرتب نہیں ہوئی ہے۔ یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جو کسی خاص واقعہ یا کسی خاص عہد سے تعلق رکھتی ہیں مگر نفس اسلام اور چین کے موضوع کو پیش نظر رکھ کر کسی نے اب تک مستقل کتاب نہیں تصنیف کی۔ چین کی عام تاریخوں سے بے شک وہاں کے مسلمانوں کی تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے لیکن اس کے لئے عہد تانگ سے لے کر آجتک جو ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب کا مطالعہ کرنا ہوگا جس کے لئے بڑی محنت اور بڑی مدت درکار ہے۔ کیونکہ ان میں کہیں کہیں جستہ جستہ ضمناً مسلمانوں کا ذکر ملے گا جن کو ایک ایک کر کے چننا پڑے گا۔

۱۹۲۶ء میں ایک چینی مورخ نے جو پیکن یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر ہے مسلمانان چین کے متعلق ایک کتاب لکھنے کا اعلان کیا تھا جس کا خاکہ اس طرح تھا۔

مذہبی خیالات۔ شرعی احکام۔ اسلامی خاندان۔ ان کی مردم شماری۔ مساجد۔ آثار قدیمہ اسلامی اسلامی علوم و فنون۔ اہم واقعات۔ چینی اور ہجری جنتری۔ عہد تانگ اور سونگ (۵۰۰ء سے ۱۲۷۹ء تک) مسلمانوں کی سفارتیں اور معاہدے۔ عہد یونگ و مینگ و چنگ (۱۲۰۵ء سے ۱۹۱۲ء تک) مسلمانوں کی خدمات اور سرکاری ملازمت میں حصے۔

مگر چونکہ مردم شماری اور مساجد کے متعلق تفصیل نہیں مرتب ہوئی تھی اس لئے کتاب مذکور اب تک شائع نہیں ہو سکی۔ ورنہ اس سے ہم کو مسلمانان چین کے متعلق بہت قیمتی حالات معلوم ہو جاتے جو بقیہ

مغربی مصنفین سے مفصل بھی ہوتے اور صحیح بھی۔ کیونکہ جس طرح مسلمان تاریخ لکھتے ہیں واقعات کو زیادہ صحت سے ساتھ لکھتے ہیں۔ اسی طرح چینی مورخ بھی ہمیشہ حقیقت کا متلاشی ہوتا ہے، اور بلا شبہ وہ انگریز یا جرمن و فرنچ مورخین سے بہت زیادہ سچے اور حقیقی حالات پیش کرتا ہے چینی مورخ کی کتاب میں اگر کوئی واقعہ غلط ملے تو یہ یقین کرنے کے وجوہات ہیں کہ اس کی ناواقفی یا غلط فہمی سے یہ غلطی واقع ہوئی کیونکہ وہ عمداً جھوٹ نہیں لکھتا ہے۔

چینی مورخ کی اس کتاب کی بابت میں دریافت کرتا رہتا ہوں جوں ہی کہ وہ شائع ہوگی اسی وقت رسالہ جامعہ کے ذریعے سے یا دوران ہند کی خدمت میں اس کا ترجمہ پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

چینی اور ہجری جنتری کا اختلاف:

چین میں مسلمانوں کی صحیح تاریخ داخلہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو ... جو چینی اور ہجری کلینڈر (جنتری) کے درمیان ہے۔ گو کہ چینی اور ہجری سنہ دونوں قمری ہیں مگر خلاف یہ ہے کہ سنہ ہجری میں بخلاف چینی کے کبیسہ نہیں نکالا جاتا۔ سنہ ہجری کا ایک سال تین سو چون یا تین سو پچپن دن کا ہوتا ہے۔ چینی جنتری میں ہر تیسرے سال ایک مہینہ بڑھایا جاتا ہے۔ اگر چینی جنتری سے سنہ ہجری کا مقابلہ کیا جائے تو ہر تیس سال کے بعد ایک سال کا فرق پڑ جاتا ہے۔ ہر سو سال میں تین سال اور ہر ہزار سال میں تیس سال کا۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے یا بعثت سے چینی جنتری کے مطابق آج تک کا حساب لگایا جائے تو سنہ ہجری سے بہت زیادہ فرق پڑ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض چینیوں نے اسلامی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان میں تاریخوں کی غلطی نظر آتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے چینی اور ہجری جنتری کے اختلاف پر نظر نہیں ڈالی مثلاً عہد سونگ (۹۶۰ سے ۱۱۹۰ء تک) میں رسالہ "کوی شنگ" اور عہد ٹینگ (۱۶۴۴ سے ۱۹۱۲ء تک) میں ممالک مغرب[1] کے مختصر

---

(۱) ازمنہ وسطیٰ میں چینی تاریخ کی کتابوں میں جہاں جہاں "ممالک مغرب" کا لفظ آیا ہے اس سے مراد وسط

حالات ،، اور موجودہ زمانے میں " رسوم چینی ترکستان ،، جن لوگوں نے لکھی ہیں انھوں نے سنہ ہجری کا ذکر کیا ہے مگر اس کو تین سو ساٹھ دن کا قرار دیا ہے۔ " حالات عرب ،، اور " معلومات چین ترکستان " میں تو ان کے مصنفوں نے سنہ ہجری کو تین سو چونسٹھ دن کا رکھ لیا ہے۔ چانگ چونگ سے کے " سفر نامہ ممالک مغرب " میں سنہ ہجری کے دسویں مہینے کی پہلی تاریخ کو جو عید الفطر کا دن ہے آغاز سال قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح چیو کری نے رسالہ " کوی ٹیگ " میں ہجری سال کے بارہویں مہینے کی دسویں تاریخ کو جو بقر عید کا دن ہوتا ہے سال نو کی ابتدا سمجھا ہے۔ لی کوی ٹینگ نے " حالات مسلمان " میں ترفان کے عہد نامہ کی تاریخ جو ۱۰۶۶ھ میں ہوا تھا شاہ یون چی کے گیارہویں سال (۱۶۵۵ء) میں لکھا ہے۔ دوسری کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نامہ شاہ کانگ شیسی کے بارہویں سال (۱۶۷۲ء) میں ہوا تھا۔

ان امور کے ذکر سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہم بغیر ہجری اور چینی کلینڈروں کا فرق معلوم کئے ہوئے مسلمانوں کے چین میں داخل ہونے کی صحیح تاریخ متعین نہیں کر سکتے۔

مسلمانان چین کے متعلق وہاں کے اکثر لوگ یہی کہیں گے کہ وہ شاہ کائی وان کے انیسویں سال (۵۹۹ء) میں آئے۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ چین تو کجا خود مدینہ شریف میں ہجرت نبوی یعنی اسلام کا داخلہ ۶۲۲ء میں ہوا ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ شاہ ہونگ او کے سترہویں سال (۱۳۸۵ء) جب چینی حکومت نے سنہ ہجری کا استعمال اختیار کیا ہے تو وہ ۷۸۶ھ تھا۔ عہد مینگ کے مورخ نے مسلمانوں کی تاریخ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۴۱)

ایشیا۔ ہندوستان۔ ایران اور عرب ہے۔ چین کے مغرب میں بحر متوسط اور بحیرۂ قلزم تک جس قدر ممالک ہیں ان سب پر اس کا اطلاق ہوتا تھا اب البتہ ممالک مغرب کا لفظ یورپ کے لئے بولا جاتا ہے

داخلہ کا حساب لگانے کے لئے بجائے ہجری کے چینی جنتری کے حساب سے ۶۰۰ سال پیچھے کا اندازہ لگایا جس سے کائی وان کی حکومت کا انیسواں سال (۵۹۹ء) نکلا اور اس نے بھی لکھ دیا۔ ان کیلنڈروں کے فرق نے صحیح تاریخ داخلہ معلوم کرنے میں بڑی رکاوٹ پیدا کر رکھی ہے۔ اسال ۲۹ ہجری ہے اگر چینی جنتری کے حساب سے ۱۳۴۹ سال پیچھے کا اندازہ لگائیں تو یہ شاہ زی وہ کا دوسرا سال (۶۰۵۲ء) پڑتا ہے۔ اس طرح فرق اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

چینی مسلمانوں کی تصنیفوں میں سے ایک مشہور کتاب جس کا نام [illegible] ہوئی آن والا اسلام کی آمد ہے۔ اس میں درج ہے کہ جس سال مسلمان چین میں [illegible] سال تھا یعنی ۶۲۸ء بعض لوگوں نے اس کتاب کے بیا[illegible] یہ بھی یہی حساب کی غلطی ہے۔ مصنف نے قصداً غلط [illegible] چینگ کوانگ کا دوسرا سال جو لکھا گیا ہے وہ درحقیقت [illegible] کیونکہ عہد ٹانگ کی دیگر تاریخی کتب سے یہ بات ثابت ہے کہ شاہ یون ہوئی نے [illegible] سال میں عربی وفد چین میں آیا تھا۔

اس زمانے میں چین میں یہ دستور تھا کہ غیر ملکوں سے جو سفیر آتے تھے وہ تانبے کی ایک جوڑ مچھلی لاتے تھے جن پر ان کے نام کندہ کر کے شاہی خزانے میں رکھ دئے جاتے تھے مگر جس ملک کا سفیر پہلی بار آتا تھا وہ اس دستور سے ناواقف ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب بھی اپنے ساتھ تانبے کی مچھلیاں نہیں لے گئے تھے۔ عہد ٹانگ کے مجالس نامہ میں اس بات کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

عہد ٹانگ کی تاریخ میں عربوں کی بابت جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ بات بھی مذکور ہوئی ہے کہ شاہ یون ہوئی کے دوسرے سال ان کے سفیر آئے جن کا بیان یہ ہے کہ ان کی سلطنت ۳۴ سال سے قائم ہے اور اس وقت ان کا تیسرا بادشاہ تخت پر ہے۔

ہجری اور چینی جنتریوں کے مقابلے سے ہم نے یہ معلوم کر لیا ہے کہ یون ہوئی کا دوسرا سال ۶۵۱ء ہے۔ یہ سنہ ہجری کا انتیسواں سال پڑتا ہے جو عربی سفیر کے بیان سے ۳۴ سال اسلامی

حکومت کے قیام کو تباتا ہے، مخالف ہو۔ عہد تانگ کے سفارت ناموں کے احوال میں لکھا ہے کہ عربوں کا سفیر شاہ یون ہوئی کے چھٹے سال میں آیا۔ یہ ۶۵۵ء کا سفیر تھا۔ مورخ سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اس کو ۶۰۱ء کا ذکر سمجھ لیا۔
۶۵۵ء ۳۴ ہجری پڑتا ہے جیسا کہ سفیر نے بیان کیا تھا اور یہ زمانہ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کا ہے۔

الغرض عربوں کا پہلا وفد جو چین میں گیا وہ یون ہوئی کے دوسرے سال ۲۹ھ میں گیا (۶۲۹ء) اب تک شہر کنٹن میں ابو وقاص رضؓ کا مقبرہ موجود ہے جس کو اہل چین پہلا عرب مسلمان سمجھتے ہیں جو ان کے ملک میں سفیر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس مقبرہ پر ایک کتبہ بھی ہے جس کے متعلق لوگ بیان کرتے ہیں کہ شاہ چینگ کونگ کے تیسرے سال ۶۲۹ء میں نصب کیا گیا۔ اس فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے جو چینی اور ہجری جنتری کے درمیان ہم نے بیان کیا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تاریخ غلط ہے اور یہ کتبہ یون ہوئی کے تیسرے سال ۶۵۲ء میں نصب کیا گیا ہو۔

مسلمانوں کی رسوم اہل چین کی نظر میں:

چینی زبان کی کتابوں میں جس میں مسلمانوں کے صحیح اور سچے حالات درج ہیں وہ دو ہیں ایک کا روزنامچہ ہے وو یونگ کا بیٹا دو وانگ شاہ تیانگ پاؤ کے عہد میں ۷۵۱ء میں مغربی مہم پر جنرل کو ہیانگ تیک کے ساتھ گیا تھا اور مغرب کے ممالک میں ۱۲ سال رہا تھا اس کے بعد بحری راستے سے کنٹن ہوتے ہوئے واپس آیا اور اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ آج کل یہ سفرنامہ نایاب ہے مگر بعض دوسری کتابوں میں اس کے بیانات منقول ہوئے ہیں انھیں میں سے چند فقرے یہاں لکھتا ہوں جس سے اہل ہند اندازہ لگا سکیں گے کہ ازمنۂ متوسطہ میں اہل چین اسلام اور اسلامی رسوم کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے۔

"مسلمانوں کا جو عبادت خانہ ہے اس میں ہزار ہا آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ ہر جمعہ کو بادشاہ (خلیفہ) نکل کر آتا ہے اور منبر پر چڑھ کر خطبہ پڑھتا ہے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی مشکل ہے۔ خدا کے عذاب سے نجات پانا آسان نہیں

زنا۔ ڈاکہ۔ چوری۔ غیبت۔ تہمت۔ اپنے لئے کسی غیر کو خطرہ میں ڈالنا۔ غریبوں اور کمزوروں پر ظلم کرنا یہ سب گناہ عظیم ہیں۔ مسلمان جو جہاد میں شہید ہوتا ہے اس کا صلہ جنت الفردوس ہے۔ ایک دشمن کے قتل کرنے کے عوض میں بے شمار ثواب ملے گا۔"

ممالک مغرب میں مختلف مذہب کے لوگ بستے ہیں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلمان بھی۔ مسلمان سور، کتا۔ گدھا۔ اور گھوڑے کا گوشت نہیں کھاتے۔ بادشاہ اور والدین کو عبادت کے قابل نہیں سمجھتے۔ مختلف دیوتاؤں کے قائل نہیں ہیں صرف ایک خدا کو مانتے ہیں۔ رسم یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں ایک دن تعطیل مناتے ہیں۔ اس دن کا م بند رکھتے ہیں اور لین دین نہیں کرتے۔"

اسی قسم کے بیانات مسلمانوں کے متعلق عہد تانگ کی کتب میں ہیں اور بہت سی ضائع نہیں ہیں۔ عہد سونگ کی کتابوں میں مسلمانوں کے متعلق اس عہد کے اکثر مورخین نے مسلمانوں کو دیوتا کے نام سے خطاب کیا ہے تیاؤ جو جون ... میں لکھتا ہے۔ "مو چہ (مکہ) مسلمانوں کا اصلی سرچشمہ ہے وہاں ایک محل (کعبہ) ہے جو کئی رنگ کے پتھروں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ہر سال ایکبار وہاں بڑا مجمع ہوتا ہے۔ ممالک اسلامی کے بادشاہ وہاں آکر عبادت کرتے ہیں اور صدقہ اور خیرات دیتے ہیں۔ اس محل پر ایک قیمتی غلاف چڑھایا جاتا ہے۔"

داستان لینگ چاؤ میں لکھا ہے کہ

"کنٹن میں اجنبی لوگ بہت ہیں۔ ان کے کھانے وہی ہیں جو ہم کھاتے ہیں لیکن سور کا گوشت ان کے نزدیک سخت ممنوع ہے۔ وہاں جتنے اجنبی ہیں سور کا گوشت بالکل نہیں کھاتے۔"

حکایات نانگ ہائی میں تحریر ہے کہ "کنٹن میں عربوں نے عہد تانگ میں ایک منار تعمیر کیا ہے جس کا نام ہے دی شینگ تھا۔ (منار یادگار نبی) اس کی بلندی ۱۶۰ فٹ ہے۔ ہر صبح وہاں سے پکارنے کی آواز آتی ہے اور اس میں نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اس منارہ کے نیچے ان کا عبادت خانہ ہے۔"

تذکرہ انساں میں ہے۔

"مسلمانوں کے بادشاہ اور عوام سب صرف ایک معبود (اللہ) کو مانتے ہیں۔ ہر ہفتہ میں داڑھی کٹواتے۔ ناخن ترشواتے اور نہاتے ہیں۔ سال میں ایک مہینہ تک اپنی مقدس کتاب کی تلاوت کرتے اور روزانہ پانچ دفعہ عبادت کرتے ہیں۔"

تاریخ یوکان میں یہ بیان ہے:

"فلاں یونگ میں دریائی مسافروں نے آکر سکونت اختیار کرلی ہے۔ دیوتا (معبود) کو پوجنے کے لئے ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ صفیں باندھ کر عبادت کرتے ہیں۔ ان کا اپنا الگ عبادت خانہ ہے۔ طرز عبادت چینیوں سے ملتا جلتا ہے۔ مگر ان کے سامنے کوئی تراشی ہوئی مورت نہیں ہوتی۔ وہ آیا آیا (اللہ۔ اللہ) پکارتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز ہے۔ عبادت خانہ پر لمبے لمبے کتبے ہیں جن میں عجیب زبان لکھی ہوئی ہے۔ کوئی چاقو کوئی قینچی کی صورت نظر آتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس ملک کی زبان ہے۔ عبادت کرنے میں سب کے سب رخ ایک ہی طرف کرتے ہیں۔"

کنٹن کے محصول نامہ میں لکھا ہے کہ:

"عربی تاجر کثرت سے آتے ہیں۔ ان کے جہازوں نے کنٹن کے بندرگاہ کو آباد کر دیا ہے جس کی وجہ سے کنٹن کی آمدنی میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔"

خاندان ٹانگ کے عہد میں مسلمانوں کی کیفیت:

ٹانگ اور سونگ کے عہد میں اسلامی سلطنتوں کے تعلقات چین کے ساتھ ایسے تھے جیسے آج کل امریکا۔ انگلینڈ اور فرانس کے ہیں۔ اس زمانے میں جو تجارتی جہاز چین میں آتے تھے وہ اکثر ایرانی مسلمانوں کے تھے۔ ٹائی پنگ کے روزنامچہ میں جو ۹۷۶ء میں لکھا گیا ہے ایرانی تجار کے متعلق یہ بیان ہے کہ ان کے پاس بے شمار دولت ہے۔ چینگ جیشان نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جس وقت ٹیانگ زین کونگ کے لشکر نے یانگ چاؤ میں بغاوت کی اور اس

شہر کو لوٹ لیا اس وقت جتنے آدمی ہلاک ہوئے ان میں سے کئی ہزار مسلمان تھے ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب اس چھوٹے سے شہر میں اس قدر کثیر تعداد مسلمانوں کی تھی تو کل چین میں ان کی آبادی کس قدر ہو گی ۔

عہد ٹانگ میں جبکہ اسلامی حکومت اسپین سے لے کر ہند تک اور قسطنطنیہ سے لے کر کاشغر تک پھیلی ہوئی تھی مسلمان چین سے غافل نہ تھے چینی کاشغر کو فتح کرنے کے بعد ان کا ارادہ تسخیر چین کا بھی تھا۔ مگر خاندان ٹانگ کی خارجہ پالیسی ایسی تھی جس سے ان کا ملک اسلامی حملہ سے محفوظ رہ گیا ۔ وہ حتی الامکان پڑوسی ممالک کے ساتھ مصالحت اور آشتی رکھنی چاہتے تھے اور یہی کوشش کرتے تھے کہ ہم سرحد سلطنتوں کو ان کی طرف سے کوئی شکایت کا ۔ ۔

کی طاقت ان کی وسعت سلطنت کے ساتھ بہت بڑھ گئی تھی اور ا

چھائی ہوئی تھی ۔ اس کے اقبال کا ستارہ بلندی پر تھا ۔ خاندان ٹا

اس غیر معمولی طاقت کے ساتھ جنگ چھیڑنا خطرہ سے خالی نہیں سمجھ

ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے کچھ دے کر صلح جوئی کا راستہ اختیار کر لیا ۔ یہ ممکن تھا کہ مسلمان اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیتے اور بغیر خراج لئے چین کو نہ چھوڑتے مگر اسی زمانے میں حجاج بن یوسف کی وفات اور تسخیر فرانس کے لئے مزید فوجی کمک کی دربار خلافت دمشق سے طلب ۔ عمر ولید بن عبد الملک کے انتقال کی وجہ سے ایک اضطرابی حالت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں نے اس ہدیہ کو غنیمت سمجھا اور چین کو اس کی حالت پر چھوڑ کر خوش خوش وہاں سے واپس آ گئے ۔

خاندان ٹانگ نے صرف یہی نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مصالحت رکھی بلکہ اپنے اندرون ملک میں بغاوت کو دبانے کے لئے ان سے مدد بھی مانگی جس کی وجہ سے تعلقات اور بھی مضبوط ہو گئے ۔

ہر شخص جانتا ہے کہ چین ایک وسیع ملک ہے ۔ مگر اس زمانہ میں چین کی وسعت اتنی نہ

تھی جتنی آج ہے۔ اصل چین تو دریائے زرد سے کر دریائے یانگ ٹس تک تھا۔ باقی جو صوبے تم وہ چین کی محفہ سلطنتیں تھیں جو اس کو صرف خراج دیتی تھیں۔ ان میں سے اکثر بسا اوقات چین کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے تھے۔ ایک ہی وقت میں سلطنت چین کے لئے متعدد دشمنوں کا مقابلہ مشکل تھا۔ جب کثرت بغاوت کی وجہ سے اس کا دم ناک میں آگیا تو اس کو اسلامی حکومت سے امداد مانگنی پڑی چنانچہ شاہی تذکرہ میں یہ یادداشت مسطور ہے کہ جینگ یونگ کے دوسرے سال (۷۵۷ء) میں ایک سپہ سالار یمی نامی چین سے مسلمانوں کے پاس مدد مانگنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ درخواست کا مضمون یہ تھا۔

"ممالک مغرب میں مسلمان سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ان کی سلطنت بحیرۂ روم سے کاشغر چین تک پھیلی ہوئی ہے۔ عالم کے اکثر حصے ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے ملک میں بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ جن کو فرو کرنے کے لئے ہمارے پاس لشکر بہت کم ہے۔ ہم مسلمانوں سے مدد کی توقع رکھتے ہیں"

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چینی سلاطین مسلمانوں کو کس نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے باہمی تعلقات کیسے تھے۔

دوانگ کے سفرنامہ میں ہے کہ دیار عرب میں پکین کے دو باشندے تھے اور ہوانگ کے چند۔ ان لوگوں نے وہاں عربوں کے درمیان سکونت اختیار کر لی تھی۔ حالات دارالسلطنت میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۳۶۲ء کے بعد صرف شہر چاآن میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار تھی۔ غالباً اس زمانے میں پکین میں بھی غیر ملکیوں کی تعداد اتنی نہیں ہے جس قدر کہ اس زمانے میں چاآن میں مسلمانوں کی تھی۔

الغرض خاندان ٹانگ اور مسلمانوں کے درمیان نہایت گہرے تعلقات تھے۔ تاریخ سفارتنامہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۶۵۱ء سے ۷۹۸ء تک اسلامی حکومتوں کی طرف سے جو سفراء چین میں گئے تھے جن کے نام سفارت نامہ میں درج کئے گئے ان کی تعداد ۳۷ تھی اور جن کے نام درج نہیں کئے گئے یا جو غیر سرکاری طور پر گئے ان کی تعداد کا علم نہیں۔

ایک پرانا اسلامی کتبہ۔ اور مندر کو مسجد بنانا۔

چین میں مسلمانوں کا ایک قدیمی کتبہ ہے جو صوبہ شنسی کے شہر شی آن کی ایک مسجد میں ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ [illegible]ء کا ہے۔ اس زمانے میں خاندان تانگ کا بادشاہ تیانگ پایۂ تخت پر تھا۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ اس کتبہ کا مضمون بادشاہ کے ایک درباری وان کونگ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ بات اگر واقعی ثابت ہو جائے تو چینی مسلمانوں کی تاریخ میں اس کو ایک غیر فانی اہمیت حاصل ہوگی مگر یہ امر ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا۔ عبارت اور الفاظ کی ترکیبوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد سونگ یا مینگ کا ہے کیونکہ اس میں اور عہد ٹانگ کی لفظی ترکیبوں میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے علاوہ برآں طرز تحریر بھی اس زمانے کا نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے عہد سونگ کا لفظی ترجمہ وہ ہے جو عہد مینگ میں کیا جاتا تھا۔

عہد ٹانگ میں مشہور علماء کثرت سے تھے اور وان کونگ کسی جرم کی بنا پر بادشاہ نے اس کے لئے خودکشی کا فرمان جاری کیا تھا۔ اس ... کے مضمون کے لئے وان کونگ کو کیوں منتخب کیا گیا۔ دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ عہد مینگ کے لوگوں کو آخر مصنوعی کتبہ بنانے کی کیا ضرورت تھی اور پھر وان کونگ کا نام لکھنا کیا ضرور تھا۔

مزید تحقیقات سے لوگوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عہد ٹانگ میں وان کونگ نے شہر شی آن کے جنوب میں ایک محل بنایا تھا جس میں وہ ایک عرصہ تک رہا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے اس محل کو مندر بنانے کے لئے وقف کر دیا۔ اس موقع پر مندر میں یہ کتبہ نصب کیا۔ اس کے بعد جب اس شہر میں مسلمان آبادی کی کثرت ہوگئی تو یہ مندر مسلمانوں کے قبضے میں آگیا اور انھوں نے اس کو مسجد میں منتقل کر دیا اور کتبہ کو تاسیس مسجد کی تاریخ لکھنے کے لئے کام میں لائے۔ ان وجوہ سے اس کا مضمون عہد مینگ کا معلوم ہوتا ہے مگر تاریخ عہد ٹانگ کی ہے۔ لیکن ابھی تک بلا مزید تحقیق کے اس کے متعلق قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ ثابت ہے کہ وان کونگ نے اپنے مندر کے لئے وقف کیا۔ بعد میں یہ مندر مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا اور انھوں نے اس کو مسجد بنا لیا

جو مسلمانان چین کی مذہبی تاریخ میں ایک دلچسپ ورق ہے۔

عہد تانگ میں مسلمان شاعر اور حکیم:

عہد تانگ میں ایک مسلمان کو جس کا نام لی نیان شنگ تھا چنشی (ڈاکٹر) کا خطاب دیا گیا تھا۔ ۸۲۲ء میں چین میں دو ایرانی مسلمان علم و فضل میں بہت مشہور تھے۔ یہ دونوں بھائی بہن تھے۔ چنانچہ وانشو فو کی داستان میں ذکر ہے کہ لی شیاتنگ جو کہ لی ٹینی کے لقب سے معروف ہے اس کے آبا و اجداد ایرانی تھے۔ یہ ہی چونگ کے ساتھ ۸۹۴ء میں سزیچوان میں آیا۔ اس کے بعد بادشاہ چین نے اس کی لیاقت کی وجہ سے اس کو اپنے درباریوں میں داخل کر لیا۔ اس کا ایک بھائی شونگ نامی شاعری میں مشہور تھا جس کے ارد گرد ہر وقت احباب اور دوستوں کا مجمع رہتا تھا۔ لی ٹینی ایک شریف مزاج، خوش طبع، صالح اور قانع حکیم تھا۔ وہ لوگوں کا علاج کرتا تھا اور اس سے جو کچھ کماتا تھا سال کے آخر تک سب خرچ کر دیتا تھا۔ اور سوائے طبی کتابوں اور دوائیوں کے اور کچھ اپنے پاس نہیں رکھتا تھا۔

ہو کونگ یون ایک چینی تذکرہ نگار اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ:

لی شونگ ایرانی نسل سے تھا وہ بچپن ہی سے محنت اور جفاکشی کا خوگر تھا۔ اور علوم و فنون کا عاشق۔ لوگ اس کو علوم کا دیوانہ کہہ کر پکارتے تھے۔ جب شعر سناتا تو لوگوں کو مست کر دیتا۔ شہر میں ایک حاکم تھا جس کو لی شونگ سے محبت تھی مگر وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس پر لی شونگ جھٹ سے شعر کہہ دیتا تھا۔

غیر ممالک کے اخلاقی امور میں نمائش نہیں ۔۔۔ لی شونگ ایرانی باشندہ کی شاعری میں بناوٹ نہیں
اگر خوش قسمتی سے شاہی محل کا پھول بھی مہکے ۔۔۔ گو اس میں رنگ کی نمائش ہو مگر حقیقت میں خوشبو نہیں

یانگ زینگ کے مجموعہ میں ہے کہ لی شونگ کی حقیقی بہن لیشو یونگ بھی اچھے خاصے شعر کہتی تھی چنانچہ شاہی دعوت کے موقع پر اس نے یہ شعر کہے تھے۔

بلبل کی آواز یکایک باہر سے سننے میں آئی ۔۔۔ چونک اٹھیں بیگمات محل کی خواب سے

ہوگیا؟ ابا شاہ نے کھینچی اپنی سنہری کمان   پھول کی جانب تیر چلایا اور مار لیا بلبل کو تاک

"نغمات پھول" میں بھی شونگ کے بہت سے اشعار مندرج ہیں۔ وہ نہ صرف شاعر تھا بلکہ طبیب بھی تھا اور لوگوں کا علاج کرتا تھا۔ اس کا پیشہ بالکل عہد یونگ کے مسلم شاعر نیک فونیانگ سے مشابہ تھا۔ وہ بھی شاعر تھا یہ بھی شاعر۔ وہ بھی حکیم تھا اور یہ بھی حکیم۔ شعر گوئی اور طبابت مسلمانوں کی خاص خصوصیت ہے جو کسی دوسری قوم میں نہیں پائی جاتی۔ آج کل چینی زبان میں شونگ کا ایک مجموعہ معالجات ملتا ہے جس میں جڑی بوٹیوں کے نام اور نسخے درج ہیں۔

تذکرہ معصوری میں ہے کہ لی شونگ کی بہن نہ صرف شاعرہ تھی بلکہ ... بھی تھی۔ یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بہت قابل عورت تھی۔

چینیوں اور مسلمانوں میں باہمی ازدواج:

اس زمانے میں بعض چینی شاہزادوں نے مسلمانوں کی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور چینیوں اور مسلمانوں کے تعلقات زیادہ مضبوط ہوگئے۔ عہد سونگ میں چینیوں اور عربوں کے درمیان ازدواج کا دروازہ کھل گیا۔ عہد سونگ سے پہلے ہم کو معلوم نہیں کہ عربوں اور چینیوں میں شادیاں ہوتی تھیں یا نہیں لیکن ایرانیوں اور چینیوں میں شادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ممکن ہے کہ چینی تاریخوں میں ایرانیوں کا لفظ جو لکھا ہے اس سے مراد وہ جملہ مسلمان ہوں جو اس زمانے میں چین کے شہروں میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ بہرحال عہد سونگ میں عربوں اور چینیوں کی مخلوط شادیوں کا تذکروں میں خصوصیت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔[۱]

سونگ کے ساتویں سال ۱۱۳۷ء میں عرب کے ایک مالدار تاجر ابو علی کنٹن میں رہتے تھے۔ وہاں کے ایک تحصیلدار چینیلہ نامی نے ابو علی سے دوستی پیدا کی۔ اس کی نگاہ اس بے شمار دولت پر تھی جو ابو علی رکھتے تھے۔ اس لئے اس نے اپنی حقیقی بہن ابو علی کے نکاح میں دے دی جس کی وجہ سے ابو علی پھر اپنے ملک کو نہ جا سکے اور کنٹن ہی میں انتقال کر گئے۔

الغرض عربوں اور چینیوں میں مخلوط شادیاں کثرت سے ہوئیں اور ان میں کوئی رکاوٹ

نہیں رہی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد چین میں تیزی کے ساتھ بڑھنے لگی۔

پیکن کا بانی مسلمان تھا:

عہد سونگ میں عرب سے جو مسلمان چین میں آئے تھے وہ دریائی راستے سے آئے تھے اور تاتاری اور مغل مسلمان خشکی کی راہ سے۔ عہد یونگ (کوبلے خاندان کے زمانہ)[1] میں چین میں مسلمانوں کو روز افزوں ترقی نصیب ہوئی اور حکومت میں ان کا اثر اور ملک میں ان کی قوت بہت بڑھ گئی وہ ہر لحاظ سے چینی باشندوں سے بہتر حالت میں تھے۔ اس عہد میں سرکاری اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کی جو تعداد تھی اور جن کے نام رپورٹوں میں درج کئے گئے ہیں وہ سو سے زیادہ تھی۔ علم و فضل میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ تقریباً ہر شعبے میں انھوں نے کتابیں لکھیں۔ مسلمان شاعر ینگ خونیانگ کا دیوان آجتک چینی زبان میں موجود ہے۔

نہ صرف علم و فضل سے وہ چینیوں سے آگے تھے بلکہ فن تعمیر میں بھی چنانچہ چین کا دارالسلطنت جو پیکن کے نام سے مشہور ہے مسلمانوں ہی کا تعمیر کردہ ہے۔ اس کے اصل بانی کا جو مسلمان تھا

---

(۱) عہد یونگ چین کے کمال عروج کا زمانہ تھا اس میں چنگیز خاں نے مشرق سے مغرب تک فتوحات کیں اور پھر اس کی اولاد نے۔ کوبلے (قوبلائے پسر تولی خاں، چنگیز خاں کا پوتا اور ہولاکو کا بھائی تھا چین کے تخت پر ۳۴ سال تک شان و شوکت کے ساتھ فرمانروائی کر کے ۶۹۳ھ میں گزر گیا اس کے عہد میں چین میں سید اجل بخاری کا خاندان وزارت پر رہا یعنی شہزادہ سید اجل۔ پھر اس کا بیٹا ناصر الدین پھر ناصر الدین کا بیٹا ابوبکر۔ کوبلے کے زمانے میں غازان خاں اور اس کے ساتھی تاتاری ایران میں مسلمان ہوئے جن کے اثر سے خود کوبلے کا پوتا انندہ سلطان والی ختا مع اپنی ڈیڑھ لاکھ فوج کے مسلمان ہو گیا۔ اور تقریباً سارے چینی ترکستان میں اسلام پھیل گیا۔ کوبلے کے بعد اس کا پوتا تیمور (الجائیتو خاں) چین کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے اکثر امرا مسلمان تھے۔ اسی کے عہد میں وزیر رشید الدین فضل اللہ نے فارسی زبان میں جامع التواریخ لکھی جو چین کی تاریخ کے متعلق واحد دستاویز مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

اسلم

بخدر نام تھا۔

اس قسم کے علمی تعمیری اور ملکی اور قومی بہت سے کام تھے جن کو مسلمانوں نے بخوبی انجام دیا ہو جن کی تفصیل بلا ایک مبسوط تاریخ کے اس مختصر مضمون میں نہیں ہو سکتی۔ افسوس یہ ہے کہ دیگر ممالک کے مسلمان بھائی چینی زبان نہ جاننے کی وجہ سے چینی مسلمانوں کے حالات سے واقف نہ ہو سکے اور چینی مسلمان اپنے بھائیوں سے الگ رہنے اور ان کی زبان نہ جاننے کی وجہ سے اپنے حالات ان تک نہ پہنچا سکے جن کی وجہ سے وہ بقیہ بلاد اسلام سے منقطع رہ گئے۔ حالانکہ اسلام سے ان کا تعلق بجنسہ قائم ہے۔

عہد یونگ میں مسلمانوں کی علٰحدہ عدالت :

اس عہد کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی علٰحدہ ۔۔۔

ان امتیازات اور اعزازات کا نتیجہ تھا جو اس زمانے میں ان کو حاصل ۔۔۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کے حصے زیادہ ہونے کی وجہ سے شاہ چین سے اصول سے جدا گانہ عدالت کا حق حاصل کر لیا۔ چنانچہ عہد یونگ کے عدالت نامہ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ہادی اعظم (قاضی اعظم) کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی مقدس کتاب کے مطابق احکام شرعی جاری کرے اور ان کی پابندی کرائے اور مسلمانوں کے تنازعات اور قضایا کو اس کے ماتحت فیصل کرے۔

مختلف عہدوں میں مسلمانوں اور اسلام کے لئے مختلف نام :

اسلام اور مسلمانوں کا نام چینی زبان میں ہر عہد میں مختلف رہا ہے۔ گو ان سب کا مطلب ایک ہی ہے لیکن الفاظ اور ان کی کتابت میں اختلاف ہے۔ کوئی خاص نام ان کے لئے کبھی متعین نہیں ہوا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل چینی زبان میں اسلام اور مسلمانوں کے بہت سے نام ہیں جس نام سے چاہیں خطاب کر سکتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بعضوں نے معنی کے لحاظ سے ان کے نام رکھے بعضوں نے لفظوں کے۔ اور بعضوں نے قوم کے لحاظ سے اور بعضوں نے دین کے

جہاں تک نسلی لحاظ سے نام کا تعلق ہے عرب تاتاری اور ہوی چینی اس میں شامل ہیں۔ ہر عہد کا لفظی ترجمہ بھی مختلف رہا ہے یعنی حروف میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ گو تلفظ تقریباً یکساں رہا ہے۔ ہم ذیل میں ان ناموں کو لکھتے ہیں۔ اگرچہ ناظرین کرام ان الفاظ کو پسند نہ کریں گے لیکن ان کا درج کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

(الف)

نسلی نام سے۔ ہوی ہوی جاؤ۔ ہوی جاؤ۔ نیانگ فانگ جاؤ ......
لفظی ترجمہ سے۔ آشلام۔ آشلا۔ آسلان۔ آسلم .... } اسلام
معنوی لحاظ سے۔ داشفا۔ داشفی جاؤ۔ تسینگ چینگ جاؤ ......

(ب)

نسلی نام سے۔ ہوی جیپا۔ ہوی خوی۔ آسلان ہوی خوی۔ وی او۔ وی ہو۔ ہوی ہوی
لفظی ترجمہ سے۔ سلمان۔ مسلومان۔ مسودان۔ موسومان۔ سومان۔ سوامان۔ مسلم ... } مسلمان
معنوی لحاظ سے۔ جاؤ مینگ۔ ٹینگ چینگ جاؤ مینگ۔ ہوی ہوی جاؤ مینگ .....

عہد ٹانگ میں لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو موموا یا محامو کہتے تھے۔ اس کا ٹھیک لفظی ترجمہ ۷۴۲ء میں ہوا جو ٹینگ چیو کی مسجد کے سنگ بنیاد پر کندہ ہے۔ ہوانگ چیو کی مسجد پر بھی یہی نام لکھا گیا ہے۔ مگر کنٹن کی مسجد النبی میں محامو لکھا ہے۔

ہوی جیپا ترکستان کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ چونکہ چنگیز خاں کی مغربی وشمالی فتوحات کے بعد اس سرزمین میں لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے چینی زبان میں اسلام کے لئے جو سب سے پیارا اور صحیح معنوں میں ٹھیک نام ہے وہ ٹینگ چینگ ہے یعنی خالص دین اس واسطے مسلمان کو ٹینگ چینگ جاؤ مینگ کہتے ہیں یعنی خالص دین والے۔ آج کل چینی زبان میں اسلام کے لئے ہوی جاؤ اور مسلمان کیلئے ہوی ہوی پسند کیا گیا ہے۔ عام طور پر انہیں لفظوں سے وہ پکارے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کا تعلق نسل سے ہے مگر اس سے مراد وہ شخص ہے جو قرآن کا بتایا ہوا عقیدہ رکھتا ہو۔

عہد مینگ میں مسلمانوں کا اثر:

عہد یونگ (تاری عہد) کے بعد جب خاندان مینگ (۱۳۶۸ء سے ۱۶۴۴ء تک) کی حکومت
قائم ہوئی تو اس زمانے میں مسلمانوں کی تعداد اور بڑھ گئی کچھ تو اس وجہ سے کہ عہد یونگ ہی سے وہ
[illegible] گئے تھے اور کچھ امیر تیمور کی وسط ایشیا کی فتوحات سے ان کا اقتدار زیادہ ہو گیا۔ اور غیر معمولی طور
پر چین میں مسلمانوں کی حالت ترقی کر گئی۔ سرکاری دفاتر میں زیادہ تر امراء اور عہدیدار مسلمان ہی تھے
اس عہد میں چینی مسلمانوں کی حالت کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے
کہ امتحان میں ۱۳۸۵ء میں دس مسلمانوں نے کامیابی حاصل
کی جس قدر ہندی مسلمان برطانوی سول سروس کے امتحان
یہ چھ سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔

عہد مینگ میں مسلمانوں کی حالت دن بدن بہتر اور برتر ہوتی گئی [illegible]
ملازمت میں ان کی تعداد کثیر تھی بلکہ اور ہر قسم کے کاموں میں وہ شریک تھے۔ اس عہد میں ایک
دار الترجمہ قائم ہوا تھا جس کا صدر بھی ایک مسلمان تھا اور اس کے کارکن بھی اکثر مسلمان ہی تھے
جو مشائخ کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

مینگ تائی تسو اپنی یادداشت میں لکھتا ہے کہ اس کے اکثر فرامین مشائخ محمد کے ہاتھوں
کے لکھے ہوئے تھے

یونگ لیو کے عہد (۱۴۰۳ء سے ۱۴۲۴ء تک) شہنشاہی حاجب ممالک مغرب میں بھیجا گیا تھا۔
جس کا نام چینگ ہو تھا۔ یہ مسلمان تھا۔ یہ ہم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کے باپ کی قبر جو صوبہ یونان
میں ہے اس پر ایک طویل کتبہ ہے جس پر یہ بھی لکھا ہے کہ حاجی اکونگ کے دو بیٹے ہیں چھوٹے
کا نام ماہو ہے جو شہنشاہ کے دربار میں ملازم ہے۔ شہنشاہ نے اس کو چینگ کا خطاب دیا جس سے
چینگ ہو ہو گیا۔ چونکہ حاجی سوائے مسلمان کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اس لئے یہ یقین کر لینا چاہئے
کہ یہ دونوں باپ بیٹے مسلمان ہی تھے۔

۱۲۰۵ء میں شہنشاہ چین ہو چونگ نے ایک مسلمان لڑکی سے شادی کی جس کی وجہ سے اس نے سور کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا ممنوع قرار دیا ورنہ اس سے پہلے سوائے مسلمانوں کے جملہ اہل چین خنزیر کھاتے تھے۔

ان باتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عہد مینگ مسلمانوں کا اثر کس قدر تھا۔

مسلمانان چین اور تعلیمات کانفوشس:

چینی مسلمانوں نے کانفوشس کی تعلیمات کا بے تعصبی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اور اس کو پسند کیا۔ اس لئے وہ کانفوشس کی عظمت کرتے ہیں۔ وہ اس قدر متعصب نہیں جس قدر دوسرے مذاہب کے لوگ ہیں۔ ان کی باتیں جو چینیوں سے الگ ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ کسی مورت کو نہیں پوجتے اور اللہ کے سوا کسی دیوتا کو نہیں مانتے۔ نہ وہ قبروں کی پرستش کرتے ہیں نہ کسی بت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ کانفوشس کو وہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں چنانچہ ایک مسلمان شاعر نے کہا ہے۔

سادھو کہتے ہیں کہ گوتم بدھ ہی مقرب ہیں	تارک الدنیا سمجھتے ہیں کہ خضر ہیں دریا کے بند میں
مگر کانفوشس کی تعلیم کی حقیقت میری نظر میں ہے	کہ اس سوز زندگی میں زن ہی زمانہ کے آغوش میں

صوبہ یونان میں کانفوشس کی خانقاہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بنائی ہوئی ہے۔ وانگ تاؤ یولی نے جو تعلیم الاسلام تصنیف کی ہے اس میں کانفوشس کا فلسفہ نظر آتا ہے۔ ۱۶۲۲ء میں لیو چیا نے جو عقائد اسلام مرتب کی اس میں بھی کانفوشس کے اقوال کثرت سے نقل کئے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مسلمانان چین کے خیال پر کانفوشی تعلیمات کا اثر قائم ہے۔

اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پہلے شاہی ملازمت کے لئے خود مسلمان باہم ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کرتے تھے اور علوم و فنون سیکھتے تھے اس میں اسلامی اور غیر اسلامی علوم کا امتیاز نہ تھا۔ اور چین میں علوم و فنون کا سرچشمہ کانفوشی تعلیمات ہیں۔ اس لئے انھوں نے اس کو بھی اچھی طرح سیکھا۔

عہد چنگ میں چین کے علما اکثر مسلمانوں کے ساتھ بحث و مباحثہ بھی کرتے تھے یا یوں کہئے
کہ باہم ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے تھے جس سے فریقین پر ایک دوسرے کے مذہبی
عقائد کا اثر پڑا۔
مسلمان اپنے مذہبی رسموں کی ادائگی میں آزاد رہے۔
موجودہ زمانے سے نصف صدی پہلے سے عیسائی مشنری چین میں آنے لگے مگر حکومت چین
نے ان کی تبلیغ اور مذہبی رسوم کی ادائگی کو قانوناً روک دیا۔ لیکن اہل اسلام چین میں اب تک
معاملات میں ہمیشہ آزاد رہے اور کبھی ان کے مذہبی امور کے متعلق کو
صرف یہ بلکہ شاہی حکم ہے، اسلامی مساجد اور معابد کی حفاظت کی
ئے چین میں جائے اور وہاں کی مساجد کو دیکھے تو اس کو ہر مسجد
سنہری حرفوں میں ایک عبارت لکھی ہوئی ہوگی جس کا ترجمہ یہ ہے
صرف مسلمان سے آباد) اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان نماز کے وقت بادشاہ کا نام لیتے یا
اس کی تعظیم کرتے تھے۔ بلکہ اس سے مسجد کی حفاظت اور حرمت مقصود تھی۔ حالت یہ تھی کہ بعض
غیر مسلم مسجد کو مندر یعنی عبادت گاہ سمجھ کر اس میں گھس جاتے تھے اور اپنے شرکیہ مراسم ادا کرنے
لگتے تھے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری اور مسجد کی بے حرمتی ہوتی تھی اس وجہ سے بادشاہ
نے حکم دیا کہ ہر مسجد میں ایک تختی لگا کر اس پر یہ عبارت لکھ دی جائے تاکہ کوئی غیر مذہب کا آدمی
اس میں داخل نہ ہو سکے۔ یہ تختیاں پہلے تو ایک نمایاں جگہ پر لگائی جاتی تھیں لیکن جب سے چین
میں جمہوریت پھیلی ہے اس وقت سے کسی کونے میں رکھ دی گئی ہیں لیکن اب تک موجود ہیں اور
اکثر مساجد میں ملتی ہیں۔

حکومت کی مسلمانوں سے مخالفت:

جب خاندان مینگ کی حکومت ۱۶۴۴ء میں مٹ گئی اور خاندان ٹِنگ کے اقتدار کا آغاز
ہوا اس وقت مسلمانوں کی حالت بالکل بدل گئی۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ عہد مینگ میں شاہی ملازمتوں

میں مسلمانوں کی تعداد غالب تھی اور ان کا اثر ان کی تعداد کے ساتھ پھیلتا جاتا تھا جب خاندان مینگ مٹ گیا اور چینگ کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ آگئی تو طبقات کو اپنی حکومت استوار کرنے کے لئے مسلمانوں کو ملازمتوں سے نکالنا پڑا۔ مگر ان کو نکالنا آسان نہ تھا کیونکہ تمام بڑے بڑے عہدوں پر یہی لوگ تھے اس لئے چینگ خاندان کے اس جور و تعدی کی وجہ سے کبھی کبھی مسلمان مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے یعنی یہ بغاوتیں خود حکومت کے ظلم و جبر سے پیدا ہوئی تھیں۔ اور یہ ہم اپنی ذاتی رائے نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ عہد چینگ (۱۶۴۴ سے ۱۹۱۲ء تک) کے مورخین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ان تمام جنگوں میں جو مسلمانوں کے ساتھ ہوئیں مسلمان بے قصور تھے۔ اور یہ صرف حکومت کی غیر روادارانہ اور متعصبانہ روش تھی جس نے ان کو بغاوت پر مجبور کر دیا تھا۔ چیانگ لونگ کے وسط عہد سے کر کوانگ چون کے آغاز تک (۱۷۷۶ سے ۱۸۷۸ء تک) کہ تقریباً سو سال کا زمانہ ہوتا ہے اس میں جو اہم واقعات مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے وہ پانچ ہیں جن کو عہد چینگ کے مورخین بغاوت سے تعبیر کرتے ہیں ان کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے نام اور جلدوں کی تعداد مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ سوزی شیشان کی بغاوت ۔ واقعہ لانگ چاؤ (۱۷۸۲ء) ۲۰ جلدیں

۲۔ ہائینگ ہینگ کی بغاوت ۔ واقعہ شیفان پاؤدہ (۱۷۸۵ء) ۲۰ جلدیں

۳۔ چانیک کیل کی بغاوت ۔ تذکرہ باغیان ہینگ چانگ (۱۸۲۱ سے ۱۸۳۰ء تک) ۱۳۰ جلدیں

۴۔ دووین شیون کی بغاوت ۔ تذکرہ مسلم باغیان یونان (۱۸۵۵ سے ۱۸۷۰ء تک) ۵۰ جلدیں

۵۔ عقیہ (؟) کی بغاوت ۔ تذکرہ استیصال مسلم باغیان شینسی کانسو و چینی ترکستان (۱۸۵۵ سے ۱۸۸۹ء تک) ۳۲۰ جلدیں۔

مندرجہ بالا کتب کو چینی مورخین نے مسلمانوں کی اہم شورشوں کے متعلق تصنیف کیا ہے ان کتابوں میں اس آخری دو صدی کے مسلمانان چین کے مفصل حالات آگئے ہیں چونکہ ان میں سے کوئی کتاب میرے پاس اس وقت نہیں ہے اس لئے کوئی اقتباس نہیں دے سکتا۔

مسلمان اپنی حالت پر برابر قائم رہے ہیں:

چین کے مسلمانوں کو ٹینگ خاندان نے اگرچہ برابر ستایا اور ان کو مٹانے کی کوشش کی مگر ان کی قوت اور اثر میں کوئی فرق نہیں آسکا ان کی حالت تقریباً وہی رہی جو عہد مینگ میں تھی، باوجود اس کے کہ مسلمانوں نے چین میں کوئی حکومت نہیں قائم کی اور نہ انھوں نے کبھی مذہبی تبلیغ کی مگر ان کی تعداد برابر بڑھتی رہی۔ کوئی قوت ان کے اثر اور وقار برابر بڑھتا رہا۔ ہمارے خیال میں ان کے ترقی کے

(۱) تجارت۔ اور تجارت کی غرض سے دور دراز کے سفر

(۲) عسکری قوت کی پشت پناہی۔

(۳) ان کی نسلوں اور خاندانوں کا انتشار۔

(۴) چینی تمدن اور تہذیب کا اختیار کر لینا۔

ان اسباب کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) عہد تانگ۔ سونگ اور یونگ میں چین میں جو مسلمان آئے اور جنھوں نے وہاں سکونت اختیار کرلی اور ان کی نسلیں بڑھیں۔ اس کی وجہ تجارت تھی۔ ان زمانوں میں خشکی اور دریائی دونوں راستوں سے مسلمان چین میں تاجرانہ حیثیت سے جاتے تھے اور وہیں رہ پڑتے تھے۔ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ کنٹن میں ان کے جہاز بے شمار تھے جن کی آمدنی سے چین کے مالیہ میں اضافہ ہوا۔

(۲) وسط ایشیا چینی ترکستان۔ کانسو اور شنسی وغیرہ میں مسلمانوں کی جو کثرت ہوئی اس کی وجہ عسکری قوت تھی۔ اگرچہ مسلمانوں کی عسکری قوت کا براہ راست چین پر اثر نہ تھا لیکن بالواسطہ ان کی قوت چین کے مسلمانوں کی حالت پر ضرور کافی طور پر اثر انداز ہوئی۔ اسلامی سلطنت کی قوت کی وجہ سے خود چینی حکومت نے ان سے فوجی امداد مانگی۔ یہ فوجیں جو کمک کے لئے آئی تھیں شاہ چین کی اجازت سے شمالی مغربی چین میں سکونت پذیر ہوگئیں اور ان کی اولاد بہت بڑھی۔

(۳) مسلمانوں میں کثرت ازدواج کا رواج تھا۔ اور ان کے لئے چینی عورتوں سے شادی

کرنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے نسلی اور قبائلی انتشار اور کثرت ازدواج کی وجہ سے ان کی تعداد اور ساتھ ہی ساتھ قوت بڑھتی گئی۔

(۴) عہد یونگ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کو اپنے علم و فضل کی بدولت دربار شاہی اور سرکاری ملازمتوں میں بے نظیر رسوخ حاصل تھا۔ اور ان کے چینی تہذیب اختیار کرلینے کی بدولت چینیوں کو ان سے کوئی بیگانگی اور منافرت نہیں تھی۔ ان کا اٹھنا، بیٹھنا، رہنا، سہنا، کھانا، پینا سب چینی روش پر تھا۔ ان کے نام بھی چینی ہی تھے اور اب تک ہیں وہ اپنے سکون اور حرکت میں، لباس اور وضع میں چینی ہیں۔ اس وجہ سے وہ چین کے غیر مذہب والوں کے ساتھ تمدنی حیثیت سے بالکل ہم آہنگ رہے اور کبھی کوئی تصادم واقع نہیں ہوا۔

مسلمانوں کی یہ خصوصیت ہے کہ جہاں کہیں وہ جاتے ہیں وہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا اثر خود قبول کرتے ہیں اور اپنا اثر ان پر ڈالتے ہیں چنانچہ ازمنہ متوسطہ میں تاتاریوں نے جب مسلمانوں پر فتوحات حاصل کیں تو ان کے اثر سے خود مسلمان ہو گئے۔ چینی مسلمانوں میں جذب و کشش خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں اور چینی تہذیب و تمدن اختیار کرلینے سے اور بھی ارتباط بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے ان کی حالت ہمیشہ اچھی رہی اور کبھی فرق نہ آیا۔

مذکورہ بالا چاروں اسباب کے علاوہ دو سبب اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ وہ کانفوشس کی تعلیم کو پسند کرتے ہیں اور اس پر اعتراض نہیں کرتے۔

عدم تبلیغ بہ چین تبلیغ؛

غالباً بیان بالا سے اہل ہند کو خیال ہوگا کہ چین کے مسلمان بالکل مردہ ہیں جو مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے۔ وہ چین میں رہتے ہیں۔ وہاں کے حالات سے باخبر ہیں اور زبان جانتے ہیں پھر چینیوں کو مسلمان کیوں نہیں بنا لیتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ چینی مسلمان اگرچہ تبلیغ سے خاموش ہیں مگر اسلام فراموشی نہیں ہے۔ اگرچہ ان میں جوش نہیں ہے مگر وہ اس ملک کی آب و ہوا کے مطابق خاموشی اور استقلال کے ساتھ کام کرتے رہتے ہیں وہ یہ نہیں چاہتے کہ باہم ایک ہی ملک کے باشندوں میں

ناگوار صورتیں پیش آئیں۔ اور مذہب کی وجہ سے آپس میں تنافر پیدا ہو۔ کیونکہ مذہب عداوت پیدا کرنے کے لئے نہیں آیا ہے۔ چینی مسلمانوں کی کیفیت اس پودے کے مانند نہیں ہے جو باد بہار کے جھونکے سے پھیلا اور مرجھا گیا۔ یا اس بلبل کی طرح جو گلشن میں آئی چہچہائی اور اڑ گئی بلکہ ایک دریا کے مانند جو جس کی روانی برابر قائم رہتی ہے اور گرد و غبار اس میں رکاوٹ نہیں پیدا کر سکتے چین میں مسلمان اپنی تاریخ داخلہ سے آج تک باوقار ہیں۔ ان میں سوائے ترقی کے کبھی تنزل کے آثار نہیں پیدا ہوئے
اگر اہل اسلام کو اس بات پر ناز ہے کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا، تو ناز ہونا چاہیے
مثال جو معترضوں کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ چین کے مسلمانوں [illegible]
چینی مسلمان اگرچہ اسلام کی حقیقت سے زیادہ واقف نہیں مگر
ایمان جا بجا پختہ[1] ہے۔

چینی مسلمان اور غیر مذاہب:

چینی مسلمانوں کے تبلیغ نہ کرنے سے غیر مذاہب کے اہل چین ان کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور نہ اجنبی سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ خوش خلقی اور نیک برتاؤ سے رہتے سہتے ہیں۔ اور اپنا ہم وطن بلکہ بھائی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مذہب والوں کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور آئندہ بھی اس کا اندیشہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ داخلہ سے لے کر آج تک کسی مذہبی نزاع کا وقوعہ نہیں ہوا۔ [illegible] جبکہ اہل چین نے بدھ کی مورتیں توڑنی شروع کیں اور جلد بیرونی مذاہب سے مخالفت کا اظہار کیا اس وقت بھی مسلمانوں کا اور اسلام کا احترام ان کے دلوں میں قائم

---

(۱) چینی مسلمانوں میں وہ دو عیب نہیں ہیں جو بدقسمتی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں عام ہیں۔ ایک تو قبر پرستی اور دوسرے فرقہ بندی۔ چینی مسلمان اس بات سے واقف نہیں کہ اللہ کے سوا بھی کسی کے آگے سر جھکایا جاتا ہے یا اس سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ اور نہ وہ سنی شیعہ اور حنفی و وہابی کی تفریقوں سے آشنا ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ نہ ان میں پیر ہیں جنھوں نے مذہب کو پیشہ بنا لیا ہے نہ فقہا ہیں جن کا کام سوائے فرقہ بندی کے اور کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ اسلم

رہا۔ انھوں نے تمام مذاہب سے نفرت ظاہر کی خصوصاً گوتم بدھ کی تعلیم پر کانفوش کے ایک سرگرم معتقد نے ایسا حملہ کیا کہ جس سے ہیجان پیدا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ ان کے آدمیوں کو مار ڈالو۔ کتابیں جلا دو۔ خانقاہوں سے راہبوں کو نکال کر ان کو ذاتی گھر بنالو تب کانفوشی تعلیم زندہ ہو گی اور بدھ مت مٹے گی یہ اسی صدی میں باکسر عیسائی مشنریوں کے خلاف اٹھے تھے اس کا بھی تماشا دنیا نے دیکھ لیا۔ مگر ایک مسلمان ہیں جن کے خلاف چین میں کبھی شورش نہیں ہوئی یعنی مذہبی حیثیت سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ اور ان کی عزت اور ان کا وقار برابر قائم رہا۔

عہد ٹینگ میں اگر حکومت مسلمانوں پر جور و تعدی نہ کرتی اور ان کو ان کے اعتقاد نہ کہ مذہب کی وجہ سے نرستاتی تو یونان۔ کانسو۔ شینسی اور چینی ترکستان میں جو ناگوار صورت پیدا ہو گئی تھی کبھی نہ پیدا ہوتی۔ چینی مورخین سب متفق ہیں جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ خاندان ٹینگ کی زیادتی تھی۔ اور مسلمانوں کا قصور نہ تھا۔ اگر یہ پانچ واقعات چینی مسلمانوں کی تاریخ میں پیش نہ آتے تو آج ان کی قوت و عزت اور ان کا اثر اور زور ہر اعتبار سے زیادہ نمایاں ہوتا۔ تاہم مقابلۃً وہ چین کی دیگر اقوام سے اچھی حالت میں ہیں اور ان کی اصلی شان باقی ہے۔

انقلاب کے بعد:

ادھر آخری زمانے میں جب انقلاب ہوا۔ اور شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور جمہوری حکومت قائم ہوئی تو مسلمان کسی لحاظ سے بھی دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔ جمہوریہ کے اصول اساسی میں ایک اصول یہ رکھا گیا کہ پانچوں اقوام (مسلمان۔ چینی۔ پانچوں۔ منغول اور تبتی) کے حقوق مساوی ہوں گے۔ اور حکومت ان کی مشترکہ حکومت ہو گی۔ سرکاری ملازمت قابلیت کے لحاظ سے دی جائے گی نمائندوں کے انتخاب میں ہر شخص آزاد ہے۔ یعنی عوام جس کو اچھا سمجھتے ہوں خواہ مسلمان ہو خواہ غیر مسلمان اس کے حق میں رائے دیتے ہیں وہاں آج نہ اقلیت کا سوال ہے نہ اکثریت کا۔ نہ تحفظات ہیں اور نہ سیف گارڈ۔ مذہبی معاملے میں ہر شخص آزاد ہے۔ سیاسی معاملات قوم کی رائے پر موقوف ہیں۔

مسلمانوں کی تعداد:

چونکہ چین میں مردم شماری نہیں ہوئی ہے اس لئے میں مسلمانوں کی صحیح تعداد نہیں بتا سکتا
میرے پاس اس کے دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ ہے۔ چینی حکومت کے اندازہ میں کل چین کی
آبادی چالیس کروڑ ہے جس میں سے مسلمانوں کا تخمینہ ۲ کروڑ فرض کیا جاتا ہے [illegible] کے
دستور اساسی میں یہ تعین ہے کہ مسلمانوں کے نمائندے اس قدر ہونے چاہئیں [illegible]
سروس میں ان کی تعداد مقرر ہے اس لئے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا [illegible]
کس قدر ہے۔ آفیشل گزٹ سے بھی ہم نہیں معلوم کر سکتے کیونکہ چینی [illegible]
میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ جہانتک مجھے ذاتی علم ہے کہ حکومت [illegible]
دو ممبر مسلمان ہیں۔ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ عہدوں پر چار ہیں۔ فوجی جنرلوں [illegible]
میں وزیر تعلیم مسلمان تھا اور چینی ترکستان کا گورنر بھی مسلمان تھا۔ سیاسی امور میں مسلمان اپنے [illegible]
سے پیچھے نہیں ہیں اس کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ اب چین میں [illegible] اور [illegible] کانفرنس
کے لئے ۱۳۱ نمائندے منتخب ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیس مسلمان ہیں اور کانفرنس کا صدر بھی مسلمان
ہی ہے جس کا نام ما فو ہینگ ہے۔ یہ [illegible] کے ہاں کمشنر رہ چکے ہیں اور حکومت [illegible] نے ان کو
محکمہ مال کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا ہے۔

قصۂ حسینی

یعنی

قطب شاہی عہد کی ایک نامعلوم مثنوی

قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے متعدد شعرا اور اُن کی تصانیف کا پتہ ل چکا ہے مگر ہنوز آئے دن نئے شعرا اور ان کی گراں بہا تصانیف کا اضافہ ہوتا ہی رہتا ہے۔ یورپ کے ذخیرہ کے مد نظر ہم متعدد تصانیف کا اضافہ کر سکتے ہیں جن کی پوری صراحت انشاء اللہ ہماری زیر تالیف کتاب "یورپ کے دکھنی مخطوطے" میں ہوگی۔ یہاں ایک غیر مشہور مثنوی کا تعارف ناظرین سے کرایا جاتا ہے۔ یہ مثنوی "قصۂ حسینی" ہے۔

یہ مثنوی انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ نمبر ([illegible]) تعداد اوراق (۹۷) سائز (۸½ × ۴) سطر (۱۶) اشعار کی تعداد تقریباً (۱۲۰۰) ہے۔

اس کے متعلق بلوم ہارٹ مصنف کیٹلاگ کی صراحت حسب ذیل ہے:-

"امام حسین کے حالات اور ان کی جنگ کا بیان ابتدا میں حمد و نعت، خلفائے راشدین کی منقبت شیخ عبدالقادر جیلانی اور محمد حسینی گیسو دراز کی مدح ہے۔ مصنف عزیز تاریخ تصنیف سنہ ۱۰۹۱ھ" اسپرنگر۔ اسٹوارٹ۔ ڈی ٹاسی کسی نے بھی اس مثنوی کے متعلق کوئی صراحت نہیں کی ہے اور پھر بلوم ہارٹ نے بھی صحیح حالات نہیں لکھے مثنوی کا نام نہیں لکھا گیا ہے۔ مصنف اور تاریخ تصنیف کی جو وضاحت کی گئی ہے وہ بھی صحت طلب ہے۔

میری تحقیقات سے اس مثنوی کا نام "قصۂ حسینی" ہے جیسا کہ خود مثنوی کے اشعار سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

دہروں نام قصۂ حسینی گر بھی کد کوئی ایسا نکتے بشر

(ص ۹۷ ب)

قصیان میں قصایواہے آبدار — حسینی قصے ہواہے آبدار

(ص ۱۰۰ ا)

بلوم ہارٹ نے جس شعر سے ۱۰۱۵ھ اخذ کیاہے وہ درست نہیں ہوسکتا بلکہ اس شعر سے صاف طور پر ۱۰۹۱ھ ظاہر ہوتاہے۔

تھے ہجرت نود پہ ہزار ایک سنہ — گذرے کہ نبی افتا ہور ہنہ

(ص ۱۴۵ ب)

علاوہ ازیں زبان کے لحاظ سے بھی یہ گیارہویں صدی ہجری کی ...

مصنف کے متعلق بلوم ہارٹ نے جن اشعار سے عزیز ...

سنو اے عزیزاں قصہ دلپذیر — قصے میں قصہ ...

(ص ۶۰ ب)

عزیزاں سنو گیان سو کان دھر — حسن شہ کا قصہ دھیان دھر

(ص ۸۰ ب)

عزیزاں سنو بات دل وجان سوں — کہوں بات سانچے میں ایمان سوں

(ص ۱۴۴ ب)

نہ رہنا کفر میں آ اے عزیز — لیا ایمان سگل یو چلو باتمیز

(ص ۱۴۴ ب)

میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے یہاں عزیز سے مصنف اپنی طرف اشارہ نہیں کر رہا ہے بلکہ مخاطب کر رہاہے اس کے برخلاف میں اس کو "خواص" کی تصنیف قرار دیتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ خواص علی مصنف کا نام ہو۔ میں اپنے بیان کی تائید میں حسب ذیل اشعار پیش کرتا ہوں :۔

سنیا کان دھر جب بچن خواص یو — سرن کر کھیا یوں نیٹ داس ہو

(ص ۶۹ ب)

ہوویں خواص ہور عام کوں فام یو ۔۔۔ رہیں بعد میرے میرا نام یو

(ص ۱۰۰ ۲)

لے یاراں سنو بھی ملی خواص کے ۔۔۔ کیا صفت جب ہیں ایسی ذات کے

(ص ۱۴۵ ۲)

امید ہیں دہرمیں یوں خدا پاس یو ۔۔۔ دیدیدار مجکوں کریں خواص او

(ص ۱۴۰ ۲)

رکھیں بھی چران پاس نبی خواص کے ۔۔۔ گل اندام نازک مشک باس کے

(ص ۱۴۶ ۱)

جگت خواص ہور عام کوں شاد کر ۔۔۔ اور لیہ سب کا بر باد کر

(ص ۱۴۶ ۱)

اسپرنگر نے عیار الشعرا کے حوالہ سے ایک دکھنی شاعر خاص کا ذکر کیا ہے۔ ممکن ہے وہ یہی ہو۔

اگرچہ دکھنی تذکروں میں بھی ان کا نام نہیں ہو مگر یہ کوئی تعجب انگیز امر نہیں ہے کیونکہ اسی عہد کے متعدد شعرا جن کا کلام موجود ہے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ بہرحال میری رائے یہی ہے کہ قصۂ حسینی کا مصنف خواص ہے۔ جو قطب شاہی دور کا شاعر تھا۔ زبان کے لحاظ سے بھی اس کو قطب شاہی تصنیف قرار دینا ضروری ہے۔

خواص کے کچھ حالات خود اس کی تصنیف سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ فقیر منش آدمی تھا۔ صوفی شاہ قادری سے بیعت تھی۔ ان سے خلافت بھی حاصل تھی۔ اس کو شاہی دربار سے کچھ تعلق نہیں تھا۔ اس کو اپنی شاعری پر دعویٰ نہیں اور نہ اپنے آپ کو وہ شاعر تصور کرتا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے اس قصے کو ایک بشارت کی بنا پر لکھا گیا ہے اس کے متعلق تفصیل کی ہے اور بتایا ہے ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ وہ آنحضرت صلعم کی مجلس میں موجود ہے۔ آپ کے آل اصحاب

جمع ہیں۔ آنحضرت نے اس سے ارشاد فرمایا کہ حسین کا قصہ لکھے۔ اس حکم کی تعمیل میں اس نے قصہ لکھا۔ بعدہ ذی الحجہ ۱۰۸۲ھ کو عصر کے وقت اس سے فرصت ہوئی۔ قصہ مرشد کو سنایا گیا وہ بہت خوش ہوئے اور پان عنایت فرمایا۔

مثنوی میں حسب رواج قدیم اول حمد ہے پھر نعت پھر خلفائے راشدین کی منقبت اس کے بعد شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی مدح پھر محمد گیسو دراز کی تعریف اس کے بعد ... بادشاہ کی تعریف وغیرہ کچھ نہیں ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا اس میں حضرت امام حسین کا قصہ ہے مگر شہ... بلکہ درحقیقت ایک افسانہ اور قصہ ہی ہے۔ وہ لکھتا ہے عبدالمناف سے ایک ہاشم تھے ان کے فرزند عبدالمطلب ہیں۔ ان کے پوتے آنحضرت کے نواسے امام حسن اور حسین ہیں۔ ان کو آنحضرت نہایت عزیز رکھتے تھے ایک دن جبرئیل آئے اور خبر دی کہ ان کو قتل کیا جائے گا۔ آپ نے دریافت کیا کون قاتل ہوگا؟ کہا گیا یزید بن معاویہ۔ اس کے بعد آنحضرت نے انتقال فرمایا ابوبکر رض جانشین ہوئے۔ پھر عمر اور عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کے بعد دیگر حکمران ہوئے علی علیہ السلام کے بعد معاویہ نے اپنی حکومت مستحکم کرلی۔ اس زمانے میں یزید مدینہ آیا۔ مدینہ کی ایک حسین اور جمیل خاتون زینب نام عبداللہ ابن زبیر کی بی بی تھیں۔ یزید ان کو دیکھ پایا عشق کا تیر جگر کے پار ہوگیا اپنا حال زار باپ سے بیان کیا۔ معاویہ نے ابن زبیر کو مال و زر کا لالچ دیکر زینب کو طلاق دلادی۔ عدت کے ختم ہونے پر موسیٰ انصاری کے ذریعہ یزید کا پیغام روانہ کیا گیا۔ راستے میں قاسم بن عباس سے ان کی ملاقات ہوئی۔ قاسم نے موسیٰ سے کہا ان کا بھی خیال رکھا جائے اس کے بعد موسیٰ کی حسن ابن علی رض سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے بھی اپنے متعلق کہا۔ غرضکہ موسیٰ زینب کے پاس پہنچے اور تینوں کے ارادے سے اطلاع دی۔ زینب نے ان ہی سے مشورہ کیا انھوں نے جواب دیا اگر حکومت مال اور دولت کی خواہش ہے تو یزید کو ترجیح دے، اگر حسن کی خواہش ہے تو قاسم کو منظور کرے۔ اور اگر آخرت کی تمنا ہے تو امام حسن کو قبول کرے۔ زینب نے امام حسن

کو پسند کیا اور عقد ہو گیا۔ جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو ان کو زہر کے ذریعہ ہلاک کر دیا اور امام حسین سے جنگ کے لئے فوج روانہ کی اس کے بعد کربلا کے حالات لکھے گئے ہیں پھر بیان کیا گیا ہے کہ امام حسین کی شہادت کے بعد ایک تاجر ہاشم نام نے محمد ابن حنیفہ کو خط لکھ کر یزید سے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ وہ بھیس بدل کر آئے یزید سے ملاقات کی اس کو قتل کیا۔ امام زین العابدین کو طلب کر کے بادشاہ بنایا گیا۔ اس مضمون پر قصہ ختم ہو جاتا ہے۔

اب کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

حمد میں کہتا ہے:

نہ تج نیند غفلت نہ انکلیان نے تون — سدا جیو تا ہے تون بن جیو سون

نہ تج باپ ماں اور نہ عورت اہے — نہ فرزند بیٹا نہ بیٹی اہے

نعت میں کہتا ہے:

محمد تون ہے تور ونتا گنبھیر — جگ آدھار ہے ہور جگ دستگیر

شرف یو جو تجکوں خدا نے دیا — اپس نور تے تجکوں پیدا کیا

تون صاحب ہے لولاک تعریف کا — تون سرور نبیان میں ہے عارف کا

شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کرتا ہے۔

تون اے غوث اعظم سو ثقلین ہے — تون اکمل مکمل سو کونین ہے

کہیا رب نے تج تے سو جم جم کلام — تون نور ہے نبی کا علیہ السلام

مثنوی کی تصنیف اور بشارت کے متعلق دیکھو:

سنا تھا سو کیرات میں خواب میں — ولیکن دل اندر تھا یاد میں

کرم لطف کر تج پہ عالم پناہ — نبی یا محمد شفیع الغناہ

بدر چودویں چاند کے برج کا — سند حسن کا ورنکے برج کا

آئے دبدبے سون چندر سورہے — نہ چندر سورج کون اتھا نور ہے

حسن اور حسین بھی اتھے چار یار　　انو میں علی شاہ دلدل سوار

کھڑا ایک طرف میں تھا حیران ہو　　بھی تلمل نبی پر قربان ہو
دیکھے بہر نظر منج بلائے نزدیک　　ہور رحمت خدا منج ہو پیارا ایک
بٹھائے سو آپ کڑ عات منج　　تون ہے دوست
اے پیار نیرا اُپر منج زیاد　　تون تلمل میرے
اہون میں محمد نبی التحم　　ہوے نور تے
کہوں بات میں ایک توں کان دھر　　سینے پر توں چلنا اب
تھا ایک حسن شاہ حسین نجیل　　بنا تون دہریں سب تصو میں نخل
دکھن سال موتی نجیل دھال کے　　لیا تون سمندر تے اپر خیال کے
گندوں ہار اس کے یوں کانٹ سون　　شجاعت حسین شاہ بہوت بہات سون

جبرئیل آنحضرت کو شہادت حسینؓ کی خبر دیتے ہیں :-

کہے جبرئیل اے حبیب خدا　　مرلیضان کیتن توں طبیب سدا
سنو بولتا ہوں بیان دار سول　　تون آدھار مت نراد ہار کوں
معاویہ ہے یک تج بر ذات کا　　یزید اسکون بٹیا ہے کم ذات کا
کھڑے رہیں عدو ہو کر جن کے نپٹ　　کٹاویں تیری آل دندی
نہ رہے سر پہ تون ہور فاطمہ یا چہار یار　　سکے آل کون تج عدو نہار رہا۔
اپن بھی غذا باتے مرجائے گا　　نکل تن سے کھڑے لیو نہائے گا

موسیٰ انصاری زینب کے مشورے کا جواب دیتے ہیں :-

اگر چاہے دولت دنیا دار کوں
سو کرنا یزید کوں نکاح آج توں

اگر چاہے صورت حسن دار توں
نکاح کر توں قاسم بن عباس کوں

اگر چاہے توں حق نے رحمت کرے
بھی دنیا ہور عقبیٰ بنی سر پرے

سو کرنا نکا توں حسن جان کوں
بولیا بو ہمارا سو سچ مان توں

علی اکبر کا حملہ کرنا :

اٹھا ناؤں اس کا سو اکبر علی
ولیان میں خدا کے اتھا اکمل ولی

اتھا او چندر شہ کبرا پیار کا
صورت میں اتھا او نبی سار کا

دیکھے شاہ اسے جب نبی یاد آوس
اپنے سوں لگا کر کرتے تسلی ائیں

اٹھا غلغل تب او تکبیر کا
اٹھا شیر بالک حسین شیر کا

پڑیا جا غنم پر سواد قہر ہو
چلیا مارتا زہر پر زہر ہو

لگیا تور سنے بے ضرب بے شمار
منڈیاں نٹ غنیم گیاں پڑے ٹھار ٹھار

کیا سب و ندیاں کوں رات تل اپر
مارا چہار صد سوار جنگی بشر

ولیکن نہ پانی اسنے پائیا
سو پھر باپ کے پاس اب لیائیا

محمد حنیفہ کا زین العابدین کو بادشاہت دینا :-

بزاں شہ محمد حنیفہ نول
کئے پر فنا سب وندیاں کوں کچل

خلافت شہ کنول پھول کوں
او فرزند حسینا کے مقبول کوں

کرایا شرن سب جگت خواص کر
ولا خلقتاں پاس اخلاص سوں

قصہ کے ختم پر اپنے پیر کی مدح شروع کرتا ہے :۔

کروں بھی صفت میرے پیر کی	اور وشس سنور اسے سور کی
فرض مج اپرہے یو شہ کا رنے	ثناکر بدل شہ اپہ وارنے
پکڑ ذات میرا چندر اد س رات	او حضرت صوفی شہ قادری ذات
جس کا کرشہ مجکوں کرم پیار سوں	رکھیا کرا لس مج زرا وھار کوں
ہور نور پر نور بھی نور کو ں	کیا دل سنور ادکے سے
پریں ایک پر یک ستی لے کر	پھریں ایک حیران
تھا مکشوف شہ کوں دنیا دین سب	او بوآیہ اکان
عرش تے سرے لگ چھپا کچ نہ تھا	مراقع میں سٹ۔

اس کے بعد مزید مدح کی گئی ہے کہ مرلضیوں کو ان سے شفا ہوتی ہے ۔ راجہ پرجہ لوں ان کی نظر میں نہ تھا۔ ان کو کبھی غصہ نہ آتا تھا۔ اس کے بعد لکھتا ہے :۔

اسی نور تے کچ رہیا پاس منج	جنم جگ بجے لک رہے پاس منج
اسی نور تے منج سدا نور ہے	دلے شہ غم و دل سدا چو رہے
زبرکت چندر شہ کے بر حال ہیں	لے آیا ہوں ایسے رتن لال میں
دگر نہ نظم کے سکت کان منے	یو توفیق ہوئی منج چندر جگ منے
ولیکن بدن بیس پانی کیا	بزاں یو قصہ منج نشانی ہوا

اس کے بعد اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ انھوں نے قصہ کو پسند کیا ۔ پان عنایت فرمایا ، شال دی اسی وقت سے ان کا دل منور ہوا اسی حال میں ایک شیر آیا جس کے خوف سے سب لوگ فرار ہو گئے ۔ انکے مرشد نے فرمایا شیر ان کی ملاقات کے لئے آیا ہے ۔ اس کے بعد وہ شیر غائب ہو گیا ۔

اس کے بعد اپنے متعلق صراحت کی ہے اور اپنے شاعر نہ ہونے کا ذکر کیا ہے ۔

ہوسے فارغ کھاں کھا شہ نول ۔۔۔ منگائے بڑاں پان کھائے بدل
پتیاں پان کے دو بخیل لیائے ۔۔۔ دے یک مج دو جی شہ اپے کھائے
بڑاں یک میندا ساز روشال تھا ۔۔۔ پیٹے ور پیشاں کا بہتر خیال تھا
دوجی یک ہری شال کا جامہ بخیل ۔۔۔ سفید پاک سالو کا فامیاں سگل
منگائے سو ور حال او لیا ی کر ۔۔۔ نیائے مجھے لیا بہوت چاؤ کر
بڑاں ہات پکڑ منجہ کنک راز کہے ۔۔۔ رضائے بڑاں مج ابی وا نج ہے
ہوا دل منور اسی وقت پر ۔۔۔ پھریا دوک جون شہ پرا نجتور
اے یاراں سنو بھی علی خواص کے ۔۔۔ کیا صفت جب میں ایسی ذات ہی
آیا شیر بیگی بہتر گھر سنے ۔۔۔ لرزنے لگے سب پیری ور سنے
علی شیر میں ہوں خدا جانتا ۔۔۔ انا مج ملاقات کے واسطا
ہوا پاک غائب اس ٹہار پر ۔۔۔ اے شاہ محمد نبی بہائے کر
میں تو کچ نہ شاعر ہوں دعوا کروں ۔۔۔ نہ شعر اوپر میں ہلاوہ کریں
نفر ہو پیر یا ہوں سدا سوچتا ۔۔۔ کریں عاقبت کیا نہ مج سوچتا

نمونہ پیش شدہ سے شاعر کی قابلیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ اگرچہ اس نے اپنے متعلق نہایت انکسار سے کام لیا ہے مگر کلام ایسا نہیں ہے جو نظر انداز کیا جائے ۔ اگرچہ اس کو قطب شاہی دور کے صف اول میں جگہ نہیں دی جا سکتی مگر آخر پر بھی نہیں رکھا جا سکتا ۔

مصری لشکر عہد فراعنہ میں

اس کی تنظیم اور قوت

جس طرح قدیم ہندوستان میں چار طبقے رعایا کے ۔گ۔ تھے

رعایا کے طبقے مقرر تھے لیکن مورخین کا اختلاف ہے کہ قدیم ... میں

خدمات مقرر تھیں ۔

چنانچہ مشہور مورخ ہیروڈوٹس اپنی کتاب میں سات طبقے

تین ہی بیان کئے ہیں ۔ افلاطون کی رائے میں چھ ہیں ۔

علاوہ ان کے اور مورخین میں بھی اختلاف ہے بعض نے سات سے زائد اور بعض نے کم بیان کئے ہیں لیکن جہاں تک تحقیقات اور معلومات صحیحہ کے ذریعہ نتیجہ اخذ کیا جاسکا یہی معلوم ہوا کہ رعایا کے چار ہی طبقے تھے جن کی ہندوستان قدیم کے طبقوں سے مشابہت کامل تھی ۔ یعنی علمار مذہب جس طرح ہندوستان میں برہمن سپاہی جیسے چھتری کاروباری جیسے ویش عوام جیسے شدر مگر مصر میں تاریخ عوام کی وہ حالت چھوت چھات کے اعتبار سے نہیں بتاتی جو حالت ہندوستان میں شدر کی رہی ہے ۔

اس تقسیم کے مطابق لشکری طبقہ کا مرتبہ علمار مذہب کے بعد تسلیم کیا گیا تھا ۔ قانوناً حکومت پر لازم تھا کہ وہ کل اراضی کا ثلث ⅓ حصہ فوج کے لئے مخصوص کردے تاکہ فوج زمانہ امن میں اس اراضی کو کاشت کرکے یا کسانوں کے ذریعہ خود کاشت کراکر اپنی ضروریات حاصل کرے (یہ طریقہ ہندوستان میں جاگیروں اور معافیوں کی شکل میں بعض دیسی ریاستوں میں اب بھی مروج ہے) اور یہی لوگ حالت جنگ میں ملک کے محافظ اور دشمن پر حملہ کرنے والے سپاہی تھے چنانچہ ہیروڈوٹس

اپنی تاریخ مصر میں لکھتا ہے کہ ہر ایک سپاہی کو اس کے رتبہ کے موافق فرعون کی جانب سے زمین ملی ہوتی ہے جس کا وہ حکومت کو کوئی لگان ادا نہیں کرتا۔ اور اسی زمین سے وہ اپنی ضروریات زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ جب عسکری طبقہ کا لڑکا فوجی خدمت کے قابل عمر کو پہنچتا تھا تو وہ مدرسہ حربیہ میں بھیجدیا جاتا تھا۔ ہر سپاہی پر لازم تھا کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرے اور ضرورت پیش آنے پر دشمن کے ملک پر بھی حملہ کرے۔ ان سپاہیوں کو حملہ کرنا قلعوں کی حفاظت کرنا وغیرہ غرض فنون جنگ کے متعلق حملہ و دفاع کی پوری پوری تعلیم دی جایا کرتی تھی۔ اور خاص طور پر ہر سپاہی کے یہ ذہن نشین کیا جاتا تھا کہ ملک کی ضرورت پر کس طرح وہ آناً فاناً ملک کی خدمت کے لئے حاضر ہو۔ چنانچہ زمانۂ قدیم میں اسی اصول کے تحت جو فوج تھی اس نے ہی کل لڑائیاں لڑی ہیں۔

مصری لشکر کی تنظیم :

تاریخی کتابوں سے جہاں تک معلوم ہوسکا اس زمانے میں مصری فوج کی تعداد ۴ لاکھ دس ہزار کے قریب قریب تھی اور یہ فوج دو حصوں میں منقسم تھی ایک کا نام کالسیزریس اور دوسری کا ہیرموتیبس تھا اور ہر سال اس میں سے سو جوان فرعون کی فوج خاصہ یعنی باڈی گارڈ کے لئے منتخب ہوتے تھے۔ اس فوج باڈی گارڈ یا خاصہ کو علاوہ معاوضہ اراضی کے ۵ روٹیاں، کافی مقدار میں بکری کا گوشت اور کچھ شراب روزانہ بطور راشن بھی ملا کرتی تھی۔

ہیرموتیبس فوج کے مقابلے میں کالسیزریس سپاہیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس فوج کی تعداد قریب قریب دو لاکھ پچاس ہزار کے تھی اور ان کی چھاؤنیاں طیبہ، بوبسطہ، افیسز، تانیس، منڈس، جزیرہ سیکفوریس، تابیس و ستمیس وغیرہ مقامات پر پڑی ہوئی تھیں۔

بعض بعض قدیمی تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض حصوں میں آج کل کی طرح ڈویژن و برگیڈ کا نظام تھا اور ان کے نام انکے دیوتاؤں کے ناموں پر تھے مثلاً کسی ڈویژن حصہ فوج کا نام (رع) اور کسی برگیڈ حصہ فوج کا نام (آمون) (پتاح) وغیرہ تھا۔

فرعون تمام افواج کا قائد اعظم یا کمانڈر انچیف تھا۔ اس کو ہی یہ حق تھا کہ ہر فرقہ یعنی ڈویژن یا
دیگیڈ پر اپنے عزیزوں اور اپنی اولاد و حاشیہ کے لوگوں میں سے افسر مقرر کرے کبھی کبھی وہ ان
افسر قیدیوں میں سے یا ان کی اولاد میں سے بھی منتخب کر لیا کرتا تھا جو کسی پہلی جنگ میں بحیثیت قیدی
فرعون کے قبضہ میں ہوتے تھے اگر ملک سے باہر فوج کو لڑانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اکثر خود
فرعون کی ہی زیر قیادت لشکر حملہ کرتا اور وہ خود جملہ امور جنگی کا نگران رہتا
اپنے رتھ میں سوار اپنے خاصہ کی فوج اور بڑے بڑے امرا
میں موجود ہوتے اور اس کی وجہ سے فوج کے سپاہی جان چراتے
تھے۔

اس لشکر کے علاوہ ایک لشکر مصر میں اور تھا جن کو نقدی سے معاوضہ دیا جاتا تھا جیسا کہ
آج کل عموماً فوجوں کی نقد تنخواہ دینے کا دستور ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر جنگی قیدی یا ان کی اولاد
ہوتی تھی جو مدت سے مصر میں ہی سکونت پذیر ہو گئی تھی۔ اس ماتحت ملک کی فوج بھی جو مصر کے
بادشاہ کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر چکی تھی۔ لیکن یہ فوجیں اگرچہ نشان اپنا ہی استعمال کرتی تھیں۔ مگر وہ
مصری افسروں کے ہی ماتحت ہوتیں اور جس طرح مصری افسر چاہتے ان سے کام کیا کرتے تھے۔
گمان میں مصری فوج کی سی طاقت نہیں ہوتی تھی نہ یہ ایسے دلیر اور آزمودہ کار ہوتے تھے جیسا کہ
مصری اصلی فوج مگر ایک نمایاں حیثیت ضرور ہو جاتی تھی۔ مگر تاریخ میں ایک زمانہ ایسا بھی ہے کہ نوبیہ
اور حبشی فوجوں کی فضیلت (جو مصر کے ماتحت ممالک تھی) مصری اصلی فوج پر ہر حیثیت سے ثابت
ہوتی ہے اور یہ فوج اصلی مصری نہیں تھی بلکہ ملازم کی ہی حیثیت رکھتی تھی چنانچہ فرعون رمسیس ثانی
کے زمانے میں بھی لیبیا، نوبیہ وغیرہ کی فوجوں کی فضیلت خاص مصری فوج پر ثابت ہے۔

مصری ہتھیار:

مصری ہتھیار میں تیر، کمان اور نیزہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ ان فنون میں مصری خاص
طور سے ممتاز ہوتے تھے۔ اس میں پیدل و سوار کی کوئی تخصیص نہ تھی بلکہ جو لوگ اپنی جنگی گاڑیوں

میں سوار ہوکر لڑائی میں شریک ہوتے تھے۔ ہم نے مندرآبیا او رہبداؤ ومیں جو مرقع دیکھا ہے اس میں مصری فوج کے ہتھیار انکی جنگی پوزیشن اس طرح ظاہر کی گئی ہے کہ جنگی گاڑیاں ہیں پھر سوار ہیں اور ان کے امدادی پیدل سپاہی ہیں۔ یہ سب تیر کمان اور برچھی سے مسلح ہیں۔ کمانڈر انچیف قلب لشکر میں ہے اور باقی افسر قلب کے دونوں بازوؤں پر کمان کر رہے ہیں چنانچہ توریت کی چودھویں فصل جو سفر الخروج کے نام سے ہے جس میں فرعون کا سمندر میں غرق ہونا ظاہر کیا گیا ہے اس میں بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ سوار اور گاڑیوں کے سوار وغیرہ سب فرعون کے ہمراہی ہیں اور یہ واقعہ کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ عین مطابق واقعہ ہے کیونکہ فراعنہ اپنی جنگی گاڑیوں ہی میں بیٹھ کر لڑائی میں شریک ہوتے تھے۔ سوار تو زیادہ تر والنٹیر کور میں ہوتے تھے اصلی فوج کے پاس تو عموماً گاڑیاں ہوتی تھیں بلکہ شمپلیون تو بیاں تک لکھتا ہے کہ توریت میں جہاں سواروں کا ذکر ہے وہاں گھوڑے کے سوار مراد نہیں ہیں بلکہ یہی گاڑیوں کے سوار مراد ہیں۔ غرض مصری فوج میں جنگی گاڑیاں بمقابلہ گھوڑوں کے زیادہ مروج تھیں۔ مصری پیدل فوج چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم تھی جس طرح پلٹن کا اس زمانے میں رواج ہے۔ اور ہر ہر حصہ کے پاس اس کے خاص نشان یا جھنڈے ہوتے تھے۔ بقول پلوٹارک مورخ ہر پلٹن اپنے اپنے ہتھیاروں سے ممیز ہوتی تھی۔ ان پلٹنوں کی تقسیم انکے اسلحہ کے اعتبار سے حسب ذیل تھی یعنی تیر کمان بردار دستے نیزے بردار دستے۔ تلوار بردار اور گوپھن بردار وغیرہ اور یہ سب فوج اسی طرح جس طرح آج کل کمپنی پلٹن بریگیڈ اور ڈویژن میں منقسم ہوتی ہیں۔ قدیم مصر میں بھی اسی قسم کی تقسیم تھی اور ہر کمپنی اور پلٹن بریگیڈ کی جھنڈیاں تھیں اور انکے جدا جدا افسر تھے۔ دوسری تاریخوں سے اسکا بھی ثبوت ملتا ہے کہ عبرانی فوجوں میں بھی اس وقت میں ایسی ہی ترتیب و نظام مروج تھا۔ کوچ و مقام کے وقت افسر اپنی پلٹن بریگیڈ وغیرہ کی پوری نگرانی رکھتے تھے۔ ان میں ایک خاص گروہ بھی ہوتا تھا جو زرہ خود پوش ہوتا تھا عموماً یہ لوگ حالت کوچ اور جنگ کی صورت میں باقی فوج کے آگے رہا کرتے تھے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عموماً حملہ کے وقت تیر کمان نیزے گوپھن اور تلوار سے کام لیا کرتے تھے۔ ان کے پاس عام زرہ خود وغیرہ تھے لیکن اس

زرہ کا چغہ نہیں پہنتا جس سے پنڈلیاں اور رانیں بھی محفوظ رہ سکیں۔ غالباً مصری ایسے لباس سے واقف نہ تھے۔ ان میں سب سے زیادہ وہ زرہ مروج تھی جو سپاہی کے برابر طول اور عرض میں اس طرح کے نصف ہوتی تھی۔

یہ زرہیں اکثر معدنی چیزوں کی بنائی جاتی تھیں اور کبھی کبھی بیل کی کھال کی بھی بنائی جاتی تھیں لیکن بال بھی کھال پر ہوتے تھے اور بال والا حصہ اوپر ہوتا تھا جیسا کہ آج کل افغانستان ... میں پوستین مروج ہے۔ یہ زرہیں یونانی و رومانی زرہوں کی طرح ہوتی تھیں بہت سی کڑیاں ایسی ہلکی بنائی جاتی تھیں کہ کل زرہ کا وزن کم ہو اور اس کو اور تکلیف محسوس نہ ہو۔

مصری کمان یوربین قدیم کمان کے بالکل مشابہ ہوتی تھی عموماً ... لانبی ہوتی تھی۔ تیر عموماً ۲۲ انچ سے ۳۴ انچ تک لانبا ہوتا تھا اس کے سرے پر کسی دھات کا پھل لگا ہوا ہوتا تھا۔ یہ تیر لکڑی کے ہوتے تھے

فوج کے پڑاؤ یا کیمپ :

مصری فوج مربع یا متوازی الاضلاع شکل میں پڑاؤ ڈالا کرتی تھی عموماً پڑاؤ کا صرف ایک ہی دروازہ رکھا جاتا تھا۔ وسط میں سپہ سالار کا خیمہ نصب ہوتا تھا، کیمپ کا نظام قریب قریب قدیم رومانی کیمپ کے نظام کے ہوتا تھا۔ سپہ سالار کے خیمہ کے چاروں طرف خندق کھودی جاتی تھی یا خاص استحکام کیا جاتا تھا۔ اس کے ہی قریب میں تین خیمے اور ہوا کرتے تھے جو سپہ سالار عام کے ماتحت بڑے افسروں کے ہوتے تھے۔ سپہ سالار کے باڈی گارڈ کا پہرہ ہر وقت اس جگہ رہا کرتا تھا۔ اور ایک خاص محافظ دستہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ فوج کے کیمپ کے قریب ہی فوجی جانوروں گاڑیوں اور سامان حرب وغیرہ کے لئے جگہ رکھی جاتی تھی۔

سپہ سالار کے خیمہ کے برابر ایک چھوٹا سا مندر اپنے کسی دیوتا کا بھی بنایا کرتے تھے اور اس کے ہی ملحق اپنے مذہبی مراسم کے لئے انتظام کیا جاتا تھا چنانچہ بعض بعض تصاویر جو قبروں اور تہ خانوں کیا

سے برآمد ہوئی ہیں انکے دیکھنے سے کیمپوں کے ایسے ہی نقشے سمجھ میں آتے ہیں۔ اور ان ہی تصاویر میں گدھے اونٹ بلکہ ہاتھی بھی دکھائے گئے ہیں اور ان کے سامنے چارہ دکھایا گیا ہے یعنی ایسی حالت میں کہ وہ کیمپ میں بندھے ہوئے ہیں۔ ان کے بعد گاڑیوں اور جنگی گاڑیوں کی قطار نظر آتی ہے۔ ایک طرف ہتھیاروں کا ایک قرینہ سے رکھا ہونا بتایا گیا ہے۔ کیمپ کے داہنی جانب ایک میدان فوجی کرتبوں وغیرہ کے لئے مخصوص کیا جاتا تھا۔ ایک جگہ مجرمین کو سزا دی جا رہی ہے۔ ایک جگہ یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ بعض بعض فوجی افسر اور امرا اپنی اپنی جنگی گاڑیوں میں سوار لشکر میں گشت کر رہے اور حکم احکام ضروری نافذ کر رہے ہیں لشکر کے بائیں جانب شفاخانہ ہوا کرتا تھا۔ اور اس کے پاس ہی حیوانات کا شفاخانہ تھا جہاں مریض حیوان دکھائے گئے ہیں۔ اور ان تصاویر میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح دوا ساز دوا تیار کرتا اور مریضوں کو پلاتا ہے۔

ہر ہر بریگیڈ اور پلٹن کا نشان اور جھنڈا علحدہ ہوتا تھا اور اس کا نام بھی ہوتا تھا جو عموماً کسی دیوتا یا بادشاہ یا حیوان مقدس کے نام سے منسوب ہوتا تھا۔ اس نشان کو عموماً ہر سپاہی ایک مقدس مذہبی شے خیال کرتا اور نہایت احترام وعزت سے اس کی طرف دیکھتا تھا۔

دیودورس لکھتا ہے کہ یہ جھنڈیاں برچھی پر بندھی ہوا کرتی تھیں جس کو افسر خود اپنے ہاتھ میں لیکر اپنے حصہ فوج کے آگے آگے چلا کرتا تھا۔ اور افسر اس نشان سے فوج میں حرکت عصبیت وشجاعت پیدا کیا کرتے تھے۔ عموماً علمبرداری کی خدمت نہادرجہ شریف بہادر آدمی کی قسمت میں آتی تھی۔ اور تمام فوج میں سے ایسا سپاہی منتخب ہوا کرتا تھا جو تمام صفات شجاعت وفنون سپہگری شرافت ونجابت میں سب سے زیادہ ممتاز ہوتا تھا۔

سلطنت کی طرف سے بھی ایک عام نشان فوج کے ہمراہ ہوتا تھا اس کو صرف فرعون کے خاص امرا یا عزیز ہی اٹھا سکتے تھے اور وہ مرتبہ میں سپہ سالار یا جنرل کے رتبہ کے ہوتے تھے۔ یہ عموماً وہ لوگ ہوتے تھے جو حالت جنگ اور درباروں میں بادشاہ کے مقربین خاص ہوتے تھے۔ اور یہی لوگ شاہی عصا در باریں اٹھاتے تھے۔ شاہی پنکھا بھی انہیں کے پاس ہوتا تھا۔

کوچ:

کوچ یعنی سفر میں تمام بھاری وزنی چیزیں اور گاڑیاں قلب لشکر میں ہوتی تھیں۔ فوجی گاڑیاں فوج کے آگے یا پیچھے ہوتی تھیں۔ ہراول یعنی مقدمۃ الجیش کے پاس صرف ہتھیار ہوتے تھے اور کوئی وزنی سامان نہیں ہوتا تھا۔

جب دشمن قریب ہوتا تو بادشاہ یا سپہ سالار ایک عام جلسہ منعقد کرتا تمام فوجی سرداران وافسران کو طلب کرتا پھر اپنے اپنے دیوتاؤں سے امداد کی دعائیں مانگی جاتیں۔ پھر بادشاہ ایک گروہ کو جس کے ساتھ ایک گاڑی مینڈھے کی شکل کے مشابہ ہوتی تھی آگے کرتا۔ اس گاڑی پر
تھی اور اس سے یہ کنایہ مقصود تھا کہ دیوتا آمون رع خود مصری فوج کی کما
یہی گاڑی سب سے آگے ہوتی تھی اور اس کی حفاظت فوج کے بہترین
سپہ سالاروں کو فوجی تمغے دے دے کر لڑائی کے لئے حکم دیتا رہتا تھا۔ یہاں تک
ہو جاتی۔ پھر بادشاہ خود جملہ افسروں کے سامنے ایک تقریر کرتا اور لڑائی اور اس کی حالت اور اپنی کامیابی سب بیان کر دیتا تھا پھر قیدیوں کا شمار کیا جاتا اور دشمن کے مقتولوں کے داہنے ہاتھ کاٹے جاتے اور وہ سب ہاتھ بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے ان کا شمار کیا جاتا اس سے دشمن کے نقصان کی تعداد معلوم ہوتی یہ پوری تفصیل مندر اسیس ثالث میں جو شہر آبو میں ہے منقوش ہے۔

اگر لڑائی خشکی میں ہوتی جیسا کہ ذکر ہوا ہے تو عموماً بادشاہ وسط فوج میں اپنی گاڑی پر سوار ہوتا تھا۔ اگر لڑائی بحری ہوتی تو مصری جنگی کشتیاں ساحل کے برابر صف بستہ ہوتیں ساحل کی فوج بھی دشمن کی کشتیوں پر تیر و گوپھن سے حملہ کرتی تھی۔ بادشاہ عموماً بری فوج کے ہی ہمراہ ہوتا اور خشکی وسمندر دونوں طرف سے دشمن کی فوج کی نقل وحرکت نظر میں رکھتا تھا جب کامیابی ہو جاتی تو دشمن کا تعاقب کیا جاتا۔ دریاؤں پر پل بنائے جاتے اور لشکر اس پل پر سے عبور کر کے دشمن کے ملک میں داخل ہو جاتا اور دشمن کے ملک پر جہاں تک ہو سکتا قبضہ کر لیا جاتا تھا پھر دشمن سے صلح کی جاتی اور اس پر جزیہ مقرر کیا جاتا کبھی یہ سونے اور چاندی کی ایک مقررہ مقدار

ہوئی کبھی مویشی لے جاتے کبھی اسلحہ جنگ حاصل کئے جاتے کبھی ایسی نادر اشیا طلب کی جاتیں جو مصر میں کمیاب اور دشمن کے ملک میں ہوتی ہوں اس کے بعد بادشاہ ایک عام جلسہ کرتا اور جملہ شرکاء جنگ افسروں کو جنھوں نے اس کے حکم سے معرکے کے لئے خونریزی کی تھی اس میں مدعو کرتا۔ ایک تقریر کرتا ان کا شکریہ ادا کرتا اور اپنے معبودوں کی عبادت کرتا کہ انھوں نے حالت جنگ میں ان کی امداد کی اور اس مدد سے ملک مصر کو کامیابی ہوئی پھر سب لوگوں کو اپنے اپنے مقامات پر واپس جانے کا حکم دے دیا جاتا۔

مصر کے قدیم معابد میں جو لوحیں ہیں انکے دیکھنے سے فراعنہ کے لشکر اور اس کی عظمت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے خصوصاً معبد امسیس ثالث کو اگر دیکھو تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس زمانے کے لشکروں میں ہیں، تقریباً دس لوحیں ہیں اور ان میں فوجوں کی ترتیب ان کا طریقۂ جنگ کوچ و قیام وغیرہ سب معلوم ہوتا ہے خصوصاً امسیس ثالث کے ہی زمانے میں جو جنگ اہل مصر اور اہل لیبیا کے درمیان یا قوم تکاری اور مصریوں سے ہوئی ان کا نقشہ خوب اور صاف دکھایا گیا ہے اور قریب قریب ہر چھوٹی سی چھوٹی بات لوح پر غور کرنے سے معلوم ہو جاتی ہے۔

ہم ان دس لوحوں کی تفصیل ناظرین کی دلچسپی کے لئے حسب ذیل لکھتے ہیں۔

اول اس لوح میں مصری فوج کی ترتیب کوچ کی حالت میں اُنکے اسلحہ جو اس وقت میں مروج تھے صاف ظاہر ہوتے تھے۔

دوسری مصر اور لیبیا کے درمیان جو جنگ ہوئی جس میں مصری کامیاب ہوئے ظاہر کی گئی ہے بادشاہ خود جنگ میں شریک ہے اور اس کے سامنے لاتعداد مقتول پڑے ہوئے ہیں۔

تیسری مصری فوج نے دشمن کے ۱۲۵۳۵ سپاہی قتل کئے ہیں سپہ سالار دشمن کی فوج کا قید ہوکر بادشاہ کے سامنے مع دیگر قیدیوں کے پیش ہو رہا ہے قیدیوں میں سپہ سالار سب سے آگے دکھایا گیا ہے۔

چوتھی، بادشاہ فوج کے درمیان میں کھڑا ان کو لڑائی کے لئے آمادہ کر رہا ہے اور لشکر

سپاہی اپنے ہتھیاروں سے آراستہ ہو کر کوچ و حملے کے لئے بالکل تیار ہے۔ اس لوح میں خصوصیت سے سپاہیوں کے تفریحی کھیل کو بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

پانچویں، فوج کا صف در صف دوبارہ کوچ دکھایا گیا ہے۔

چھٹی، دوسری جنگ اور مصری فوج کی کامیابی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

ساتویں، ایک شکارگاہ کا نقشہ ہے بادشاہ مع فوج درندوں کے شکار میں مصروف ہے چند وہ شکار کر چکا ہے لیکن آخر کو خود زخمی ہو جاتا ہے۔

آٹھویں یہ سب سے زیادہ عجیب و غریب لوح ہے آثار قدیمہ سے لوح حاصل نہیں کی۔ اس میں بحری جنگ کا نقشہ اس زمانہ میں طریقہ مدافعت غرض سب معلوم ہوتا ہے۔ قوم نکاری کے ساتھ مل کر ملک مصر پر حملہ کر رہے ہیں۔ مصری جہاز مدافعت میں مصروف ہیں [illegible] مع اپنی بری فوج کے ساحل پر موجود ہے۔ تیروں اور گوپھنوں سے دشمن کے جہازوں پر حملہ کر رہا ہے۔

نویں، مصری فوج اپنے ملک کو واپس آ رہی ہے اور ایک قلعہ کے پاس فوج ٹھہر کر دشمن کے مقتولوں کے کٹے ہوئے ہاتھوں سے ان کا شمار کر رہی ہے اور قیدی صف بستہ بادشاہ کے سامنے موجود ہیں بادشاہ اپنے امراء اور شہزادوں کے سامنے کھڑا ہوا لکچر دے رہا ہے۔

دسویں، بادشاہ شہر میں داخل ہو رہا ہے اور اپنے ان معبودوں کی ثنا و صفت ہاتھ اٹھا کر کر رہا ہے جنھوں نے اس کو اس جنگ میں کامیاب کیا۔ اور یہاں بھی خطبہ دینے کی سی حالت معلوم ہوتی ہے۔

کیا اہل مصر کے لئے یہ فخر نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے ملک اور بادشاہ کی بڑے بڑے

بادشاہوں کے مقابلے میں ہمیشہ حفاظت کی اور اکثر و بیشتر دشمنوں کو شکست نصیب ہوئی۔

مصری قوم کی قدیم عظمت اس کی فوجی طاقت دیگر اقوام پر جو مصر قدیم کے زمانے میں متمدن و مہذب تھیں ہمیشہ فائق رہی ہے۔ یہ اہل مصر کے لئے قابل فخر ہے اور مصریوں کو چاہئے کہ وہ اپنے قدیم فخر کو اب بھی برقرار رکھیں

عہد قدیم میں عربوں کی تجارت

اہل یمن کی تجارت سے مناسبت، تجارتی سامان، تجارتی تعلقات، بری، بحری سفر، تجارتی
قافلے اور بیڑے، توراۃ میں ذکر، کتب بلینوس و بطلیموس میں تجارت کا ذکر، عرب مشرق و مغرب
میں ذریعہ تعارف اور مواصلت تھے، سرمایہ تجارت، مشہور بازار
جریدہ "المقتطف" میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس
ہی تفصیل سے نظر ڈالی گئی ہے، مضمون کو دو حصوں میں تقسیم
"زمانہ اسلام" "زمانہ جاہلیت" کا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں
کے تجارتی حالات پر مشتمل ہے، کیونکہ جزیرۃ العرب میں سب سے زیادہ اسی ملک کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔

یمن کچھ ایسے موقع پر واقع ہے کہ وہاں کے لوگ طبعاً تجارت پیشہ ہوتے ہیں، اگر وہ ایک طرف بحری راستہ سے تجارت کرتے ہیں تو دوسری طرف خشکی کا راستہ بھی ان کے بہت ہی مناسب ہے۔

اہل یمن ہندوستان سے بہت ہی گہرے تجارتی تعلقات رکھتے تھے، یہ ہندوستان جایا کرتے اور وہاں کی خام پیداوار اور دیگر مصنوعات لاتے تھے جو یہاں عام طور پر استعمال ہوتی تھیں اور یمن کے بازاروں میں ان کی بہت قدر تھی، اس کے علاوہ عربوں کے تجارتی تعلقات اہل مصر، فنیقیہ، بابلیہ اور کلدانیہ سے بھی تھے۔

اہل یمن بری اور بحری دونوں ذریعے سے تجارت کرتے تھے، ان کی تجارت گاہیں بہت آباد تھیں، سب سے بڑی تجارت گاہ جزیرہ "سقطرہ" تھا جو کہ نہایت ہی مناسب جگہ پر واقع تھا، اس کے علاوہ عدن، حصن غراب (ظفار) اور مسقط بھی مشہور تجارتی مقامات تھے۔

اس زمانے میں ضرورتیں بھی محدود تھیں اور وسائل تجارت بھی، بالعموم "قافلہ" ذریعہ تجارت تھا، موسم اور ضرورت کے اعتبار سے یہ قافلے ایک دوسرے مقام پر جایا کرتے، قافلوں کے لئے بہت سی منزلیں اور حفاظت گاہیں تھیں جب کوئی قافلہ ان قیام گاہوں میں مقیم ہوتا. وہاں کے قبایل اس کی حفاظت کرتے اور اپنی سرحد میں یہ قبائل ہر طرح سے ذمہ دار ہوتے جب تک کہ وہ قافلہ ان کی سرحد سے چلا نہ جائے کیونکہ خدانخواستہ اگر کوئی قافلہ لوٹا جاتا تو یہ بدنامی کا دھبہ ان کے دامن سے کبھی دور نہ ہوتا دیگر قبائل کی نظروں میں وہ گر جاتے. ہر شخص جانتا ہے کہ عرب کی بہادری غیرت، ہوس جاہ و حشمت کب اس کو گوارا کر سکتی، قافلے ایسی جگہوں پر لٹ جاتے تھے جہاں کوئی قبیلہ دور یا نزدیک خیمہ زن نہ ہوتا۔

توراۃ میں اسماعیلیہ قافلہ کا تذکرہ ہے جو کہ سامان تجارت مصر کو لیجاتا تھا. انہیں قافلوں میں ایک وہ تجارتی قافلہ بھی ہے جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آپ کے بھائیوں سے خرید اور مصر لے جاکر فروخت کیا تھا، جہاں آپ اپنی پاکدامنی، سچائی اور دانائی کے سبب بہت مشہور ہوئے۔

کتب بلینوس اور بطلیموس میں ان قافلوں کا نہایت ہی تفصیل کے ساتھ تذکرہ ہے اور حرقبال کا سفر سے لوٹنا نیز عرب کے رؤسا اور تجار کا بھی ذکر صفحہ ۲۰-۲۱-۲۲-۲۳ میں موجود ہے۔

تجار عرب و روما کے درمیان معاہدات کا بھی پتہ چلتا ہے جو کہ اس قانون کے مطابق ہے جس کو تاودوسیوس اکبر نے مرتب کیا تھا جس میں اس نے ان قافلوں کا تذکرہ اور ان کی تجارت کے حالات بیان کئے ہیں جو کہ اسکندریہ سے بلاد حمیر اور حبشہ کی طرف جاتے تھے وہ کہتا ہے کہ اہل عرب ہی سے قوم میں مشرق و مغرب کے درمیان ذریعہ تجارت اور وجہ مواصلت تھے. وہ بہت سے تجارتی مال مشرق سے مغرب میں لیجاتے اور پھر وہاں کی چیزیں مشرق میں لاکر فروخت کرتے بعض مورخین نے مال تجارت کا اندازہ بھی لگایا ہے یعنی اہل عرب تقریباً ۱۰۰۰۰ لیرہ کی سالانہ تجارت کرتے تھے اور تجار جو سالانہ محصول ادا کرتے تھے وہ ۲۲۰ ہزار لیرہ ہوتا تھا (لیرہ۔ ترکی پونڈ ہے)

پیسے کے مساوی ہوتا ہے، مترجم)

اہل یمن کی مشہور تجارت سونا، قیمتی پتھر، قلمی، ہاتھی دانت، صندل، مسالہ (ایک قسم کی لکڑی تھی جس سے کپڑا وغیرہ رنگتے تھے) اور اسی قسم کی دوسری اشیاء کی۔ ہندوستان سے خاص تجارت ان کی روئی کی تھی اور شتر مرغ کے پر، ہاتھی کے دانت، سونا، خوشبو میں اور آبنوس کی تجارت افریقہ کے مشرقی ساحل سے کرتے تھے، بحرین سے موتی، عود، بخور (یہ سب ایک قسم کے خوشبو دار گوند ہیں) یمنی قیمتی پتھر اور دیگر قسم کی خوشبو

ان تجارتی قافلوں کے سبب مشرق اقصیٰ، افریقہ اور بابل قائم ہوگیا تھا اور ان کے درمیان تجارت بہت کچھ ترقی کر گئی تھی۔

اہل فنیق اور بابل کے درمیان تجارتی سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ (فنیق یہ کے کنارے آباد تھا)

اہل یمن نسبتۃً بری راستوں کو بہت پسند کرتے تھے، ان کی اکثر تجارت بری ہی ہوتی تھی کیونکہ بحری راستہ تجارت کے لئے خالی از خطرہ نہ ہوتا تھا اور پھر موافق ہوا کا انتظار، ہاں وہ بحری سفر اس وقت پسند کرتے جبکہ انھیں طاقت سے کام لینا پڑتا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجارت کے لئے وہ بحری سفر بالکل کرتے ہی نہ تھے، کرتے تھے لیکن نسبتۃً کم

قوم (شراب فروخت کرنے والے) شام کی مصنوعات شراب اور روغن زیتون وغیرہ اور فنیقین کی مصنوعات جیسے شیشہ وغیرہ اپنے شہروں کو لیجایا کرتی اور ایشیا کے مشرقی حصہ سے کپڑے، لوہے کے برتن، چاندی کی اینٹیں اور (ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے) بغرض فروخت لاتی تھی۔

یمن کی تجارت بہت ہی وسیع تھی، وہاں کے بازار خوب آباد تھے۔ بالعموم تجارت کرنے والے قبائل معین، جبائیین، سبئیں، قتابین اور رفدئین تھے، یہانتک کہ وہ زمانہ آیا کہ تجارت عربوں کے ہاتھ سے نکل کر رومیوں کے ہاتھ میں چلی گئی، مملکت زنجبار قرن اول میلاد میں مملکۃ عربیہ

کے تابع تھا جسکی حکومت پورے مغربی افریقہ پر تھی، وہاں کے بادشاہوں میں عفیر، سبا اور حمیر تھے ان کی بعض اولادیں زنجبار کے تخت سلطنت پر حکومت کر چکی تھیں،

ملوک قحطان (سنہ ق م) نے جزیرۃ العرب کے جنوبی حصہ پر حملہ کیا اور تابع کر لیا، انہیں میں کا ایک گروہ حضرموت کی جانب گیا اور ایک نے مدینہ سبا کی بنیاد رکھی جو کہ بہت ہی مشہور رہا یہی لوگ بنی یعرب تھے ان میں سے بعض نے مملکت عثمانیہ میں بھی حکومت کی، ملوک عمان نے بھی سلطنت زنجبار پر حکومت کی اور اس طرح سلطنت زنجبار ملوک عمان اور سبا، دونوں سے مربوط ہو گئی، سبا، نے تجارت کو بہت فروغ دیا اور سارے مشرقی افریقہ پر حاوی ہو گئے، جیسے فینیقین سواحل بحر ابیض اور غربی یورپ تک سرگرم تجارت تھے، سبا، سواحل جزیرۃ العرب اور بحر ہند میں مصروف تجارت تھے، اہل عرب جو کہ ان شہروں پر حاوی تھے، کشتی رانی میں بہت ہی ماہر ہوتے، انکے تجارتی بیڑے بالعموم چالیس کشتیوں پر مشتمل ہوتے، جس پر چار ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے، زنجبار کی حد گویا ان کی حفاظت گاہ اور آرام لینے کی جگہ تھی، یہ تجار وہاں تقریباً، ہفتے ٹھہرتے تھے اور ان ایام میں وہ یہاں خشک مچھلی، مسالہ، عربی قالین اور اسی قسم کی دیگر چیزوں کو دانے لکڑیاں اور مکانات کی تعمیر کے سامان وغیرہ سے تبدیل کرتے، جب وہ اس طرح، ہفتے پورے کر لیتے اور لین دین ختم ہو جاتا تو وطن کی جانب مراجعت کرتے۔

بطلیموس الجغرافی نے جو حالات اس عہد کے مہیا کئے ہیں اس میں ایک کتاب "المرشد للمحیط الہندی" کا بھی پتہ چلتا ہے، یہ کتاب سنہ میلاد کی تصنیف ہے، اس میں تجارت کے حالات اور افریقہ و عرب اور زنجبار کے تجارتی تعلقات بیان کئے گئے ہیں،

قوم انباط (عراق عرب میں آباد تھی) اپنے تجارتی مقام "بترہ" یا "سالع" پر جو کہ وادی موسیٰ میں واقع تھا بہت ہی فخر کرتی تھی، یہ مقام اپنے تجارتی موقع کے اعتبار سے نہایت ہی عمدہ تھا اور اکثر تجارتی قافلوں کا مرکز، وہ لوگ اس کی بہت حفاظت کرتے تاکہ پر امن طریقے پر تجارت کو فروغ دے سکیں۔

عربوں کی تجارت اس میں ہندوستان چین اور بلاد فارس تک پھیلی ہوتی تھی، خشکی
اور تری دونوں ذریعے سے عربی تجار ان ممالک میں جاتے، اپنا تجارتی سامان فروخت کرکے
وہاں کی پیداوار اور مصنوعات لے آتے۔ اس ربط ضبط سے عربی تہذیب و تمدن کچھ نہ کچھ مخلوط
ضرور ہو گیا لیکن انکے خیالات اور جو ان کی خصوصیتیں تھیں ان پر اور جدا ہو گئی اس لیے
ان کے "ہمچو دیگرے نیست" کے مسلک کا اقتضا بھی یہی تھا۔ ان کے نزدیک عرب "عرب"
تھا اور عجم "عجم"

اس عہد میں عرب میں بہت سے بازار تھے جو کہ مہینوں ت
سب سے زیادہ مشہور بازار سوق عکاظ تھا یہ سال میں ایک
بڑے تجار جمع ہوتے۔ ہر قسم کی خرید و فروخت ہوتی اور ہر قسم کی
جلسے ہوتے اور مہینوں یہ سلسلہ قائم رہتا۔

مصر کے قدیم آثار

(جدید انکشافات)

مصر کی سرکاری یونیورسٹی "جامعہ امیریہ" کی جانب سے پروفیسر سلیم حسن جو آثار قدیمہ کے ماہر اور محقق ہیں، متعین کیے گئے تھے کہ مصر کے قدیم آثار کا پتہ چلائیں اور تلاش و تجسس کے بعد اپنے نتائج محنت مفصل رپورٹ کی صورت میں پیش کریں چنانچہ انھوں نے ابھی چند روز ہوئے جیزہ کے لق و دق صحرا میں محنت شاقہ برداشت کرکے بہت سے نایاب و اہم آثار دریافت کیے ہیں۔ یہ آثار مصر کی قدیم تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ان سے اس ملک کی تاریخی منزلت میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے گا جو زمانۂ قدیم سے تہذیب کا مرکز، تمدن و شائستگی کا گہوارہ اور مختلف حکومتوں اور سلطنتوں کا پایۂ تخت رہا ہے، نیز دنیا میں اپنی خاص تہذیب و معاشرت اور آثار کے لحاظ سے غیر معمولی شہرت اور بلند پایہ رکھتا ہے۔

پروفیسر سلیم نے ان آثار کے متعلق مصر کے وزیر تعلیمات اور یونیورسٹی کے چانسلر (مدیر الجامعہ) کی خدمت میں اپنے کارناموں کی رپورٹ پیش کر دی ہے، یہ صحرائے جیزہ کے ان زبردست آثار قدیمہ کے بیش بہا خزانے پر تفصیلی روشنی ڈالتی ہے جو مشہور مصری اہرامات کے زیریں حصہ کے نزدیک مقبرۂ (ریع ولہ) کے جوار میں دستیاب ہوئے ہیں ان کا انکشاف مصر کے اس نامور ماہر اثریات نے گزشتہ سال میں کیا ہے، اور اب المسار کے نامہ نگار کی بدولت اس کی تمام تفصیلات کی اشاعت کا موقع ملا ہے۔ نامہ نگار کا بیان ہے کہ:-

"دریافت شدہ آثار میں سب سے اہم ایک تابوت ہے جس میں ایک عورت کی لاش رکھی ہوئی ہے۔ یہ تابوت سفید چونے کے پکائے ہوئے پتھر کا ہے، یہ تابوت بند پایا گیا جو کئی

نہایت مضبوط قفلوں سے بند اور محفوظ کیا گیا تھا۔ باوجود اس احتیاط اور حفاظت کے قبرستان کا بدبودار پانی اس تابوت میں کسی قدر سرایت کر گیا ہے۔

یہ لاش اس تابوت میں اوندھی لٹائی پائی گئی؛ اور اس کا منہ مشرق جانب تھا۔ ابتک اس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھ میں آسکا ہے کہ یہ خاتون (ری ورر) کاہن (مذہبی پیشوا) کی کوئی رشتہ دار ہے اور اس کی عمر ۳۰ سال سے زیادہ کی نہیں ہے۔ یہ لاش قسم قسم کے بہت زیوروں سے آراستہ ہے۔ اس کے سر پر ایک سونے کا تاج ہے جس کی لمبائی ۸ سینٹیمیٹر ہے اس تاج کے دونوں جانب سونے کے دو ٹکڑے دو پھولوں کی طرح آویزاں ہیں یہ دونوں ... کے پاس آکر مل جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک پھول پر ایک ... اس چڑیا سے تقریباً بہت زیادہ مشابہ ہے جسے آج کل مصر میں ... کے بیچ میں ایک سونے کی ٹکیہ اور ایک سونے کا ٹکڑا لگا ہوا ہے جو اسنوانی ... سینٹیمیٹر ہے اور بلندی ڈیڑھ سینٹیمیٹر سے زیادہ نہیں۔

دوسرے زیوروں میں لاجورد کا ایک ہار ہے جس میں اٹھائیس دانے ہیں اور دو ہار سونے کے ہیں جو نہایت قیمتی جواہرات سے آراستہ ہیں ایک اور ہار معمولی جواہرات کا ہے۔ ہار سونے کے ٹکڑوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ دونوں ٹکڑے اس حرف نون کی شکل ہیں جو مصر کی قدیم زبان میں مروج تھا یعنی پانی کے تموج کی شکل کے ان میں سے پہلے ٹکڑے کا طول سات سینٹیمیٹر ہے۔ اسی میں ایک چھوٹا سا طلائی ٹکڑا اور آویزاں ہے جو نصف دائرہ کی شکل کا ہے۔ اس کا قطر ساڑھے پانچ سینٹیمیٹر ہے۔ اس میں بے شمار خزف[1] لاجورد، فیروزہ، سونے اور عقیق کے دانے ہیں۔

انھیں زیوروں میں ایک اور ہار ہے جس میں ۱۵ دانے لاجورد کے ہیں اور (۱۳) دانے اس پتھر کے جو (اشانبت) کے نام سے متعارف ہے۔ دو دانے سونے کے ہیں اور ایک دانہ

---

(۱) آگ میں پکی ہوئی مٹی۔

عقیق کا۔ ایک اور ہار ہے جس کے دو دانوں کے درمیان میں سونے کا ایک ٹکڑا تموج کی شکل کا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی لمبائی اڑھائی ۲½ سینٹیمیٹر ہے اور ایک سونے کی مالا ہے جو پچاس دانوں سے بنائی گئی ہے اور ایک طلائی کنگن ہے اور دو کنگن برونز(۱) کے ہیں اور ایک کنگن دو طلائی تاروں سے بنا ہوا ہے اور ایک کنگن شاخ دار یا لڑی دار ہے جس کی شاخ یا لڑی نہایت نادر صنعت کا نمونہ ہے ہر لڑی یا شوخ میں سونے کی گئی گئی دانے ہیں اور ایک سونے کی پازیب یا چھاگل ہے۔

اور اس خاتون کے دونوں پاؤں کے پاس دونوں قدموں کی مٹی کی بنائی ہوئی انگلیاں بھی رکھی ہیں۔ ان مصنوعی انگلیوں کے بنانے میں ایک خاص حکمت ہے جو مصریوں کے ایک نہایت قدیم عقیدے کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ یہ کہ جب اصلی انگلیاں گل کر ضائع ہو جاتی ہیں تو یہ مصنوعی مٹی کی انگلیاں انکی جگہ لگ جاتی ہیں۔

پروفیسر سلیم حسن نے اسکے علاوہ ایک گہرا کنواں بھی دریافت کیا ہے جس کے اندر تین کھڑکیاں ہیں ان غرفوں میں دو رسیاں کوئیں میں اترنے کی لگی یا بندھی ہیں ان میں سے ایک نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس پر ایک سونے کی تختی ہے۔ اس تختی پر سیاہ روشنائی سے "کتاب الموتی" کی تیسویں فصل کا کچھ حصہ لکھا ہوا ہے جس طرح اکثر تعویذ وں پہ لکھا رہتا ہے جو بڑی تعداد میں سفید چونے کے پکائے ہوئے پتھر کے دستیاب ہوتے ہیں!

اور (۸) برتن سنگ مرمر کے چکنے پالش کئے ہوئے ملے ہیں چار برتن مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ایک چھوٹی چوکی قربانیاں چڑھانے کی ہے یہ بھی پالش کئے ہوئے مرمر کی ہے ایک اور چوکی ہے جس پر باقی قربانیاں رکھی ہیں۔ پھر پانچ طباق (تھالیاں) نہایت پتلے پتلے سنگ سرخ کی ہوئی مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ان پر ایک خاص قسم کے مادہ کی پالش کی ہوئی ہے۔

---

(۱) ایک مرکب دھات۔

اس عظیم الشان انکشاف کے اثنا میں اس ماہر اثریات کو حسن اتفاق سے دو قبریں اور ملیں
معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک قبر (تماح حوی) کاہن کی ہے جو (رع ۵۵) کے کاہنوں میں
سے تھا۔ دوسری پر صاحب قبر کا نام (رنسوکا) لکھا ہوا ہے مگر اس سے زیادہ اب تک اس شخص
کی حقیقت اور شخصیت کے متعلق اور کچھ پتہ نہیں چلا، اندازے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ بھی کوئی
کاہن تھا۔ ان کے علاوہ پروفیسر موصوف نے ایک اور کنویں کا سراغ لگا یا ہے۔ اس کی گہرائی
تقریباً ۹ میٹر ہے۔ اس کنویں کی تاریخ مصر کے قدیم چوتھے خاندان [illegible]
اس کی کھدائی کے سلسلے میں پروفیسر سلیم کو ایک چھوٹی سی سنگ
بڑے کاہن (رع ور) کی ہے۔
یہ ہیں تفصیلات اُن آثار کی جو المسا، کے نامہ نگار نے [illegible]
کی ہیں۔ علامہ احمد بک لطفی السید جامعہ کے رجسٹرار اور اُن کے ساتھ علامہ عبدالحمید بدوی بتا
ان قیمتی آثار کو دیکھنے کے لئے صحرائے جیزہ کو تشریف لے گئے ہیں۔
مصر کی وزارت تعلیمات عامہ نے جیزہ میں ایک مکان کرایہ پر لیا ہے تاکہ مصر کے ان
علماء آثار کے ذریعے جو مصر کی جامعہ امیریہ کی جانب سے کھدائی کا کام کر رہے ہیں جن جن
آثار کا انکشاف ہو وہ حفاظت سے یہاں رکھے جائیں۔

(روزنامہ المسا قاہرہ)

انسان اور زمانہ

(از ڈاکٹر یوسف حسین خانصاحب بی اے (جامعہ) ڈی لٹ (پیرس)

لطف شعور زیست نے   رقص خودی کو دیکھ کر
حیرت نقش جلوہ میں   شوق کا رنگ بھر دیا

عالم رنگ و بو میں تھا   حسن ہنوز محو خواب
جلوہ فروز کائنات   عشق ازل نے کر دیا

مرکز گردش زماں   نقطۂ وہم پر نہ تھا
ساز خودی کے تار میں   لرزش کیف حق نہاں

مہر بہ لب ملک تمام   حیرتیاں باصفا
پست نشیمنی پہ یہ   بالِ ہما کا حوصلا

دہر کی چشم تیز بیں   محرم راز انس و جن
محو تماشۂ ازل   عارف بخت زندگی
بھانپ گئی کہ ہے یہی   پرتو ذات کبریا
وجہ وجود کائنات   عطر رگ گل حیات

آئینۂ تضاد میں   صورت حق ہے جلوہ گر
اس کا پیام آرزو   رنج و طرب کا آشنا
اس کے فسون شوق سے   گردش ہفت آسیا
اس کی طلب کے داغ میں   آئینۂ جہاں نما
نغمۂ جاں نواز میں   لذت کرب کا خمیر
شورش اضطراب میں   شان سکون [illegible]
درد تپش کا پیچ و تاب   حاصل [illegible]
ہدیۂ لذت گناہ   مایۂ [illegible]
اس کی کرشمہ سازیاں   پردہ در [illegible]
اس کا زیاں بھی سود ہے   اس کے شر میں [illegible]
اس کی شکست کی صدا   نقش وجود نغما ہے
اس کا نشاط بیخودی   رشک شعور دو جہاں

مردم چشم انتظار   وقف طلسم ہست و بود
طائر دل کو کر لیا   یاد کے دام میں اسیر

ماضی و حال کو کیا   بطن زماں نے آشکار
لمحوں کے گیسوؤں میں زیست   صید زبون خستہ جاں

اوتائی

(ایک جاپانی قصہ)

بہت دنوں کی بات ہے کہ نیاگا شہر میں ناگو نامی ایک شخص رہتا تھا۔ ناگو ایک حکیم کا لڑکا تھا اور خود اسے بھی حکمت کی تعلیم دی گئی تھی، کم سنی ہی میں اس کی نسبت ایک لڑکی سے جس کا نام اوتائی تھا ٹھہر گئی تھی۔ لڑکی اس کے باپ کے ایک دوست کی بیٹی تھی۔ لڑکے لڑکی کے ماں باپ میں یہ سمجھوتا ہو گیا تھا کہ لڑکے کی شادی پڑھائی ختم ہونے کے بعد ہی کر دی جائے گی، نسبت طے ہونے کے بعد لڑکی کی صحت کچھ خراب رہنے لگی اور جب پندرہ برس کی ہوئی تو تپ دق کا عارضہ ہو گیا جب اس بیچاری غریب لڑکی کو یہ احساس ہوا کہ وہ اس دنیا میں بس چند دن کی اور مہمان ہے تو اس نے ناگو کو بلا بھیجا تاکہ اس سے رخصت لے۔ ناگو اس لڑکی کے بستر کے قریب دو زانو بیٹھ گیا تو اوتائی نے کہا:

ناگو۔ میرے منگیتر۔ ہم دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو زبان دے چکے تھے اور اس سال کے ختم ہونے تک ہماری آپس میں شادی ہوتی لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں اب عنقریب مرنے والی ہوں بس دیوتاؤں کو ہماری بہتری معلوم ہے۔ اگر یہ ممکن بھی ہو کہ میں اپنی زندگی کے کچھ سال اور اسی طرح کاٹ سکوں تو میرا زندہ رہنا دوسروں کے لئے تکلیف اور رنج کا باعث ہوگا۔ میں بیمار ہوں۔ میرا جسم کمزور ہے۔ میں کسی طرح سے ایک اچھی بیوی نہیں بن سکتی اگر میں اس حال میں زندہ رہنا چاہوں تو یہ تمنا ایک بڑی خود غرضانہ خواہش ہوگی۔ یہ میں ضرور جانتی ہوں کہ اس سے تم کو بیحد خوشی حاصل ہوگی لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے میں خوشی کے ساتھ مرنا اچھا سمجھتی ہوں اور تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ تم میری موت کے بعد میرے لئے ماتم نہ کرنا۔ ہاں ایک بات تم سے اور کہہ دوں وہ یہ ہے کہ شاید میں پھر دوبارہ تم سے ملوں۔ ناگو

فوراً بول اٹھا: "بے شک ہم دونوں پھر ملیں گے اور اس پاک ملک میں جہاں جدائی کی تکلیف کا کھٹکا نہیں۔"

"نہیں نہیں" آہستہ سے اوتائی نے جواب دیا۔ "میرا مطلب اس پاک ملک سے نہیں۔ میں امید کرتی ہو کہ ہماری قسمت میں یہ لکھا ہے کہ ہم پھر ایسی دنیا میں ملیں گے حالانکہ میں شاید کل ہی دفنا دی جاؤں۔" ناگو اس کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور اس کی ہنسی پر تعجب کر رہا تھا۔ اس نے ناگو کی حالت دیکھ کر [illegible]

"ہاں میری اسی دنیا سے مراد ہے! تمہاری اسی زندگی [illegible] خواہش ہو! اپنی بات رکھنے کے لئے مجھے پھر لڑکی کا جنم لینا [illegible] حسین خاتون بننا پڑے گا۔ اس لئے تم کو کچھ انتظار کرنا ہوگا [illegible] یہ خاصہ زمانہ ہے! لیکن میرے منگیتر شوہر تمہاری عمر اس وقت [illegible]"

ناگو چاہتا تھا کہ اس کی موت کے آخری لمحے سکون کے ساتھ گذریں۔ اس نے محبت میں ڈوبے ہوئے انداز سے جواب دیا:-

"تمہارا انتظار کرنا میرے لئے صرف خوشی ہی کا باعث نہ ہوگا بلکہ ایک فرض ہے ہم اپنے اعتقاد کے مطابق سات جنم تک ایک دوسرے سے محبت کے رشتہ میں گوندھے ہوئے ہیں۔" اوتائی نے سوال کیا، "لیکن کیا تمہیں اس میں شک ہے؟" ناگو نے جواب دیا "میری غمگسار ہاں مجھے شک ہے! کیونکہ میں تم کو دوسرے جنم میں دوسرے نام میں کس طرح پہچان سکوں گا۔ جب تک کہ تم مجھکو اپنی کوئی نشانی یا یادگار نہ دو گی۔" لڑکی نے کہا "یہ میں نہیں کر سکتی۔ سوائے دیوتاؤں اور خدا شناسوں کے کوئی نہیں جانتا کہ ہم کیسے اور کہاں ملیں گے لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ اگر تم مجھ سے خوشی خوشی نہ ملے تو میں اس قابل نہ ہونگی کہ تمہارے پاس پھر واپس آسکوں۔ ان الفاظ کو یاد رکھو۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ چند ہی گھڑیوں میں وہ دنیا سے کوچ کر گئی۔ ناگو اوتائی کی محبت میں گرفتار تھا۔

اس کی موت کا اس کو بیحد صدمہ ہوا۔ لڑکی کی یاد میں اس نے ایک تعویذ بنایا جس میں اس نے اپنی محبوبہ کا نام اور اس کی پیدائش کا دن لکھا تھا اور اس تعویذ کو اس جگہ رکھ دیا جہاں گھر کے دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی اور ہر روز اس تعویذ پر پھول چڑھاتا تھا (یہ ایک خاص جاپانی رسم ہے کہ ہر ایک گھر میں دیوتاؤں اور بزرگوں کی پوجا ہوتی ہے) وہ اکثر اوتائی کی ان عجیب پراسرار باتوں پر غور کیا کرتا تھا جو اس نے مرنے سے پہلے کی تھیں۔ اس آس میں کہ اوتائی کی روح کو فرحت پہنچے۔ ایک دن اس نے تعویذ پر اپنا وعدہ لکھ دیا کہ اگر اوتائی دوسرا جنم لے کر پھر نمودار ہو تو میں اس سے شادی کر لوں گا۔ اس اقرار پر اپنی مہر لگائی اور اسے بھی پوجا کی جگہ جا کر رکھ دیا۔

اپنے خاندان میں ناگو بس ایک ہی لڑکا تھا۔ اس کے والدین چاہتے تھے کہ لڑکے کی شادی کہیں ہو جائے۔ ناگو کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے والد کی پسند کردہ لڑکی سے شادی کرے۔ آخر کار ایک لڑکی سے شادی ہوئی۔ شادی کے بعد بھی وہ حسب معمول تعویذ پر پھول چڑھایا کرتا۔ اور اس کے دل سے کبھی اوتائی کی محبت کا نقش مٹا نہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اوتائی کی تصویر اس کے دل میں دھندلی ہونے لگی جیسے کسی خواب کا یاد کرنا مشکل ہوتا ہے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ اسے مصیبتوں نے آگھیرا۔ اس کے والدین موت کے شکار ہو گئے بیوی بھی چل بسی اور اس کا اکلوتا لڑکا بھی تمام ہو گیا وہ بیچارا اب دنیا میں اکیلا رہ گیا۔ اس نے گھر بار کو خدا حافظ کہا۔ اور اس امید میں ایک لمبے سفر کو چلا کہ شاید اپنی مایوسیوں اور مصیبتوں کو بھول جائے۔

سفر میں وہ ایک دن آکو نامی ایک مقام پر جا پہنچا۔ یہ پہاڑی گاؤں گرم چشموں اور قرب و جوار کے مناظر کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ اس گاؤں کی ایک سرائے میں جا اترا ایک خادمہ اس کی خدمت گزاری کے واسطے حاضر ہوئی۔ ناگو کی نظر اس لڑکی کے چہرے پر پڑی ہی تھی کہ اس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس لڑکی

میں اس نے اوتائی کی کمال مشابہت پائی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ عالم خواب میں ہے یا جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ اس نے اپنے زور سے چٹکی لی تاکہ پتہ لگ جائے کہ وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ لڑکی باہر چلی گئی اور جب پھر اندر کھانا لے کر آئی۔ اس کی ادا اور چال ڈھال سے ناگو کے دل میں اسی لڑکی کی یاد تازہ ہو گئی جس سے اس نے اپنی جوانی میں شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے لڑکی سے باتیں کیں۔ اس لڑکی نے نرم آواز سے جواب دئے جن کی شیرینی نے اس کے پرانے غموں کی یاد تازہ کر دی۔ آخر ناگو نے تعجب کے ساتھ اس سے سوال کیا:

"بڑی بہن! تمہاری شکل ایک لڑکی سے بہت ملتی ہے۔

میں حیرت میں رہ گیا جب میں نے تمہیں اس کمرے میں دیکھا۔

میں تمہارے شہر کا اور تمہارا نام دریافت کروں"۔ لڑکی نے فوراً ایک نہ بھولنے والی آواز میں جواب دیا "میرا نام اوتائی ہے اور تم نیاگا نا کے رہنے والے میرے منگیتر شوہر ہو۔ سترہ برس ہوئے میرا انتقال لیاگا تا میں ہوا تھا۔ تم نے اس وقت اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ تم مجھ سے شادی کروگے جب میں دوبارہ عورت کا جنم لے کر اس دنیا میں آؤں گی تم نے اپنے عہد کو مہر لگائی تھی اور دیوتاؤں کے پاس جا کر رکھ دیا تھا۔ جہاں میرے نام کا ایک تختہ تم نے بھی بنا کر رکھا تھا"۔ ان لفظوں کا منہ سے نکلنا تھا کہ وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ کچھ دیر میں اسے ہوش آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت بھری آنکھوں سے دیکھا۔ بالآخر ناگو کی اس سے شادی ہو گئی اور دونوں نہایت ہی خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اوتائی اپنی پرانی داستان بالکل بھول گئی اور اس کو اپنی پچھلی زندگی کا کوئی واقعہ یاد نہ رہا۔

شذرات

جامعہ کے صفحات میں بار بار یہ تلخ حقیقت ظاہر کی جا چکی ہو کہ عربی تعلیم جس پر مسلمانوں کے دین اور تمدن کی بنیاد قائم ہے، سرعت کے ساتھ زائل ہوتی جارہی ہے۔ ہمارا قدیم نظام مکاتب جس کے اکثر پرانے مسلمان مداح ہیں تقریبًا بالکل فنا ہو چکا ہے اور اس کی جگہ سرکاری اور نیم سرکاری مدارس نے لے لی ہے جن کو ہمارے مذہب یا تمدن سے کوئی قریبی واسطہ بھی نہیں ہے۔ بڑے بڑے عربی مدارس کا نظام اس قدر فرسودہ ہے کہ بجز فنا کے ان کی زندگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

اکثر علماء اسلام اور بعض جرائد نویس جنھوں نے "مذہب" کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے اور جو بالعموم خود مسلمانوں ہیں سے اپنے مخالف بنا کر ان سے لڑتے رہتے ہیں اور حمایت اسلام کے مجاہدانہ فرائض بزعم خود ادا کرتے ہیں ان کی نگاہیں اس قدر قاصر ہیں کہ وہ اس کٹتی ہوئی جڑ کو نہ دیکھتے ہیں نہ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ بڑے سے بڑے عربی تعلیم کے حامی اسی دقیانوسی طریق تعلیم کے موید ہیں اور کوئی نئی صورت عربی تعلیم کے احیار کی نہیں سوچتے۔ حالانکہ اس قدیم طریقۂ تعلیم کا اس زمانہ میں زندہ رکھنا تقریبًا محالات میں سے ہے۔ کیونکہ اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ثابت ہو چکا ہے۔

مسلمانوں نے عربی تعلیم کو ہمیشہ سے دینی غرض سے سنبھالے رکھا اور آج بھی اس کا سب سے بڑا مقصد وہی ہے۔ اس لئے ضرورت دینی کو پیش نظر رکھ کر ہم کو ایک نہایت صحیح نصاب ہلکے سے ہلکا اور مکمل سے مکمل تیار کرنا چاہیے جس کو مسلمانوں کی زیادہ تعداد پڑھ سکے اور جو ان کے دنیاوی معاد اور کسب کمال میں خلل انداز نہ ہو۔ قدیم نصاب اس قدر بوجھل اور اس

قدر غیر ضروری اور لاطائل مضامین سے پُر کیا گیا ہے کہ اس کے لئے ایک انسان جبتک اپنی
پوری زندگی یا کم سے کم زندگی کا بڑا حصہ نہ صرف کرے اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اور میرے خیال
میں اصلی وجہ علماء کے مذہب کو پیشہ بنا لینے کی یہی ہوتی ہے کہ وہ اس نصاب کو پورا کرنے کے بعد کسی
دوسرے کام کے قابل نہیں رہ جاتے یا کوئی دوسرا ہنر سیکھنے کا جس سے عزت کے ساتھ زندگی بسر
کر سکیں موقع نہیں پاتے۔ اس لئے دین کو کمائی کا ذریعہ بنا کر نہ صرف اپنی بلکہ بہتوں کی دنیا اور
نیز دین دونوں کو برباد کرتے ہیں۔

آج کل کا زمانہ جس قدر عربی تعلیم کا مخالف ہے اس سے [illegible]
اس کے لئے مہلک ہے۔ اسی طرح مذاہب کے لئے دنیا میں جس [illegible]
سے زیادہ خود مذاہب کی رسوم و قیود سے گرانباری اٹھا کر وجود کو مٹا سکے [illegible]
ایک زندہ جاوداں شے ہے جس کو کوئی فنا نہیں کر سکتا اور عربی زبان کی تعلیم ایک مفید علمی کمال ہے
جس کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ کاش ہماری قوم اس حقیقت کو سمجھتی۔

کیا کلثوم ابن عیاض کی فوج میں جتنے جوان تھے سب مضبوط و مستقل مزاج تھے۔ کلثوم کے لیے بہت سی رعایتیں رکھی گئی تھیں اس اہتمام کے ساتھ کلثوم مصر روانہ ہوا اور وہاں کے لوگوں میں سے تین ہزار سپاہی بھرتی کئے اب اُس کے لشکر میں تیس ہزار نفر تھے جن کا باقاعدہ اندراج تھا جو لوگ اپنی خوشی سے ان میں شامل ہو گئے ان کی تعداد اس کے سوا ہے۔

امیرالمومنین نے کلثوم کو حکم دے دیا تھا کہ ہارون قرنی مولات معاویہ بن ہشام اور مغیث مولائے ولید کی اطاعت کرے کیونکہ یہ دونوں مقامی حالات سے واقف ہیں اور عامل افریقیہ کو حکم بھیج دیا کہ تم کلثوم ابن عمرو کی اطاعت کرو۔ پھر کلثوم افریقیہ پہنچا۔ وہاں طنجہ کے عرب کثرت سے بھرتی ہوئے یہاں تک کہ کلثوم کی فوج کی پیادہ فوج پر مغیث اور سوار فوج پر ہارون قرنی سردار بنا۔

بربریوں کی سورش کے اسباب | بربری قبائل اور اُن کے سردار میسرہ۔

یہ لوگ بھی جمع ہوئے اس کا حال پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انکے خروج و بغاوت کی کیا وجہ تھی۔ جن لوگوں کو حکام پر طعن کرنے کی عادت ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بربری اپنے عمال کی حرکتوں سے تنگ آکر بغاوت کر بیٹھے۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خلیفہ اور اُس کے بیٹے جب ضرورت ہوتی تو عمال طنجہ سے لیے چمڑے کی فرمائش کرتے تھے جو حاملہ بکریوں کا پیٹ چاک کر کے ان کے بچوں سے حاصل کیا جاتا تھا اور یہ شرط بھی لگا دیتے تھے کہ یہ چمڑا شہد کا ہمرنگ ہونا چاہیے چنانچہ عمال اپنی نگرانی میں سو سو بکریاں ذبح کرالیتے مگر بسا اوقات ان میں ایک چمڑا بھی شرائط کے مطابق نہ ملتا تھا اور یہ بات بربریوں کی تکلیف و برہمی کا باعث ہوتی تھی۔ غرض جن لوگوں کو امرائے اندلس سے بغض ہے وہ اسی قسم کے الزامات لگا کر اس بغاوت کا باعث وہاں کے امراہی کو قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ الزامات سچ ہیں تو ازارقہ و اہل نہروان و اصحاب راسبی عبداللہ ابن وہب و زید ابن خصص وغیرہ کی اقتدا میں قرآن اٹھوانے اور سر منڈوانے کی کیا توجیہ ہے۔

شامی فوج کے انتظامات | بہرحال میسرہ نے بے شمار فوج جمع کر کے موضع بقدورہ میں کلثوم ابن عیاض

کے سامنے پڑاؤ ڈالا۔ کلثوم نے اس وقت تک خندق نہیں کھدوائی تھی۔ ہارون و مغیث نے کلثوم کو مشورہ دیا کہ آپ خندق کھدوائیے اور سواروں کی ایک بڑی جماعت تیار رکھئے اور ایک دستہ سواروں کا ہمیں دیجئے۔ تاکہ ہم اُن سے اُن کے گاؤں اور مسکنوں تک لڑتے چلے جائیں۔ کلثوم نے اس بات کو اہم جان کر تامل کیا اتنے میں اس کا قائمقام بلج آگیا۔ بلج اس کا حکم کبھی نہ ٹالتا تھا۔ بلج نے کہا کہ آپ ایسا نہ کیجئے باغیوں کی کثرت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان میں سے اکثر ننگے اور نہتے ہیں اس کے بعد جب لڑائی شروع ہوئی تو کلثوم کی سوار فوج کا افسر بلج تھا۔ افریقیہ کی سوار فوج کا ہارون قرنی اور پیادہ فوج کا مغیث اہل شام کی پیادہ فوج پر کلثوم خود نگراں تھا۔

بربریوں کی ایک چال | یہ جنگ نہایت سخت تھی۔ بربری فوج کا پلہ بھاری تھا۔ جب بلج اپنے سواروں کو لے کر حملہ آور ہوتا تھا تو بربری بھی مقابلہ کرتے تھے اور چمڑے کی گوپھن میں پتھر رکھ کر اہل شام پر سنگباری کرتے تھے اور اونٹوں کی دم میں پانی کی مشک اور خشک چمڑے باندھ کر ان کو کلثوم کے لشکر پر چھوڑ دیتے تھے۔ اس حرکت سے شامی لشکر کے گھوڑے بھڑکتے تھے اور سواروں کے قابو سے باہر ہو جاتے تھے۔ یہ دیکھ کر لوگ بلج کے حکم سے پیادہ ہو گئے۔ مورخین کہتے ہیں کہ بربریوں کو ایسا کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ بربریوں کی سوار فوج اتنی نہ تھی کہ حریف کی سوار فوج کا مقابلہ کر سکتی۔ جب کلثوم کی سوار فوج میں سے اکثر لوگ پیادہ ہو گئے تو بلج کی سوار فوج میں بارہ ہزار نفر رہ گئے اور بقول بعض سات ہزار سوار باقی رہے۔ قول آخر زیادہ صحیح ہے۔

سواروں کے پیادہ ہونے اور بربریوں کے عجیب الہیئت اونٹوں کے گھسنے سے حملہ آوروں کی صفیں ٹوٹ گئیں انتظام جاتا رہا اور اب بربریوں نے سختی کے ساتھ حملہ شروع کیا۔ بلج بہت کوشش کرتا تھا مگر ان پر قابو نہ ملتا۔ یکایک بربریوں نے جنگ مغلوبہ شروع کر دی اور اہل شام کی صفوں پر ٹوٹ کر گرے اور نہایت سختی سے در آئے۔ بلج نے یہ دیکھ کر ایکبار نہایت برہم ہو کر سختی سے مقابلہ کیا اور بربریوں کی فوج کو درہم برہم کر دیا۔ اُس کے بعد چاہا کہ ایک بار اور ایسا ہی پر زور حملہ کرے مگر اب کے بربری فوج تازہ دم ہو کر کئی حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک جماعت نے کلثوم پر کیا اور ایک بلج سے

مقابلہ کرتی رہی اور ایسی سختی سے گھبرا کر بلج اپنے پڑاؤ پر نہ جا سکا اور بربریوں کی فوج کے پیچھے ہو گیا بربریوں کا ایک گروہ اس سے برابر لڑتا رہا۔ مگر دوسری طرف ان کی فوج کا بڑا حصہ میسرہ کے ساتھ بھڑ گیا اور یہ لوگ لڑتے لڑتے کلثوم تک پہنچ گئے۔ ان کی اس معرکہ آرائی سے حبیب ابن ابی عبدۃ قرشی، مغیث اور ہارون شہید ہو گئے اور اہل افریقیہ کی سوار و پیادہ فوج شکست کھا کر بھاگ گئی جو کلثوم کے لشکر کا ایک حصہ تھی۔ صرف کلثوم میدان میں جمے رہے۔

ایک شخص کی حیرت انگیز بہادری
لشکر شام کی ہزیمت اور جنگ کے نتائج

مجھے ایک ثقہ شخص سے روایت پہنچی ہے کہ [illegible] ثلث میں شام والوں میں کا ایک شخص اٹھا جس کے [illegible] تھا کہ سر کی کھال الٹ کر اس کی آنکھوں پر آ پڑی تھی۔ اس شخص کی آنکھوں سے سر پر رکھی اور اپنے لوگوں کو آواز دی۔ اس کے طرف سے مدافعت کی اور وہ بلند آواز سے یہ آیت پڑھتا جاتا تھا ''ان اللہ [illegible] واموالہم (الخ)'' اس آیت کے بعد اس نے یہ آیت پڑھی وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا وہ یہ آیت پڑھ ہی رہا تھا کہ بربریوں نے پھر شدت کے ساتھ حملہ کیا۔ اس حملے میں وہ گر پڑا اور اس کے ساتھی کام آئے۔ اس وقت تک شاہی جھنڈا اور کسی نے نہیں لیا تھا غرض شامی لشکر بری طرح پسپا ہوا جو لوگ سوار ہو سکے وہ سوار ہو کر افریقیہ کی طرف بھاگے۔ بربریوں نے مفرور لشکر کا تعاقب کیا اور شام کی شکست خوردہ فوج کو قتل اور قید کرنے میں کمی نہ کی۔ چنانچہ جب حساب ہوا تو شام کے ثلث لشکری مقتول، ثلث اسیر اور ثلث مفرور معلوم ہوئے۔ مگر بلج بربری لشکر سے مقابلہ کرتا رہا اور جم کے لڑا کئی بار فریقین نے ایک دوسرے کو روک دیا۔ بلج کی تیغ زنی سے بہت سے بربری مارے گئے مگر چونکہ بربریوں کی فوج بے شمار تھی اس لئے ان کے مقتولین کا حساب نہ ہو سکا۔ بلج اسی عالم میں تھا کہ بربری کلثوم کو قتل کر کے اس کے ساتھیوں سے فارغ ہو کر بلج کی طرف جھپٹے جب بلج نے دیکھا کہ اب مقابلہ و مدافعت کی طاقت نہیں ہے تو مجبوراً پسپا ہوا اور انھیں کے شہروں سے گزرتا ہوا سمندر کی طرف بڑھا۔ بربریوں نے بحر اخضر تک اس کا تعاقب کیا، مگر بلج بڑھا چلا گیا اور شہر

سبتہ میں پناہ ملی۔ اس سے پہلے اس کا ارادہ طنجہ میں داخل ہونے کا تھا مگر طنجہ پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اس لئے سبتہ میں داخل ہوا۔ سبتہ نہایت بارونق و باآباد شہر تھا اس کی مضبوطی و دولت قابل رشک تھی۔ بلج نے یہیں پڑاؤ ڈال کر سبتہ پر قبضہ رکھا اور ذخائر رسد جمع کئے مگر ہنگامی ضرورت سے زیادہ فراہم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔

بربریوں نے یہ خبر سن کر بلج پر پھر چڑھائی کی مگر بلج نے سر میدان مقابلہ کر کے ان کو بھگا دیا۔ اور نہایت بے دردی سے قتل کیا۔ دوبارہ پھر بربریوں نے حملہ کیا اور بلج سے ہار گئے۔ اسی طرح پانچ یا چھ بار بربریوں نے فوج کشی کی اور ہارے۔

بربریوں کی دوسری چال جب ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اب بلج کے پاس لشکر باقی نہیں رہا ہے تو سبتہ سے دو دن کی مسافت تک آس پاس کے تمام مواضعات لوٹ کر اس سرزمین کو ہر طرف سے بے آب و گیاہ کر دیا تاکہ بلج کے ہاتھ کچھ نہ آئے اور خود چلتے ہوئے۔

اب بلج اور اس کے ہمراہیوں نے ان کے قیاس کے مطابق پڑاؤ سے نکل کر غارتگری شروع کی مگر اس میں کامیابی نہ ہوتی اور کچھ دن بعد انکے ذرائع معاش بالکل منقطع ہو گئے اور یہ لوگ اتنے مجبور ہوئے کہ وہ اپنے گھوڑے تک ذبح کر کے کھا گئے۔ پھر اسی قسم کی پریشانیاں اٹھاتے ہوئے خراب وخستہ حالت میں اندلس پہنچے۔ باقی واقعات حسب موقع آئندہ لکھے جائیں گے۔

خلیفہ ہشام کی ندامت اور دوبارہ فوج کشی بلج کے ہمراہیوں کے علاوہ جو شامی اس ہزیمت کے بعد نہایت کم تعداد میں بچ کر شام پہنچے تو ہشام اور اہل شام کو یہ بات بہت گراں گزری اور وہ شام کا لشکر بھیجنے پر بہت پچھتائے اور یہ خیال کیا کہ انکے ساتھ عراقیوں کو کیوں نہ بھیجا شام کے لشکر میں اتنی کمی نہ آتی پھر ہشام نے قسم کھائی کہ اگر زندہ رہا تو اہل بربر پر ایک لاکھ آدمیوں کا لشکر بھیجوں گا اور یہ سب تنخواہ دار ہونگے۔ اس کے بعد پھر ایک لاکھ فوج بھیجوں گا اور برابر بھیجتا رہوں گا یہاں تک کہ سوائے میرے اور میرے بیٹوں کے کوئی باقی نہ رہے۔ پھر ان میں بھی قرعہ ڈالوں گا اگر میرے نام پر قرعہ نکلا تو میں خود لڑنے کے لئے نکلوں گا۔ یہ قسم کھا کر ہشام نے بشر بن صفوان گورنر افریقیہ

حنظلہ بن صفوان کی مہم | کے بھائی حنظلہ بن صفوان کلبی کو تیس ہزار آدمیوں کی جمعیت سے جنگ کے لئے افریقیہ روانہ کیا۔ اور انہیں ہدایت کر دی کہ جب تک میرا حکم نہ پہنچے افریقیہ سے نہ ہٹنا کیونکہ ہشام کو بربریوں سے اندیشہ تھا کہ افریقیہ پر غالب نہ آجائیں اس لئے حنظلہ کو وہاں جلد پہنچنے کی تاکید کر دی تاکہ افریقیہ پر مضبوط قبضہ رہے اور افریقیہ سے فوج اور خزانہ و رسد وغیرہ پہنچنے میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ حنظلہ نے افریقیہ پہنچ کر ایسا ہی کیا پھر ہشام نے حنظلہ کے پاس بیس ہزار آدمیوں کا لشکر اور بھیج دیا۔

بربریوں سے دوسری عظیم الشان جنگ | کلثوم اور انکے ہمراہیوں کی شکست کلثوم اور حبیب ابن ابی عبیدہ وغیرہ کام آئے سنہ ۱۲۲ھ میں ہو ہے۔ حنظلہ افریقیہ پہنچے تو ہشام کی بھیجی ہوئی کمک بھی پہنچی سنہ ۱۲۴ میسرہ اور حنظلہ میں جنگ ہوئی۔ اس موقع پر میسرہ نے بربریوں سے: جن میں بے شمار سپاہی تھے ادھر ہشام بستر علالت پر دراز تھے اور ان کی یہی علالت بعد میں مرض موت ثابت ہوئی۔

ہشام کے متعلق ایک روایت | خلیفہ ہشام کی علالت کے سلسلے میں ایک واقعہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن شدت مرض ان کی زبان سے نکلا یا حنظلہ ابدی یا حدی الطائفتین قبل الاخری (حنظلہ میسرہ کے دونوں لشکروں میں سے پہلے ایک سے جنگ کر لو") لوگ یہ سمجھے کہ ہذیان کی حالت میں بڑبڑا رہے ہیں۔ ادھر حنظلہ نے ایسا ہی کیا اور موقع قرن میں بربریوں کے ایک لشکر کو ختم کر کے دوسرے لشکر پر حملہ کیا۔ جو موضع اصنام میں تھا۔

ان دونوں لشکروں کو شکست فاش دینے کا واقعہ سنہ ۱۲۴ھ کے بعد پیش آیا۔ اس عظیم الشان فتح کی اطلاع حنظلہ نے ہشام کو دی اور بربریوں کے شہروں پر چڑھائی کرنے کی اجازت طلب کی حنظلہ کا یہ خط ہشام کے پاس اس وقت پہنچا جب وہ نزع کے عالم میں تھے۔ ہشام کا انتقال شعبان سنہ ۱۲۵ھ میں ہوا۔

بلج کی بقیہ سرگزشت
عبدالملک ابن قطن کی بے اعتنائی

بلج کے اندلس میں داخل ہونے کا مکمل حال بیان ہوچکا ہے یہاں تفصیل لکھی جاتی ہے۔ بلج اپنے چچا کلثوم بن عیاض کے کام آنے کے بعد تقریباً ایک سال سبتہ میں محصور رہے جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے۔ محاصرہ کی سختیاں اس حد کو پہنچ گئیں کہ اپنے جانور ذبح کرکے کھا گئے اور چمڑا پکا پکا کر اس سے پیٹ بھرنے لگے اور ہلاکت تک نوبت پہنچی۔ اس زمانے میں اندلس کا والی عبدالملک ابن قطن تھا۔ بلج نے عبدالملک ابن قطن کو کئی بار لکھ کر امداد طلب کی اور امیر المومنین و سلطنت عربیہ کی اطاعت پر توجہ دلائی کہ ہم تم دونوں ایک ہی خلیفہ کے محکوم ہیں مگر اس نے تغافل سے کام لیا بلکہ ان کی اس حالت سے خوش ہوا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں یہ لوگ اس پر غلبہ نہ حاصل کرلیں جب اندلس کے عربوں سے ان کی حالت زار نہ دیکھی گئی تو بنی لخم کے ایک شخص عبدالرحمٰن ابن زیاد احرم کو رحم آیا اور اس نے دو کشتیوں میں جو اور ترکاری وغیرہ اشیاء خوردنی بار کرکے ان کے پاس بھیج دیں جس سے کچھ مصیبت کم ہوئی مگر یہ امداد اس درجہ غیر مکتفی تھی کہ اس سے چنداں فائدہ نہ ہوا اور پھر وہی فاقہ کشی اور ہلاکت سے سابقہ پڑنے لگا مگر کچھ مدت بعد زمین سے روئیدگی کے آثار نمایاں ہوئے اور سبزی وغیرہ پیدا ہوگئے جس پر ان لوگوں نے گزارہ کیا۔

عربوں کا قتل

اس کے بعد اندلس کے بربریوں کو جب عربوں اور مطیع رعایا پر باغی بربریوں کی یورش معلوم ہوئی تو وہ اطراف اندلس میں اکٹھا ہوئے اور پہلے جلیقیہ کے عربوں کو نکال کر قتل کیا پھر استرقہ اور ان شہروں کے عربوں کو نکالا جو دریائے وادی الحجارہ کے دوسری جانب رہتے تھے مگر ان حالات سے عبدالملک ابن قطن بالکل خوفزدہ نہ ہوا۔ ادھر جو عرب بربریوں سے بچ کر نکل آئے تھے وہ بھی اس کے پاس آگئے اور اطراف کے تمام عرب وسط اندلس میں اکٹھا ہوگئے صرف سرقسطہ اور بربری سرحدوں کے عرب رہ گئے۔ کیونکہ ان کی تعداد بربریوں سے زیادہ تھی۔ اسی لئے بربری ان پر حملہ نہ کرسکے۔

بعد ازاں عبدالملک ابن قطن نے بربریوں پر کئی لشکر بھیجے مگر بربریوں نے ان کو شکست دی

اور جہاں عربوں کو پایا قتل کیا۔

عبدالملک ابن قطن شام کی فوج سے مدد لیتا ہے

جب عبدالملک نے بربریوں کی پوری تعداد اور اپنی حالت کا صحیح اندازہ لگایا تو ڈرا کہ کہیں ہماری بھی وہی نوبت نہ ہو جو افریقیہ کے علاقہ طنجہ میں عربوں کی ہوئی اور اس موقع پر اہل شام سے جو سبتہ میں تھے مدد لینے کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی۔ یہ سوچ کر اس نے اہل شام کے پاس سامان رسد وغیرہ سے بھری ہوئی کشتیاں بھیجیں اور اُن سے یہ طے کر لیا کہ شام والے اپنی ہر فوج میں سے دس افسر رہن کے طور پر دینگے جن کو جزیرہ میں رکھا جائے گا جب لڑائی کے شام کی فوجوں کی ضرورت نہ رہے گی تو اُن فوجوں اور ... پہنچا دیا جائے گا۔ شامیوں نے بھی عبدالملک سے یہ عہد لیا کہ ہم لوگ ... اور ہمیں بربریوں کے مقابلہ پر نہ لایا جائے گا۔ اس قرارداد کے بعد ... بھیجے جن میں عبدالرحمٰن ابن حبیب ابن ابی عبید، فہری بھی تھے۔ یہ عبدالر... نقدورہ پر شہید ہو چکے تھے۔ جب عبدالرحمٰن شامی کمک لے کر ۱۲۳ھ میں اندلس آئے تو عبدالملک نے ان لوگوں کو جو بطور رہن ساتھ لائے تھے جزیرہ ام حکیم میں ٹھہرایا۔ اس موقع پر شامیوں کی حالت نہایت تباہ ہوئی۔ ان کے پاس کچھ نہ رہا۔ کپڑے تک نہ رہے زرہوں سے ستر پوشی کرنے لگے پھر یہ شامی فوجیں جزیرہ اندلس میں اتریں یہاں ان کو پکا ہوا چمڑا بافراط ملا۔ اس چمڑے سے انھوں نے تن پوشی کی پھر قرطبہ آئے تو عبدالملک ابن قطن نے انکے سرداروں کو خلعت دی اور ہر ایک کو انعام دیا مگر یہ سب کچھ بھی اتنا نہ تھا کہ انھیں کافی ہوتا۔ پھر اندلس کے عرب امرا نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور ان کے معززین کو اپنے یہاں کے معززین کا لباس پہنایا اور اُن پر بڑی مہربانی کی۔ ان عربی سرداروں کی میزبانی سے ان کی حالت درست ہوئی اور کھا پہن کر سیر ہو گئے۔

عبدالملک ابن قطن سے بربریوں کی جنگ

اب کے بربریوں نے اندلس میں اپنا سردار ابن (۴ صفحہ ۴۹[۱۵]) کو مقرر کیا تھا اور جلیقیہ، استورقہ، ماردقہ، قوریہ، اور طلیسرہ سے اپنی افواج اکٹھا کی

---

[۱۵] اصل کتاب میں نام کی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔

تھی۔ اس جنگ کے لئے ان کے پاس اس کثرت سے فوج جمع ہوگئی تھی کہ اس کا کوئی شمار نہیں ہو سکتا
اس تیاری کے بعد بربری دریائے تاجہ کی طرف بڑھے تاکہ اسے عبور کرکے قرطبہ میں عبدالملک ابن
قطن پر حملہ کردیں۔

عبدالملک ابن قطن نے مدافعت کے لئے اپنے دونوں بیٹے قطن اور امیہ بلج کے ساتھ
والی شامی عربوں اور شہر کے عربوں کے ساتھ بھیجے۔

شامیوں اور بربریوں کا تصادم اور بربریوں کی شکست

بربریوں کو ان کی آمد معلوم ہوئی تو انھوں نے میسرہ کی تقلید میں اپنے سر منڈوا ڈالے تاکہ مقابلہ کے وقت مخلوط نہوں اور آسانی سے
پہچان لے جائیں اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کرسکیں پھر یہ بربری شہر طلیطلہ کی طرف بڑھے
اور ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا۔ اب قطن اور امیہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ ان کی طرف بڑھے۔ سرزمین
طلیطلہ میں مقام وادی سلیط پر دونوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ حسب سابق اس جنگ میں
بھی بربری توڑ کر لڑے مگر اہل شام چونکہ پہلے کی شکست سے بہت زیادہ خار کھائے ہوئے
تھے۔ اور تلافی کے لئے موقع کے منتظر رہتے تھے اس لئے انھوں نے نہایت غیظ و غضب کے ساتھ
حملے کئے اور دلیرانہ جوش کے ساتھ بربریوں کو مارنے باندھنے میں مصروف رہے۔ آخر بربری شکست
کھا کر بھاگ نکلے اور جو بھاگ کر نکل گئے وہی بچ گئے ورنہ اور سب وہیں کھیت ہوگئے۔

شامی فوج کا عبدالملک ابن قطن سے جھگڑا اور اس کے نتائج

اس جنگ کے بعد اہل شام نے باقاعدہ مسلح فوج تیار کی اور اندلس کے علاقوں میں جابجا تقسیم ہوکر بربریوں کو قتل کرنا شروع کیا۔

بلج کی امارت

جب اس کارروائی سے بربری فسادات کی آگ بجھ گئی تو ان لوگوں نے معاہدہ
کے مطابق اپنی واپسی کی خواہش کی اس پر عبدالملک نے عذر کیا کہ ہمارے یہاں اتنی کشتیاں نہیں
ہیں جن پر تم ایک دم سوار ہوکر جا سکو کیونکہ تمھارے ساتھ گھوڑے غلام پوشاک وغیرہ سامان کافی
کثرت سے ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم لوگ تھوڑے تھوڑے کرکے افریقیہ بھیج دئے جاؤ۔ شامیوں نے جواب
دیا کہ ہم تو سب ایک ساتھ جائیں گے۔ پھر عبدالملک نے کہا اچھا تم افریقیہ نہیں جاتے ہو تو سبتہ

کی راہ لو اس بات پر شامی بگڑ گئے اور انھوں نے کہا تم ہم کو طنجہ کے بربریوں سے الجھانا چاہتے ہو، اس سے تو بہتر یہ ہے کہ ہمیں سمندر کے گرداب میں دھکیل دو۔ اس حص بحص جب شامیوں نے ابن قطن کے تیور اچھے نہ دیکھے تو سب نے متفق ہو کر اس پر حملہ کر دیا اور قصر حکومت سے اس کو نکال کر اپنے سردار و بلیق بلج کو امیر بنایا۔ ابن قطن یہاں سے نکل کر اپنے اس مکان میں اترا جس کو دار ابی ایوب کہتے تھے۔ ابن قطن کے دونوں بیٹے بھاگ گئے ایک اردہ پہنچ گیا ... نے سرقسطہ میں پناہ لی۔ یہ دونوں تھوڑے دن اپنی اپنی جگہ مقیم رہے اور اپنی ... رہے۔

یہ شامی لشکر کچھ مدت تک قرطبہ میں رہے اور اپنی ... کے لوگ بھی حکومت کی نسبت کوئی فیصلہ کن تجویز نہ کر سکے اور ... پڑتی رہی۔ ادھر الجزیرہ کے والی نے ان رہن شدہ شامیوں کی ام حکیم میں مقیم تھے اور ان کی غذا و آب رسانی کا انتظام بند کر دیا تھا۔ ان تکلیفوں کی شدت سے ان لوگوں کے ساتھ والوں میں شام کے ایک ذی عزت شریف کا انتقال ہو گیا۔

عبدالملک ابن قطن کی شامت اور انجام

جب بلج نے ان لوگوں کو جزیرہ سے نکالنے کے لئے آدمی بھیجے تب یہ لوگ نجات پا کر آئے اور ابن قطن کے سلوک کی شکایت کی اور کہا کہ ابن قطن نے ہمارے ایک سردار کو پیاسا رکھ کر مار ڈالا اس لئے ابن قطن ہمارا مجرم ہے اسے ہمارے حوالہ کر دیا جائے تاکہ ہم اس سے سمجھ لیں۔ بلج نے ان کو سمجھایا کہ ایسا نہ کرو کیونکہ وہ قریش سے ہے اس کے علاوہ تمہارے ساتھی کی موت ابن قطن کے ہاتھ سے قتل خطا کے طور پر ہوئی ہے۔ تمھیں اس وقت تک صبر کے ساتھ خاموش رہنا چاہئے جب تک معاملات وحالات پر قابو نہ مل جائے۔ اس جواب سے شامی لشکر کے یمنی سپاہی دفعۃً برہم ہو گئے اور انھوں نے بلج سے بگڑ کر کہا کہ تم نے مضر کی حمایت کی ہے یہ اچھا نہیں کیا جب بلج کو ان کے فساد و تفرقہ کا ڈر ہوا تو مجبوراً اس نے ابن قطن کو قید خانے سے نکلوایا۔

ابن قطن نوے سال کے سفید ریش بڈھے پھونس تھے۔ اہل مدینہ کے ساتھ واقعہ حرّہ میں شریک ہو چکے تھے اور جنگ حرّہ سے بھاگ کر افریقیہ آئے تھے ان کو دیکھتے ہی مجمع نے شور کیا اور کہا کہ کیوں رے بجگوڑے، تو حرّہ کے واقعہ میں ہماری تلواروں سے بچ کر نکل آیا اور یہاں اس کا بدلہ یوں لیا کہ ہمیں تو نے کتوں کا کھانا اور کھالیں کھانے کو دیں اور امیر المومنین کی فوجیں اس کھانے کے معاوضہ میں خرید کر ضائع کر دیں۔ پھر اس پر ہجوم کر کے گھیرتے ہوئے پل پر لائے اور قتل کر کے اس کی لاش راستے میں ایک جگہ لٹکا دی اور لاش کے دائیں جانب ایک سور اور بائیں جانب ایک کتے کی لاش لٹکا کر اپنی نارضگی کا مظاہرہ کیا۔

عبدالملک ابن قطن کی لاش ایک دن تک وہیں لٹکی رہی پھر اس کے بربری غلام جو مدہ کے رہنے والے تھے لاش چرا کر لے گئے اور اپنے اہتمام سے اسے دفن کیا۔ اس مقام کو جہاں کہ عبدالملک کی لاش لٹکائی گئی تھی مصلب عبدالملک ابن قطن کہتے تھے۔ جب یوسف قرطبہ کا والی ہوا اور امیہ ابن عبدالملک نے مصلب عبدالملک پر ایک مسجد بنوائی تو اس کو مسجد امیہ کہنے لگے۔ مصلب کا نام جاتا رہا۔ پھر جس زمانے میں اہل قرطبہ نے حکم ابن ہشام پر زغہ کیا اور یہ مقام میدان ہو گیا اور مصلب اور مسجد دونوں کے نام جاتے رہے۔

ابن قطن کے بیٹوں کی جنگی تیاریاں | جب عبدالملک کے دونوں بیٹے اپنے باپ پر شامیوں کا زغہ دیکھ کر بھاگ گئے تو انھوں نے کچھ مدت بعد والی اربونہ کو ہموار کر کے اربونہ میں فوجیں جمع کرنا شروع کیں ساتھ ہی یہ دیکھ کر کہ اب اہل بلد اور بربری دونوں وہ بس ہو گئے ہیں اور اہل بلد کی تلواروں سے اہل بربریوں کا خون خشک نہیں ہوا ہے، بربریوں کے داغ ابھی تازہ ہیں، بربریوں کو بھی شامیوں سے بدلا لینے پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ شریک کر لیا اور بربریوں سے طے کر لیا کہ اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد تمھیں اختیار ہو گا کہ اہل بلد کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ اس اہتمام و اجتماع کے بعد

عبدالرحمٰن ابن حبیب اور عبدالرحمٰن علقمہ لخمی | عبدالملک کے دونوں بیٹے عبدالرحمٰن ابن حبیب کے ساتھ فوجکشی کے ارادے سے بڑھے۔ عبدالرحمٰن ابن حبیب بلج کے ساتھیوں میں تھے جب عبدالملک

والا واقعہ پیش آیا تو بلج سے الگ ہو گئے اور اہل شام کی رفاقت سے انکار کر دیا۔ اور اس موقع پر ان کے خلاف عبدالملک بیٹوں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ عبدالرحمٰن ابن علقمہ لخمی والی اربونہ نے خود بھی ان کا ساتھ دیا۔ غرض مجموعی طور پر یہ فوج ایک لاکھ آدمیوں پر مشتمل ہو کر بلج اور اس کے خلاف چڑھائی کر کے قرطبہ پہنچی۔

<u>بلج کی فوجی استعداد</u> | بلج کا لشکر شمار میں تقریباً بارہ ہزار سواروں پر مشتمل تھا۔ یہ سوار وہی مفرور شامی تھے جو پہاڑوں، قریوں یا افریقیہ کے بعض مقامات میں روپوش تھے اور شام واپس جانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ اہل بلد و اہل بربر کے غلام جو بلج نے اکٹھا کر لئے تھے ۔ ...... کر حا . . . سے یہ سب کے سب قرطبہ سے ہوتے ہوئے تقریباً ۲۰ میل پر اس موضع ہیں اور بلج کے لشکر میں شامل ہو گئے۔

<u>عبدالرحمٰن ابن علقمہ کا بلج سے مقابلہ</u> | بلج ان سب کا لشکر سے ہوئے ...

اس موقع پر شامی لشکر نے کچھ زیادہ استقلال سے کام نہ لیا اور معمولی طور پر لڑے رہے ب اثنا میں عبدالرحمٰن ابن علقمہ جو اہل اندلس کے شہ سواروں میں مشہور تھے آگے بڑھے اور انھوں نے شامیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمیں بلج کو دکھلا دو تاکہ میں اسے قتل کر دوں یا خود اس کے ہاتھ سے مارا جاؤں۔ شامیوں نے اشارہ سے بلج کو دکھا دیا کہ وہ سفید گھوڑے پر سوار ہے عبدالرحمٰن نے دیکھتے ہی سرحد کے سواروں کو ساتھ لے کر اس پر حملہ کیا۔ شام والوں نے ہٹ کر راستہ دے دیا اس وقت جھنڈا بلج کے ہاتھ میں تھا۔ عبدالرحمٰن نے پاس پہنچ کر بلج کے سر پر تلوار کے دو وار کئے مگر حصین ابن دجین عقیلی نے جو لشکر شام کے حصہ قنسرین کا سردار تھا مقابلہ میں آ کر تلوار سے عبدالرحمٰن کے حملہ کا جواب دیا۔ عبدالرحمٰن دفع کرتا رہا۔ اس مقابلے نے اتنا طول کھینچا کہ عبدالرحمٰن جہاں پہنچا حصین وہیں اپنی فوج کے ساتھ مقابلہ پر آ جاتا آخر حصین نے عبدالرحمٰن کے گھوڑے کی کونچیں کاٹ ڈالیں اور اس کو پیادہ کر کے کئی پر زور حملے کئے اور حملے کے زور میں ان کو ان کے لشکر تک ریل کر لے لیا مگر عبدالرحمٰن اتنے زبردست شہ زور سوار تھے اور ایسے چھپے اسلحہ و لباس جنگ سے

آراستہ تھے کہ ان پر حسین کی تلوار اثر نہ کرتی تھی۔ آخر کو بلج کی فوج ہمت ہار کر بری طرح پسپا ہوگئی اور حملہ آوروں نے تعاقب کر کے ان لوگوں کو مارنا باندھنا شروع کیا۔ اور فاتح ہزاروں نفوس قتل و قید کر کے واپس ہوئے۔

بلج کا تھوڑے دن بعد انتقال ہوگیا بعض کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن ابن علقمہ کی تلوار سے جو زخم آئے تھے انھیں کے صدمہ سے وفات پائی اور بعض کا خیال ہے کہ اجل طبعی سے انتقال کیا۔ غرض بلج کے بعد اہل اندلس نے ثعلبہ ابن سلامہ عاملی کو اندلس کا والی بنایا۔ ان کے برخلاف

ثعلبہ بن سلامہ عاملی کی امارت | اہل بلد اور بربریوں نے اکٹھا ہو کر ماردہ پر چڑھائی کی۔ ثعلبہ نے مقابلہ کیا مگر ان لوگوں نے اس کثرت سے فوجیں مہیا کیں اور اس شدت سے جنگ کی کہ ثعلبہ ان کی مقابلے کی تاب نہ لاسکا۔ اور اپنی پوری کوششوں کے بعد بھی اسے قلعہ بند ہو کر اپنی حفاظت کرنا پڑی تاہم مقابلہ ہوجانے پر ثعلبہ ان سے خوب لڑا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس نے اپنے نائب متعینہ قرطبہ کو لکھا کہ بلدیوں سے مقابلے کے لئے ہمارے باقی ماندہ لشکری بھیجدو۔

ثعلبہ کی محصوری کے زمانہ میں جبکہ بلدی عرب اور بربری ثعلبہ کے مقابلے کے لئے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے عید الفطر یا عید الضحیٰ آگئی اس موقع پر ثعلبہ نے دشمنوں کی غفلت اور انتشار سے فائدہ اٹھایا اور دشمنوں کو عید کی تیاری میں مشغول دیکھ کر حملہ کی تیاری کی اور کوچ کر کے عین عید کی صبح کو حملہ کیا اور شکست دے کر بری طرح قتل کیا اور ان کے بچوں کو بھی قید کرلیا۔ حالانکہ اس جنگ سے پہلے بلج نے اسیران جنگ کی اولاد و ناموس سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا اس لئے

ثعلبہ کا عجیب ظلم | اس زمانے میں یہ لوگ محفوظ تھے ثعلبہ کے زمانے میں انھیں میں کے دس ہزار سے کچھ زائد قیدی قرطبہ کے محلہ مسارہ میں آئے۔ اندلس کے ان حالات کی اطلاع افریقیہ کے گورنر کو بھی ہوئی پھر اندلس کے ثقہ و صالح لوگوں نے خود بھی وفد و مراسلت کے ذریعہ سے گورنر کو توجہ دلا کر الحاح وزاری سے استدعا کی کہ ہم پر ایسا امیر مقرر کیجئے جو ہم سے اپنے اور امیر المومنین کے لئے اس بات پر بیعت لے کہ شام و اندلس کے تمام ممالک ایک ہی حکومت میں آجائیں گے۔ کیونکہ

نظم حکومت کی اس ابتری سے دن رات کے قتل وغارت نے ہمیں تباہ کر دیا اور اب تو ہمیں اپنی اولاد کے متعلق بھی اندیشہ ہے

جنگ کے قیدیوں کی نرالی قیمت ابھی یہ معاملہ گورنر کے یہاں زیر غور تھا۔ ابن ثعلبہ مسارہ میں اترا ہوا اہل بلد کے بوڑھوں اور بچوں کو بیچ رہا تھا۔ جو لوگ بک جاتے ان کو ان کی کجاووں میں بٹھا کر روانہ کر دیتا۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس نے ان قیدیوں میں سے جو بوڑھے تھے انھیں اس طرح بیچا کہ جو کم سے کم قیمت دے وہی لے جائے۔ چنانچہ مدینہ کے اندلسی عربوں میں سے ابن الحسن اور حرثہ ابن اسد جہینی پر بولی کا حکم دیا اور کہا کہ ان دونوں کے کم سے کم دام لگاؤ۔ [illegible] شخص نے کہا میرے پاس ۱۰ دینار ہیں ثعلبہ نے کہا اس سے [illegible] میں کمی کرتے رہے اور وہ برابر کمی پر اصرار کرتا رہا۔ آخر ان میں [illegible] میں اور ایک کو ایک بھیڑ کے بدلے بیچ دیا

ابوالخطار حسام ابن ضرار کی امارت یہاں یہی تماشا ہو رہا تھا کہ مسارہ میں ابن الخطار حسام ابن ضرار کلبی، حنظلہ بن صفوان گورنر افریقیہ کی طرف سے اندلس کے والی مقرر ہو کر آ پہنچے۔ اس وقت یزید ابن ولید خلیفہ تھے۔ ابوالخطار اندلس کے نئے والی شام کے نیک لوگوں میں سے تھے اور دمشق ان کا وطن تھا۔ شامی اور بلدی عرب ان سے خوش رہے انھوں نے آتے ہی قیدیوں اور لونڈی غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اس لئے ان کے لشکر کا نام عسکر العافیہ مشہور ہو گیا۔ اس کے بعد سے ملک میں امن و اتحاد قائم ہو گیا اور یہ رنگ دیکھ کر ثعلبہ ابن سلامہ اور عثمان ابن ابی نسعہ اور شام کے ۱۰ سرداروں نے راہ فرار اختیار کی۔ عبدالملک ابن قطن کے بیٹوں کو بھی شر و فساد سے نجات مل گئی۔ امن و امان کی بدولت لوگوں کی حالت درست ہو گئی اور شام کے باشندوں نے اندلس کے اضلاع و اقطاع میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ کی آمد شام میں بنی امیہ کا آخری دور اب کچھ بیان عبدالرحمٰن ابن معاویہ کے اندلس میں داخل ہونے کا کیا جاتا ہے مگر چونکہ دولت امویہ کے انقلاب کے بعد ہی عبدالرحمٰن ابن معاویہ

اندلس میں آئے اس لئے واقعات کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے اس سلسلہ کے ضروری واقعات کسی قدر تفصیل کے ساتھ درج کئے جاتے ہیں۔

مروان ابن محمد بنی امیہ کے آخری خلیفہ پر مشرق میں بنی امیہ کا شیرازہ بکھر کے بنی عباس کی حکومت قائم ہوئی۔ مروان ۱۳۲ھ میں قتل ہوا اور اس کا سر ابوالعباس سفاح پہلے خلیفہ عباسی کے پاس پہنچایا گیا سفاح نے خلیفہ ہوتے ہی امیہ کو چن چن کر قتل کرانا شروع کیا۔ اس نے اس نے بنی امیہ کی نسبت اتنے سخت احکام نافذ کر دئے تھے کہ ان میں کا کوئی فرد بھی جہاں کہیں مل جاتا۔ حکومت کے لوگ اسے قتل کر کے اس کا لاشہ لٹکا دیتے تھے۔ ابان ابن معاویہ گرفتار ہوئے تو ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کو شام کے محلوں میں تشہیر کیا گیا۔ منادی حکم کے مطابق ان کی سواری کے پاس نعرہ لگاتا جاتا تھا کہ "ابان ابن معاویہ بنی امیہ کا سردار یہی ہے" اسی حالت میں ابان ابن معاویہ کی جان گئی۔ اس کے بعد تو بنی امیہ کی عورتیں اور بچے کوئی قتل سے نہ بچے۔ عباسی لشکر نے عبدہ بنت ہشام ابن عبدالملک کو صرف اس بنا پر قتل کر ڈالا کہ اس سے جواہرات اور خزانوں کا پتہ پوچھتے تھے۔ مگر اس نے کچھ نہ بتایا۔ اس خوفناک ہنگامہ سے مرعوب ہو کر بنی امیہ کے بڑے بڑے عالی مرتبہ سردار بھاگ گئے۔ اور عرب کے مختلف مقامات میں ایسے چھپے کہ تلاش کرنے پر بھی ان کا پتہ نہ چلا۔

بنی عباس کا فریب | انہی روپوش ہونے والوں میں سے عبدالواحد بن سلیمان اور عمر ابن یزید وغیرہ بھی ہیں جن کو اب اپنی بے بسی کا پورا یقین ہو چکا تھا۔ بنی عباس نے اس خیال سے کہ سلیمان ابن ہشام ہمارا فریب معلوم کر کے کہیں بھاگ نہ جائے سلیمان سے معاہدہ کر لیا اور دنیاوی ندامت ظاہر کر کے جو بنی امیہ زندہ بچ رہے تھے ان کی امان کا اعلان عام جاری کر دیا کچھ مدت کے لئے تلواریں میان میں کی گئیں اور بنی امیہ کے نام اشتہار ہوا کہ "بنی امیہ پر جو کچھ گزری ہے اس سے امیرالمومنین نادم ہیں اور وہ ان کی زندگی چاہتے ہیں لہذا بنی امیہ کے لئے امان کا عام اعلان کیا جاتا ہے۔ اب کسی کو بنی امیہ سے تعرض کرنے کی جرأت نہ ہو"

اس قسم کی منادی شام کے محلوں اور سلیمان کے لشکروں میں بھی پہنچی۔ سلیمان ابن ہشام اس وقت لشکر میں تھے۔ اس منادی کے بعد بنی امیہ نے کئی وفد بھیجا اور کچھ اوپر ستر شخصوں کو نجات ملی۔ یہ سب قبیلہ کلب سے اور انکے موالی میں سے تھے۔ اور ان میں تقریباً سب کی بنی امیہ کے ساتھ سسرالی رشتہ داری تھی۔ انھیں لوگوں میں عبدالواحد عمر اور اصبغ ابن محمد ابن سعید تھے اور ان کے علاوہ ایک گروہ ایسا تھا جس کا نام معلوم نہیں۔

اس زمانے میں جب عباسیوں کے پاس بنی امیہ کا کوئی شخص آجاتا تو عباسی اس کی عزت کرتے۔ اس کو اپنے یہاں ٹھہراتے اور اس سے یہ وعدہ کر لیتے کہ ہم آپ کو امیرالمومنین تک پہنچانے سے پہلے کسی قسم کی تکلیف نہ دیں گے۔ پھر یہ لوگ امیرالمومنین
امیرالمومنین اعلان کے مطابق ان کو پوری آزادی دے دیتے
معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں کے لئے کامل امن کا انتظام کر دیا گیا
مفرور مطمئن ہو کر واپس آگئے۔ یحیٰی بن معاویہ بن ہشام اس موضع میں رہتے تھے ... کے فاصلہ پر صالح بن علی کا لشکر مقیم تھا۔ یحیٰی ابن معاویہ، صالح بن علی ہی کے مکان میں تھے مگر ان کو اور لشکر والوں کی طرح کسی قسم کا اضطراب نہیں ہوا جب اس لشکر کی نسبت صدور حکم کا وقت آیا تو لوگ یحیٰی بن معاویہ کی سکونت و قرب کی وجہ سے تشویش میں پڑ گئے کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ انتظار و تشویش کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک مدینہ، عراق اور مصر کے اموی نہ آگئے جب ان مقامات کے اموی بھی جمع ہو گئے تو یحیٰی ابن معاویہ نے اپنا آدمی بھیجا کہ واقعات کی تفتیش کر کے اطلاع دے۔ وہاں یہ آدمی پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اموی قتل کئے جا رہے ہیں اور ایک آفت برپا ہے وہ یہ دیکھ کر بدحواس ہو گیا اور بھاگ بھی نہ سکا۔ دشمنوں کے سواروں نے اس کو آلیا اور اسے بھی قتل کر ڈالا۔

ابن معاویہ کا شام سے فرار | عبدالرحمٰن ابن معاویہ بھی یحیٰی کے ساتھ اس گاؤں میں رہتے تھے مگر اتفاق کی خوبی ہے کہ اس دن شکار کے لئے کہیں گئے ہوئے تھے رات کے انھیں اس حادثہ کا علم

[illegible] اس کی پیروی کی اور ساتھ والوں کو ہدایت کی کہ اسکے بیٹے ابرا ہیم اور عبدالواحد دونوں [illegible] [illegible] بھی پیروی جائیں۔

جن بزرگ کا اوپر ذکر ہو چکا ہے انھیں سے معلوم ہوا ہے کہ جب بنی امیہ سفاح سے نزدیک ہونا شروع ہوئے تو وہ ان لوگوں کو عزت کے ساتھ اپنے پاس بٹھاتا اور طرح طرح میں ٹھہراتا رہا۔ جب سب اکٹھا ہو گئے اور سفاح کی نظر عبدالواحد بن سلیمان پر پڑی تو سفاح نے عبدالواحد کا ایک احسان یاد کر کے اس کے معاوضے میں اپنے قریب بٹھایا اور اس احسان کا ذکر کرتا اور انھیں امید دلاتا رہا اس وقت چاروں طرف مسلح سپاہی لوہے کے گرز تانے ہوئے کھڑے تھے۔ دفعۃً سفاح نے ان کو اشارہ کیا اور کہا کہ ان لوگوں کے سر کچل ڈالو۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی پھر سفاح نے عبدالواحد سے مخاطب ہو کر کہا "تجھے بھی اپنی قوم اور زوال اقبال کے بعد جینا مناسب نہیں ہے ہم نے تیرے لئے فیصلہ کر دیا ہے کہ تجھے تلوار سے قتل کیا جائے۔ چنانچہ حکم کے ساتھ ہی عبدالواحد کو قتل کر دیا گیا۔ جس نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ جان دی۔ پھر یہی عمل عمر ابن یزید کے ساتھ ہوا۔ سب سے آخر میں سلیمان ابن ہشام کی گردن بھی مار دی گئی۔

یہ بیان بھی انھیں راوی کا ہے کہ جب بقیہ بنی امیہ نے امان کا یہ نتیجہ سنا تو دور دور کے ضلعوں میں اپنے ٹھکانوں میں چلے گئے۔ مذکورہ بالا مقتولین کے سبب سے نہر ابی فطرس کے مقتولوں کی تعداد پوری بہتر ہو گئی۔ حفص ابن نعمان نے اپنے اشعار میں انھیں کا ذکر کیا ہے۔

این اصحاب العطایا منہم والبہالیل بنو الصید النجب

من یردیسل عنہم فہم حیث ۔ ۔ ۔ من فوق الخشب

(ان میں سے اصحاب عطا و کرم کہاں اور بنی صید کے شریف و سربلند لوگ کدھر گئے۔

جو شخص ان کی حالت پوچھنا چاہے اس سے کہدو ان کا جنازہ اٹھ گیا)

افریقیہ میں بنی امیہ کی آمد | اس کے بعد بنی امیہ کی تلاش بڑی سختی سے ہونے لگی یہ لوگ جا بجا بھاگ کر روپوش ہو گئے اور چونکہ ان لوگوں نے سنا تھا کہ ان کا امن مغرب میں ہوگا اس لئے اکثر لوگ

(باقی)